بے تیغ سپاہی
نواب صدیق علی خان

ایوان قائداعظمؒ
سلسلۂ مطبوعات نمبر 35

بے تیغ سپاہی
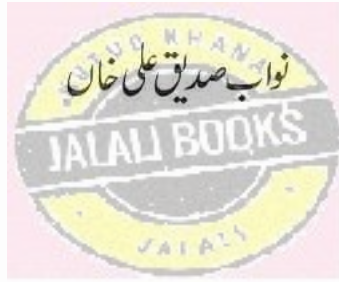
نواب صدیق علی خان

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

نام کتاب	:	بے تیغ سپاہی
مصنف	:	نواب صدیق علی خاں
زیر نگرانی	:	شاہد رشید
مہتمم اشاعت	:	ناہید عمران گل
ایڈیٹنگ	:	نعیم احمد
رابطہ کار	:	عدنان اشرف
ڈیزائننگ	:	محمد شہزاد یٰسین
کمپوزنگ	:	نوید انور
اشاعت اول	:	اگست 2018ء
اشاعت دوم	:	اکتوبر 2018ء
تعداد اشاعت	:	1000

ناشر

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

ایوان کارکنان تحریک پاکستان، مادرِ ملتؒ پارک، 100-شاہراہ قائداعظمؒ، لاہور

فون: 14-99201213 فیکس: 99202930 ای میل: trust@nazariapak.info

ویب سائٹ: www.nazariapak.info www.facebook.com/NazarialPakistanTrust

طابع نظریۂ پاکستان پرنٹرز

ایوانِ قائداعظمؒ، 1-شاہراہ نظریۂ پاکستان، 20-J/1، جوہر ٹاؤن، لاہور

فون: 35951641, 042-35951642

ابتدائی کلمات

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اُجاگر کیا جائے' نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہلِ وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ نے وطن عزیز کی نئی نسل کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنایا ہے کیونکہ ہماری نسلِ نو ہی ہمارے ملک و قوم کا مستقبل ہے اور ان کے فکر و عمل کو علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار و کردار کے سانچے میں ڈھال کر ہی ہم اپنے مستقبل کو زیادہ روشن اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیر تحریک پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو

انتساب

قائداعظمؒ اور ان کے دس کروڑ

بے تیغ سپاہیوں کے نام جنہوں نے

تن من دھن کی بازی لگا کر

پاکستان حاصل کیا

فہرست

☆☆☆☆☆

عرض واقعی

''اے کہ آرائش ہماری داستاں کی تجھ سے ہے''

اللہ کے فضل و کرم سے اسلامی مملکت پاکستان کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے تیئیس (23) سال ہو رہے ہیں۔ اس عرصہ میں کئی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے لیکن جنگ آزادی کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالی گئی مثلاً آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، مسلم نیشنل گارڈ اور مسلم خواتین کا اس تحریک سے کیا تعلق تھا اور انہوں نے اسے کامیاب بنانے میں کیا حصہ لیا اور مزید برآں قائداعظمؒ اور شہید ملت کے کردار اور افکار کے بہت سے رخ اُجاگر نہیں کئے گئے۔

اس حقیقت کے پیش نظر باوجود اپنی ہیچ مدانی اور کوتاہ قلمی کے اپنے قلم کو اس اُمید کے ساتھ حرکت میں لانے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ مقدس فریضہ جو میرے لئے قوم کی آخری خدمت ہوگا، انجام پا سکے۔ اللہ میری مدد کرے۔

ان اوراقِ پریشاں میں میرا بھی ذکر واقعات کی وابستگی یا چند حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے آئے گا لیکن یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ اس اظہار سے اپنی شہرت یا خودستائی مقصود نہیں ہے۔ میرا مقصد تو صرف اپنے عظیم محسنوں اور ان کے چند رفقاء کی شاندار خدمات کو موجودہ اور آنے والی نسلوں کی آگہی کیلئے قلمبند کرنا ہے۔

1- میں اس کتاب میں عام وفرسودہ ڈگر سے ہٹ کر نئی راہوں پر گامزن ہو رہا ہوں۔ اللہ

میری لاج رکھ لے۔

2- یہ بتلا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ پیش کش نہ تو تاریخ ہے اور نہ قائداعظمؒ یا شہیدِ ملت کی سوانح حیات۔ یہ تو چند واقعات اور میرے تاثرات ہیں جو میں اپنی قوم کے سامنے پیش کرر ہا ہوں۔

3- چند خطوط و دستاویزات اصلی زبان میں تبرکاً بغرضِ اظہارِ مدعا زینتِ اوراق کئے جا رہے ہیں۔

4- استدعا ہے کہ زبان اور کتابت کی غلطیوں کو اس نیک مقصد کی اہمیت کے پیش نظر معاف کر دیجئے۔

صدیق علی خاں
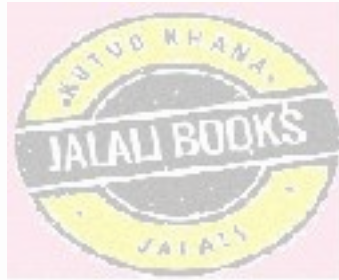
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا فتّاح و یا مُعینُ

کچھ اپنے متعلق

(معذرت کے ساتھ)

صغیر سنی ہی میں میری والدۂ محترمہ کا سایۂ شفقت جن کے قدموں تلے میرے لئے جنت تھی اور جن کا شغلِ زندگی سوائے میری پرورش، تربیت اور دعا گوئی کے اور کچھ نہ تھا، میرے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو یہ دیکھا کہ میرے والد مرحوم و مغفور نواب غلام محی الدین علی خان صاحب ہمارے خاندان کے واحد سرپرست تھے۔ چونکہ میں تین بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اس لئے مجھے بہت لاڈ اور پیار سے پرورش کیا جا رہا تھا لیکن میرے والد مرحوم میری تعلیم و تربیت کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ قبلہ والد صاحب نے بہ نفسِ نفیس مجھے بندوق چلانا، تیرنا، درخت پر چڑھنا اور شہسواری سکھلائی۔ اُس زمانہ میں تعلیم کے ساتھ جسمانی ورزش پر بہت زور دیا جاتا تھا اور بچپن سے ہی ایک اچھا سپاہی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مجھے فنِ کشتی سے خاصا شغف تھا کیونکہ بھوپال کے حافظ پہلوان ہمارے یہاں ملازم تھے جو کئی کئی گھنٹے ورزش کرتے اور دنگلوں میں مشہور پہلوانوں سے کشتی لڑا کرتے تھے۔

مجھے صدر بازار ناگپور میں میرے واجب التعظیم استاد ماسٹر عبدالعزیز صاحب کے زیرِ نگرانی ان کے گھر پر رکھا گیا اور میری ابتدائی تعلیم مڈل تک ان شفیق استاد کے گھر جو ایک ولی صفت انسان تھے ہوئی۔ انجمن ہائی سکول، مڈل سکول اور پرائمری سکول ناگپور میں جناب محمد فرید خاں صاحب فضا، مولوی محمود علی خاں صاحب، محمد یعقوب خاں صاحب کلام، قاضی ناصر علی عباسی

صاحب، سمیع اللہ خان صاحب، عبدالطیف خاں صاحب، وحید الحق صاحب صدیقی، سید یاسین صاحب، انیس الدین احمد صاحب، خیر خاں صاحب، مولوی حکیم باز محمد خاں صاحب، مولوی مبارک علی صاحب اور ماسٹر عبدالکریم صاحب وغیرہ وغیرہ قابل احترام اساتذہ کے سامنے میں نے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان ہی بزرگوں کا فیضانِ تعلیم و تربیت تھا جو میری زندگی کو سنوارنے و بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوا۔

تعلیم کے سلسلہ میں تقریباً ایک سال تک میں کلکتہ میں بھی رہا اور وہاں محمڈن سپورٹنگ کلب کی طرف سے فرسٹ ایلیون میں کرکٹ اور ہاکی کھیلتا رہا۔ میں نے بائٹن کپ میں بھی محمڈن سپورٹنگ کلب کی نمائندگی کی تھی۔ اس وقت علی گڑھ کے مشہور کرکٹر محمد کلیم اللہ صاحب انصاری کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے۔

بچپن سے ہی میں کھیل کود میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مارس کالج ناگپور میں داخل ہوا لیکن میری بدنصیبی کہ اچانک ایک سانحۂ عظیم رونما ہوا۔ یعنی میرے والد محترم جائیداد کے جائز قانونی حقوق کی نگہداشت کرتے ہوئے ہندو رعایا کے ہاتھوں قصبہ لاکھنی (ضلع بھنڈارہ، سی پی) میں شدید زخمی ہو کر شہید ہوئے۔ اس طرح نوعمری میں ہی میرے ناتواں کندھوں پر قرض کی ادائیگی، جائیداد کے انتظامات اور پانچ اَن بیاہی بہنوں اور تین خورد سال بھائیوں تقی علی خاں، ابراہیم علی خاں اور ہدایت علی خاں کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ آ پڑا۔

قدیم رسم و رواج کے مطابق خاندان میں سب سے بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے والد مرحوم کی وفات کے بعد سوائے پولیٹیکل پنشن کے جو انگریزوں نے یک لخت بند کر دی، باقی تمام سرکاری اعزازات مجھے دیے گئے یعنی صوبہ کے گورنر کا خاص درباری اور خاص ملاقاتی مقرر کیا گیا اور مجھے آنریری مجسٹریٹ بھی بنایا گیا۔ خاندانی اسلحہ جات کا لائسنس میرے نام پر منتقل کیا گیا اور موضع لاکھنی (ضلع بھنڈارہ) اور دیگر جائیداد کا مجھے نمبردار مقرر کیا گیا۔ اس طرح جواں سالی میں میری عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ بعد میں ناگپور میونسپل کمیٹی ڈسٹرکٹ کونسل، لوکل بورڈ کا ممبر نامزد

کیا گیا نیز نا گپور سنٹرل جیل کا عرصہ تک غیر سرکاری وزیٹر رہا۔

ناگپور میونسپل کمیٹی کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ محمد سمیع اللہ خاں صاحب سب سے پہلے مسلمان میونسپل ممبر تھے جو ہندو اکثریت والی میونسپلٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد تو آج تک کوئی مسلمان صدر نہیں چنا گیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ میونسپلٹی کی رکنیت کے زمانہ میں ہندوستان فیڈرل کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس (محمد ہدایت اللہ صاحب)' مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق گلاؤٹھوی' میرے عزیز دوست عباس علی کمال صاحب' ابراہیم خاں صاحب فنا' بیرسٹر محمد احمد اللہ صاحب اور عبدالمجید لیڈر ناگپور میونسپلٹی کے رُکن ہوا کرتے تھے۔ ان عہدوں کی بنا پر میں انگریز حکام اور سربرآوردہ ہندوؤں سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ بعدہٗ کئی مسلم وغیر سرکاری اداروں میں بھی کام کرنے کے مواقع ملے۔ یہاں تک کہ ناگپور کے سب سے بڑے مسلم ادارہ یعنی انجمن حامئ اسلام کا مجھے صدر منتخب کیا گیا۔ اس انجمن کی مالی حالت ہمیشہ پست رہی۔ مسلم عوام اپنی مشکلات کے پیش نظر بہت کم مدد کرتے تھے۔ اللہ اُن چند میمن کچھی اور بوہرہ تاجروں کو جزائے خیر دے جو مستقلاً اس انجمن کی مدد کرتے رہے لیکن پھر بھی ہمارا کام نہیں بنتا تھا۔ ہم سی پی برار والے کس طرح سلطان العلوم خسرو دکن میر عثمان علی خاں کا شکریہ ادا کریں جنہوں نے اس انجمن جیسے بہت سے حاجت مند اداروں کی وقتاً فوقتاً شاہانہ مالی امداد کی اور امراؤتی میں مسجد عثمانیہ تعمیر فرما کر بہشت میں اپنے لئے شایان شان ایک اور قصر بنوایا۔ انجمن مذکور کی زیر سرپرستی ایک ہائی سکول اور مڈل سکول پس ماندہ مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلاتے تھے جن کی اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے بڑی فراخدلی سے ہمیشہ مالی امداد کیا کرتے تھے۔

یہ کہتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میرے زمانہ صدارت میں انجمن ہائی سکول کی سلور جوبلی صوبہ کے گورنر سر ہائیڈ گون کی زیر سرپرستی منائی گئی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے آؤٹ ڈور گیم کا بہت شوق تھا' بالخصوص کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل تھا لیکن اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اپنی جیب سے کافی رقم خرچ کرنی پڑتی

تھی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں ہندوؤں، پارسیوں اور انگریزوں کی نمائندہ صوبائی کرکٹ ٹیمیں ہوتی تھیں اور ہر سال ان چاروں ٹیموں میں مقابلے ہوتے تھے اور فاتح ٹیم چیمپئن کہلاتی تھی۔ میرے ہم عصروں میں کرنل سی کے نائیڈو، ان کے دو نائیڈو برادران، ایس پی چوبے، جی وی مولانکر، ڈی آر رتنم، جے جے ایرانی (آر جی بھیڑے) ڈی ڈی ڈرائیور، گوند سوامی، جارج لوکھنڈے، منوہر بھیڑے اور مانک راؤ وغیرہ تھے۔ مسلمانوں میں آغا محمد اکرم، خواجہ محمد اکرم خان محمد خاں، سید منہاج الدین، سید واجد علی، اسماعیل شریف عبدالرزاق محمد اسماعیل، رحمان پاشا، ایم اے لطیف، محمد کلیم اللہ انصاری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کرکٹ ٹیم کے کپتان)، حبیب احمد، فضل القدیر، محمد حنیف، محمد بشیر الدین، ایم اے حفیظ، لطف اللہ خاں، سید حفظ الرزاق، سید خلیل الرزاق، نذیر سانی، اقبال یوسف چوٹی کے کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ 1938ء تک مسلم کرکٹ ٹیم کی قیادت میرے ہی ذمہ تھی۔ میں مسلم کرکٹ ٹیم کو لے کر صرف صوبہ کے اندر ہی نہیں بلکہ صوبہ سے باہر بھوپال، اورنگ آباد وغیرہ جایا کرتا تھا۔ بھوپال میں نواب صاحب پٹودی مرحوم، نواب صاحب کردائی، استاد وزیر، جج سلام الدین صاحب، میجر ممتاز اور میجر وزیر علی، رام جی وغیرہ وغیرہ کے خلاف بارہا کرکٹ کھیلنے کا موقعہ ملا۔

کرنل نائیڈو کی وجہ سے بمبئی کے بعد ناگپور کرکٹ کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ کرنل سی کے نائیڈو ہندوستان کے ایک شہرۂ آفاق کھلاڑی تھے۔ بین الاقوامی حیثیت سے ان کا وہی مقام تھا جو پرنس رنجیت سنگھ (رانجی)، سر ڈان براڈمان اور سر جیک ہابس کا ہوا کرتا تھا۔ وہ بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ کامٹی کے راؤ صاحب راجتا کو وہ اپنا کرکٹ کا گرو مانتے تھے۔ نائیڈو نہایت منکسر المزاج اور خوش خلق انسان تھے۔ میرے عزیز دوست تھے۔ بابا صاحب حضرت تاج الدینؒ سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی۔ اُن کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ وہ ہر بڑے میچ سے قبل بابا صاحب کے دربار میں حاضری دیتے اور دعا کے طالب ہوتے۔

اللہ نے مجھے یہاں تک نوازا کہ میں صوبہ سی پی و برار کرکٹ ایسوسی ایشن کا مدتوں

اعزازی سیکرٹری رہا۔ صرف اندرون ملک سے ہی نہیں مثلاً کرکٹ کلب آف انڈیا کی ٹیم جس میں مشہور کرکٹ کھلاڑی ناوٗلے، سید دلاور حسین، ہنڈلیکر، سید مشتاق علی، ناوٗمل، منکڈ، ہزارے، لالہ امرناتھ وغیرہ شریکِ ٹیم ہوا کرتے تھے۔ بیرون ملک سے بھی کرکٹ ٹیمیں ایم سی سی، سیلون اور آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیموں کے میچوں کے انتظامات اور ان کی مہمان نوازی کے فرائض مجھے ادا کرنا پڑتے تھے۔ میں مدتوں انڈین کرکٹ بورڈ آف کنٹرول میں سی پی و برار کی نمائندگی کرتا رہا۔ مسلمانانِ صوبہ ہماری کوارڈر ینگولر کرکٹ ٹیم کی پیہم ہندوؤں کے ہاتھ شکستوں سے بہت رنجیدہ تھے لیکن آخر وہ دن آ گیا جب ہم نے بیگ برادران یعنی مراد بیگ صاحب و مظفر بیگ صاحب کو اپنی ٹیم میں شامل کر کے اور ان کی بہترین بولنگ اور بیٹنگ کی بدولت ہندو ٹیم کو فائنل میں شکست فاش دی اور پہلی مرتبہ اپنی برتری کے باعث صوبہ کے چیمپئن ہوئے۔ اس پہلی شاندار کامیابی سے صرف مسلمانانِ صوبہ ہی مسرور نہیں ہوئے بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں کہیں مسلمان آباد تھے، بہت خوش ہوئے اور تہنیت نامے بھیجے جس میں سے ایک خط جواب تاریخی حیثیت کا حامل ہے، کراچی سے انتالیس سال قبل موصول ہوا تھا، شائع کیا جا رہا ہے۔ الحاصل زندگی کے کئی سال کھیل کود اور سماجی خدمت کی نذر ہوئے۔

تقریباً پندرہ سال تک آنریری مجسٹریٹی کے فرائض ادا کئے جس میں سے زیادہ زمانہ مجسٹریٹ درجۂ اول کا رہا اور اس وجہ سے کئی چوٹی کے وکیل عدالت میں پیروی کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہندوستان فیڈرل کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب بھی ایک تھے۔ اگر تعلّی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ الحمدللہ میرے فیصلے باوجود اپیلوں کے عدالت عالیہ میں بھی ہمیشہ بحال رہے۔ اس طرح مجھے عدل و انصاف، جھوٹ اور سچ میں امتیاز کرنے اور قیافہ شناسی کی کچھ خوسی پڑ گئی جو میری سیاسی زندگی کو ڈھالنے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

سی پی او برار میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 4 فیصدی تھا۔ لہٰذا ہندو اکثریت مسلمانوں سے چھیڑ خانی کرتی اور ہمیشہ ان کے مذہبی جذبات کو اپنی اکثریت کے زعم میں شدید

طور پر مجروح کیا کرتی تھی۔ چنانچہ کئی ہندو مسلم فسادات ہوئے جس میں مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن مسلمان باوجود اقتصادی پستی و اقلیت کے ہندوؤں پر اپنی ہمت و تنظیم کی وجہ سے ہمیشہ بھاری رہے۔

آپ یقین فرمائیں کہ سطور بالا میں میرا ذاتی ذکر میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہوا ہے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اگر ذکر نہ کرتا تو اوائل عمری کے حالات جن سے آنے والی زندگی کی داغ بیل پڑی، مخفی رہ جاتے اور جن سے اخلاق و کردار سازی میں بڑی مدد ملی، سامنے نہ آتے۔ دوئم اپنے شفیق والدین اور اپنے واجب التعظیم اساتذہ کے ذکر خیر سے چشم پوشی یا گریز بڑی ناخلفی ہوتی۔ سوئم کرکٹ کا ذکر نہ کرنے سے جس نے اپنے کپتان سے عقیدت، فرماں برداری، رواداری، اجتماعی سعی اور نظم و نسق سے دوچار کیا اور بعد میں جزوِ کردار بن کر قوم کا سپاہی بنایا، ناقابل معافی کوتاہی ہوتی۔ الحاصل اس زمانہ کی ہر سرگرمی متعین کردہ منزل کی طرف ایک بڑھتا قدم تھا۔ چنانچہ میں اپنی اس تحریر اور اس جیسی دوسری تحریروں پر عفوِ بزرگانہ کا متمنی ہوں۔
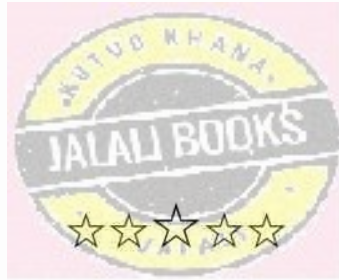
مرکزی اسمبلی کا انتخاب

1934ء

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شعورِقومی کروٹیں بدل بدل کر بیدار ہو رہا تھا۔ آخر مسلمان کب تک سوتے رہتے۔ ہندو قوم بالکل جاگ گئی تھی اور مصروف عمل تھی۔ اس کا آزادی ہند کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم سماجی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی دوڑ میں ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے لیکن وقت کے تقاضوں کو کب تک نظر انداز کرتے۔

بڑی بڑی ہندو شخصیتوں نے آئینی طور پر مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں ہندو نشستوں پر قبضہ کر کے ہندوستان کی تحریک آزادی کو اس فورم کے ذریعہ اور زیادہ تیز کر دیا۔ اس زمانہ میں عام طور پر اکثر و بیشتر ایسے مسلمان نمائندے منتخب کئے جاتے تھے جو پنشن یافتہ ہوتے یا خطاب یافتہ۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے سوائے چند کے سب کو رائے دہندگی کی وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو قوم کے ایک آزاد فرد کو ہونی چاہئے۔ ان بیچاروں پر اعلیٰ انگریز حکام جنہوں نے ان کے حصول مراتب میں مدد کی تھی، ہمیشہ اثر انداز ہوتے اور اس لئے صاحبان قومی و ملکی مفاد کو بسا اوقات پس پشت ڈال کر انگریزوں کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے اور کبھی بھولے سے بھی انگریزوں کی مخالفت کی ہمت نہ کرتے۔ قوم نے اُن کے اس رویہ سے بیزار اور نالاں ہو کر اُن پر کڑی نکتہ چینی کرنی شروع کر دی تھی۔ صوبہ سی پی و برار کی آٹھ لاکھ مسلمان آبادی کا مرکزی اسمبلی میں صرف ایک نمائندہ ہوتا تھا۔ مسلمانانِ صوبہ چند شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں آباد تھے اور کہیں کہیں ان کے صرف دو یا ایک مکان ہوتے۔

اسی لئے حلقۂ انتخاب بہت وسیع تھا۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ مرکزی اسمبلی کے لئے بہت کم لوگ اُمیدوار ہوا کرتے تھے اور لازمی طور پر وہی دولتمند امیدوار کامیاب ہوتا جس کو انگریز سرکار کی سرپرستی حاصل ہوتی۔

1934ء کے اواخر میں نیا انتخاب عمل میں آنے والا تھا۔ اس وقت خان بہادر حافظ محمود ولایت اللہ صاحب' او بی ای پنشن یافتہ سابق ڈپٹی کمشنر 50 سال سے مسلسل اسمبلی میں صوبہ ہٰذا کی طرف سے رکن تھے۔ اس پانچ سالہ رکنیت میں ہوسکتا ہے کہ انہوں نے پنشنز اور خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے سرکاری پارٹی کا کئی بار ساتھ دیا ہو۔ اب حالات بالکل بدل چکے تھے اور عالمگیر ذہنی انقلاب کی وجہ سے صوبہ کے مسلمان متمنی تھے کہ آئندہ انتخاب میں ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو بہتر طریقہ پر آزادی کے ساتھ بغیر بیرونی دباؤ کے ملکی مفاد کی نگہداشت کر سکے اور حکومت کے اشاروں پر نہ چلے۔

چند ہمدردِ قوم نوجوانوں نے جن میں حاجی عبداللہ بھائی (حاجی حسن دادا)' حاجی ابراہیم موتی والا (حاجی کریم نور اینڈ سنز)' ملّا صادق بھائی' ولی بھائی سندر جی احمد خاں براری' حاجی محمد صادق ہارون (صدو سیٹھ)' عزیز الحق' ڈاکٹر محمود علی اور لطیف سیٹھ (لطیف برادرس)' حاجی عبدالغنی' محمد ابراہیم' محمد بشیر الدین' محمد یقین الدین' سعید اللہ خان' شیخ قاسم ٹھیکیدار' شیخ حسین قابل ذکر ہیں' جنہوں نے باہمی مشورہ سے طے کرکے ''قرعہ فال بہ نام منِ دیوانہ زدند۔'' میرے احباب نے جب اپنا متفقہ فیصلہ بہ تائید خواجہ میاں پٹیل اور فضل اللہ سیٹھ مجھے سنایا تو میں سخت کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں:-

1- میں خان بہادر صاحب کو اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور ان کے صاحبزادوں محمد اکرام اللہ' محمد احمد اللہ اور محمد ہدایت اللہ سے میرے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور یہی وجہ تھی کہ حافظ صاحب مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ جب کلکتہ میں کرنل سرحسان سہروردی کی صاحبزادی شائستہ بیگم کی شادی اکرام اللہ صاحب سے ہوئی تو وہ

مجھے اپنے ساتھ اصرار کر کے بارات میں لے گئے۔ یہ خاص سبب تھا کہ میں ان کا حریف بننا نہیں چاہتا تھا۔

2- اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے خود کو اس اہم مقام کا اہل بھی نہیں سمجھتا تھا۔

3- حلقۂ انتخاب کی وسعت پریشان کن تھی لیکن مصلحت ایزدی یہ ہی تھی کہ میں اپنے دوستوں کے شدید اصرار پر امیدوار بننے کے لئے رضامند ہو جاؤں۔ آخر کار مسلمانانِ صوبہ کی خدمت و نمائندگی کرنے کے لئے میں میدانِ انتخاب میں مجبوراً آ گیا۔

اس انتخاب کے وقت مسلم لیگ کا وجود تقریباً عدم کے برابر تھا اور مسلم لیگ کی جگہ بڑی حد تک آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے لے لی تھی جس کے سربراہ نواب احمد سعید خاں آف چھتاری تھے اور مولوی سر محمد یعقوب، سر محمد یوسف، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، نواب سر محمد یامین خاں وغیرہ وغیرہ اس جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔ مسلم قوم پرستوں کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں تھی لیکن انہوں نے مسلم یونٹی بورڈ بنایا اور ان سب کا عام مسلمانوں میں کافی اثر و رسوخ تھا۔ چونکہ خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب کے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے بانیوں سے دیرینہ دوستانہ تعلقات تھے، لہٰذا ان کو بغیر کسی تگ و دو کے مسلم کانفرنس کا ٹکٹ مل گیا۔ مرزا اختر حسین صاحب ایڈووکیٹ بمبئی دوسرے اُمیدوار تھے جو کھنڈوہ کے ایک قوم پرست رئیس تھے۔ انہیں پوری طرح سے قوم پرست مسلمانوں کا تعاون حاصل تھا اور اس لئے انہیں آسانی سے یونٹی بورڈ کا ٹکٹ مل گیا۔ تیسرے اُمیدوار عباس علی حاجی بی اے مالک الیکٹرک کمپنی اُمراؤتی بوہرہ جماعت کے ایک ممتاز فرد تھے اور انہیں بے شمار تجارت پیشہ رائے دہندوں کی حمایت حاصل تھی۔ مزید برآں وہ ایک متمول شخص تھے اور ان کی جماعت کے کافی لوگ بھی ووٹر تھے۔ میں صرف ایک ایسا امیدوار تھا جس کو کسی جماعت کی سرپرستی حاصل نہیں تھی مگر قوم کے نوجوان میرے ساتھ تھے۔ اس لئے میں نے اللہ کے توکل اور نوجوان دوستوں کی پرجوش و مخلصانہ کوششوں اور دوڑ دھوپ کے سہارے انتخاب لڑنے کی ٹھان لی۔

جوں جوں انتخاب کا وقت قریب آتا گیا' ناگپور کے حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اکابرین قوم میں سے دو بزرگوں نے علی الاعلان حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔ سابق رکن مرکزی اسمبلی وسوراج پارٹی محترم سمیع اللہ خاں صاحب ایڈووکیٹ نے ایک شرط عائد کی جس کو میں نے بہ خندہ پیشانی قبول کیا۔ وہ شرط یہ تھی کہ منتخب ہونے کے بعد میں مرکزی اسمبلی میں مسٹر ایم اے جناح کی پارٹی میں شامل ہوں گا۔ خان صاحب موصوف جناح صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ ایک زمانہ میں وہ ان کے ساتھ مرکزی اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ وہ جناح صاحب کی سیاسی سرگرمیوں سے کماحقہٗ آگاہ تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مرکزی اسمبلی میں اُن کی قیادت سے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرے بزرگ وممتاز مسلم رہنما بیرسٹر محمد یوسف شریف صاحب میرے انتخاب میں بغیر کسی شرط کے بڑی گہری اور عملی دلچسپی لینے لگے۔ اُنہوں نے ازراہِ کرم میرے حلقۂ انتخاب میں میرے ساتھ کئی مقامات کا دورہ کیا اور مجھے ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور میری کامیابی کے لئے دل سے خواہاں وکوشاں رہے۔

اس زمانے میں تاج الدین صاحب جبلپور کے مسلمہ مسلم رہنما تھے۔ اُنہوں نے اپنی پارٹی کے ساتھ میری حمایت کا اعلان کیا اور میری کامیابی کے لئے رات دن مصروف رہے۔ اس علاقے سے محض اُن کے ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے مجھے غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی۔ افسوس ہے کہ میں ان کے احسانِ عظیم سے کبھی عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ وہ پاکستان بننے سے بہت قبل رحلت فرما گئے۔ تاج الدین صاحب کے پرانے خلافتی اور کانگریسی ہونے کی وجہ سے ان کے بہت سے ہندو اور کانگریسی نیتا دوست ہوا کرتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تاج الدین صاحب کی دوستی کی بدولت جبلپور کے دو مشہور ہندو کانگریسی لیڈر سیٹھ گووند داس اور ڈی پی مصرا نے اپنے ذاتی رسوخ وتعلقات کی بناء پر میرے لئے مسلم رائے دہندگان میں کام کیا اور تاج الدین صاحب کے ہفتہ وار اخبار ''تاج'' نے بھی انتخابی مہم میں بڑی مدد کی۔ ''تاج'' کے ذکر کے ساتھ مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ذکر ضروری ہوجاتا ہے۔ اُنہوں نے ہمارے

پسماندہ صوبہ کے شہر جبلپور میں ایک عرصہ تک قیام فرما کر اخبار ''تاج'' کے ایڈیٹری کے فرائض انجام دیے۔ بعد میں مولٰینائے محترم نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعہ مذہبی وملی نقطۂ نظر سے آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبات کی پرزور تائید کی۔ ہم صوبۂ ممالک متوسط و برار کے قدیم باشندے اور مسلمانان ہندان کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ میں اپنے اُن دو بزرگوں کو بھی بھلا نہیں سکتا جو میرے والد مرحوم کے دوستوں میں سے تھے: ایک سابق انسپکٹر پولیس مان خان صاحب اور دوسرے سابق سب انسپکٹر پولیس مرزا بلاقی بیگ صاحب۔ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جو اپنا نام بغیر ظاہر کئے اپنے خاص حلقۂ اثر میں خاموشی کے ساتھ سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ ساگر کے وکیل مجیدالدین احمد صاحب میری موافقت میں بڑی تندہی سے کام کرتے رہے۔ چھتیس گڑھ ڈویژن سے ڈاکٹر رگھوندر راؤ (سابق چیف منسٹر' گورنر' انڈین ہائی کمشنر و رکن وائسرائے کونسل)' سید وکیل احمد صاحب رضوی (سابق سپیکر صوبائی اسمبلی اور دھمتری والے وکیل عبدالوکیل صاحب میرے مخلص مددگار تھے۔

پہلے بتلا دیا گیا ہے کہ میرا حلقۂ انتخاب بہت وسیع تھا' لہٰذا مجھے ہر اس مقام پر جہاں ایک بھی رائے دہندہ رہتا تھا' جانا پڑا۔ شاید ہی کوئی ایسا ووٹر ہو جس کے پاس براہِ راست یا کسی اور ذریعہ سے رسائی نہ ہوئی ہو۔ انتخاب کے سلسلہ میں ایک ایسا عجیب اور پراثر واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے میرے حوصلے بڑھائے اور الحمدللہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے مجھے روحانی قوت و اطمینان بخشا۔ ساگر جاتے ہوئے میں دموہ شہر پر سے گزرا جہاں کچھ رائے دہندگان رہتے تھے۔ سیٹھ حاجی ابراہیم صاحب موتی والا کی ناگپور فرم کی ایک شاخ موسوم بہ ''حاجی کریم نور اینڈ سنز'' دموہ میں تھی۔ میرے دورہ کے پروگرام میں اُن کی دکان پر رات کے کھانے کے بعد ساگر کے لئے روانگی طے کی گئی تھی۔ رات کے کھانے سے قبل ایک بزرگ تشریف لائے جو نہایت صاف اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ پستہ قد' گورے چٹے' سفید ریش اور نورانی چہرے والے شخص تھے۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا' ان کی عمر سو سال سے کسی

بھی طرح کم نہ ہوگی۔ لب ولہجہ، لباس، وضع قطع سے پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ منحنی سے تھے لیکن مکمل صحت مند، نہ تو کمر میں خم آیا تھا اور نہ چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اُن کا نام کسی کو معلوم نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ وہ کہاں قیام فرماتے ہیں۔ دکان کے منیجر اور عملے کے لوگوں نے یہ بتلایا کہ وہ کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ جب میری روانگی کا وقت آیا تو میں نے اور دکان کے لوگوں نے ان بزرگ سے گزارش کی کہ میری کامیابی کے لئے دعا فرمائیں۔ انہوں نے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر میرے لئے دعا کی اور مجھ سے فرمایا کہ ''جب رائے شماری کے لئے ناگپور میں صندوق کھولے جائیں تو اُس سے چار دن قبل بذریعہ تار دموہ میں حاجی کریم نور اینڈ سنز کی دکان پر اطلاع کر دی جائے تا کہ میں رائے شماری کے دن ناگپور میں موجود ہوں۔'' اُنہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ موٹر میں جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں ان کی بابرکت معیت میں ساگر کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباًرات کے ساڑھے بارہ بجے راہ میں ایک گھنا جنگل آیا۔ اُنہوں نے کار رکوائی اور اس تاریک شب میں اس گنجان وسنسان جنگل میں باوجود میرے احتجاج کے سڑک کے کنارے اُتر گئے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں تشریف لے گئے۔

جوں جوں انتخاب کا وقت قریب آتا گیا، کارکنوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں انتخاب زور دولت کے بل بوتے پر نہیں ہوتے تھے بلکہ اول تو امیدوار کی قابلیت، صلاحیت، ہر دلعزیزی، جذبۂ خدمت اور دیانت داری دیکھی جاتی تھی۔ دوم مخلص کارکنوں کی عملی سرگرمیوں پر اُمیدوار کی کامیابی کا دارومدار ہوتا تھا۔ میری خوش نصیبی تھی کہ میری حمایت میں ہر خاص و عام حتیٰ کہ وہ لوگ بھی شریک تھے جنہوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ میں اُن سے واقف تھا۔ یہ محض اللہ کا فضل و کرم تھا اور حضرت تاج الدین بابا رحمتہ اللہ علیہ کی دعائیں شاملِ حال تھیں جن کی نظر کرم مجھ پر میری صغیر سنی سے ہی رہی جبکہ میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

اُس زمانے کے چند واقعات ایسے ہیں کہ جنہوں نے مجھے بابا صاحب کے غلاموں کی صف میں لا کھڑا کیا اور زمانۂ قریب کے چاندور بسوا کے واقعہ نے تو مجھے صحیح معنوں میں ان کا حلقہ بگوش کر دیا۔

اپنی صغیر سنی کا ایک واقعہ سنا دوں جب میں والد مرحوم کی انگلی پکڑ کر بابا کے دربار میں گاہے گاہے جایا کرتا تھا۔ بابا صاحب بالعموم لمبا کرتا پہنتے اور برہنہ سر و برہنہ پا رہا کرتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت پا پیادہ چلنے میں گزارا کرتے تھے۔ ایک دن میں اپنی سلیم شاہی پہنے ہوئے جس کی ایڑی کے حصہ کو میں نے شرارت میں سپاٹ بنا دیا تھا' بابا صاحب کے پیچھے پیچھے والد کے ساتھ جا رہا تھا کہ بابا صاحب ایکدم رک گئے اور مجھ سے فرمایا: ''لاؤ جی ہم تمہاری جوتی پہنیں گے۔'' میں گھبرا گیا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کرنے کو کہا۔ بابا صاحب نے اپنے پیروں کی چند انگلیاں ڈال کر میری جوتیاں پہن لیں اور تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ یقیناً یہ میری بڑی سرفرازی تھی جس کے زمانۂ بعد میں بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے اور جولائی 1961ء میں افریقہ کی سفارتی صحرا نوردی کے بعد ختم ہوئے۔ اُن کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ اپنا کچھ وقت ٹانگہ میں بیٹھ کر ناگپور کے گلی کوچوں میں پھر کر گزارا کرتے تھے۔ وہ اکثر ہمارے آبائی گھر کے سامنے سے جو میرے بزرگوں کے بسائے ہوئے نواب محلّہ میں واقع تھا' سواری میں گزر کر اسے رشکِ ارم بناتے۔ جذبۂ عشق خداوندی سے وہ اکثر اوقات بے تاب ہو کر بلند و پست آواز میں سلسلۂ تکلم جاری رکھتے جو بعض اوقات مجھ جیسے کوڑھ مغزوں کے لئے بے معنی لیکن عارفینِ حق کے لئے معرفت کا ایک بحرِ ذخّار ہوتا۔ ان کا جلال کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ ستانے والوں کو زدوکوب سے بھی باز نہ آتے اور خصوصاً ان کی بہت پٹائی کرتے جو ان کے سامنے منہ کے بل اوندھے پڑ جاتے یا پیر پکڑ کر منتیں مرادیں مانگتے۔ میں اس دن کا واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس دن میری بڑی بہن جو صرف خاندان میں ہی نہیں بلکہ اس سے باہر بھی بہت محبت وعزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں' ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے منہ موڑ نے

والی تھی۔ دوپہر سے قبل ہم سب نے بابا کی سواری کو اپنے غمکدہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا اور سب اہل خاندان میری بہن کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر طالبِ دعا ہوئے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' ان کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی اور سب کو یقین ہوگیا کہ بس اب دمِ واپسی ہے۔ غمزدہ عزیزوں نے خاموش آہ وزاری شروع کردی۔ عصر ومغرب کے درمیان اطلاع ملی کہ حضور کی سواری پھر آرہی ہے۔ میں چشمِ پرنم کے ساتھ بے تحاشہ بھاگتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ حضور نے سواری رکوائی۔ کچھ بے ربط جملے فرمائے جو میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ غالبًا رحلت کی اطلاع اور دلاسا دینا مقصود تھا۔ دوسرے واقعہ کا تعلق 1927ء کے ہندو مسلم فساد سے ہے جس میں ہندوؤں نے مار دھاڑ کے علاوہ مسلمانوں کی املاک کو لوٹنا' نذرِ آتش اور توڑ پھوڑ کا منصوبہ بنایا تھا۔ دوزخیوں نے نواب محلے کی قدیم مسجد کو جس سے میرے بزرگوں کی یادیں وابستہ تھیں' جلا کر راکھ کردیا۔ مسجد کے شہید ہونے اور بے حرمتی سے بہت دن قبل حضور اپنا گھوڑے کا ٹانگہ رکوا کر نیچے اترے اور مسجد کے صدر دروازے کے باہر رُک گئے۔ پھر دیوار پر مٹی کا ڈھیلا رکھ کر اُسے گرا دیا اور چلے گئے۔ اس وقت تو کوئی کچھ سمجھ نہ سکا لیکن بعد میں عقدہ کھلا کہ مسجد کے شہید ہوکر مسمار ہونے کی نشاندہی کرنے تشریف لائے تھے۔ تیسرے واقعہ کا تعلق میرے ہم عمر عزیز دوست سید عظیم الدین عرف میر صاحب سے ہے جو میرے بھائیوں جیسے تھے۔ میرے والد نے میر صاحب کی والدہ کو بہن بنایا تھا۔ اس مناسبت سے میں انہیں پھوپھی اور سید احمد حسین صاحب پٹیل کو پھوپھا کہتا تھا جنہوں نے بابا صاحب سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر دنیا چھوڑ کر ان کے دربارِ عرفان میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ میر صاحب کو شکار کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ ناگپور کے اکناف یا اپنے مالگزاری گاؤں کے اطراف تمام وقت ہرن کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ المختصر وہ دماغی توازن کھو بیٹھے اور مارنے پیٹنے پر اُتر آئے۔ لوگ اور محلے والے ان سے ہراساں اور خوفزدہ رہنے لگے۔ ان کے والد نے دربار سے دلی وابستگی کی وجہ سے میر صاحب کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر تاج الاولیا کے دربار میں پہنچا دیا۔ میر

صاحب تنومند، گورے چٹے، خوبصورت، دراز قد نوجوان تھے۔ دست درازی و دشنام طرازی اس زمانہ میں ان کا شغلِ حیات بن گیا تھا۔ میں ان کی حالتِ زار دیکھنے اور چار آنسو بہانے روزانہ جاتا تھا۔ ایک دن میرے والد محترم نے جنہیں علمِ طب سے شغف تھا، فرمایا کہ اگر میر صاحب کی فصد کھلوائی جائے تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔ جب میں نے یہ پیغام پٹیل صاحب کو ان کی فرودگاہ پر پہنچایا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے اور فرمایا کہ بابا صاحب کے دربار میں بغیر ان کے حکم کچھ نہیں کیا جائے گا۔ میں آزردہ خاطر اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹا اور والد کو کل احوال سنایا۔ وہ خاموش ہو گئے لیکن میں نے دوسرے دن تک اپنا تمام وقت یہ سوچنے میں کاٹا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ حسب معمول عازم شکر ہوا۔ دل نے کہا بابا صاحبؒ کشف ہیں۔ اُن سے دل ہی دل میں کہہ ڈالو کہ میر صاحب کے والد کے دل میں خدا فصد کھلوانے کا خیال ڈال دے تا کہ میرا محبوب ترین دوست پھر سے تندرست ہو جائے۔ میں دربار میں پہنچا۔ وہاں روز جیسی چہل پہل تھی۔ عقیدت مند و حاجت مند بابا صاحب کو دو تہائی گھیرے میں لئے بیٹھے تھے۔ بابا صاحب ہمیشہ کے مطابق جذب سے سرشار اونچی نیچی آواز میں بولے چلے جا رہے تھے۔ دائرہ کا جو ایک تہائی حصہ کھلا پڑا تھا، اس سمت بہت دور میر صاحب زنجیروں کے بندھن میں چیختے چلاتے ہاتھ پیر مارتے ہوئے پڑے تھے۔ ایسی حالت میں بھی وہ کبھی مجھ سے قولاً و فعلاً بری طرح پیش نہیں آئے۔ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور بابا صاحب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس جھرمٹ میں پٹیل صاحب پھوپھا ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اُن کی غیر متوقع موجودگی نے میری دلی تمنا کو تازیانہ لگایا اور میرا دل تڑپ گیا۔ اپنی دلی خواہش کو زبان ہلائے بغیر بابا صاحب تک پہنچا دیا اور میں انتہائی توجہ کے ساتھ اپنے جواب کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا اور میں بے چینی سے جواب کا منتظر تھا کہ با آواز بلند ایک جملہ فرمایا گیا تا کہ پھوپھا صاحب، میں اور دیگر سامعین اچھی طرح سن لیں۔ ٹھیٹ مدراسی لب و لہجہ میں ارشاد کیا گیا: ''پیشانی کی رگ کاٹ کے خون نکال دیو جی۔ اچھے ہو جاتے۔'' میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا

اور پھوپھا صاحب کی طرف جھپٹا۔انہوں نے مجھے کوئی موقعہ دیے بغیر فرمایا کہ جاؤ بابا تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میں میر صاحب کو ٹانگہ میں ڈال کر گھر لے گیا۔ والد صاحب بہت خوش ہوئے اور پھونسل راجاؤں کے خاندانی جرّاح سید احمد صاحب کو جو نالے پار رہا کرتے تھے' شام کو بلوا کر میر صاحب کی فصد کھلوائی اور پھر میر صاحب اللہ کی مہربانی سے دوبارہ بھلے چنگے ہوگئے ۔اُس ہی زمانہ کا ایک اور واقعہ سنا کر اپنی عقیدت مندانہ شیفتگی کو تازہ اور زیادہ مستحکم کردوں ۔اس زمانہ میں سی پی و برار کے ہائی سکولوں کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے ہونے کی وجہ سے میٹرک کے امتحان کے پرچے الٰہ آباد یونیورسٹی سے آیا کرتے تھے۔حساب کے تین علیحدہ پرچے ہوا کرتے تھے۔ میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوا لیکن حساب میں بہت کمزور ہونے کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔ والد صاحب کے دل کو بہت ٹھیس لگی کیونکہ انہوں نے میرے لئے بہت سے منصوبے بنائے ہوئے تھے۔ میں بھی بہت مایوس و شرمسار تھا۔ بالآخر کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت مل گئی جہاں سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ حساب کا صرف ایک پرچہ ہوا کرتا تھا۔امتحان میں شریک ہوا اور کلکتہ سے روانہ ہوتے وقت چار دوستوں کو تاکید کر کے ناگپور لوٹا کہ نتیجہ جیسے ہی شائع ہو' مجھے فوراً مطلع کریں۔آپ جانتے ہیں کہ امتحان کے نتیجے کا انتظار ایک طالب علم کے لئے کس قدر جان لیوا ہوتا ہے۔ چنانچہ میری بھی یہ ہی اضطرابی کیفیت تھی اور کبھی کبھی تو میرا اضطراب اس خیال سے ہوش اڑا دیتا تھا کہ اگر اب کے ناکام ہوگیا تو والد صاحب کو ناقابل بیان صدمہ ہوگا اور میں انہیں اپنا منحوس چہرہ کیسے دکھلاؤں گا۔کلکتہ سے نتیجے کی وصولیابی میں کافی تاخیر ہوجانے کی وجہ سے دل بہت پریشان تھا۔ میں اس دن شکردرہ میر صاحب کی عیادت کو گیا لیکن تڑپتے دل سے دل ہی دل میں بابا صاحب سے عرض مدعا کر بیٹھا یعنی آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ میں کامیاب ہوجاؤں ۔اس دربار سے تو کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا' لہٰذا میں کیسے بے مرام لوٹتا۔فدائیوں نے حضور کو گھیر رکھا تھا۔ میں بہت دور سوالی بنا ہوا میر صاحب کے پاس بیٹھا ہوا کسی کرامت کا انتظار کررہا تھا۔معلوم نہیں زور زور سے بہت سے بے ربط جملے ارشاد کئے

جارہے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں کہ عیسیٰ خاں صاحب جوان کی حاضری میں اکثر رہا کرتے اور بابا صاحب کی ڈاک رکھا کرتے تھے، بابا صاحب کے جو کھردری زمین پر لیٹے ہوئے تھے پیر دبا رہے تھے۔ بابا صاحب اچانک اُٹھ بیٹھے۔ عیسیٰ خاں صاحب کے کرتے کے بالائی جیب میں ہاتھ ڈال کر چار پوسٹ کارڈ ہوا میں پھینکتے ہوئے بآواز بلند فرمایا: ''جاؤ جی نتیجہ آ گیا۔ پہلے درجے میں پاس ہوگئے۔'' میں خوشی خوشی بائیسکل پر گھر کے لئے روانہ ہوا۔ مکان کے باہر شہ نشین کے قریب پہنچ کر سائیکل سے اُترا ہی تھا کہ دور سے کسی نے زور سے پکار کر کہا۔ ''میاں! میاں! ذرا رُک جائیے اور اپنی ڈاک لیتے جائیے۔'' دھڑکتے ہوئے دل سے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکیہ نے چار پوسٹ کارڈ دیے۔ مضمون من وعن وہی تھا جس کا انکشاف پہلے ہی تاج الاولیاء کر چکے تھے۔

انتخاب کا دن آ گیا۔ میرے لئے غیر ممکن تھا کہ میں اس روز اپنے پورے حلقۂ انتخاب کا دورہ کرتا، لہٰذا میں نے یہ ہی مناسب سمجھا اور دوستوں کا بھی یہ ہی مشورہ تھا کہ میں ناگپور میں ٹھہرا رہوں جہاں میری بود و باش تھی اور جو صوبہ کا دارالسطنت بھی تھا اور جہاں بہت بڑی تعداد رائے دہندگان کی رہتی تھی۔ دن بھر پولنگ ہوتی رہی۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے اپنے حق رائے دہندگی کو استعمال کیا۔ نظر سے اوجھل ایک بند کمرہ میں مختلف صندوقوں میں پرچیاں ڈالی گئی تھیں۔ لہٰذا حتمی طور پر یہ کہنا بہت دشوار تھا کہ کس کے حق میں کتنی پرچیاں ڈالی گئیں۔ قیاس آرائی یا کارکنوں یا رائے دہندگان کے بیانات سے آخر کسی قدر اندازہ ہو جاتا تھا۔ ناگپور میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہ آخری مرحلہ سرانجام پایا۔ یہ اندازہ لگایا گیا کہ ناگپور میں دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں مجھے زیادہ ووٹ ملے ہیں۔ رات بھر اور دوسرے دن تک مختلف مقامات سے بذریعہ تار اطلاعات موصول ہوتی رہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ میری کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ انتخاب پورے صوبہ سے ایک واحد نمائندہ کے لئے تھا۔ دور دراز مقامات پر ایک ہی دن میں پرچیاں ڈالی گئی تھیں، اس لئے پرچیوں کے مہر بند صندوقوں کو بہ

حفاظت نا گپور لانا بھی ایک مرحلۂ دشوار تھا۔اس کی تکمیل میں کئی دن لگ گئے۔رائے شماری کی تاریخ حکومت کی طرف سے بذریعہ سرکاری اعلان مقرر کی گئی۔حسب وعدہ اس تاریخ کی اطلاع دموہ میں حاجی کریم نور کی دکان پر کردی گئی تھی تا کہ اُن بزرگ کو جن سے مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا'اس تاریخ کا علم ہو جائے۔

صندوق کھولے جارہے تھے اور ہر امیدوار کے دوستوں' کارکنوں اور حامیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔عام طور پر یہ خیال تھا کہ درحقیقت مقابلہ میرے اور حافظ صاحب مرحوم کے درمیان ہے'اس لئے مقامی لوگوں میں بہت زیادہ جوش وخروش پھیلا ہوا تھا۔حافظ صاحب کے حامیوں کو ان کی کامیابی کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ پھولوں کے ہار لے کر پہنچے ہوئے تھے۔حافظ صاحب رائے شماری کے وقت نا گپور کی ضلع کچہری میں جہاں صندوق کھل رہے تھے'بذاتِ خود معہ اپنے دو بیرسٹر صاحبزادوں احمد اللہ اور ہدایت اللہ موجود تھے لیکن میں وہاں نہیں گیا بلکہ میرے پولنگ ایجنٹ سعید اللہ خاں صاحب دیگر احباب کے ساتھ حاضر تھے۔

رائے شمارے کی صبح حاجی کریم نور کی دکان سے مجھے یہ خوشخبری سنائی گئی کہ ''آن بزرگ'' شب میں تشریف لے آئے ہیں۔میں جا کر حضرت کو لے کر آیا اور وہ تنہا درختوں کے سایہ میں کچہری کے قریب دعا و وظیفہ میں مصروف ہو گئے اور جب تک آخری نتیجہ کا اعلان نہیں ہوا' برابر انہماک کے ساتھ مراقبہ میں مصروف عبادت رہے۔الحاصل! اللہ کے فضل و کرم' اپنے مخلص دوستوں' کرم فرماؤں' کارکنوں کی جدوجہد اور بزرگوں کی دعاؤں سے مجھے شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔نتائج کا نقشہ ملاحظہ کیجئے:۔

1-صدیق علی خاں-765 (2)عباس علی حاجی-564 (3)مرزا اختر حسین-241 (4)خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب-218 نتائج کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرے شہر نا گپور کے مسلم رائے دہندگان نے میری موافقت میں تین سو پچیس 325' عباس علی حاجی (امراؤتی) کو ساٹھ' خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب (نا گپور) کو چھیالیس اور مرزا اختر حسین (کھنڈوہ) کو تیس ووٹ دیے تھے۔افسوس ہے کہ نتیجہ کے اعلان کے بعد چند لوگوں

نے اپنے امیدواروں کے ساتھ طوطا چشمی کر کے جو پھولوں کے ہار اپنے اپنے امیدواروں کے لئے لائے تھے، وہ مجھے پہنائے اور ساتھ ہی ان میں سے چند نے کہا کہ وہ ہمیشہ میری حمایت کرتے رہے ہیں۔ بہر حال میں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور حضرت صاحب کو اپنی کار میں بٹھا کر حاجی کریم نور کی دکان پر چھوڑا اور حضرت بابا تاج الدین رحمتہ اللہ علیہ کے دربار میں حاضری دی جہاں بابا صاحب کے مزار اقدس سے سبز چادر اٹھا کر میرے سر پر لپیٹ دی گئی۔ میری کامیابی درحقیقت اس نوجوان طبقہ کی شاندار کامیابی تھی جو ملک کو آزاد کرانا اور مسلمانوں کو ترقی کے راستہ پر دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆
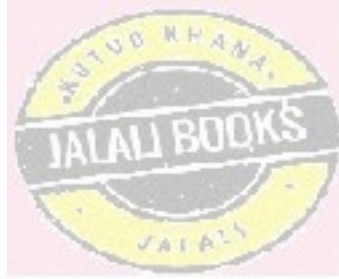
بائیس خواجہ کی چوکھٹ

ناگپور کے کرکٹ کے میدان سے میں دہلی میں اپنی منزل (میدانِ سیاست) کی طرف جو قسامِ ازل نے میرے لئے متعین فرمائی تھی اور جس کا بلاوا مرکزی اسمبلی کے اجلاس کی صورت میں موصول ہو چکا تھا' سامانِ سفر باندھ کر روانہ ہوا۔ یہ وہ دلی تھی جو انگریزوں کی راج دھانی تھی اور یہ ہی دلی شاہانِ مغلیہ کا پایۂ تخت بھی رہی تھی اور اس ہی دلی میں زمانہ پھر تاریخ دہرانے کی تیاری کرر ہا تھا۔ انسانی نظروں سے اوجھل یہاں ایک اور روحانی سلطنت قائم ہے جو تاابد رہے گی اور اس سلطنتِ معرفت کے بڑے بڑے روحانی ستون تاقیامت اس بوجھ کو سنبھالے رہیں گے۔ یہ دلی ان اولیائے کرام کی نگری ہے جہاں سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدینؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ باقی باللہؒ، حضرت امیر خسروؒ وغیرہ وغیرہ کے فیوض و برکات کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

ایک کھلنڈرے کی حیثیت سے مجھے سیاسی زندگی کی الجھنوں سے بہت کم ہی سابقہ پڑا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جو ذمہ داری قوم نے میرے سپرد کی ہے' وہ کوئی آسان نہیں ہے لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہر نوجوان اور خصوصاً ایک کھلاڑی جوانی کے عالم میں ہر مشکل سے مشکل کام کو بھی آسان سمجھتا ہے۔ یہ ہی جذبہ لئے ہوئے مَیں دہلی پہنچا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی کی پر شکوہ و مدوّر عمارت' وائسریگل لاج اور دہلی شہر کے خوبصورت بازاروں وغیرہ سے میں مرعوب نہیں ہوا۔ اسمبلی کے اجلاس میں دو تین دن کی تاخیر تھی۔ میں اسمبلی کی عمارت میں گیا۔ پرسانِ حال تو بہت تھے لیکن کسی ایک کو بھی اپنا شناسا نہ پایا۔ اجنبی ماحول اور اجنبی شکلیں۔ میں نے دیکھا کہ ناگپور کے ایک ہندو وکیل دوست مسٹر آر۔جی نافڑے لپک کر میری طرف آئے اور

مجھ سے ملے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اسمبلی میں کسی عہدہ پر فائز ہیں۔ مجھے انتخاب سے قبل کا اپنا وعدہ کہ میں مسٹر ایم اے جناح کی پارٹی میں شریک ہوں گا' بخوبی یاد تھا۔ میں نے مسٹر نافڑے کو بتلایا کہ میں مسٹر جناح سے ملنا چاہتا ہوں۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ انہوں نے کہا کہ مسٹر جناح اس وقت لابی میں تشریف فرما ہیں اور وہ مجھے اُن کے پاس لے گئے۔ میرا تعارف کرایا۔ میرے سامنے ایک نحیف و کمزور جسم کا انسان بیٹھا تھا جس کے الفاظ میں پہاڑوں کا استقلال' جس کے لہجے میں گہرے دریا کا سکون' جس کے اندازِ فکر میں آسمانوں کی بلندی اور جس کی آواز سے خلوص و سچائی کے پاکیزہ نغمے پھوٹ رہے تھے۔ مجھے اس واجب التعظیم شخصیت نے مرعوب بھی کیا اور مطمئن بھی۔ وہ باوجود منحنی بدن ہونے کے ایک پر شکوہ اور بارعب انسان تھے۔ ان کے چہرہ پر جلال برستا تھا۔ ان کی منفرد شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جو کوئی ایک وقت ان کے دائرہ اثر میں آ گیا' وہ ہمیشہ کے لئے ان کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ وہ علامہ محمد اقبالؒ کے اس شعر کی جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے' تفسیر تھے۔

نرم دمِ گفتگو' گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو' پاک دل و پاکباز

میرا دل بیساختہ بول اٹھا یہی ایک ایسا لیڈر ہے جو مسلمانانِ ہند کی مشکلات کا حل کرنے والا ثابت ہوگا۔ اس وقت بھی وہ کئی بڑے بڑے لوگوں کے جن سے میں بعد میں ملاقی ہوا' جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے اُن کی انڈی پینڈنٹ پارٹی میں شرکت کی خواہش ظاہر کی جسے انہوں نے بہ خندہ پیشانی قبول کیا اور الحمدللہ میں اپنے وعدہ کو پورا کر کے مطمئن ہوا۔ ان کی پارٹی ہندو' پارسی اور مسلمان ممبروں پر مشتمل تھی۔ اس پارٹی کے لیڈر آنریبل سر عبدالرحیم ہوا کرتے تھے۔ وہ جناح صاحب کی لندن سے واپسی پر جب وہ بمبئی کے حلقہ انتخاب سے منتخب ہو کر دہلی آ گئے تو وہ پارٹی کی لیڈری سے علیحدہ ہو گئے اور نیز انہوں نے اسمبلی کی صدارت کے اُمیدوار بننے سے قبل پارٹی سے اپنا ناتا توڑ دیا۔ بمبئی کے مشہور بیرنیٹ سر کاوس جی جہانگیر اس

پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے اور بنگال کے ایک مشہور متمول ہندو زمیندار ڈی کے لاہری چودہری چیف وہیپ اور عبدالمتین چودہری سیکرٹری تھے۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ اس زمانہ میں صرف چھ مسلمان ممبر مولانا شوکت علی صاحب' عبدالمتین چودہری صاحب' سید غلام بھیک نیرنگ صاحب' حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب' بدرالحسن صاحب اور راقم الحروف ہمیشہ اپنی پارٹی کے قائد کے ساتھ ووٹ دیا کرتے تھے جس پر ہندو پریس یہ کہہ کر طعنہ زن ہوتا تھا کہ یہ لوگ مسٹر جناح کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔

انڈی پینڈنٹ پارٹی کے ایک سابق رکن کا جو حاجی عبدالستار سیٹھ کے اور میرے ایک محبّ صادق ہیں اور آج کل معہ اہل وعیال پی ای سی ایچ ایس میں رہتے ہیں ذکر ضروری ہے۔ یہ حضرت بدرالحسن صاحب ہیں جو مظفر پور (بہار) کے ایک کامیاب وکیل تھے۔ وہ سابق رُکن مرکزی اسمبلی مولوی شفیع داؤدی کو شکست دیکر 1935ء میں دہلی آئے تھے۔ یہ مشکل سے دو برس ہمارے ساتھ رہے اور 1936ء کے اواخر میں مسلم لیگ کی طرف سے بہار اسمبلی کا کامیابی کے ساتھ انتخاب لڑنے چلے گئے۔ ہم دونوں کو بالخصوص اور دوسرے اراکین کو بالعموم ان کے اسمبلی سے مستعفی ہونے کا بڑا قلق رہا۔ بدرالحسن صاحب انڈی پینڈنٹ پارٹی کے بڑے وفادار رکن تھے۔ انہوں نے اپنے لیڈر مسٹر جناح کا ہمیشہ بغیر ''اگر'' ''مگر'' کے برغبتِ خاطر ساتھ دیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ عبدالمتین چودہری صاحب جنہیں قائداعظمؒ اپنا مخلص اور وفادار دوست سمجھتے تھے' 1933ء میں مرکزی اسمبلی کے ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب ہوئے اور اس کامیابی پر لندن سے مسٹر جناح نے ان کو مبارک باد دی تھی۔ چونکہ یہ پارٹی مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں کی تھی اور جن کا سوائے چند معاملات کے ہر وقت ایک نقطہ پر جمع ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا' اس لئے پارٹی کے نام کی مناسبت سے ہر رکن کو آزادیٔ رائے حاصل تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ اراکین پارٹی کسی مسئلہ پر ''ہاں'' اور ''نہیں'' کی لابی میں رائے دینے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ اس عجیب مظاہرہ سے پارٹی کا ڈسپلن برقرار نہیں رہ سکتا تھا لیکن دقت یہ تھی کہ کوئی متفقہ

فیصلہ نہیں ہوسکتا تھا اور نہ اکثریت کی رائے کو اراکین کی اقلیت لائحہ عمل بنانے کے لئے تیار تھی۔ اگر ذرا سی سختی کی جاتی تو رکنیت سے مستعفی ہوجاتے اور پارٹی کالعدم ہوجاتی۔ اس پارٹی کے مسٹر ایچ پی موڈی بھی رکن ہوا کرتے تھے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ انڈی پینڈنٹ پارٹی کافی قدیم پارٹی تھی اور مسٹر ایم اے جناح اس وقت اس کے لیڈر منتخب ہوئے جب اسمبلی میں سوراج پارٹی کی پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں تشکیل ہوئی۔ اُس زمانہ میں مسٹر جناح کی پارٹی میں ہندوستان کے تین مایۂ ناز ہندوسپوت پنڈت مدن موہن مالویہ' سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور سر چمن لال سیتل واڈ سرگرم رکن تھے۔

اسمبلی میں مسلم نمائندگان کا اس زمانہ تک ایک اہم اور بڑا فریضہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی آئینی طور پر نگہداشت کریں اور جو اصلاحات حکومتِ برطانیہ وقتاً فوقتاً ہندوستان کو دے' اُس میں سے مسلمانوں کا حصہ طلب کریں اور جتنی مرکزی ملازمتیں ہیں' اس میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو حصہ دلوائیں۔ حکومت کو اُن قوانین کے نفاذ سے باز رکھیں جن سے مسلمانانِ ہند کو من حیث القوم نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ میرے اس خیال کی تصدیق میاں بشیر احمد صاحب نے جو پنجاب کے ایک ممتاز خاندان کے درخشندہ ستارے اور ہمارے معزز اور قابل فخر رہنما ہیں اپنے ایک بیان میں کی ہے کہ 1928ء سے 1936ء تک حقوق طلبی کا دور رہا ہے۔ یہ سب کچھ التوا کی تحریک' تخفیف کی تحریک (کٹوتی)' تجاویز پیش کرکے' وفود کی شکل میں جا کر یا اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو کام میں لا کر کیا جاتا تھا کیونکہ ان کے پاس اتنی طاقت یا اسمبلی میں ان کی اتنی آواز نہیں تھی کہ وہ حکومت سے ٹکر لے کر اسے شکست دے سکتے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُنہوں نے کبھی کسی ایسی تحریک کی مخالفت نہیں کی جس سے ہندوستان کے آزاد ہونے میں کوئی مزاحمت ہو۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان بحیثیت ہندوستانی ان تمام رعایتوں یا نئے حقوق سے جو دیئے جانے والے ہیں' پوری طرح بہرہ ور ہوں اور ان کے جائز حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالا جائے۔ اس زمانہ کے چند ممتاز منتخب شدہ نمائندوں

کے اسمائے گرامی جو اپنے فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہیں رہے، حسب ذیل ہیں:-

مسٹر ایم اے جناح، سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب، سر سلیمان قاسم مٹھا صاحب، سر ہارون جعفر صاحب، مولوی محمد رفیع الدین صاحب، سر حاجی عبداللہ ہارون صاحب، حسین بھائی لالجی صاحب، سر عبدالرحیم صاحب، سر عبدالحلیم غزنوی صاحب، ڈاکٹر عبداللہ سہروردی صاحب، حاجی عبدالستار حاجی اسحٰق سیٹھ صاحب، عبدالمتین چودہری صاحب، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب، مولوی سر محمد یعقوب صاحب، سر سید رضا علی صاحب، سر محمد یامین خاں صاحب، خاں بہادر حاجی وجیہہ الدین احمد صاحب، راجہ غضنفر علی صاحب، شیخ صادق حسن صاحب، سر محمد مہر شاہ صاحب، خان بہادر شیخ فضل حق پراچہ صاحب، محمد نعمان صاحب، میاں غیاث الدین صاحب، حافظ محمد عبداللہ صاحب، حسین امام صاحب، محمود پاشا صاحب، حاجی سیٹھ عبداللہ صاحب، حسین امام صاحب، محمود پاشا صاحب، حاجی سیٹھ عبدالرزاق صاحب، مولوی محمد شفیع داؤدی صاحب، مولوی بدیع الزماں صاحب، مولوی سید مرتضٰی صاحب بہادر، اُپّی صاحب ملابار والے، خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب، کبیر الدین احمد صاحب، خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب وغیرہ وغیرہ۔

1934ء کے انتخابات میں چند مسلمان ممبر پہلی مرتبہ منتخب ہو کر آئے جن میں مولانا شوکت علی صاحب، سید غلام بھیک نیرنگ صاحب، حاجی عبدالستار حاجی اسحاق سیٹھ صاحب، سید عمر علی شاہ صاحب، خالد لطیف گابا صاحب، محمد نعمان صاحب، احمد ای ایچ جعفر صاحب، میاں غیاث الدین صاحب، حافظ محمد عبداللہ صاحب تھے۔ حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب جو اپنی سابقہ بے لوث خدمات و بے پناہ ہر دلعزیزی کی وجہ سے اپنے موپلا حریف کو شکست دے کر موپلا قوم کے واحد نمائندہ اور ان کے جذبات کے مترجم بن کر آئے تھے، الحمدللہ اس دن سے آج تک وہ میرے نہایت سچے دوست، مونس و غمگسار اور بھائیوں سے بڑھ کر بھائی ثابت ہوئے اور ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں حصول پاکستان تک ایک دوسرے سے بہت قریب رہے۔ ہماری رفاقت کو دیکھ کر خادمِ کعبہ مولانا شوکت علی صاحب بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ سے بھی

ہم دونوں اکثر اوقات بیک وقت ملا کرتے تھے۔ ترچنا پلی والے مولوی سید مرتضٰی صاحب بہادر بزرگانِ سلف کی جیتی جاگتی تصویر تھے اور باوجود مرکزی اسمبلی کے رکن ہونے کے دریا گنج کی مسجد کے حجرہ میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہ دہلی کی مجلس قانون ساز کو تقدس بخشنے دوبارہ منتخب ہوکر آئے تھے۔

مولٰینا شوکت علی کے انتخاب سے خلافت کا زمانہ یاد آ گیا۔ علی برادران کے ایثار و بے لوث خدمات کی داستانوں کے اوراق کھل گئے۔ بی اماں کی یاد تڑپانے لگی جنہوں نے دولا ثانی بطلِ حریت اسلام کی خدمت کرنے کے لئے پیدا کئے۔ خادمِ کعبہ مولٰینا شوکت علی کی ہستی میرے لئے جانی پہچانی سی تھی کیونکہ علی برادران کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ یہ چھندواڑہ میں عرصہ تک قید رہے تھے۔ مولانا شوکت علی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ میں جو چھکا لگایا تھا، وہ کرکٹ کی تاریخ میں ایک مثال بن کر رہ گیا ہے۔ میرے والد مرحوم جو برطانوی سامراج کے بڑے دشمن تھے، انہوں نے بتلایا تھا کہ جب بھنڈارہ میں مولانا شوکت علی صاحب کا جلوس نکلا تو اس وقت انہوں نے مولانا پر سے چاندی کے پھول بنوا کر نچھاور کروائے تھے۔ وہ میرے مشفق باپ کے ہیرو تھے تو میرے کیوں نہ ہوتے۔

مولوی سید غلام بھیک نیرنگ صاحب کو میں ایک عرصہ سے جانتا تھا کیونکہ وہ جنوبی ہند کے تبلیغی دورے پر اکثر ناگپور کے راستے سے جایا کرتے تھے اور کئی بار ناگپور تشریف لائے تھے۔ اُن کو اور ہم سب کو ان کے اس تبلیغی کارنامے پر بڑا ناز تھا کہ وہ مسٹر گاندھی کے بڑے لڑکے ہیرالال گاندھی کو اپنی اور اپنے چند ساتھیوں کی سعیِ بلیغ سے مشرف بہ اسلام کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ تبلیغِ اسلام کو اپنی زندگی کا اہم ترین مشن سمجھتے تھے۔ بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ اسمبلی میں بڑی نپی تلی تقریریں کرتے تھے۔

سید عمر علی شاہ صاحب کو مدراس کے باشندے اور ہندو سنسکرت زبان کا عالم تسلیم کرتے تھے۔ وہ اسمبلی میں اشلوک سناتے اور سنسکرت زبان میں بڑی فصیح و بلیغ تقریریں کرتے۔ کوئی پچیس ہزار سے زیادہ اونچے خاندانوں کے اعلٰی تعلیم یافتہ ہندو جن میں پروفیسر، انجینئر، ڈاکٹر، وکیل

اور تجار شامل تھے، ان کے مرید تھے جنہیں وہ کلمۂ شہادت پڑھا کر صراطِ مستقیم دکھلاتے تھے۔ ڈاکٹر بھگوان داس، مسٹر ایم ایس آنے، ہندو مہاسبھائی لیڈر بھائی پرمانند، مہاراج کمار وزیانگرم اور کتنے ہی ہندو ممبران کی بہت عزت کیا کرتے اور ان کے مداح تھے۔

حال ہی میں شاہ صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادہ کے نام بھارت کے راشٹر پتی کا ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جو آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

کانگریس ونیشنلسٹ پارٹی میں بھی بے شمار ہندو ممبر جو ہندوستان میں ہر شعبۂ زندگی پر چھائے ہوئے تھے اور جنہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں، ان کے علاوہ کچھ ایسی بھی مسلمہ ہندو ہستیاں تھیں جنہوں نے اسلام کو مٹانے اور اس کے نام لیواؤں کا قلع قمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، بحیثیت رکن کے موجود تھے۔ مزدوروں کے نمائندے، اچھوتوں کے نمائندے، عیسائیوں کے نمائندے، مل مالکوں اور سرمایہ داروں کے نمائندے، یوروپین فرموں کے نمائندے الغرض اسمبلی میں ہر طرف صرف نمائندوں کا ہی بازار گرم تھا اور ظاہر ہے کہ ایسی جگہ بھانت بھانت کی بولیاں بولی اور سنی جاتی تھیں۔ دورانِ اجلاس دہلی یا شملہ میں بڑی گہما گہمی رہتی اور ان دونوں شہروں کی رونق دوبالا ہوجاتی تھی۔ اگر اس زمانہ میں والیانِ ریاست آجاتے تو پھر کیا کہنا، ہر طرف چہل پہل ہی نظر آتی۔ ایسے مواقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کھیل کود، تماشے، دعوتیں، مشاعرے، علمی مجالس، کانفرنسیں غرضیکہ کوئی ایسی تقریب نہیں تھی جو نہ ہوتی ہو۔

ہندوستان کے مشہور و معروف کرکٹ کھلاڑی مہاراج کمار سروجے انندا آف وزیانگرم جنہیں فنافی الکرکٹ کہا جاسکتا ہے اور جنہوں نے انگلستان سے جیک ہابس اور سٹ کلف کو بلوا کر اپنی ٹیم کی طرف سے کھلوایا تھا، اسمبلی کے رکن منتخب ہوکر اپنا بیٹ و بلّہ لے کر اپنی کرکٹ ٹیم کی ہمراہی میں دلی پہنچے اور اپنی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں مستقلاً کرکٹ نیٹ لگا دیا جہاں شہاب الدین، رامچند رُ، پالیا وغیرہ ہر وقت کرکٹ کھلانے کے لئے دستیاب تھے۔ مجھے بھی انہوں نے وزیانگرم ٹیم کا اعزازی ممبر بنا کر کلر بخشا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ روشن آرا کلب کے خلاف ہم لوگوں

نے مہاراج کمار کی قیادت میں میچ کھیلا جس میں ہندوستان کے مشہور تیز بولر محمد نثار اور دلی کے سید تجمل حسین اور ادریس بیگ ہماری ٹیم کی طرف سے کھیلے تھے۔ مہاراج کمار ایک بلند پایہ اسپورٹس مین ہونے کی وجہ سے تعصب سے کوسوں دور تھے۔ زیادہ تر ان کے دوست مسلمان ہوتے تھے جن میں دلی کے ہنس مکھ رئیس بدرالاسلام صاحب سرفہرست تھے۔

حکومت ہند نے ممتاز اینگلو انڈین رہنما لیفٹیننٹ کرنل سر ہنری گڈنی کو عارضی صدر نامزد کیا تا کہ وہ اراکین اسمبلی سے حلف اٹھوائیں اور نئے صدر کا انتخاب کروائیں۔ منتخب شدہ و نامزد کردہ اراکین اسمبلی کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو تھی۔ چونکہ اتنی بڑی تعداد سے حلف لینا تھا' اس لئے اس کارروائی میں غالباً چار دن لگ گئے۔ صدر و نائب صدر کے عہدوں کے لئے انتخاب کی تاریخ پہلے ہی سے مقرر کر دی گئی تھی۔ صدارت کے لئے دو امیدوار سر عبدالرحیم اور کانگریسی لیڈر تصدق احمد خاں شروانی صاحب تھے۔ ان دو امیدواروں میں سخت مقابلہ ہوا اور ووٹوں کے لئے اسمبلی کے ممبروں پر مختلف طریقوں سے اثرات ڈالے گئے۔ بالآخر سر عبدالرحیم جنہیں انڈی پینڈنٹ پارٹی کے کثیر اراکین کی تائید حاصل تھی۔ چند ووٹوں کی اکثریت سے صدر منتخب ہو گئے اور ان کے نائب بابو آکھل چندروت بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ اس طرح اسمبلی کی کارروائی باقاعدہ طور پر شروع ہوگئی۔ اسمبلی کی وہ تمام کارروائی جس کا تعلق مسٹر ایم اے جناح' مسلمانوں کے مفاد اور مسلم لیگ سے ہوگا' صرف اس کا ذکر مناسب محل وموقعہ پر کیا جائے گا۔

پارلیمانی جدوجہد

یوں تو مسٹر ایم اے جناح پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن چند کتابیں قابل ذکر ہیں مثلاً (1) مسٹر مطلوب الحسن سید کی کتاب جو 1945ء میں لکھی گئی جب قائداعظمؒ بقید حیات تھے (2) مسٹر ہیکٹر بولا یتھو کی کتاب 1954ء (3) مسٹر ایم اے ایچ اصفہانی کی کتاب 1966ء اور (4) مسٹر جی الانہ کی کتاب 1967ء۔ ان میں سے اصفہانی صاحب کی کتاب کو علیحدہ کر کے باقیماندہ تین کتابوں میں مسٹر جناح کا یوم وسنِ پیدائش، مقامِ پیدائش، تعلیم اور سکولوں کا ذکر، اوائل عمری کے حالات، لندن کا مقام اور بیرسٹری کے امتحان وغیرہ کا کافی وضاحت کے ساتھ ذکر ہے۔ اس لئے ان باتوں کا اعادہ غیر ضروری اور میرے احاطۂ مقصدِ تحریر سے باہر ہے۔

دو کتابوں میں چند ایسی شک وشبہ کی باتیں کہی گئی ہیں جن کے متعلق اظہارِ خیال کرنا از بسکہ ضروری ہے۔ ان کی پیدائش کے متعلق سکول کے دستاویزات کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا ہے کہ وہ 20 اکتوبر 1875ء کو پیدا ہوئے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس بحث سے کیا فائدہ؟ جب کہ متعلقہ شخص خود کہتا ہے کہ وہ 25 دسمبر 1876ء کو پیدا ہوا اور اس کے اس اعلان کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ نے سرکاری طور پر کل ہند میں سالہا سال تک نہایت تزک و احتشام سے اُس ہی تاریخ اور اسی مہینہ میں یومِ پیدائش منایا۔

ایک اور عجیب وغریب بات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ ریکارڈ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مسٹر جناح نے کس سکول سے میٹرک پاس کیا حالانکہ مسٹر مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب میں ہائی سکول کا نام تک لکھ دیا ہے۔ یہ بھی مزید کہا گیا ہے کہ 1892ء میں جب وہ لندن گئے تو

پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ یہ بات بھی کتنی مضحکہ خیز ہے کہ سولہ سال کی عمر میں مسٹر جناح پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ میٹرک کا امتحان یا اس کے برابر کا کوئی امتحان پاس کئے بغیر پانچویں جماعت کے ایک طالبعلم کو بیرسٹر کے لئے 1893ء میں ''لنکنز اِن'' میں کیونکر داخلہ مل سکتا تھا۔

مسٹر جناح کے متعلق کہ ان کا تعلق کس برادری یا کس جماعت سے تھا' بہت قیاس آرائیاں کی گئی ہیں اور بہت سی روائتیں بیان کی گئی ہیں۔ دیکھیں وہ خود اپنے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ اس بات چیت کا ذکر میرے ایک مضمون ''سپاہی کا نذرانہ'' ماہِ نو صفحہ 21 قائداعظمؒ نمبر' دسمبر 1950ء میں درج ہے۔ ناظرین کی دلچسپی و آگاہی کے لئے مذکورہ مضمون سے چند اقتباسات اور مسٹر جناح کے الفاظ نقل کئے جاتے ہیں:-

''1938ء کا واقعہ ہے کہ شملہ میں موسم خزاں کا اسمبلی اجلاس ہو رہا تھا۔ کارروائی کے اختتام پر ممبران مسلم لیگ پارٹی موسلا دھار بارش کی وجہ سے پارٹی روم میں جا بیٹھے۔ قائداعظمؒ بھی ایک صوفے پر رونق افروز ہو گئے۔ ہم لوگوں نے اس شمعِ سیاست و قیادت کو پروانہ وار گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے چند احباب حاجی سر عبداللہ ہارون صاحب' مولانا ظفر علی خاں صاحب' مولوی سید غلام بھیک نیرنگ صاحب' محمد نعمان صاحب اور حاجی عبدالستار صاحب قابل ذکر ہیں۔ افسوس ہے کہ باقی اراکین کے نام یاد نہیں رہے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ اُس دن قائداعظمؒ گفتگو کرنے کے تفریحی رنگ میں تھے اور بہت بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ لفظ ''خوجہ'' کی وجہ تسمیہ' اپنے خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا اور ہز ہائی نس آغا خاں سے اپنے انحراف کی وجہ بیان فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کے آباواجداد لوہانہ راجپوت تھے اور یہ لوگ پنجاب کے بعض حصوں بالخصوص ملتان میں ابھی تک آباد ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت غوث اعظمؒ کے خاندان کے ایک ممتاز فرد پیر سید عبدالرزاق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اس لئے وہ خواجہ کہلاتے تھے لیکن

بعد میں یہ نام بگڑ کر ''خوجہ'' ہوگیا۔ وہ اور ان کا تمام خاندان ہز ہائی نس کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا تھا لیکن ان کی بڑی ہمشیرہ کی شادی کے موقعہ پر اختلاف رائے ہوا اور یہ رشتۂ عقیدت منقطع ہوگیا۔''

مولوی سید غلام بھیک نیرنگ صاحب نے میرے مضمون کو پڑھ کر اس کے حوالہ سے میرے بیان کے درست ہونے کی اپنے ایک مضمون میں تصدیق کی اور اسے شائع کرایا۔ اس ''جوئے شیر''، یعنی رسالہ کی بسیار تلاش میں بہت کوشش کی گئی لیکن افسوس ہے کہ وہ مضمون اور پرچہ ہاتھ نہ لگا۔ یہ صحیح ہے کہ حافظہ بمطابق روایت کمزور ہوتا ہے لیکن آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ نشست اور گفتگو میرے حافظہ اور نظر کی گہرائیوں میں بالکل محفوظ ہیں لیکن اپنی دلیل وتحریر کی مضبوطی اور آپ کی صدقی صد پذیرائی کے لئے نیرنگ صاحب کا طبع شدہ مضمون ضروری تھا۔ بہرحال ایک غیر متوقع لیکن خود مختار ذریعہ سے میرے بیان کو بڑی تقویت پہنچی اور مکمل تائید ہوئی۔ ماہ نو کے اس ہی مخصوص شمارہ یعنی قائداعظمؒ نمبر میں ایک اور اہم مضمون شائع ہوا ہے جو برصغیر کے بہت مشہور و واجب التعظیم شاعر اسد ملتانی نے لکھا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے میرے بیان کی تصدیق کی ہے۔ معاف فرمائیے۔ میں شاعر تو نہیں ہوں لیکن مجھ سے سخن گسترانہ بات ہوگئی۔ اسد صاحب کی بزرگی و عظمت کے پیش نظر میرے لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے قائداعظمؒ کے خاندانی تعلق کے واقعہ کی بات چیت کو دہرا کر ان کے بیان کی مزید تائید کی ہے۔

اصلی موضوع یعنی پارلیمانی جدوجہد کی طرف رجوع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ایم اے جناح کی پارلیمانی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالتے چلیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو منظور تھا کہ پارلیمانی میدان میں اسلامیانِ ہند کی قیادت کے لئے ایک مسلمان کی زندگی کو بنایا اور سنوارا جائے۔ اس لئے اُسے باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا جارہا تھا اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ غیر مسلم کیمپوں میں اس کی سیاسی تعلیم و سیاسی تربیت کرائی جارہی تھی تا کہ سنتِ موسوی کی تجدید حق و صداقت کا علم سرزمینِ ہند میں جو بعد میں فراعین کا ملک بنا' نصب کر کے کی

جائے۔تاریخ میں ایسی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کچھ لوگ محلات کے سیاسی جوڑ توڑ' کچھ حادثات کی پیداوار' کچھ سودابازی' کچھ ڈنڈے کے زور سے بغیر کسی تربیت اور تیاری کے لیڈر بن گئے لیکن ہمارے عظیم رہنما نے کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یا کسی کا دامن تھام کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ تو وہ کسی پچھلے یا چور دروازے سے داخل ہوئے۔ان کا ایمان تھا کہ اگر انسان دیانت داری اور جفاکشی کے ساتھ کوئی چیز حاصل کرنا چاہے اور اللہ سے مانگے تو وہ چیز اسے ضرور ملتی ہے۔ان کی صداقت' خلوص اور بے لوث خدمت میں ان کی شاندار کامیابی کا راز مضمر تھا۔ ''طلب العلم فریضۃ'' ان کا نصب العین تھا۔زندگی کے ہر دور میں وہ اس سے غافل نہیں رہے۔ پارلیمانی بلندی پر بھی وہ اپنی فہم و دانش' سعیِ پیہم' بے لاگ تبصرہ' حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے پہنچے۔ واقعی مسلمانانِ ہند بڑے خوش نصیب تھے کہ اس میدان میں انہیں ایک لاجواب قائد ملا جو عزم وہمت سے میدان مار کر اپنی قوم کو لے کر منزل کی طرف آگے بڑھا۔اس کے ثبوت میں حسب ذیل سطور پیش خدمت ہیں۔

جب مسٹر ایم اے جناح کامیابی کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے 1896ء میں لوٹے تو ان کے نوجوان لیکن نحیف کندھوں پر ان کے مفلوک الحال خاندان کا بارِگراں پڑ گیا۔کوئی اور ہوتا تو شاید پریشان ہو جاتا لیکن وہ ناسازگاریٔ حالات کے باوجود گھبرائے نہیں۔ پامردی و استقلال کے ساتھ وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرتے رہے۔انہوں نے حالات کو کچھ بہتر بنانے کے لئے عارضی طور پر پریذیڈنسی مجسٹریٹی کی ملازمت 1900ء میں قبول کر لی۔اُنہوں نے دل کی آواز پر کہ وکالت سے ایک دن میں پورے مہینہ کی تنخواہ کمائی جاسکتی ہے' ملازمت سے بغاوت کر دی اور پھر نئے جذبہ کے ساتھ وکالت شروع کی۔

سیاست کا چسکا تو لندن میں طالب علمی کے زمانہ سے پڑ گیا تھا۔ وہاں برطانوی دارالعوام کا انتخاب ہونے والا تھا اور ایک معزز ہم وطن دارالعوام کے انتخاب میں پہلی مرتبہ اُمیدوار بنا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ہندوستانی طالب علم مقیم لندن خاموش تماشائی بن کر بیٹھے

رہتے۔ وہ سب اس انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ہمارے ہونے والے رہنما بھی بہت متاثر تھے اور دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے کہ ہندوستانی اُمیدوار پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوجائے۔ لارڈ سیلسبری کا دورانِ انتخاب دادا بھائی نوروجی کو کالا آدمی کہنا بس غضب ہوگیا لیکن ساتھ ہی یہ کامیابی کا بھی باعث بنا۔ دادا بھائی نوروجی نے دوران انتخاب اس ہونے والے بیرسٹر کی کارگزاری، سوجھ بوجھ اور ''چکنے چکنے پات'' کو دیکھ کر تاڑ لیا تھا کہ یہ ''ہونہار بروا'' ہے۔ انتخابی مہم میں مسٹر جناح کے حصہ لینے کی یہ ابتدا تھی اور وہ بھی انگلینڈ میں جہاں کی پارلیمنٹ کو ''اُمّ الپارلیمنٹ'' کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مسٹر جناح کو دوبارہ کامیابی کے ساتھ بیرسٹری کرتے ہوئے مشکل سے 9 سال گزرے تھے کہ زندگی کا سنگ میل آ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ 1909ء میں سپریم لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب ہوا۔ بمبئی کے مسلم حلقہ سے ایک نشست کے لئے دو بڑی ہستیاں اُمیدوار تھیں۔ دونوں اُمیدواروں میں سے ایک بھی اپنا نام اس وجہ سے واپس لینے کو تیار نہ تھا کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کی نمائندگی کا اہل سمجھتا تھا۔ اللہ نے انہیں سمجھایا کہ وہ دونوں امیدواری سے دستبردار ہوکر تیسرے آدمی کو اُمیدوار بنائیں۔ اُس تیسرے آدمی کو یعنی مسٹر جناح کو قدرت نے بہت پہلے منتخب کرلیا تھا۔ اب تو ان کی کامیابی کے لئے راہ ہموار کی جارہی تھی۔ اس طرح 1909ء میں مسٹر جناح کی عملی پارلیمانی زندگی کی داغ بیل پڑی۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ آئین ساز ادارہ ہندوستان میں بہت بڑا اور اہم تھا۔ اُس کے رُکن صرف چوٹی کے ہندوستانی ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں رشوت کا بازار نہیں کھلا تھا کہ دولت کے بھرم پر تجوری کے تالے کھول کر ہاتھ گرما دیے یا منہ بند کردیے جاتے۔ اُس وقت تو صرف بہت قابل، نہایت اہل یا ''پیا'' سرکار جسے چاہے، وہ ہی اُمیدوار کامیاب ہوسکتا تھا۔ اس ادارہ کی اہمیت اور بڑے پنے کا اندازہ صرف ایک امر سے ہوسکتا ہے کہ اس ادارہ کے مستقل صدر وائسرائے بہادر ہوا کرتے تھے جو کرسیٔ صدارت کو ہمیشہ زینت بخشتے۔ ان حالات میں

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی رُکن کی یہ کیسے مجال ہوتی کہ وہ وائسرائے کی موجودگی میں اپنی تقریر میں کوئی ایسا لفظ استعمال کرے جس سے اُس کی برطانیہ کے ساتھ وفاداری مشکوک ہوجائے یا وائسرائے کی نظر کرم ہٹ جائے۔ وائسرائے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات مصلحت کوشی و مصلحت بینی کا تقاضہ تھا کہ اپنے ضمیر کے خلاف خاموش ہوجاؤ یا اپنے دل کی اس آواز پر کہ اپنا کیا بگڑتا ہے بلکہ اپنا کچھ بن ہی جائے گا تو بہتر ہے ہاں میں ہاں ملا دو لیکن ان میں چند جن کا انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے' بلاشک ایسے بھی تھے جو انتہائی احتیاط اور دبی زبان سے اپنی رائے دیتے جو بعد میں صدا بہ صحرا ثابت ہوتی کیونکہ اس میں کوئی زور یا اثر نہیں ہوتا تھا۔

1909ء میں جب مسٹر جناح نے ایوانِ بالا میں بحیثیت منتخب رکن قدم رکھا' اس وقت وہ ایک خوش شکل' خوش پوش' خوش مزاج اور خوش گفتار تینتیس سالہ بھرپور جوان تھے۔ لندن کے چار سالہ قیام نے ان کی کردار سازی میں بڑی مدد دی تھی۔ ان کی صلاحیتیں جو قدرت نے انہیں ودیعت کی تھیں اور موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے خفتہ تھیں' بیدار ہوگئی تھیں لیکن انہوں نے مغربی تہذیب و ثقافت کی اچھائیوں کو اپنا لیا تھا اور یہ ہی خوبی تھی جس نے انہیں ایک قابل رشک روپ میں جلوہ گر کیا۔ برطانوی جمہوریت' برطانوی طرز حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ کی کارروائیوں کے مطالعہ نے انہیں آئین پسند اور جمہوریت کا متوالا بنادیا تھا۔

دادا بھائی نوروجی کی معیت میں ان کا رشتہ اس سیاسی مکتبۂ فکر سے جڑ گیا جو اعتدال پسند کہلاتا تھا۔ بعد میں سر فیروز شاہ مہتہ' گوپال کرشنا گوکھلے' رانڈے وغیرہ کی رفاقت نے اُن پر ''سونے پر سہاگہ'' کا کام کیا اور یہ ہی وجہ تھی کہ اعتدال پسندی ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی اور وہ جب تک جئے' اعتدال پسند رہے۔ ان کے لئے آئین سازی کا تجربہ بالکل نیا تھا لیکن وہ اس کے لئے بھی کیل کانٹے سے لیس تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر میدان کے شاہسوار ہیں۔ علم حاصل کرنے کی طلب جو ہمیشہ تشنہ رہی ہے' اس نے انہیں پارلیمانی کاموں میں بہت زیادہ منہمک کردیا۔ پھر کیا تھا' پارلیمانی افق پر بھی وہ درخشندہ ستارہ بن کر اُبھرے۔ کئی مرتبہ ایوان میں

معرکتہ الآرا تقریریں کیں۔ اُنہوں نے (1) حکومت پر بے لاگ تنقید (2) تعمیری کاموں کی حمایت (3) تخریبی کاموں کی کھلی مخالفت اور (4) ہندوستان کی آزادی کے آئینی مطالبہ کو اپنی پارلیمانی زندگی کا نصب العین بنایا۔ وہ ان چار ہتھیاروں سے مسلح تھے اور اس کی بدولت وہ ہمیشہ نیک نام رہے اور سب نے اُن کی عزت کی۔

اپنے فرض کی انجام دہی میں مسٹر جناح کا سپریم لیجسلیٹو کونسل کے صدر یعنی وائسرائے سے تصادم ہوگیا جنہوں نے مسٹر جناح کی تقریر کے دوران جنوبی افریقہ کی حکومت کے متعلق ''بے رحمی'' کے لفظ کے استعمال پر صرف اعتراض ہی نہیں کیا بلکہ واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ منجھے ہوئے خوددار وحق گو بیرسٹر جناح نے اس کا نہ کچھ اثر لیا اور نہ وائسرائے کے طمطراق سے رعب میں آئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک ہندوستانی نے تہذیب کی حدود میں رہ کر وائسرائے کو قائل کر دینے والا انتہائی شائستہ جواب برملا دیا۔ آپ بھی جواب سے لطف اندوز ہوں:-

''تقاضائے طبع تو اس سے بھی زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن ایوان کے قوانین کے پیش نظر یہ کہتا ہوں کہ ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ ایسا ''بے دردانہ'' برتاؤ کیا گیا ہے جو تصور میں بھی نہیں آسکتا۔''

یہ برجستہ جواب سن کر وائسرائے بہادر لارڈ منٹو سکتہ میں آ گئے اور یہ عالم ان پر بہت دیر تک طاری وساری رہا۔ دوسرے دن ہندوستان کے اخباروں نے جلی حروف میں اس واقعہ کو شائع کیا اور راتوں رات مسٹر جناح عوام کے منظور نظر ہو گئے۔

مسٹر جناح نے مباحثوں میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ اُن کا سکہ بیٹھ گیا اور اُن کی پارلیمانی استعداد کو سب نے تسلیم کر لیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ مسٹر جناح کی میعادِ رُکنیت ختم ہونے پر اُن کو کونسل کا ممبر اس غرض سے نامزد کیا گیا کہ وہ اپنا نجی شہرۂ آفاق ''وقف علی الاولاد بل'' خود پیش کر کے پاس کرالیں اور ایسا ہی ہوا۔ یہ فخر کی بات ہے کہ ایک غیر سرکاری ممبر کے سر پہلی مرتبہ خانگی بل پاس کرانے کا سہرا بندھا۔ اس طرح مسٹر جناح ایک ممتاز قانون ساز کی

حیثیت سے اُبھرے اور دنیائے قانون پر چھا گئے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی وکالت خوب چمکی اور اُن کا بہترین مقررین میں شمار ہونے لگا۔

حکومتِ برطانیہ نے ماہ نومبر 1927ء میں ہندوستان کو مزید اصلاحات یا اختیارات دینے کے لئے سائمن کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ دراصل مسٹر جناح اس کمیشن کے بائیکاٹ کے بانی تھے اور کانگریس نے اُن کی پیروی کی تھی لیکن اس نے اس تجویز کو بڑی شدت سے اپنالیا اور سائمن کمیشن کے مقاطعہ کرنے میں بہت پیش پیش رہی اور اس کی پیہم کوشش سے کمیشن ملک کے لوگوں کا عملی تعاون حاصل کرنے سے محروم رہا لیکن کمیشن کی کاوشوں اور اس کا ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ گول میز کانفرنس کی صورت میں 12 نومبر 1930ء میں رونما ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ گول میز کانفرنس میں گول مول باتیں ہوئیں کیونکہ مختلف سیاسی خیال' مختلف المذاہب مندوبین کا ایک نقطہ پر جمع ہونا محال تھا۔ مسلم اکابرین جو شرکائے کانفرنس تھے' ان میں مسٹر جناح بھی تھے۔ مسٹر گاندھی نے شترغمزوں کی آڑ لے کر ہندوستان کے باہر قدم نہ نکالا۔ بس یہ سمجھیے کہ پہلی گول میز کانفرنس ''نشستند و گفتند و خوردند و برخاستند'' کی نذر ہوگئی۔ دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کئی چہرے والے دیوتا کے روپ میں نمودار ہوئے اور قسم قسم کی بولیاں بولتے رہے لیکن ان کے قول وفعل کے تضاد کو برطانوی حکمران ٹولی' مسلم رہنما اور بالخصوص مسٹر جناح بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

حکومت برطانیہ کی عطا کی جانے والی اصلاحات کا ایک ہلکا سا خاکہ مندوبین کے سامنے پیش کیا گیا جس سے ظاہر ہوا کہ کیا کچھ ملے گا۔ مندوبین نے اپنے اپنے طور پر مذمت اور تائید کی۔ اللہ بھلا کرے گاندھی جی کا جنہوں نے جماعتی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو سر جوڑ کر بیٹھنے اور پارلیمانی نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم کرنے میں روڑے اٹکائے اور مسٹر جناح کی دیرینہ خواہش وتمنا کو پیروں تلے روند ڈالا اور یہ ثابت کر کے دکھلا دیا کہ ہندو مسلم اتحاد نہیں ہوسکتا حالانکہ مسٹر جناح عرصہ سے ہندو مسلم اتحاد کا خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے اس خیال کی پختگی کی

وجہ سے مسلمانوں سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ بہرحال بہت بحث وتمحیص کے بعد گاندھی جی نے اپنی اور کانگریس کی طرف سے مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کو اسمبلیوں میں نشستوں کی تقسیم کے لئے ثالث مقرر کردیا۔

یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ تیسری گول میز کانفرنس میں صرف ایسے لوگوں کو مدعو کیا گیا جو کانفرنس کی تجاویز کی مخالفت نہ کریں۔ قصہ مختصر دارالامراء اور دارالعوام نے برطانوی تجاویز پر اپنی اپنی مہر تصدیق ثابت کردی اور وزیر اعظم نے بھی لیت ولعل کے بعد نشستوں کی تقسیم کا اعلان کردیا۔ اب یہ تین منظور شدہ برطانوی تجاویز قانونی دستاویز کی شکل میں فروری 1935ء میں مرکزی اسمبلی دہلی کے اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کی گئیں۔

اسمبلی کی پارٹیوں کی ساخت اور طاقت کے متعلق کچھ عرض کردینا مناسب ہے تاکہ آئندہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوسکے کہ کس پارٹی کے ہاتھ میں کامیابی کی کنجی تھی اور اُس پارٹی کی اس زمانہ میں کیا اہمیت تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ اہم معاملات میں جب ایک دوسرے کو للکارا جاتا تھا تو جیتنے والی پارٹی صرف چند ووٹوں سے جیتی تھی اور اس طرح ہر ووٹ بڑا قیمتی تھا۔ پارٹی بندی کی وجہ سے منظم پارٹیوں کے ووٹ کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہیں بدلتے تھے اور ہر رکن کا ووٹ جماعتی ووٹ ہوتا تھا ان حالات میں کس کی مجال تھی کہ رکن کو جماعت سے توڑ کر اس کا ووٹ حاصل کرے۔

اب اس پارلیمانی جدوجہد کا وقت جس کا خاص تعلق مسلمانانِ ہند سے تھا' آ گیا اور مسٹر جناح سرگرم عمل ہوگئے۔ آئینِ زیر بحث میں مسلمانوں کا کچھ مفاد بھی تھا اور کچھ نقصان بھی۔ مسٹر جناح کو اس پرخطر راستے سے اپنی ٹیم کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانا تھا۔ اگر ایک غلط قدم اٹھاتے تو آئندہ کے لئے راہ گزر بند کردی جاتی۔ اُنھوں نے وہ رویہ اختیار کیا جس سے ہر منزل پر مقصد برآری کے لئے مختلف پارٹیوں سے مختلف اوقات میں پورا پورا تعاون حاصل کرکے کامیاب ہوسکیں اور ہندوستان کے عام مفاد اور مطالبۂ آزادی کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ پہلے تو

اسمبلی کے قواعد کے مطابق اس آئینی تجویز میں انہیں ایسی ترمیمات پیش کرنی تھیں جن سے مقصد حاصل ہو۔ اس لئے ترمیم کو مناسب اور موزوں الفاظ کا جامہ پہنانا تھا۔ بادی النظر میں یہ بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے لیڈر کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ اُنہوں نے ترمیمات پیش کیں جن کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ یہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتاتا چلوں کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے خلاف دو بہت بڑے طاقتور محاذ قائم تھے۔ ایک چھوٹا لیکن مضبوط ہندو مہا سبھائی (نیشنلسٹ پارٹی) محاذ جو حالیہ انتخاب کی بدولت عالمِ وجود میں آ گیا تھا۔ دراصل یہ محاذ کانگریس پارٹی کا ایک جزو لاینفک تھا کیونکہ کانگریس کے دانت کھانے کے اور' دکھانے کے اور تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسٹر جناح دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھتے تھے اور وہ اس محاذ پر بھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان کی تین ترمیموں کا اجمالی خلاصہ ملاحظہ کیجئے:-

(1) وزیرِ اعظم برطانیہ کے فرقہ وارانہ تقسیم کے فیصلہ کو جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی متفقہ سمجھوتہ نہیں ہوتا' قبول کیا جاتا ہے۔

(2) صوبائی خودمختار حکومتوں کے ڈھانچہ کو بغیر مسترد کئے ہوئے اصولاً ناقص لیکن قابلِ اصلاح قرار دیا جاتا ہے۔

(3) مرکز سے متعلق وفاقی حصہ کو بنیادی طور پر ناکارہ اور ناقابل قبول تجویز کیا جاتا ہے۔

کانگریسی تجویز کا تو یہ لب لباب تھا کہ برطانوی دارالامراء اور دارالعوام کی پاس کردہ مشترکہ رپورٹ پر ہندوستان کا جو نیا آئین تجویز کیا گیا ہے' وہ نامنظور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ تجویز جسے 61 کے مقابلہ میں 72 ووٹ ملے' منظور ہو جاتی تو ''ڈھاک کے تین پات'' کے سوا کیا ہاتھ آتا۔

مسٹر جناح کی پہلی ترمیم 15 کے مقابلہ میں 68 ووٹ سے پاس ہوگئی۔ کانگریس پارٹی فرقہ وارانہ تقسیمِ نشست کے معاملہ میں اپنے وعدے کے مطابق غیر جانبدار رہی اور ہندو مہا سبھا نے مخالفت کی۔ ہماری اس ترمیم کی حمایت سرکاری ممبروں نے اپنے حوارین کے ساتھ

کی کیونکہ وزیراعظم برطانیہ کے فیصلہ کی تائید کرنا ان کا فرضِ اولین تھا۔

دوسری اور تیسری ترمیموں پر بیک وقت ایوان کی رائے لی گئی۔اب تو کانگریس پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی (ہندومہاسبھا پارٹی) بمصداق ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' مسٹر جناح کی دونوں ترمیموں کی تائید کرنے کے لئے مجبور ہوگئیں۔ اس لئے کہ اگر وہ اس تجویز کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرتیں تو دنیا کی نظروں میں نکو بنتیں۔ چونکہ سرکاری پارٹی اور اس کے معاونین کو مخالفت کرنا لازمی تھا' لہٰذا اس نے مخالفت میں ووٹ دیے۔ یہ دونوں ترمیمیں جو بیک وقت پیش کی گئیں' 58 ووٹ کے مقابلہ میں 74 ووٹ سے منظور ہوئیں۔ مسٹر جناح کی اس شاندار کامیابی سے کانگریسی اور ہندو اخبار بوکھلا گئے اور اپنی سابقہ روایات کے مطابق دشنام طرازی شروع کر دی اور یہ الزام لگایا کہ اس کارگزاری سے مسٹر جناح کے جیسے قوم پرست نے ہندوستان کو شکست فاش دی اور قومی مفاد کو سخت نقصان پہنچایا۔ افسوس ہے کہ انہوں نے اپنی ہرزہ سرائی سے رائی کا پربت بنا دیا۔

معترضین نے اس حقیقت کو یکسر بھلا دیا کہ مسٹر جناح کی دو ترمیمیں اس حد تک ملک کے مفاد میں تھیں کہ کانگریس اور نیشنلسٹ پارٹی نے بغیر زیروزبر کی کمی کے اپنا کر ان کی تائید کی۔ مزید برآں کانگریس پارٹی صوبہ کی خود مختاری کی پہلے سے طرفدار تھی اور اس نے بعد میں سات صوبوں میں کامیابی کے ساتھ انتخاب لڑا' جیتا اور قلمدانِ وزارت سنبھالا۔ ہر سیاسی جماعت اور خصوصاً کانگریس اور ہندومہاسبھا مرکز میں وفاق کے خلاف تھی۔ مسٹر جناح بھی اس کے بدترین مخالف تھے' لہٰذا مسٹر جناح اور مذکورہ بالا دو جماعتوں کے درمیان تنازعہ کی چیز صرف فرقہ وارانہ نشستوں کی تقسیم تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے ہمیشہ سے بہت بڑے علمبردار رہے۔ اس زمانہ میں باہمی مفاہمت کی خاطر ان کا یہ نظریہ تھا جسے مسلمانانِ ہند نے کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ ''ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد'' میں ہیں۔ اس نظریہ کے تحت ہندو مسلم مسائل کو حل

کرنے کی انہوں نے ہمیشہ سعیٔ بلیغ کی اور کبھی ہمت نہ ہارے لیکن کانگریس اور گاندھی جی کی طرف سے ہر ہر قدم پر ٹال مٹول ہوتی رہی۔ بعد میں مسلم نشستوں کے بارے میں سودا بازی شروع ہوئی اور کوئی معاملہ طے نہ ہوسکا کیونکہ بنیائی ذہنیت کے تحت جھوٹے ناپ تول استعمال کئے گئے اور ڈنڈی مارنے کی تو ہمیشہ کوشش کی گئی۔ اس میں بھی جب گاندھی اور کانگریس کو ناکامی ہوئی تو جداگانہ انتخاب کو ملیامیٹ کرنے کے لئے ایک نئی ترکیب نکالی۔

یقیں ہے پھر کوئی تازہ ستم گاندھی کو یاد آیا
نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں گورِ غریباں کی

مہاتما گاندھی نے ''کورے چیک'' کی پیش کش پوری نہ ہونے والی اس شرط کے ساتھ کہ چیک کو پُر کرنے اور بھنوانے سے قبل کانگریسی مسلمانوں کی جو جناح صاحب اور مسلم لیگ کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے رضامندی حاصل کی جائے۔ آخر وہ ہی ہوا جو ہونا تھا یعنی ''من از بیگانگان ہرگز نہ نالم کہ با من اُنچہ کرد آں آشنا کرد۔'' اس طرح یہ اہم معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور اس کے لئے مسٹر جناح کو موردِ الزام گرداننا سراسر زیادتی اور صریح ظلم ہے۔

مسلمانوں کے لئے سر سید احمد خاں کے زمانہ سے جداگانہ قومیت اور جداگانہ انتخاب کا اصول ایک تسلیم کردہ امر تھا جسے 1909ء میں جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو مان کر مہر تصدیق ثابت کردی گئی تھی۔ اب 1933ء میں مسٹر رامزے میکڈانلڈ نے اپنے حالیہ فیصلہ کے مطابق چند مسلم نشستیں اِدھر اُدھر بڑھادیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسٹر جناح نے اسمبلی میں اپنی ترمیم اور تقریر سے مفاہمت اور منظور شدہ تجویز پر دوبارہ غور وخوض کا دروازہ اور زیادہ کھول دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ خودداری کا تقاضہ ہے کہ اس گتھی کو فوراً باہمی رضامندی سے خود سلجھایا جائے اور اس سلسلہ میں کانگریس سے تعاون کی اپیل کرتے ہوئے اُسے یقین دلایا تھا کہ سمجھوتہ ہوجانے پر ان کی پاس شدہ تجویز کالعدم سمجھی جائے گی۔ دنیا پر یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ مسٹر جناح اس میدان کے بھی ماہر فن شاہسوار ہیں اور وہ پارلیمانی شطرنج کی بساط پر ایک پیادہ کی حیثیت سے

فرزین (کانگریس) اور فیل (مہاسبھا) کو پیچھے ہٹا کر شاہ (حکومتِ برطانیہ) کو مات دے سکتے ہیں۔

اس کھلی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جب کبھی ایوان میں کوئی تجویز یا بل مفاد عامہ اور ہندوستان کے مفاد میں پیش ہوا تو انہوں نے اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جب کبھی وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلاں قانون سے ملک کو نقصان پہنچے گا تو اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے بھی کانگریسیوں سے آگے رہے۔ تجارتی معاہدہ (آٹووا پیکٹ)، فوجداری قانون ترمیمی بل اور سالانہ بجٹ اس امر کے شاہد ہیں۔ ایوان کی شائع کردہ کارروائی کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وائسرائے ہند کو 1940ء تک آٹھ مرتبہ اپنے اختیاراتِ خصوصی کو کام میں لا کر اُن قوانین اور تجاویز کو جو مسٹر جناح۔ کانگریس اور نیشنلسٹ پارٹیوں کی متحدہ کوششوں سے ناکام ہوگئی تھیں، پاس کرنا پڑا۔

اسمبلی کے ابتدائی زمانہ میں چند واقعات جو خالی از دلچسپی نہیں ہیں، رونما ہوئے۔ میں نے ابھی تک برابر کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں وہ واقعات درج نہ کئے جائیں جن کا صرف میری ذات سے تعلق ہو لیکن میں اس وقت مجبور ہو جاتا ہوں جب میرے کسی ذاتی معاملہ کے بنانے یا سلجھانے میں جس کا تعلق جماعت کے مفاد سے ہو، کوئی اور ہی شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔ ان حالات میں شرافت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ اپنے محسن کی کرم نوازی یا دستگیری کا علی الاعلان ذکر کروں اور بالخصوص جب کہ قائداعظمؒ نے بندہ نوازی کی ہو۔ مذکورہ بالا معذرت کے ساتھ ان واقعات کو جن کی طرف گزشتہ سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے، آپ کی بصارت کو مطالعۂ زحمت دوں گا۔

وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن کا عہد حکومت ہے اور اُنکی خاص الخاص سرپرستی مہاراج کمار وزیانگرم کو حاصل ہے اور اس کی بدولت وہ کیپٹن سی کے نائیڈو کے مسلمہ حق کو نظرانداز کر کے اس ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان مقرر کر دیے گئے ہیں جو انگلستان کا دورہ کرنے والی ہے۔

مہاراج کمار نے میری دوستی' کرکٹ سے میری غیر معمولی دلچسپی اور کرکٹ کنٹرول بورڈ کی ممبری کا خیال کر کے میرے لئے انگلستان جانے والی کرکٹ ٹیم کے خزانچی کا عہدہ تجویز کرایا اور خود ہی پیامبر بنے۔ میں پہلی مرتبہ صوبہ سے باہر نکلا تھا۔ طبیعت میں کچھ حجاب اور بہت زیادہ تکلف تھا۔ اس لئے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا جس سے ظاہر ہے کہ مہاراج کمار کو بہت افسوس و رنج ہوا۔ بات آئی گئی ہوئی لیکن وہ اپنے پیچھے ایک احساس چھوڑ گئی کہ مجھے اس زریں موقع کا فائدہ اٹھانا چاہئے تھا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' اس تلخ حقیقت کے بعد میں نے یہ طے کر لیا کہ آئندہ جو بھی موقعہ ہاتھ لگے گا' تکلف سے بالکل کام نہیں لوں گا۔ قدرت نے کچھ عرصہ کے بعد ایک اور موقع عطا کیا۔ 1936ء میں آسٹریلیا کی پارلیمانی ایسوسی ایشن نے ہندوستانی پارلیمانی ایسوسی ایشن کے ایک مندوب کو جنوبی آسٹریلیا کی صد سالہ جوبلی میں شرکت کی دعوت دی۔ میں عزم مصمم کے تحت جرأت کر کے اُمیدوار بن گیا۔ میری اس جسارت کو چند پرانے ممبروں نے گستاخی سمجھا۔ چنانچہ چودہری سر ظفر اللہ خاں نے جو وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے' مجھے بہت سمجھایا اور وعدہ کیا کہ اگر میں اپنے مرد مقابل کے حق میں یعنی لائل پور والے ایڈووکیٹ سردار سنت سنگھ جو اسمبلی کے قدیم ممبر اور جہاندیدہ شخص تھے' دستبردار ہو جاؤں تو وہ مجھے آئندہ کہیں باہر بھجوائیں گے۔ اب تو میرے لئے میدان چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں تو ڈٹ گیا۔ یہ سخت حیرانی کی بات ہے کہ عبدالمتین صاحب چودہری کی پرزور سفارش پر جنہیں مسٹر جناح بہت چاہتے تھے' وہ (مسٹر جناح) اپنی پارٹی کے ایک نئے اور ناتجربہ کار ممبر کے لئے اپنے خاص حلقۂ احباب میں پہلی اور آخری مرتبہ کنویسنگ کرنے پر تیار ہو گئے اور آخر کار ان کی کوشش سے میں چار ووٹوں سے جیت گیا۔ میں یہ بتا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کہ میں نے آسٹریلیا میں کیا دیکھا اور اپنے ملک کی بہتری کے لئے کونسی نئی راہیں تلاش یا ہموار کیں۔

کرکٹ کے اُن شائقین کی دلچسپی کے لئے جن کی یہ کتاب دست بوسی کرے گی'

تیسرے ٹیسٹ میچ کا جو میلبورن میں پچاسی ہزار تماشائیوں کی موجودگی میں مسلسل چھ دن تک مہمان ٹیم ایم سی سی اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلا گیا' کچھ جھلکیاں پیش کروں گا۔ اتفاق سے میرے پاس میلبورن کرکٹ کلب کی عطا کردہ بہت سی تصاویر میں سے تین بڑی معرکۃ الآرا تصویریں (1) میلبورن کرکٹ گراؤنڈ (2) براڈمین کھیلتے ہوئے اور (3) ممبروں کا باکس موجود ہیں جنہیں زیبِ اوراق کر رہا ہوں۔ اس ٹیسٹ میچ میں ڈان براڈ مین نے 270 رنز بنائے تھے۔ یاد رہے کہ آسٹریلیا پہلا اور دوسرا ٹیسٹ میچ بُری طرح ہار گیا تھا اور بیشتر اسٹیٹ میچوں میں بھی اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تینتیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے' اس لئے اپنے حافظ پر بلاوجہ بار نہیں ڈالوں گا اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میری اس تقریر کا مسودہ محفوظ ہے جو میلبورن کرکٹ گراؤنڈ سے دوران لنچ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لئے بروز چہارشنبہ 6 جنوری 1937ء کو نشر کی گئی تھی' پیش کر رہا ہوں۔

غالباً یہ عرض کر چکا ہوں کہ حکومت ہند اپنے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر کبھی کبھی بڑی گھٹیا حرکتیں کر کے اپنے جی حضوریوں (پاکستانی اصطلاح میں چمچوں) یا تربیت یافتہ عملے کے ذریعہ لوگوں کے ضمیر خریدا کرتی تھی۔ ان کے ترکش میں تین زہر آلود تیر تھے یعنی خطابات' دولت' ٹھیکہ۔ ضمیر خریدنے کے لئے آدمی کے کردار' حرص' افادیت' ضرورت اور نمائش پسندی کو ملحوظ خاطر رکھ کر جو تیر کارگر ہوتا' استعمال کیا جاتا۔ اگر تینوں تیروں کی بیک وقت ضرورت محسوس کی جاتی تو ان کے چلانے میں دریغ نہ کیا جاتا۔ بہت سے تیر نشانہ پر جا لگتے اور کچھ خطا بھی ہو جاتے لیکن اکثر لوگ تو بہ طبیب خاطر ایسے موقعوں کا فائدہ اٹھانے اور دولت سمیٹنے کے لئے منہ کھولے منتظر رہتے اور اس کے حصول میں ان کو کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ اسے اپنے لئے باعثِ ترقی و عزت سمجھتے تھے۔

بہرحال قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ان تینوں تیروں کو میرے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ نے مجھے اپنے ملک اور قوم کے سامنے سیاہ رو ہونے سے بچا لیا۔ اس کا

مختصر حال سنیے۔ انڈی پنڈنٹ پارٹی جس کا میں رکن اور مسٹر جناح لیڈر تھے' ایک ایسی انوکھی پارٹی تھی جس کا مروجہ دستور یہ تھا کہ تم اپنی رائے کے مالک ہو۔ جس کو چاہو آزادی سے ووٹ دو۔ چنانچہ حکومت ہند کے وہپ اس کھلے دروازے سے دندناتے ہوئے اندر داخل ہو کر ممبروں کو بہکاتے تھے۔ حکومت نے مجھے بہکانے کے لئے میرے ایک انگریز دوست کو جونا گپور کے ڈپٹی کمشنر تھے' نامزد کر کے دہلی بلوایا۔ ان کا صرف یہ فرض تھا کہ وہ مجھ سے جونک کی طرح چمٹے رہیں اور مچھر کی طرح میرے کانوں میں حکومت کے گن گاتے رہیں۔

جب فوجداری قانون کا ترمیمی بل پیش ہوا تو حکومت کو کامیاب ہونے کے لئے صرف ایک ووٹ کی ضرورت تھی۔ مجھ پر ہر طرف سے حملے شروع ہوئے۔ میں چونکہ نووارد تھا' اس لئے یہاں کے معاملات کا تجربہ بھی نہیں تھا لیکن اللہ نے مجھے نیک ہدایت دی اور میں نے بل کی مخالفت کا تہیہ کر لیا۔ اسمبلی کی لابی کی گزرگاہ تنگ تھی' اس لئے بیک وقت صرف ایک رکن اندر داخل ہو سکتا تھا۔ دروازہ پر مجھے روکنے کے لئے میرے انگریز دوست کھڑے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنی لابی میں لے جانا چاہتے تھے تاکہ حکومت کو فتح حاصل ہو۔ میں بھی جسمانی طور پر ان کی مدافعت کر رہا تھا۔ اس کھینچا تانی سے ڈرامہ کا ایک سین پیدا ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے پیچھے میری پشت پناہی کے لئے میرے لیڈر مسٹر جناح کھڑے ہیں۔ اس تماشہ کو دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو گئے اور ترش لہجے میں اس انگریز کو اس غیر جمہوری حرکت پر بری طرح ڈانٹا۔ صریحاً اس کا قصور تھا' کچھ کہہ نہ سکا۔ لال پیلا ہو کر سر جھکائے چلا گیا۔ رائے شماری کے بعد اعلان کیا گیا کہ حکومت ایک ووٹ سے ہار گئی۔ ہمارا انگریز دوست دوسرے ہی دن اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے کر ناگپور کی ڈپٹی کمشنری سنبھالنے چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد اتنا تو ہوا کہ پھر کسی سرکاری ممبر کو ہمت نہ پڑی کہ وہ مجھ پر ڈورے ڈالتا۔

نشأۃ ثانیہ

1906ء سے آل انڈیا مسلم لیگ مختلف ادوار سے گزر کر اپنی کمزور ہستی کی خیر مناتی ہوئی 1931ء کے ایسے دور میں پہنچی جب اس کا وجود و عدم برابر نظر آتا تھا۔ اس کے چند اکابرین نے ایک علیحدہ جماعت موسوم بہ آل انڈیا مسلم کانفرنس بنالی تھی۔ باقیماندہ اراکین شفیع لیگ اور میاں عبدالعزیز لیگ میں بٹ گئے تھے اور ہر دو جماعتیں تقریباً دیوالیہ ہوگئی تھیں۔ شفیع لیگ سخت جاں ثابت ہوئی اور وہ مسلم کانفرنس اور میاں عبدالعزیز لیگ کو فنا کرنے میں کامیاب ہوئی لیکن خود اس کا بھی وجود برائے نام تھا۔ بہرحال اس کو زندہ رکھنے میں ان کے اسسٹنٹ سیکرٹری سید شمس الحسن صاحب کا بڑا دخل تھا جس کا احسان مندی کے ساتھ مولوی سر محمد یعقوب صاحب اعزازی سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی 1931ء کی سالانہ رپورٹ میں اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی مالی حالت کی خرابی کا بھی بڑے درد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کی سالانہ رپورٹ بابت 1931ء-1932ء میں ایس ایم عبداللہ صاحب اعزازی جائنٹ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے سید شمس الحسن صاحب کی بے لوث خدمات اور چند معطیون کا جنہوں نے مسلم لیگ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو اپنی امداد سے 'بچالیا' خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر ایم اے جناح ہندوستان کی سیاست سے جہاں ہندو و متعصب ذہنیت' مسلمانوں کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے صاف منکر تھی اور جس کو منوانے کے لئے وہ پیہم برسہا برس سے باوجود ناکامیوں کے کوشاں رہے تھے لیکن اب وہ برگشتہ خاطر ہوکر اس نتیجہ پر پہنچے کہ انہیں ہندوستان کی سیاست سے کچھ عرصے کے لئے کنارہ کش ہوجانا چاہئے۔ وہ بحیثیت ایک پرانے قوم پرست کانگریسی کے یہ گوارہ نہیں کرسکتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف کیمپوں

میں بٹ کر آزادی کا علیحدہ مطالبہ کریں۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کا متحدہ محاذ ہوتا کہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو فوراً منوانے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو اور ہندوستان غیر ملکی غاصبوں کے چنگل سے نکل آئے اور ہندوستانی اپنے ملک کی باگ ڈور خود سنبھال کر اپنا پیدائشی حق حاصل کرلیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ وہ چوٹی کے کانگریسی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے اور اُس کی کارروائیوں میں عملی حصہ لیتے تھے اور کبھی اس کا خیال نہیں کرتے تھے کہ ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جائے گا یا نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مفید مشورہ دیتے کیونکہ اُنہوں نے اوائل عمری میں سر فیروز شاہ مہتہ اور گوپال کرشنا گوکھلے کے رفیقِ کار رہ کر ان سے سیاست میں بہت کچھ فیض پایا تھا اور وہ اینی بیزنٹ کی قیادت اور ان کی شخصی صلاحیتوں سے بھی بہت متاثر تھے۔

کانگریسی ہندو اکابرین اور قوم پرست مسلمان ان کو ان نیک جذبات کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور انہیں ہندو مسلم اتحاد کا صحیح علمبردار سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اُن کو بڑے سے بڑا دنیاوی لالچ دے کر ان کے اصولوں اور ان کی اس راہ سے جس پر وہ بہت سوچ سمجھ کر گامزن ہوئے ہیں۔ ہٹا نہیں سکتی ہے۔ الحاصل وہ ایک ایسے مقام پر تن تنہا تھے جہاں کوئی دوسرا ہندوستانی بسیار کوشش کے بعد بھی نہیں پہنچ سکا۔ بمبئی کے ہندوؤں نے خصوصاً ان کی شاندار خدمات کا عملی اعتراف ''جناح پیلس میموریل ہال'' تعمیر کر کے کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ باوجود ہندوستانی متحدہ محاذ کے زبردست حامی اور تسلیم کردہ قوم پرست ہونے کے مسلمانانِ ہند کے لئے ان کا کیا نظریہ تھا۔

مسٹر جناح نے مفادِ ملّی یعنی مسلمانوں کو حقوق دلوانے کے لئے ہر حال، ہر موقعہ اور ہر زمانہ میں بیباکانہ مطالبہ اور کوشش کی۔ اس کا بولتا ہوا ثبوت ان کے وہ مشہور اور تاریخی چودہ نکات ہیں جو انہوں نے اکتالیس سال قبل یعنی 1929ء میں اس نازک دور میں پیش کئے تھے جب مسلمانانِ ہند شدید سیاسی اختلافات کی بنا پر پانچ گروہوں میں زیرِ قیادت سر محمد شفیع، ہز ہائی نس

دی آغا خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح تقسیم ہو گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ دو ایک سال کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ نے ان چودہ نکات کو اپنا لیا لیکن مسٹر جناح ہی اس کے موجد کہلائے۔ دراصل یہ مسلمانان ہند کا منشورِ آزادی تھا جو بدلتے ہوئے حالات میں بتدریج مطالبۂ پاکستان میں متشکل ہو گیا۔ اس تاریخی دستاویز کے چند اہم نکات یہ ہیں (1) بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی (2) صوبہ شمال مغربی سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ (3) صوبہ پنجاب، بنگال اور سرحد کی ایسی علاقائی تقسیم نہ کی جائے جو مسلمانوں کی اکثریت پر اثر انداز ہو اور (4) آئین میں مسلمانوں کے مذہب، کلچر، زبان، اسلامی تعلیم، شخصی قوانین، عبادات اور تبلیغ وغیرہ کی ضمانت دی جائے۔

مذکورہ بالا حقائق سے بلاخوفِ تردید ثابت ہو جاتا ہے کہ مسٹر جناح ابتدا سے انتہا تک مسلمانوں کے حقوق کے محافظ اور ان کے حامی و مددگار رہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسٹر جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے اس لئے باقاعدہ ممبر نہیں تھے کہ اس کا دستور ان کے لئے قابل قبول نہیں تھا لیکن وہ ہر سالانہ اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرما کر عملی دلچسپی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا کہ جب ان کے ایماء پر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ زیرِ صدارت ہز ہائی نس دی آغا خاں 22 مارچ 1913ء میں نئے آئین کا نئے اغراض و مقاصد کے ساتھ اعلان کیا گیا۔ مولانا محمد علی صاحب جوہر اور سر وزیر حسن صاحب نے بحیثیت نمائندگانِ لیگ مسٹر جناح سے لیگ میں باقاعدہ شمولیت کی درخواست کی جسے وہ قبول کر کے لیگ کے ممبر بن گئے۔ اس کا بھی سہرا ان کے سر ہے کہ لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بیک وقت ایک ہی شہر میں ہوتے تھے اور کانگریسی ممبر مسلم لیگ کے اجلاس میں اور علیٰ ہذا القیاس مسلم لیگی کانگریس کے کھلے اجلاس میں بطور مہمان شریک ہوتے۔ ایسی شرکت سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کے قریب ہونے کا موقعہ ملتا اور اس طرح ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی۔ بالخصوص مسٹر جناح کو حالات و واقعات کا

صحیح جائزہ لینے کا بہت اچھا موقع ملتا اور ہندوؤں کے قول وفعل کو پرکھنے کا بھی بہت اچھا تجربہ ہوتا تھا۔ اس اثناء میں انہیں متحدہ قومی محاذ قائم کرنے اور اپنے قوم پرستانہ خیالات کا مسلمانوں میں پرچار کرنے کے لئے ایک اور نئی راہ کھل گئی۔ مزید برآں کانگریس اور ہندوؤں تک مسلمانوں کے خیالات اور جائز مطالبات پہنچانے کے لئے ایک نیا پلیٹ فارم ہاتھ آ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور کم وبیش تمام مسلم رہنما جناح صاحب کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے 1931ء-1932ء-1933ء میں ان کی نو' دس سالہ خدمات کو سراہا اور ہندوستان سے ان کی غیر حاضری کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان سے مخلصانہ گزارش کی کہ وہ لندن سے جہاں درحقیقت وہ مسلمانوں کی خدمت سے غافل نہیں تھے' اس نازک وقت پر مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے لئے فوراً ہندوستان لوٹ آئیں۔

جی اَلانہ صاحب کی کتاب ''تحریک پاکستان- تاریخی دستاویزات'' میں لکھا ہے کہ آسام کے عبدالمتین چودھری صاحب پرانے زمانہ میں مسٹر جناح کے چند خاص دوستوں اور بہی خواہوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے چند خطوط کے جوابات جو مسٹر جناح نے انہیں 1931ء' 1932ء اور 1933ء میں ارسال کئے تھے' شائع ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو اپنے چودہ نکات کے ذریعہ حقوق دلوا کر عروج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ لندن میں اس موقع اور وقت کا انتظار کر رہے تھے جب ہندوستان کے حالات ان کی واپسی کے لئے سازگار اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے مناسب ہوں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے اپنے حیات بخش وعمل آفرین کلام سے مسلمانانِ ہند کو قعرِ مذلّت اور تباہی سے بچانے کے لئے خوابِ غفلت سے بیدار کر کے الہ آباد کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1930ء میں شمال مغربی اور شمال مشرقی ہند میں ایک اسلامی ریاست کی تجویز اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے مسلمانوں کی منزل کا تعین بھی فرمایا۔

وہ اقبال جنہوں نے مسلم قوم میں خودداری وخوداعتمادی کی قوتیں بیدار کیں۔ وہ اقبالؔ

جنہوں نے شعر کے شیریں زیروبم میں مسلمانوں کو سمجھایا کہ

''خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے ناداں کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے''

وہ اقبال جن کا نام ان کے دل کو گرمانے والے کلام کی وجہ سے زندۂ جاوید شاعروں کی فہرست میں سرِ ورق ہے۔ وہ اقبال جنہوں نے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

کہہ کر مسلمانانِ عالم کو ان کا بھولا ہوا فرض یاد دلایا۔ وہ اقبالؒ مسٹر جناح کے مخلص دوستوں اور رفقائے کار میں سے تھے۔ وہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ' قیادت کی صلاحیتوں اور اسلام دوستی سے باخبر تھے اور وہ ایک مردِ مومن اور صاحب بصیرت ہونے کی وجہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسٹر ایم اے جناح ہی وہ ہستی ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ملاّ حی کر کے ساحلِ مراد تک بخیریت پہنچا سکتے ہیں۔ اس خیال کی تائید ان کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے مسٹر جناح کو لندن بھیجا تھا اور انہیں دعوت دی تھی کہ وہ ہندوستان آ کر مسلمانانِ ہند کی قیادت کی باگ ڈور سنبھالیں۔ اس مردِ حق بیں کی نظرِ انتخاب بیسویں صدی میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے سلسلہ میں مسٹر جناح پر پڑی۔ غالباً اس کا محرک ان کا وہ معرکتہ الآ را شعر تھا جو شاید اُنہوں نے اسی موقعہ کے لئے فرمایا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مسٹر جناح کو دورانِ قیامِ لندن جب ہندوستان آنے کے لئے مختلف اداروں اور

احباب سے دعوتیں وصول ہورہی تھیں' اس وقت لندن میں نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب اپنی رفیقۂ حیات بیگم رعنا کے ساتھ مقیم تھے۔ ان دونوں نے مسٹر جناح سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جناح صاحب نے ان کو ظہرانہ پر مدعو کیا۔ سیاسی گفتگو ہو اور یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ہندوستان کی سیاست پر بات چیت نہ ہو اور مسلمانوں کی بیکسی اور زبوں حالی کا ذکر نہ ہو۔ دورانِ گفتگو آل انڈیا مسلم لیگ' عبدالمتین چودہری صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے بلاوے کا ذکر آیا جس کی نواب زادہ صاحب نے اپنے طور پر پرزور تائید کی۔ مسٹر جناح نے چند شرائط کے ساتھ ہندوستان لوٹنے پر رضا مندی ظاہر کی۔ پہلی شرط یہ تھی کہ نواب زادہ صاحب ہندوستان کا دورہ کر کے مطلع کریں کہ کیا حالات ساز گار ہیں اور ان کی قیادت سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ دوسری اہم شرط یہ تھی کہ مسٹر جناح کی واپسی پر نوابزادہ صاحب ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ نوابزادہ صاحب ہندوستان آئے' حسبِ وعدہ رپورٹ بھیجی اور اپنی رفیقۂ حیات سے مشورہ اور ان کی رضا مندی کے بعد کہ انہیں آئندہ وہ سکھ اور چین کی زندگی میسر نہیں ہوگی جس کی وہ عادی ہیں' مسٹر جناح کی قیادت میں کام کرنے کا وعدہ کرلیا۔

بمبئ کے چند دوستوں نے شدید اصرار کر کے مسٹر جناح کو مرکزی اسمبلی کے لئے بمبئ کے حلقے سے اُمیدوار بننے پر راضی کیا۔ اس طرح 1934ء میں تین سال کی غیر حاضری کے بعد مسٹر جناح کا ہندوستان میں ورودِ مسعود ہوا۔

دورِ جناح

اپریل 1936ء تا 6 اگست 1947ء

1935ء کے نئے دستور کے نفاذ کے بعد حکومتِ ہند کے لئے لازمی ہو گیا کہ وہ صوبوں میں انتخاب کرانے کے بعد صوبائی وزارتیں قائم کرے۔ انتخابات کی تاریخوں کا تعین ہوا اور زوروں سے انتخاب کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ کانگریس بہت ناز و نخروں کے ساتھ میدان میں آئی۔ بیچاری مسلم لیگ کے پاس نہ طاقت تھی اور نہ سرمایہ، وہ سسک سسک کر جی رہی تھی۔ اس کے خشک حلق میں پانی ڈالنے اور مسیحائی کرنے کے ارادہ سے مسٹر جناح لندن سے آ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل تھا اور کامیابی کے ساتھ اس کام کو کرنے کے لئے بہت وقت درکار تھا۔ چونکہ صوبائی انتخابات سر پر کھڑے تھے، اس لئے ان سے فوراً نمٹنا ضروری تھا۔ اگرچہ صرف اپنے بل بوتے اس کام کو انجام دینا تسخیر قمر سے کم نہ تھا لیکن اگر انتخابات میں حصہ نہیں لیتے اور میدان سے ہٹ جاتے تو گویا اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود کر اپنے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔ ہمارے رہنما صاحبِ دماغ تھے۔ انہوں نے خادمِ کعبہ مولانا شوکت علی صاحب کے تعاون اور توسط سے پرانے تجربہ کار اور مخلص خلافتی رہنماؤں کو اپنے اطراف جمع کر لیا۔ دوسرا اقدام جمعیت العلمائے ہند سے عملی تائید حاصل کرنا تھا۔ جب اللہ نے اس میں بھی کامیابی عطا کی تو مسٹر جناح نے کانگریس سے یہ مفاہمت کر ڈالی کہ مسلم لیگی امیدواروں کی کانگریس مخالفت نہیں کرے گی اور کانگریسی مسلم اُمیدواروں کے خلاف مسلم لیگ اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ توقع تھی کہ اس شریفانہ سمجھوتے کے بعد انتخابات ہو جانے پر یہ دونوں جماعتیں سر جوڑ کر بیٹھیں گی اور صوبوں میں مخلوط وزارتیں عالمِ وجود میں آئیں گی۔

مسلم لیگ جیسی بے سروسامان اور بے مایہ جماعت کے لئے کثیر رقم خرچ کر کے انتخاب لڑنا بہت مشکل تھا۔ چند بااثر کارکن حضرات پیسہ کا تقاضا کر رہے تھے۔ پیسہ ہوتو دیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ مسٹر جناح اصول کے کتنے پکے تھے۔ان کا رشوت دے کر اور ہوس کی شکم پری کرا کے کام لینا ناممکن تھا۔ پیسہ کھانے والے لوگ روٹھ کر اس کیمپ میں چلے گئے جہاں انہیں بغیر حساب کتاب کے بہت خرچی مل سکتی تھی۔ ''اللہ اکبر'' اور ''اللہ ہو'' کہتے ہوئے مسلم لیگ نے مولٰینا شوکت علی صاحب کے مضبوط کندھوں پر بوجھ کا بڑا حصہ رکھ دیا۔ وہ بہت بڑے اور مشہور کھلاڑی تھے۔اُنہوں نے علیگڑھ میں ایسا بڑا چھکا لگایا تھا کہ کوئی دوسرا کرکٹ کا کھلاڑی آج تک اس کی گرد تک نہ پہنچ سکا۔ وہ اپنی آزمودہ پرانی خلافتی ٹیم کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ خلافتی اکابرین سرگرم کارکن اور انتہائی وفادار لیگی تھے۔ اللہ نے مولٰینا کو لوگوں کے دلوں کو موہ لینے کی ایسی قوت عطا کی تھی کہ لوگ صرف ان کا نام سن کر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ پھر ان کی تقریر کا مدوجزر بلا کا تھا۔ کبھی محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں اور کبھی جو تیور پر بل آ گئے تو تیکھے پن اور رامپوری پٹھانی انداز میں آستینیں چڑھنی شروع ہو گئیں اور موٹا سا ڈنڈا تھام لیا گیا۔

مسٹر ایم اے جناح نے بھی اس انتخابی مہم میں اپنے اُمیدواروں کی حمایت کرنے کے لئے بذات خود کئی صوبوں کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں وہ ناگپور بھی تشریف لائے۔ ناگپور کی مسلم لٹریری سوسائٹی کی طرف سے جس کے صدر بیرسٹر محمد ہدایت اللہ صاحب (موجودہ چیف جسٹس ہندوستان) تھے ایک جلسہ انجمن حامیٔ اسلام کے ہال میں منعقد ہوا جس میں مسٹر ایم اے جناح نے مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلایا اور مسلم لیگ کے اُمیدواروں کو کامیاب کرنے کی پرزور اپیل کی۔ اس طرح انتخابی مہم کا اختتام ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس انتخاب میں کتنی کامیابی نصیب ہوئی اور اس کامیابی سے مسلمانان ہند کے کیا پلّے پڑا۔ ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے پتہ چلے گا کہ باوجود اپنی بے سروسامانی کے مختلف صوبوں میں 60 سے 70 فی صد تک نشستیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔

وہ کانگریس جو نئے دستور میں صدہا کیڑے ڈال کر بصد غرور و تکبر اس امر سے بے خبر کہ کامیابی اس کے قدم چومے گی پہلی مرتبہ میدانِ انتخاب میں آئی۔ بڑے بڑے کانگریسی نیتاؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کانگریس کو غیر متوقع طور پر چھ صوبوں سی پی، یو پی، بہار، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس میں قطعی اکثریت حاصل ہوئی۔ اس شاندار کامیابی سے کانگریس ہائی کمان پھولے نہ سمایا۔ حکومت کرنے کا جامِ زرّیں، ان کے دسترس میں تھا لیکن اس کو چھونے سے قبل انہوں نے خود کو واحد مستحق حصہ دار تسلیم کرانے کے لئے منتخب شدہ کانگریسی ممبروں کا کنونشن طلب کیا اور اُس میں ایک دوررَس یعنی اقلیت کش بہ معنیٰ دیگر مسلم کش تجویز پاس کرائی جس کی رو سے برطانوی صوبائی گورنروں کو دھمکی دی گئی کہ چھ صوبوں میں جہاں کانگریسی ممبروں کو اکثریت حاصل ہے، اس وقت تک کانگریسی وزارتیں قائم نہیں کی جائیں گی جب تک گورنر وعدہ نہ کرلیں کہ وہ اپنے اختیاراتِ خصوصی استعمال نہیں کریں گے۔ کانگریس کا یہ داؤں چل گیا اور حکومت نے اعلان کردیا کہ حتی المقدور گورنر اپنے اختیاراتِ خصوصی استعمال نہیں کریں گے۔ یہ بھی ذہن نشین کرلیا جائے کہ گورنروں کو اختیاراتِ خصوصی صرف اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت کے لئے سونپے گئے تھے۔ دوسری تجویز کے ذریعہ کانگریسی ممبروں کو ہدایت کی گئی کہ ہائی کمان کی اجازت کے بغیر وہ کسی پارٹی سے بات چیت اور سمجھوتہ نہ کریں۔

اب مسلم لیگ کے منتخب شدہ ممبروں کا حال سنئے۔ ویسے تو مسلمان ہر صوبہ میں سوائے بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ، اقلیت میں تھے مگر ان چار اکثریتی صوبوں میں دھڑے بازیوں کی وجہ سے مسلم لیگی ممبر کمزور اقلیت سے بھی کمزور تر تھے۔ برخلاف اس کے اقلیت کے صوبوں کے منتخب مسلم ممبر متحد اور متفق تھے لیکن تعداد میں کم۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ہر صوبہ میں صرف اپنے بل بوتے پر خالص مسلم لیگی وزارت بنانے سے نہ صرف قاصر ہی رہے بلکہ درخورِ توجہ بھی نہیں ہوئے لیکن ایک سب سے بڑا یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم لیگ کا جال بچھ گیا۔

انتخاب سے قبل کانگریس نے جو زبانی وعدے کئے تھے، اس کے پیش نظر قطعی اُمید تھی

کہ کانگریس وزارت بناتے وقت مسلم لیگی اراکین کو ان کے تناسب کے مطابق وزارت میں حصہ دے گی لیکن کانگریس جو ہندوؤں پر مشتمل تھی اور جس میں قوم پرست مسلمانوں کی حیثیت سمندر میں چند قطروں سے زیادہ نہ تھی، مکر گئی۔ ہندو قوم جو مسلمانوں اور انگریزوں کی غلامی میں صدہا برس تک رہ چکی تھی، اب تیزی سے حکومت پر قبضہ جمانا چاہتی تھی اور بغیر مئے پئے ہوئے حکومت کے نشہ میں چور ہوگئی تھی۔ یہ سبب تھا کہ ہندو اپنے کو سنبھال نہ سکے اور اپنے اصلی رنگ و روپ میں ظاہر ہوگئے۔ مسلمان ان کی بازی گری کے صدہا تماشے پہلے دیکھ چکے تھے لیکن پھر اس اُمید کے ساتھ کہ ممکن ہے کوئی باہمی مفاہمت ہو جائے، آگے بڑھے اور ان کے لیڈر مسٹر جناح نے اپنی قوم کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بدعہدی کی اس سے بدترین کوئی مثال نہیں ملے گی کہ اُنہوں نے بڑی بے باکی سے مسلم لیگ کو نمائندگی دینے سے صاف انکار کر دیا اور طرفہ تماشا یہ کہ خود کو الگ تھلگ رکھ کر ایک کانگریسی مسلم رہنما مولٰینا ابوالکلام آزاد کو مسلم لیگی ممبروں کو جماعت سے توڑنے اور خریدنے کی گھٹیا خدمت انجام دینے پر مامور کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ انگریزوں اور ہندوؤں کی ہندوستانی تاریخ ایسے مکروہ واقعات سے پٹی پڑی ہے۔ مولٰینا نے چودہری خلیق الزماں صاحب پر پرانی دوستی کا سہارا لے کر ڈورے توڈالے لیکن یہ بھول گئے کہ چودھری صاحب ایک پرانے اور باران دیدہ ماہر سیاسی کھلاڑی ہیں اور کانگریسی گھر کے پرانے بھیدی ہونے کی وجہ سے کانگریسی لنکا کو بڑی آسانی سے ڈھا سکتے ہیں۔ مولٰینا نے وزارت کا لقمۂ تر چودہری صاحب کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس کو کھانے سے قبل تمہیں چند شرطیں پوری کرنی پڑیں گی: 1- مسلم لیگ پارٹی کو ختم کر کے اس کے تمام ممبروں کے ساتھ کانگریس میں بغیر کسی شرط کے شریک ہو جاؤ اور (2) صوبائی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دو۔ اخباروں میں جب یہ خبر شائع ہوئی تو مسٹر جناح نے للکارا کہ مرکز کو نظر انداز کر کے صوبہ مسلم لیگ اور صوبہ پارلیمنٹری بورڈ کو گفت وشنید کرنے کا کوئی مجاز نہیں ہے۔ بالآخر چودہری صاحب نے مولٰینا کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بھلا وہ کیونکر اپنی جماعت کے قصر کو ڈھا کر اپنی پارٹی کی قبر کھودتے۔ مولٰینا

کو جب جماعتی سطح پر شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو انہوں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے انفرادی سطح پر کام شروع کر دیا۔ایک دو مسلم ممبروں کے مل جانے سے مولٰینا کا کام بن گیا لیکن سب سے زیادہ مسلمانانِ سی پی کو سخت صدمہ پہنچا جب انہوں نے سنا کہ مسٹر یوسف شریف جیسے بلند پایہ مسلم لیگی رہنما مسلم لیگ کو چھوڑ کر وزارت کی خاطر کانگریسی صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔ان کا یہ فعل ناقابلِ فہم و معافی تھا حالانکہ یہ درست ہے کہ صوبائی مسلم لیگ کے ابتدائی دور میں وہ اندرونی چپقلشوں سے تنگ آ گئے تھے کیونکہ ان کے خلاف چند لوگوں نے محاذ بنا رکھا تھا جس کے مقابلہ کی غالباً وہ تاب نہ لا سکے اور افسوس ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے کمزور لمحات میں ہمیں سیاسی داغِ مفارقت دے گئے۔

عجیب بات ہے کہ یہ واقعہ مسلم لیگ کے لئے بجائے نقصان دہ ہونے کے بڑی تقویت کا باعث ہوا۔واقعات نے ثابت کر دیا کہ شریف صاحب کو کانگریسی وزارت راس نہیں آئی۔تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ وزارت سے ان کی زبردستی علیحدگی کا محرک صرف اتنا جرم تھا کہ انہوں نے ایک مسلم ملزم کی رحم کی درخواست پر بحیثیت وزیر قانون سزا میں تخفیف کر دی۔ایک کتاب ''سی پی میں کانگریس راج'' مرتبہ حکیم اسرار احمد صاحب کریوی میں یہ واقعہ وضاحت کے ساتھ صفحہ 3، 4 اور 5 پر درج ہے۔میں تو صرف صفحہ 5 کے آخری جملہ پر اکتفا کروں گا۔لکھا ہے: ''مسٹر شریف کو وزارت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے رشتہ جوڑنے کا خمیازہ انہیں مل گیا۔''

یوسف شریف صاحب عصبیت کا شکار ہوئے اور ان کے ساتھ سی پی کے کانگریسی وزیراعظم ڈاکٹر این بی کھرے بھی باوجود ہندو ہونے کے کانگریسی علاقائی زہریلی ذہنیت کی دستبرد سے نہ بچ سکے اور انہیں وزارتِ عظمیٰ کی گدی کو چھوڑنا پڑا۔مولٰینا سید ابوالحسن صاحب ناطق گلاوٹھوی نے ان دونوں صاحبوں کی علیحدگی پر ایک قطعہ کہا تھا جس سے میں اکیلا ہی کیوں لطف اندوز ہوں۔آپ بھی سنیئے ؎

گئے تھے لے کے جو عزت وہ کھو کے گھر آئے
شریف اپنی شرافت پہ رو کے گھر آئے
یہ کانگریس نہیں سارا ٹھگوں کا ہے بازار
کھرے گئے تھے وہاں کھوٹے ہو کے گھر آئے

کانگریس کی ان ریشہ دوانیوں، اشتعال انگیزیوں اور مسلم دشمنی نے مسلمانانِ ہند کی نیم وا آنکھوں کو کچھ اور تھوڑا کھول دیا۔ وہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ کانگریس سے آئندہ بہتری کی اُمیدیں وابستہ کرنا سخت حماقت ہے۔ مسلمانانِ ہند کے ملی احساسات کو پنڈت جواہر لال نہرو جو اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے، اپنے زعمِ باطل میں نظر انداز کر کے ایک ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے انہیں بعد میں سخت خفت اٹھانی پڑی۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک کرنے کے لئے ایک مسلم عوام رابطہ کمیٹی قائم کی تا کہ چند کانگریسی مسلمانوں کی شب و روز کوشش اور ورغلانے سے مسلم لیگ کا شجر جو جڑیں پکڑ رہا تھا اور آہستہ آہستہ مسٹر جناح کی آبیاری اور ذاتی نگہداشت سے پنپ رہا تھا اور سرسبز ہو رہا تھا، خشک ہو جائے اور وہ کانگریس اور ہندوؤں کے زر خرید غلام بن جائیں۔ مسلمانوں نے اس گہری اور ناپاک سازش کو تاڑ لیا جو اُن میں تفرقہ ڈلوا کر اور انہیں ہمیشہ برسر پیکار رکھ کر ان کو اور مسلم لیگ کو اتنا کمزور کر دے گی کہ وہ کانگریس کے رحم و کرم کے محتاج ہو جائیں گے اور باہمی نزاع کی بدولت ان کی جماعت مسلم لیگ بھی نیست و نابود ہو جائے گی۔ فطرت نے بھی مسلمانوں کو قوتِ استقلال عطا کی ہے، اس لئے کانگریسی پروپیگنڈا کی شدت نے انہیں مسلم لیگ کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے پر اکسایا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک اور ہلاکت آفریں قدم اٹھایا لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ مسلم لیگ کے لئے جاں بخش ثابت ہوا۔ اُنہوں نے شہر احمد آباد میں مزدوروں کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں: ایک برطانیہ اور دوسری کانگریس اور ان ہی کو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ مسلمانوں کے رہنما اور اسلام کے ایک نڈر بے تیغ سپاہی

مسٹرایم اے جناح نے اپنی مالابارہل بمبئی کی اقامت گاہ سے جرأت ایمانی اورحق گوئی کا یہ کہہ کر ثبوت دیا کہ یادرکھو!ایک اورتیسری پارٹی دس کروڑ مسلمانوں پرمشتمل موجود ہے جس کی نمائندگی آل انڈیا مسلم لیگ کرتی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسٹر جناح نے بالکل کھل کر اپنی تیسری پارٹی کا ببانگ دہل اعلان کیا۔

کانگریس زور وشور سے اپنے وزیروں کی پیشانیوں پر قشقہ لگا کر اور پوجا پاٹ کر کے اپنے اکثریت کےصوبوں میں وزارتوں کی گدیوں پرآ بیٹھی۔ وہ حکمرانی کرنے کا سلیقہ صدہابرس کی غلامی کی وجہ سے بھول بیٹھی تھی لیکن انڈین سول سروس کے لوگ جنہیں ہر حاکم کے ساتھ نباہ کرنے کا ملکہ حاصل تھا اور جن میں مٹھی بھر مسلمانوں کے علاوہ باقی سب ہندو تھے ان کے پشت پناہ بن گئے۔ انگریز گورنروں نے برطانیہ کی ہدایت پر ایسی چپ سادھی کہ گویا انہیں سانپ سونگھ گیا۔ عدم مداخلت کی یہ ایک سوچی سمجھی چال تھی۔ ہندو افسروں نے کانگریسی وزراء کوحکومت چلانے کے گر سکھائے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' ان کی حکمرانی کی آتشِ ہوس تیز ہوتی گئی۔ طاقت واقتدار کا جائز وناجائز استعمال ہونے لگا۔ حکومت کا نشہ بھی چڑھنے لگا۔ پرانی دشمنی اور جذبۂ انتقام کی آگ سینوں میں زور سے بھڑکنے لگی اور بیچارے مسلمانوں کو مشقِ ستم بنانے کے لئے سرجوڑ کر منصوبے بنائے گئے کیونکہ وہ ایک طویل عرصہ تک ہندوؤں پرحکومت کر چکے تھے اوراب وہ ہندوؤں اور کانگریسیوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہے تھے۔ انہیں اس کانٹے کو دور کرنا تھا اور اس روڑے کو جو ہندو دھرم اور پورے ہندوستان کو صحیح معنوں میں بھارت ماتا بنانے میں رکاوٹ بن رہا تھا' پاش پاش کر کے باریک باریک ذرّے بنا کر ہٹانا مقصود تھا یا بھارت ماتا کی مٹی میں خلط ملط کر دینا ملحوظ خاطر تھا۔ اس وحشیانہ اورانسانیت سوز منصوبہ کوعملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر حالات کب نصیب ہوتے اور بھلا اس سے بڑھ کر اور کونسا سازگار وقت آسکتا تھا۔ ویسے تو انگریزوں کے دورِحکومت میں کبھی ذبیحہ گاؤ پر' کبھی مسجد کے سامنے باجہ بجانے پر' کبھی شدھی سنگھٹن پر ہندو مسلم فساد ہوا کرتے تھے۔ اب تو انگریز حاکم امن و

امان قائم رکھنے کا ذمہ دار نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے بہت سے اختیارات اور جوابداریاں کانگریس کے حوالہ کر کے بے نیاز ہو گیا تھا اور خاموش تماشائی بن بیٹھا تھا۔

صوبائی انتخابی مہم کو سر کرنے کے لئے نیم جاں و سسکتی ہوئی مسلم لیگ کی کچھ از سر نو تشکیل کر لی گئی تھی اور اس کا ایک نامکمل سا خاکہ بھی تیار کر لیا گیا تھا لیکن دورانِ انتخاب کانگریس کے ساتھ باہمی مفاہمت کی وجہ سے مسلم لیگ زیادہ طاقتور نہ ہو سکی۔ اس کا سب سے بڑا عیاں سبب یہ تھا کہ کسی جماعتی امیدوار کے خلاف مقابلہ ہی نہیں ہوا لیکن مسلم لیگ کی بنیادیں چاہے وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں' ضرور موجود رہیں۔ کانگریس کی عہد شکنی اور مسلم لیگ کو مدغم کرنے کی ناپاک کوشش نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی آنکھوں کو اَور زیادہ کھول دیا۔ وہ مسلمان جو مسلم لیگ کے ہمدرد تھے لیکن دور سے تماشہ دیکھتے تھے' وقت کی پکار اور اپنی بقاء کی خاطر مسلم لیگ میں آن ملے۔ مسلم عوام رابطہ کمیٹی کے بے شمار مسلم اراکین کانگریس کی حقیقی نیت اور ریشہ دوانیوں کا قریب سے مشاہدہ کر کے مسلم لیگ کی صفوں میں آن شریک ہوئے۔ جب مسٹر جناح اور مسلمانوں نے دیکھا کہ صلح جوئی کی کوششیں' سیاسی گتھیوں کو باہمی سعی سے سلجھانے کی پیش کش سب کچھ رائیگاں گئی اور خلیجوں کو پاٹنے کے بجائے کانگریس اپنے ناروا سلوک اور زیادتیوں سے وسیع تر بنا رہی ہے تاکہ وہ قابلِ عبور نہ رہیں تو مسلمانوں کی سیاسی بقاء کو قائم رکھنے کے لئے مسلم لیگ کو مضبوط تر بنانا اور وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق اس کو نئے سانچے میں ڈھالنا لازمی ہو گیا۔

قوم کا شیرازہ تفرقہ بازی' سہل انگاری' عدم فکر' اپنے مستقبل سے بے توجہی اور ماضی کے کارناموں کی رٹ سے بُری طرح بکھر گیا تھا اور جو رہا سہا کسی جگہ جمع ہو گیا تھا تو وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گیا تھا۔ لیڈروں کی کمی نہیں تھی۔ معاذ اللہ! وہ حشرات الارض کی طرح گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ قوم کے سامنے ہمہ گیر نظام نہیں تھا۔ جس کے سینگ جدھر سمائے وہ اُدھر چلا گیا۔ فکرِ دور رَس ماؤف ہو چکی تھی۔ الحاصل ہر سُو ابتری ہی ابتری اور انتشار

ہی انتشار تھا۔ ہمارے رہنما مسٹر جناح بڑے دور بین اور حالات کے ناقد انسان تھے۔ کانگریس کی دور رکھنے اور مسلمانوں کو ختم کرنے والی پالیسی سے انہیں بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ تو ہندو مسلم اتحاد کے بڑے پکے اور سچے علمبردار تھے۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان شیر و شکر کی طرح رہیں۔ لیکن ان کے دوستی کے ہاتھ کو کانگریس نے ہمیشہ جھٹک دیا اور انہیں ہمیشہ پیچھے کی طرف دھکیلتے رہے۔ اب مسٹر جناح کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کریں جس سے مسلمان ہندوؤں اور کانگریس کی دست برد سے محفوظ رہیں اور عزت کے ساتھ زندہ رہیں۔ اس کے لئے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر ایک جھنڈے تلے جمع کریں تاکہ مسلمانوں کی متحدہ کوششوں سے مخالف جماعتوں کا بالخصوص کانگریس کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اس کے لئے لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا گیا۔

جواں بخت و جواں سال راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب والئ ریاست محمود آباد جنہیں اللہ نے وراثت میں ملک و قوم کی خدمت تفویض کی تھی اور مومن کا دلِ دردمند عطا کیا تھا اور جن کے لئے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کرنا مقسوم تھا' تاریخ بنانے کے لئے اپنے چچا مسٹر ایم اے جناح کا جنہیں مہاراجہ صاحب مرحوم بھائی کہا کرتے تھے' ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے جاہ وحشم اور عزت و دولت کے ساتھ میدان میں آ گئے اور وہ ہی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے گہوارہ لکھنؤ میں 1937ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے محرک ہوئے اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو نذر کیا تاکہ مسلم لیگ کا اجلاس کامیاب ہو اور مسلم قوم منظم ہو جائے۔ 80 فی صد سے زیادہ کونسل کے اراکین تا اختتام کانفرنس ان کے مہمان رہے۔ خاندانی روایت کے مطابق مہمانوں کی وہ خاطر تواضع کی گئی کہ ایک مثالی اور تاریخی چیز بن کر رہ گئی۔ ریاست کا تمام عملہ مہمانوں کو آرام پہنچانے اور ان کی دیکھ بھال میں چوبیس گھنٹے مصروف رہتا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہر نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہا۔ یہ جماعت جو چند

خطاب یافتگان اور کرسی نشینوں کی تصور کی جاتی تھی' لکھنؤ میں عوام کی جماعت بن گئی۔ اس میں دو آنہ فیس رکنیت ادا کر کے ایک پان والا' ٹھیلہ والا اور یکے والا راجہ محمود آباد' نواب چھتاری' نواب سر محمد یوسف صاحب اور نواب اسمٰعیل خاں صاحب کا رفیقِ کار بن گیا۔ جب یہ عوامی جماعت ہوگئی تو اس کے صدر مسٹر ایم اے جناح بھی خواص کے زمرہ سے نکل کر عوام کے لیڈر بن گئے یہ انقلابی تبدیلی مسلم لیگ کی کامیاب نشاۃٔ ثانیہ کے لئے ایک فالِ نیک ثابت ہوئی۔ اس شاندار کامیابی کا سہرا ہمارے نوجوان رئیس راجہ محمود آباد کے سر بندھا جو صحیح معنوں میں اس کے حقدار تھے۔

اس ہی شہر لکھنؤ میں مسلمانانِ ہند کا ایک سیاسی محاذ قائم ہوا جس میں سر سکندر حیات خاں صاحب معہ اپنی پارٹی کے شریک ہوئے۔ اَور بھی کئی جماعتوں نے اپنے نمائندوں مولوی فضل الحق صاحب اور سر محمد سعد اللہ کے ذریعہ اشتراکِ عمل کا اعلان کیا۔ یہ بڑی شاندار کامیابی تھی جس نے مخالفین اور کانگریس کے دانت کھٹے کر دیے۔ صحیح معنوں میں لکھنؤ کے آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس نے مسلمانانِ ہند کو ایک پلیٹ فارم' ایک جھنڈا اور ایک لیڈر دیا اور یہاں سے دورِ جناح کا آغاز ہوا اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لی گئی۔ ہم کانگریس کے مرہون منت ہیں کہ اس تنظیم نو کے قیام کی کامیابی میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ اگر وہ مخالفت نہ کرتی تو مسلمان کی حیثیت ہندوستان میں وہی ہوتی جو یورپ میں کچھ عرصہ تک ترک مردِ بیمار کی تھی۔ سچ ہے۔

'عدو شرے برانگیزد کہ خیرے مادر آں باشد'

اجلاس سے واپسی پر ممبران کونسل نے اپنے اپنے صوبوں میں مسلم لیگ کے نیم مردہ جسم میں اپنی تگ و دو اور سعیٔ بلیغ سے اُمید' ہمت' استقلال' اتفاق' یقین محکم اور نظم وضبط کی تازہ روح پھونکی اور عام مسلمانوں نے بڑا حوصلہ افزا اور پر اُمید جواب دیا۔ انہوں نے اپنے مورچے کو صرف سنبھالا ہی نہیں بلکہ اپنے وسیع تجربہ رکھنے والے فرزانہ سیاسی کمانڈر کی وقتاً فوقتاً ہدایتوں پر اُسے بہت مضبوط بنایا۔ وہ ہر حکم پر انتہائی تنظیم کے ساتھ قدم ملا کر آگے کی طرف بڑھے۔ یہ قدم انہیں ایک ایسی منزل کی طرف لے جا رہے تھے جس سے وہ بے خبر تھے لیکن ایک مردِ مومن

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے 1930ء میں الہ آباد میں دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر جہاں ہندو اشنان کر کے (نہا کر) اپنے پاپوں (گناہوں) کو دھوڈالتے ہیں اور پوتر یعنی پاک بن جاتے ہیں، اس منزل کی نشان دہی کی تھی اور اس مہم کو سر کرنے کے لئے ایک سردار کا بھی انتخاب کیا تھا۔ درحقیقت یہ منزل جس کی طرف مسلمان مسٹر جناح کی قیادت میں کشاں کشاں بڑھے جارہے تھے، مشیت کی طرف سے متعین ہوچکی تھی۔

ماہ اپریل 1938ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاسِ خصوصی کلکتہ میں مسٹر ایم اے جناح کی صدارت میں ہوا۔ اس کا خاص مقصد تنظیم نو کو مضبوط کرنا، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، کانگریسی استبداد سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اور حکومتِ برطانیہ سے آئینی مطالبات تسلیم کروانا تھا۔ جیسے ہی اجلاس ختم ہوا، ایک ایسی خبر بد ملی کہ مسلمانانِ ہند سخت رنج وغم میں مبتلا ہوگئے اور خاص طور سے آل انڈیا مسلم لیگ، اس کے ممتاز صدر اور تمام اراکین۔ وہ ہوش ربا خبر علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دائمی مفارقت کے بارے میں تھی۔ علامہ ایک عرصہ سے صاحبِ فراش تھے لیکن ہر شخص یہ آس باندھے ہوئے بیٹھا تھا کہ وہ لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مسٹر جناح بہت زیادہ رنجیدہ خاطر تھے کہ ان کا ایک سچا اور مخلص رفیق ان سے بچھڑ گیا، جس کی موجودگی اس پرآشوب زمانہ میں بالخصوص پنجاب کے لئے ضروری تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ بھی اپنے ایک بہی خواہ، آزمودہ کار، صاحبِ بصیرت، ممتاز رکن کے صائب مشوروں اور جلیل القدر خدمات سے محروم ہوگئی۔

وہ مردِ مومن جس نے اپنی قوم کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا تھا، وہ ان کی بہاریں دیکھے بغیر میٹھی نیند سوگیا۔ جب وہ آسمانِ شعر وسخن پر جلوہ گر ہوا تو کسی نے فلسفی، کسی نے علمبردار انسانیت، کسی نے شاعرِ اسلام اور کسی نے شاعرِ مشرق کے خطابات دیے۔ یہ خطابات اس کی توصیف وتعریف کے صحیح آئینہ دار تھے لیکن اس کے علاوہ وہ ایک نکتہ رس، مدبر اور سیاستدان بھی تھا۔ ابتداً علامہ اقبالؒ کی شاعری ہندوستان کی گھٹی ہوئی فضاؤں اور وطنیت کی تنگ راہوں میں بھٹک کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے مایوس، مبتلائے احساسِ کمتری اور تقدیر پرست مسلمانوں کو اُمید کی مشعل

دکھلائی۔ جوقوم عرصہ ہوا سوگئی تھی، اسے اپنے دل ہلا دینے والے کلامِ بلاغت نظام سے بیدار کر دیا۔ زمانہ کے مدوجزر، برادرانِ وطن کی طوطا چشمی اور مسلم آزاریوں نے اُن پر دوقوموں کے نظریہ کی حقیقت کو روشن کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک نئی آزاد اسلامی مملکت کا تخیل وخاکہ پیش کیا لیکن افسوس، صد افسوس وہ اس دنیاوی زندگی میں اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔ وہ اللہ کے پیارے بندہ اور اس ذات گرامی کے اُمتی وشیدائی تھے جس کا نام لیتے ہی وہ آبدیدہ ہوجاتے۔ ان گہری اور قریبی مناسبتوں نے انہیں بلاشک دانائے راز بنا دیا تھا اور اسی لئے انہوں نے فرمایا تھا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ اقبالؒ کے انتقال پر ملال کے چند مہینوں بعد ماہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں قائداعظمؒ کی زیر صدارت کراچی میں صوبائی مسلم لیگ کانفرنس ہوئی۔ اولاً قائداعظمؒ کے صدر ہونے کی وجہ سے یہ کانفرنس تاریخی بن گئی اور دوئم اپنی کارروائی کے لحاظ سے بہت اہم تھی۔ اہمیت اس لئے حاصل ہوئی کہ حاجی سرعبداللہ ہارون صاحب نے جن کے متعلق اور کسی جگہ ذکر آیا ہے، اپنے خطبۂ استقبالیہ میں دو جداگانہ راہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے متعین کیں جو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان پر ختم ہوتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو یہ تفریق عرصہ سے قائم تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہندوستان کے ریلوے سٹیشنوں پر ''ہندو پانی'' ہندوؤں کے لئے اور ''مسلم پانی'' مسلمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کا علامہ اقبالؒ کا پرانا تخیل جو کہیں دبا دبایا پڑا تھا، اب پھر سے ابھرنے لگا۔ اس تاریخی کانفرنس میں ان ہی خطوط پر ایک تجویز پاس کر کے آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کی گئی کہ وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے

ایک اسکیم بنائے۔ قائداعظمؒ نے صرف اپنی نیک خواہشات ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دعائیں بھی دیں اور مزید برآں اپنی تقریر میں چیکوسلواکیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور اُسکے دورابتلاء کا ذکر کیا اور اس کو تجویز کے جواز اور اسکی تائید میں بطور دلیل پیش کیا۔ لہٰذا قراردادِلاہور جو دو سال بعد پاس ہوئی، دراصل اس کا خاکہ حاجی سرعبداللہ ہارون صاحب کے ایماء پر کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور اس کا سہرا حاجی صاحب اور سندھ صوبائی مسلم لیگ کے سر ہے۔ اس واقعہ سے یہ بات بھی بہت اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ قائداعظمؒ ایک عرصہ سے اس خاکہ کے متعلق سوچ رہے تھے اور قراردادِلاہور ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم تھی۔ قائداعظمؒ کے متعلق اب جبکہ وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، یہ جھوٹا الزام لگانا کہ انہوں نے بے دلی یا سردمہری سے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا یا انہوں نے پاکستان کے مطالبہ کا ڈھونگ رچا کر ایک اشتہاری حرکت کی تھی یا اس مطالبہ کے ذریعہ وہ ہندوؤں اور کانگریس سے سودے بازی کرنا چاہتے تھے، بڑا بہتان ہے۔ یاد رکھئے! قائداعظمؒ کی راست گفتاری اور دیانت داری انشاءاللہ ہر زمانہ میں ہمیشہ چاند اور سورج کی طرح چمکتی رہے گی اور کبھی ماند نہیں پڑے گی اور نہ گہنائے گی۔

اس زمانے میں جنگ عظیم بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ نیتا جی بابو سوبھاش چندر بوس ہٹلر سے جاملے تھے اور جاپان کو اپنا جنگی مرکز بنا کر ہندوستانی فوج کے قوم پرست جذباتی افسروں کو انڈین نیشنل آرمی میں بھرتی کرکے برطانیہ کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ حقیقت میں حالات تو ایسے ہوگئے تھے کہ حکومت برطانیہ کے اقتدار کا آفتاب جو دنیا بھر میں وسیع مقبوضات کی وجہ سے کہیں غروب نہیں ہوتا تھا، ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے ڈوبتا ہوا نظر آرہا تھا اور کانگریس دل سے اس کی خواہاں بھی تھی۔ ان حالات میں ہندو انگریزوں کے ناتے کو توڑ کر نیا رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ بقول مولینا ماہرالقادری صاحب ''اسٹالن وہٹلر پہ زمانہ کی نظر ہے۔''

فتح وشکست آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کانگریس وگاندھی جی یہ حیلہ کرکے کہ حکومت میں ہمارا دخل نہیں ہے، ہم کسی جنگی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے اور نہ ہمارا جنگ سے کوئی تعلق ہے،

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے ۔ صاف الفاظ میں اس حرکت کا دوسرا نام ترکِ موالات تھا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ انگریزوں کی ڈوبتی لٹیا کو ڈبونے کے لئے فوری آزادی کا مطالبہ یعنی ''ہندوستان چھوڑ دو'' اور دھمکی یعنی ''انفرادی سول نافرمانی'' کی تحریکوں کا آغاز کیا گیا۔ پہلی توڑ پھوڑ کی تحریک تھی ۔ سرکاری عمارتیں جلائی گئیں' ریلیں پٹری سے اُتاری گئیں' تار کاٹے گئے الغرض کوئی ایسا تخریبی کام نہیں تھا جسے کانگریس نے نہ کیا ہو۔ دوسری تحریک حکومت کے خلاف سول نافرمانی کر کے اُس کو مفلوج کر دینا تھا۔ کیوں نہ ہو' یہ یقین بھی تو کمال کی حد تک پہنچ چکا تھا کہ جاپان سے نیتا جی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ کلکتہ میں کسی بھی وقت وارد ہو کر ہندوستان کو بس آزاد کرا دیں گے کیونکہ ان کے ہراول کا ایک ہوائی جہاز بہت بلندی سے کلکتہ شہر پر ایک یادواپٹم بم نہیں بلکہ ''اہنسا'' کا بم پھینک چکا تھا جس سے ظاہر ہے کہ کوئی جانی یا مالی نقصان تو نہیں ہوا لیکن ایسی بھگدڑ مچی کہ الامان ۔ بھاگنے والے دولت مند ہندو تھے اور وہ بھی مارواڑی جو مارواڑ کے مقابلہ میں کلکتہ میں بہت زیادہ آباد تھے اور تجارت پر چھا جانے اور سٹہ بازی کی وجہ سے لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے تھے۔ انہیں دولت جان سے زیادہ عزیز تھی' اس لئے بری طرح کلکتہ سے پیٹھ کو پیر لگا کر بھاگے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا اور کلکتہ اس ہی وقت لوٹے جب جاپان کی شکست یقینی اور نیتا جی کی جنگی مہم بری طرح ناکام ہو گئی۔

ہمارے قائداعظمؒ کی قیادت اتنی مستحکم اور ان کی قوم بھی اتنی منظّم ومنضبط اور تربیت یافتہ ہو گئی تھی کہ اس کی نظریں صرف قائداعظمؒ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں ۔ جیسا کہ مولٰینا ماہر القادری نے کہا ہے ۔

''میں مرد مسلماں کی نظر دیکھ رہا ہوں''

اور ان نظروں میں متوقع جاپانی حملہ سے کوئی ہراس پیدا نہیں ہوا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی ڈیفنس کمیٹی نے ہندوستان کا دورہ کر کے دفاعی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کی ۔ مسلمان بھی ''کُلّ اَمر مرہون باوقاتھا'' پر ایمان رکھتے ہوئے اللہ کا نام لے کر امن وامان کے ساتھ اپنے کام

دھندے میں لگے رہے۔ کانگریس کا نعرہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' جب ہندوؤں میں زیادہ زور پکڑنے اور برطانیہ پراثر انداز ہونے لگا تو قائداعظمؒ نے اس نعرہ کوترمیم کے ساتھ اپنایا۔ اُنہوں نے فرمایا۔

''تقسیم کرواور چلے جاؤ۔''

غور فرمایئے کہ ہمارے قائد نے بتائیدایزدی اس محاذ پر بھی کانگریس اور شرارت پسند ہندوؤں کو دندان شکن جواب دیا اور ہنومان راج کوروپ دھارنے نہیں دیا۔
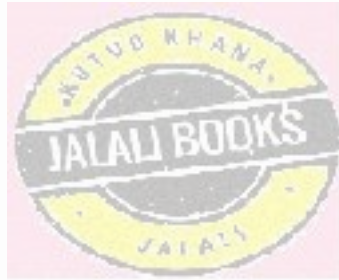
خادمِ کعبہ

غالبًا مجھے کسی کانفرنس کے سلسلہ میں ناگپور طلب کیا گیا تھا۔ جب میں 28 نومبر 1938ء کو دہلی لوٹا تو سٹیشن سے سیدھا اجلاس میں شریک ہونے ایوان پہنچا۔ وہاں انتہائی اندوہناک اور ہوش ربا خبر ملی کہ شب میں حرکت قلب بند ہونے سے مولٰنا شوکت علی جنت کو سدھارے۔ یہ ناقابل تلافی نقصانِ عظیم اور بڑا صدمۂ جانکاہ تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کی زیرِتعمیر عمارت کا ایک مضبوط ستون جو عمارت کو تھامے ہوا تھا' دھڑام سے گر پڑا۔ آپ جانتے ہیں کہ ابتدائی دور میں معدودے چند بااثر سیاستدان مسٹر جناح کے ساتھ تھے۔ ان میں مولانا کا نام نامی سرفہرست تھا۔ ان کے بارے میں کچھ اپنے تاثرات بیان کرتا چلوں تاکہ اس سے نوجوانوں کو اپنے کردار کو بنانے میں مدد ملے۔ کسی جگہ بتلایا گیا ہے کہ مولانا بڑے کھلاڑی تھے۔ یہ ہی سبب تھا کہ وہ ڈسپلن کے قائل تھے اور اپنے رفقائے کار کو بھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ اُنہوں نے جب سے مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا' وہ کہتے تھے کہ میں جناح کا سپاہی ہوں۔ دراصل ان کی یہ بات بزرگی کی علامت تھی۔ کون نہیں جانتا کہ وہ اپنی خدماتِ جلیلہ اور عظیم ایثار وقربانی کی وجہ سے باوجود ایک فرد ہونے کے کسی بڑی سے بڑی جماعت سے کم طاقتور نہیں تھے لیکن ڈسپلن ملاحظہ ہو۔ ایک امریکی صحافی لیگ کے متعلق اُن کا بیان قلم بند کرنے اسمبلی میں آیا۔ امریکہ میں بھی ان کی کافی شہرت تھی کیونکہ انہوں نے وہاں کا دورہ کیا تھا۔ صحافی سے فرمایا کہ کھیل کود کے بارے میں کچھ پوچھو گے تو جواب دوں گا۔ اگر سیاست کے بارے میں کچھ دریافت کرنا ہے تو جناح کے پاس جاؤ۔ وہ میرے لیڈر ہیں۔ صرف وہ ہی سیاست پر بیان دینے کے اہل ہیں۔''

لحیم وشحیم وجسیم تو پہلے ہی سے تھے لیکن آخر زمانے میں چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے میں

تکلیف محسوس کرنے لگے تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے تاکہ بقول علامہ اقبال ''آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز''، تو سربسجود ہو جائیں۔ اسمبلی کی کارروائی کے دوران اگر ظہر وعصر کی نماز کا وقت آ گیا تو اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز ادا کرتے۔ ویسے تو سب پر مہربان تھے لیکن مجھے سب سے زیادہ بزرگانہ شفقت سے نوازا کرتے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ ان کا بستہ سنبھالنے اور ان کا دست شفقت اپنے کندھے پر رکھوا کر ان کی نشست تک یا پارٹی روم تک پہنچانے کے لئے بے چینی سے ایوان کے صدر دروازہ پر انتظار کرتا تھا۔ مجھے آج تک ہر بات یاد ہے۔ خصوصاً ان کے شفقت بھرے ہاتھ کا ہلکا سا بوجھ آج بھی اپنے کندھے پر محسوس کرتا ہوں۔ رواج کے مطابق اراکین اسمبلی اپنے قیام کا بل مہینہ گزر جانے کے بعد پہلے ہفتہ میں وصول کرتے تھے لیکن مولانا کے بل کی وصولی اور ادائیگی ہر ہفتہ ہوتی تھی۔ جب چپراسی غلام حسین بنک سے روپیہ لاتا تو مولانا پارٹی روم میں کئی منی آرڈر لکھتے ہوئے پائے جاتے۔ فرماتے تھے کہ جن لوگوں کا قرض ہے، اس کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔ اللہ اللہ کیسے بزرگ تھے۔ کچھ رقم بچا کر فرماتے تھے: ''نواب'' آج عیاشی کریں گے۔ بہت سستے کا زمانہ تھا فوراً حلوائی کی دکان سے مٹی کی ہنڈیا میں دو روپے کے رس گلے منگوا کر جتنے مسلم لیگی ممبر موجود ہوتے، ان کو خوش ہو کر کھلواتے، خود نہ کھاتے لیکن ہنڈیا کو منہ سے لگا کر تمام شیرہ غٹ غٹ پی جاتے۔ یہ یاد رہے کہ مولانا ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ ہر وقت کوشش کرتے تھے کہ رس گلے کھلانے کے بعد مہینہ میں کم از کم دس روپے بچالیں اور جب ایسا خوش نصیب دن آتا تو اس دن گویا ان کی عید ہوتی تھی۔ انگریزی کی اچھی تصویریں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ تنہا نہیں جاتے تھے۔ اس بڑی عیاشی میں حاجی ستار سیٹھ صاحب اور راقم الحروف کو ضرور شریک کرتے۔

اراکین اسمبلی کو لازمی طور پر وائسرائے کی پارٹیوں کی دعوت ملا کرتی اور ہم لوگ شرکت کیا کرتے تھے۔ مولٰنا کی اپنے عقیدتمندوں کو دو باتوں کی سخت تاکید تھی کہ دورانِ پارٹی عصر و مغرب کی نماز کا وقت آ جائے تو ہمارے ساتھ چل کر ضرور نماز پڑھا کرو۔ اس سے غیر

مسلمین کے سامنے اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس پر ان کے چاہنے والوں کا الحمدللہ سختی سے عمل تھا۔ دوسرا حکم یہ تھا کہ جب تمہیں سگار پیش کیا جائے تو بغیر جھجک کے لے لو اور اپنے جیب میں حفاظت سے رکھ لو۔ مولٰینا کو سگار کا بہت شوق تھا۔ پارٹی کے اختتام پر ہم سب سگار پیش کر دیتے۔ یہاں تک کہ مولوی سید مرتضٰی صاحب بہادر جیسے بزرگ اور لائل پور والے حافظ محمد عبداللہ صاحب بھی اپنی جیبوں سے سگار نکال کر مولٰینا کو دیتے اور رہے سہے لوگوں سے میں تفویض کردہ فرض کے تحت ان کے لئے وصول کرتا۔ مولٰینا اپنے ساتھیوں اور اپنے چھوٹوں کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ سب کے ساتھ انتہائی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مولٰینا ساگر (سی پی) کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی اُمیدوار کی حمایت کے لئے تشریف لائے۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ اچانک خاموش ہو گئے۔ ٹکٹکی باندھے ہوئے ایک جانب کافی فاصلے پر دیکھنے لگے اور دفعتاً کسی کا نام لے کر پکارا۔ وہ صاحب لپک کر سٹیج کی طرف دوڑے۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ جب وہ مولٰینا محمد علی کے ساتھ چھندواڑہ میں نظر بند تھے' اس وقت یہ صاحب ان دونوں بھائیوں کی بہت خدمت کیا کرتے تھے۔ اللہ اللہ کیسے شفیق بزرگ تھے۔ اگر شمع لے کر قیامت تک ایسے بزرگوں کی تلاش کی جائے تو مل نہیں سکتے۔ خود کو انہوں نے سپاہی کہا تھا اور اس لئے احساس فرض اتنا تھا کہ آخری سانسوں تک قوم و ملک کی خدمت کرتے رہے۔ جس دن اللہ کے پاس گئے' اس دن آسام میں ایک ضمنی انتخاب کی مہم سر کرنے جانے والے تھے جہاں مسلم لیگی امیدوار کھڑا کیا گیا تھا۔ مسٹر جناح کا سپاہی جو خود ایک بڑا جنرل تھا' ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کی واحد کوشش سے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے قریب حضرت سرمد شہیدؒ اور حضرت ہرے بھرے صاحبؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ واللہ وہ جب تک دنیا میں جئے' بڑے کہلائے اور جب اٹھیں گے تو انشاءاللہ بڑوں کے زمرہ میں ہوں گے۔

وہ اُٹھ گیا جو پیکرِ احساس و درد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سلطان العلوم

انجمن ترقی اُردو نے عرصۂ دراز سے اُردو زبان کی حفاظت، بقا اور ترویج و ترقی کے لئے ایسے ایسے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں کہ انسان کا کمزور حافظہ بھی اس کو بھلا نہیں سکتا۔ احسان شناسی و اعتراف خدمات کا تقاضہ ہے کہ اس کی کم از کم مختصر ہی سہی، تاریخ بیان کی جائے۔ دراصل اس انجمن کو 1903ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے قائم کیا تھا اور اُس وقت سے اس کا ایک ہی نصب العین تھا یعنی اُردو زبان کی خدمت اور فروغ۔ اس کے معتمد اعزازی مولانا شبلی نعمانی صاحب، مولوی حبیب الرحمان خان صاحب شروانی اور عزیز مرزا صاحب تھے۔ آخر الذکر کی وفات کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے 1913ء سے اس خالی جگہ کو پُر کیا اور تا زیست یعنی 16 اگست 1961ء تک معتمد اعزازی رہے۔

یہ ادارہ جب تک یو پی کی سرزمین میں رہا جو علم و ادب کا گہوارہ تھا اور جسے گھن لگنا شروع ہو گیا تھا، زیادہ ترقی نہ کر سکا لیکن جب اس کا دائرۂ عمل منتقل ہو کر حیدرآباد کی علم خیز اور مردم پرور سرزمین میں آیا جس کے متعلق خود اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔

سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس سرزمین میں یہ ادارہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا کیونکہ اعلیٰ حضرت جو اپنی بے بہا علمی خدمات کی وجہ سے سلطان العلوم کہلاتے تھے، اس کے سرپرست اعلیٰ بن گئے۔ ان کا خزانہ دولتِ قدردانی اور حوصلہ افزائی سے بھرا ہوا تھا اور جب کہ مولوی عبدالحق صاحب کے جیسا مخلص، دھن کا پکا، مستعد اور اَن تھک محنت کرنے والا انسان مل جائے تو وہ کیونکر فیضِ خسروانہ سے

محروم رہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیجا نہ ہوگا جبکہ میں اعلیٰ حضرت کی شاہانہ فیاضی کا ذکر کر رہا ہوں تو ان کی ذات کے متعلق جو رکیک حملہ کیا گیا ہے' اس کا جواب دوں۔ الزام یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت بہت کنجوس اور خراچ تھے۔ عقل سلیم بتلاتی ہے کہ انسان بیک وقت خسیس اور فیاض نہیں ہوسکتا۔ دنیا کہتی ہے اور اس کے جیتے جاگتے عملی ثبوت اور شہادتیں موجود ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی زندگی میں کروڑ ہا روپیہ مساجد کی تعمیر' تعلیمی اداروں کی شاہانہ مالی امداد' ذہین طلباء کے وظائف' مقامات مقدسہ میں حجاج اور زائرین کے آرام کے لئے رُباط کا قیام' خراب وخستہ حال ادیبوں' شاعروں اور عالموں کا وظیفہ مقرر کر کے اور معاشرتی شعبۂ حیات کی کئی مدوں پر نہایت وسعت قلب سے خرچ وصرف کیا۔ یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں جن کی بنا پر انہیں حاتمِ ثانی کہیں تو بجا ہوگا۔ کیا ایسے شخص کو آپ فضول خرچ کہہ سکتے ہیں؟ دوسروں کی طرح مجھے بھی ذاتی علم ہے کہ وہ اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کرتے تھے۔ اُن کی غذا اور ان کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا اور وہ تکلیف دہ حد تک سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کیا ہماری تاریخ میں ایسی بیشمار مثالیں موجود نہیں ہیں جن میں سے میں صرف تین مثالیں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کیا حضرت عمر فاروقؓ گاڑھے کا پیوند لگا کرتہ پہن کر پاپیادہ غلام کو اونٹ پر بٹھا کر دمشق میں داخل نہیں ہوئے تھے؟ کیا امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا ٹوپی بنانا ذریعۂ معاش نہ تھا۔

پاکستانی قوم کو یاد رکھنا چاہئے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد جب ہم کوڑی کوڑی کو محتاج تھے تو اعلیٰ حضرت نے ہمیں بیس کروڑ روپے عطا کئے تھے۔ یہ واقعہ کہیں راز بن کر نہ رہ جائے' اس لئے اس کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب پاکستان بنا' اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی مالی حالت یہ تھی کہ اس کے پاس اپنے ملازمین کو تنخواہ دینے کے لئے ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ حکومتِ ہند اگر اپنے قول وقرار کا احترام کرتی تو ریزرو بنک آف انڈیا کے اثاثہ کی تقسیم کے بعد حکومت پاکستان کو اس کے حصہ کا ستاون کروڑ روپیہ مل جاتا اور ہماری مالی حالت ایسی ناگفتہ بہ نہ ہوتی لیکن حکومت ہند اور بالخصوص سردار ولبھ بھائی پٹیل کی ہلاکو خانی ذہنیت کی یہ سوچی سمجھی ہوئی چال تھی کہ رقم کی ادائیگی میں اتنی زیادہ تاخیر کی جائے کہ پاکستان خود

بخود ختم ہو جائے۔ جب قائداعظمؒ کے بیدار دماغ نے اس تباہ کن سازش کو بھانپ لیا تو انہوں نے اعلیٰ حضرت نظام دکن سے ذاتی طور پر گزارش کی کہ فوراً مالی امداد فرما کر پاکستان کو نیست و نابود ہونے سے بچا لیجئے۔ نظام نے صدر اعظم میر لائق علی صاحب کو طلب فرما کر مشورہ کیا اور ان سے دریافت فرمایا کہ کتنی رقم دی جائے۔ میر صاحب نے دس کروڑ روپیہ کی سفارش کی جسے نظام نے ناکافی سمجھ کر اپنی خوشی سے بیس کروڑ روپیہ کی رقم عطا کی۔ اس خسروانہ بخشش کی وجہ سے ہندوستان کا سوچا سمجھا منصوبہ خاک میں مل گیا اور وہ واجب الادا رقم یعنی ستاون کروڑ روپیہ ادا کرنے پر مجبور ہو گیا لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ سیدھی انگلی سے کبھی گھی نہیں نکلتا۔ مہاتما گاندھی جو بڑے گیانی اور سیانے آدمی تھے' انہوں نے دیکھا کہ بیس کروڑ روپیہ کی وصولی کے بعد پاکستان کے ختم ہونے کا ایک رمق برابر بھی امکان نہیں رہا' اس لئے اس کا حصہ ادا کر کے مزید ملامت سے بچ کر دنیا والوں کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے سردار پٹیل سے کانا پھوسی کی جنہوں نے بظاہر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مہاتما گاندھی ہر اُس موقعہ کا فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے تھے جس کی نشر و اشاعت غیر ملکوں میں ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے محض دکھاوے کے لئے اپنا آخری حربہ استعمال کیا یعنی نقلی مرن برت رکھ لیا اور اس طرح پاکستان کو ستاون کروڑ روپیہ دیر سویر سے مل ہی گئے۔ ہمارا تو کام بن گیا لیکن اس کا بھی آپ کو کچھ احساس ہے کہ ہمارے محسن (نظام) پر کیا آن پڑی۔ اُن سے کئی اقساط اور مختلف اوقات میں انتقام لیا گیا اور حیدر آباد کے مکمل زوال کے بعد اس انتقامی جذبہ کو عامتہ المسلمین کی طرف موڑ دیا گیا۔

میں نے میر لائق علی صاحب کا اوپر کی سطروں میں حوالہ دیا ہے۔ صرف ان کا نام لینا ہی کافی نہیں سمجھتا ہوں جب تک کہ ان کا کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ جب وہ اعجاز خیز طریقہ سے حیدر آباد سے بچ کر ہمارے ملک میں تشریف لائے' اس وقت نوابزادہ پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے میر صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں اور تجربات کا مشیر وزارتِ دفاع مقرر کر کے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تعمیل قواعد میں ان کا ایک روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا گیا تھا۔ آج کل اُن کے جیسے

اتنے بڑے صنعت کار، مدبّر اور رموزِ حکمرانی کے ماہر جیکب آباد جیسے سخت گرمی والے خطہ میں کاشتکاری کر کے غلہ اگاؤ کی مہم کو کامیاب بنا رہے ہیں۔ خود غرض اور اقتدار کے بھوکے لوگ جو کرسیوں سے چپک کر رہنا چاہتے ہیں ہمیشہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں ہم سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے اور ہم بہترین عطیۂ فطرت ہیں۔ میر صاحب جیسے کئی بزرگ اپنی عزت کو سنبھالے ہوئے کونے میں پڑے ہیں اور سسکیاں لے لے کر دعائے خیر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ایک اور احسان کا بوجھ ہم پاکستانیوں پر ہے۔ زوال حیدرآباد کے بعد جب مہاجرین اور حیدرآباد کے باشندوں نے پاکستان کا رخ کیا' اُس وقت حیدرآباد بنک اور اس کی کراچی شاخ نے نو واردوں کو اقتصادی بربادی سے بچالیا۔ بتلایئے ہم کس کس بات اور کس کس کا شکریہ ادا کریں۔ ہمارے دل تو احسان سے لبریز ہیں اور ان سے ہمیشہ خاموش دعائیں نکل کر عرشِ اعظم تک پہنچتی ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کی ہمہ تن مشغولیت' سعیٔ پیہم اور اعلیٰ حضرت کی داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ انجمن ترقیٔ اُردو نے اسّی سے زیادہ کتابیں شائع کیں جو زیادہ تر تاریخ و ادب پر مبنی ہیں۔ اُردو کی نایاب کتابوں کے قلمی نسخے بھی حاصل کئے۔ دو ایک رسالے بھی جاری کئے گئے۔ اعلیٰ حضرت کی گہری دلچسپی اور انجمن ترقیٔ اُردو کی کارگزاری کو دیکھ کر چند علم دوست' ادب نواز اور قدردان رؤسا کی بھی اس پر نظرِ کرم پڑی۔ ان میں خاص طور پر نواب عماد الملک نواب مسعود جنگ بہادر' مہاراجہ سر کشن پرشاد' راجہ پرتاب گیر نرسنگھ گیر جی بہادر' نواب سالار جنگ بہادر' نواب لطف الدولہ بہادر قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو کی خوش نصیبی سے اب تو ہن برس رہا تھا۔ اس طرح مولوی صاحب کی کامیاب کوششوں کے بدولت انجمن ترقیٔ اُردو روپیہ کی طرف سے بے نیاز ہوگئی اور اس کے پاس 1932ء تک تقریباً چالیس ہزار روپیہ کا مستقل سرمایہ جمع ہوگیا۔

اُردو

میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کانگریس نے حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد مسلمانانِ ہند کو زیر اور تباہ کرنے کے لئے چند محاذ قائم کئے۔ان میں سے لسانی محاذ بہت اہم اور سنگین تھا جس کے پردہ میں مسلمانوں کی کلچرل، مذہبی و ثقافتی تباہی مقصود تھی۔اب اُردو کو مٹانے کی مختلف ترکیبیں کی گئیں جن کا مناسب موقعہ و محل پر ذکر کیا جائے گا۔اُردو سے دشمنی کے کئی اسباب تھے حالانکہ یہ زبان ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک ہر حصہ میں، ہر طبقہ میں کثرت سے بولی، سمجھی اور سمجھانے کا ذریعہ تھی۔ہندوستانی افواج اور انگریز فوجی افسروں میں یہ ہی گفتگو کا واحد ذریعہ رہی۔الغرض مرطوب آب وہوا والی راس کماری سے گل بداماں جنت نشاں کشمیر تک اور بلوچستان کے سنگلاخ کوہستانی علاقہ سے برما کے گھنے جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں تک اس ہی زبان میں بات چیت کی جاتی تھی۔یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ذرا ہندوستان کی حدود سے باہر نکلیے اور دیکھئے کہ غیر ملکوں میں بھی یہ زبان بہت زیادہ مقبول اور عام ہے۔یہ سب کچھ ہوتے ہوئے آخر اس کی بیخ کنی اور عناد کا کیا سبب تھا۔ہندو اور کانگریس کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے تھے۔ہندوؤں نے تعصب کی عینک لگا کر دیکھا تو انہیں یہ نظر آیا کہ یہ زبان ہر چھوٹے بڑے مسلمان کی قومی زبان ہے۔اس میں افسانوں، قصوں کہانیوں اور اشعار کے علاوہ مسلمانوں کا تمام مذہبی لٹریچر ہے۔دراصل یہ زبان مسلمان فاتحین کے میل جول کا نتیجہ تھی جنہوں نے ہندو راجاؤں کی حکومتوں کو مغلوب اور پورے ہندوستان پر قبضہ کر کے اسلامی حکومتیں قائم کی تھیں۔جب ہندوؤں نے انگریزوں کے دورِ حکومت اور اپنے دورِ غلامی میں مشاہدہ کیا کہ انگریز فاتح نے اپنی انگریزی زبان کے ذریعہ ذہنی طور پر انہیں غلام بنالیا ہے اور عیسائیت کا بے دھڑک

پرچار کر رہا ہے تو انہیں حاکم بننے پر یہ تمام ہتھکنڈے سوجھے لیکن انہوں نے بڑے بھونڈے طریقے اختیار کئے اور ہر وقت اوچھے حربے استعمال کئے۔

اب ہمیں بہت سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ہے کہ یہ زبان کیسے بنی' کس نے بنائی اور کیونکر ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہلائی۔ اگر چہ اس موضوع پر بہت کچھ تحقیقات ہو چکی ہے اور متعدد مستند کتابیں لکھی گئی ہیں تاہم میں باریکیوں میں نہ جاتے ہوئے چند موٹی موٹی باتیں عرض کروں گا۔ درحقیقت اس کی ابتدا جیسا کہ کہا جاتا ہے' مہاتما گوتم بدھ کے زمانہ سے ہوئی اور اس کی داغ بیل پڑی۔ تاریخ بین حضرات اور مسلمان خصوصاً اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب اسلام تیزی کے ساتھ دنیا میں پھیلنے لگا تو تجارت کو بھی بہت فروغ ہوا کیونکہ یہ تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ تجارت کے ذریعہ صرف روزی ہی نہیں کمائی جاتی تھی بلکہ اپنے ہر قول و فعل سے ثابت کیا جاتا تھا کہ اسلام کی کیا تعلیم ہے اور مسلمان کیا ہوتا ہے۔ تجارت کرنے آ تو گئے لیکن ملک کے رہنے والوں کی زبان' رہن سہن اور رسم و رواج سے نابلد' ان ناہموار حالات میں کس طرح تجارت و تبلیغ کرتے۔ شروع میں تو عرب تاجر ہندوستان کے ساحل پر آ کر عربستان کی چیزیں فروخت کرتے اور ہندوستان سے کچھ چیزیں خرید کر عربستان واپس چلے جاتے۔ اس زمانہ میں برج بھاشا ہندوستان کی ملکی زبان تھی۔ کچھ عرصہ تک آنکھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے کام چلایا۔ پھر ایک لفظ عربی کا یہاں اور وہاں بولا گیا اور برج بھاشا کا ایک لفظ یہاں سے اور وہاں سے اپنایا گیا۔ جیسا جیسا میل جوڑ بڑھتا گیا' تجارت کی اجناس کے تبادلہ کے ساتھ عربی اور برج بھاشا کے الفاظ بھی تبادلے میں لئے اور دیے جانے لگے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب مسلم فاتحین نے ہندوستان کا رُخ کیا تو ان کی معیت میں یا ہندوستان کے فتح ہو جانے کے بعد یا اُس سے قبل صرف تبلیغِ اسلام کے لئے اس ظلمت کدۂ کفر میں بزرگانِ دین کفر کی گہری تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے اپنے اولین اور آخری' زندگی کے اہم ترین تبلیغی مشن پر نورِ اسلام کی مشعلیں لئے ہوئے آن وارد ہوئے۔ ان بزرگوں کے لئے لازمی ہو گیا کہ تبلیغ اسلام اور پیغمبر

آخرالزماںؐ کے آخری پیغام کو بت پرستوں تک پہنچانے اور انہیں حلقہ بگوش اسلام کرنے کے لئے ایسی زبان میں ترجمانی کریں جو عام فہم ہو اور گوشہ گوشہ میں پہنچ جائے۔ چنانچہ اس لسانی و مذہبی خدمت کا بھی سہرا اُردو کے سر رہا۔ اس ضمن میں بالخصوص حضرت امیر خسروؒ نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے بھی اُردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی۔ ہم اپنے ان بزرگوں اور مبلغینِ اسلام کی اس ابتدائی و ارتقائی منزل میں اُردو نوازی کو اُردو کی ترویج و ترقی میں ایک ٹھوس تعمیری اقدام سمجھتے ہیں۔

جب غازی محمد بن قاسم سندھ کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے اور مسلمانوں کی حکومت قائم کر کے چلے گئے جو تقریباً دو سو سال تک قائم رہی تو سندھ میں جو زبان رائج تھی، اس نے عربی رسم الخط کو اپنا لیا اور کتنے ہی صوفی منش لوگ اور کتنے ہی چوٹی کے صوفی شعرا پیدا ہوئے جن کے کلام کی مقبولیت ابھی تک برابر بڑھتی جا رہی ہے اور اس نے انہیں زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ہندوستان پر چنگیز خاں نے حملہ کیا اور مال و دولت لوٹ کھسوٹ کر چلتا بنا لیکن ترکی کے الفاظ کا خزانہ چھوڑ گیا جس کے خلط ملط سے ایک نئی زبان بنی جس کا نام اُردو ہوا جو خود ایک ترکی لفظ ہے۔ جب بت فروش نہیں بلکہ بت شکن غازی محمود غزنویؒ ایاز کے ساتھ تشریف لائے تو اپنی معیت میں فارسی بھی لائے۔ خود تو ضرور چلے گئے لیکن ایاز اور فارسی کو مستقلاً چھوڑ گئے۔ یورپ کی قوموں نے جب ہندوستان کا رخ کیا تو ان کے دوران قیام ان کی زبانوں کے کچھ الفاظ اس نئی زبان میں جو جنم لے رہی تھی، گھل مل گئے۔ الغرض اس طرح اُردو کی داغ بیل پڑی اور دورِ شاہجہانی میں ان تمام زبانوں کے میل جول سے ایک کھچڑی زبان ادبی صورت اختیار کر گئی اور مختلف ناموں سے پکاری جانے لگی۔ مثلاً (1) دہلوی (2) زبان ہندوستانی (3) ہندوی (4) ہندی (5) ریختہ اور ہندوستانی وغیرہ لیکن آخر میں اُردو نام بہت سندر ہونے کی وجہ سے زبان زدِ خلائق ہوا۔

حال ہی میں ایک پی ایچ ڈی صاحب کی دو عالمانہ تقریریں سنیں۔ دونوں سیاسی

تقریریں تھیں لیکن آخرالذکر کا تعلق اُردو زبان سے تھا۔ دونوں تقریریں محققانہ اور بلند پایہ تھیں۔ دوسری تقریر کے اختتام پر حسبِ رواج سوال پوچھنے کو کہا گیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ ہندی زبان اُردو پر کس حد تک اثر انداز ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مختصر سا جواب دیا کہ چونکہ اُردو عربی اور فارسی کی پیداوار ہے' اس لئے اُردو میں ہندی کے بہت کم الفاظ ہیں۔ یہ جواب سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ جس زبان کی سرزمین ہندوستان میں تخلیق ہوئی اور جس کے تمام افعال اور اضافتیں بھی خالص ہندی ہیں' اس میں بقول فاضل مقرر ہندوستان کی زبانوں کے الفاظ نے بہت کم جگہ پائی۔ اگر یہ دلیل صحیح ہے یا تھی تو بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو تسلیم کر لینا چاہئے تھا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے کیونکہ اس میں کثرت سے فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں اور اس لئے بھی اُردو کو ہندوؤں کے سر زبردستی تھوپنا نہ چاہئے تھا۔ علاوہ ازیں آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو' ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور پنڈت برج نارائن دتاتریہ کیفی علی الترتیب صدر' معتمد اور شریک معتمد کل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کا یہ دعویٰ باطل تھا کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کو ورثہ میں ملی ہے اور وہ ان کی مشترکہ زبان ہے۔ لائق استاد کا بسیط علم بدنصیبی سے اُن پر محیط نہیں ہے' اس لئے وہ لاعلمی میں بہک گئے۔ بغیر مطالعہ و سوچے سمجھے ایسے اہم و دقیق مسئلہ پر عامیانہ اظہار رائے کرنا جس کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں اور جس کے وجود سے حکومت برطانیہ اور کانگریس نے کبھی انکار نہیں کیا' یہ موجودہ نسل اور ان لوگوں کے ساتھ جو لاعلمی میں گرفتار ہیں' بڑا ظلم ہے اور خصوصاً ان کے ساتھ جنہوں نے اس تحریک میں زبانی' قلمی اور علمی جہاد کیا ہے' اعترافِ احسان فراموشی ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نکتہ چینوں اور معترضین کی غلط فہمیاں پیدا کرنے والے بیجا اعتراضات کا جواب دے کر اپنے ذاتی علم اور اُردو زبان کے ساتھ بے پناہ لگاؤ کی بنا پر خامہ فرسائی کی جائے تاکہ آئندہ اِس قسم کے سوالات نہ اٹھائے جائیں۔ میں اس ضمن میں کل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کی اس ناقدانہ تحقیق کا سہارا لے رہا ہوں جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی زیر

سرکردگی کی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی نقاد اس سے مطمئن نہ ہو تو اسے اختیار ہے کہ وہ از سر نو تحقیق کرے اور اپنا نقطۂ نظر اُردو دانوں کے سامنے پیش کر کے منوالے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جاتا ہے' اس وقت تک پرانی تحقیق حرفِ آخر سمجھی جائے گی۔ میں اس کا ماٴخذ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ آسانی سے سمجھ سکیں کہ اُردو کے گھر کو جوڑھانے کی بے سود کوشش کی گئی' وہ تعمیری نہیں بلکہ تخریبی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُردو' ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور چونکہ اس کی تخلیق برج بھاشا اور دیگر پراکرت سے ہوئی ہے' لہٰذا اس پر ہندی بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔ اپنی اس دلیل کے جواز میں فرہنگِ آصفیہ بطور شہادت پیش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' فرہنگِ آصفیہ ہندوستانی (اُردو) کی ایک مستند لغت ہے۔ اس کے گہرے مطالعہ کے بعد اعداد و شمار کا صحیح پتہ لگتا ہے کہ اس لغت میں کل 54,014 الفاظ ہیں جن کی زبان وار حسب ذیل تفصیل ہے:-

1- ہندی 22,198
2- عربی 7,589
3- فارسی 6,041
4- انگریزی 500
5- پرتگالی' ترکی' فرانسیسی وغیرہ 181
6- ملے جلے 17,505
کل 54,014

عربی' فارسی اور بھاشا کے چند مرکب الفاظ نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں مثلاً امام باڑہ' جگت استاد جواہر لال' لٹک دار' کٹ مُلاّ' چال باز' جیب کترا وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ دیگر زبانوں کے الفاظ ہندی میں کتنے گھل مل گئے تھے۔ اس ہی زبان کی ہمہ گیری' مقبولیت اور افادیت کے متعلق اسدؔ ملتانی مرحوم نے چند شعر کہے ہیں جن سے آپ ضرور محظوظ ہوں گے۔

وہ زباں ہے یہی اُردو ، یہی ہندوستانی
جس میں کر سکتے ہیں آزاؔد سے باتیں نہرو
یہی میداں ہے جہاں مولوی عبدالحق کا
ساتھ دے سکتے ہیں سرتیج بہادر سپرو
آج بھی آشتیِ شیخ و برہمن کا اسدؔ
ہے اگر کوئی ذریعہ تو زبانِ اُردو

☆☆☆☆☆

ڈان

آل انڈیا مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کی ترویج' قائداعظمؒ کے بیانات و تقاریر' مجلسِ عاملہ کی کارروائیاں اور صوبہ مسلم لیگوں کی کارگزاریوں وغیرہ کی نشرواشاعت ہندوستان کا پریس جو کلیتہً ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا اور جو روزِ اوّل سے ہی مسلمانانِ ہند کا بدترین دشمن تھا کیونکر کرتا۔ مسلمانوں کا پریس نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا حالانکہ چند ہفتہ وار انگریزی پرچے مثلاً اسٹار آف انڈیا' ایسٹرن ٹائمز' ڈکن ٹائمز وغیرہ یا دلی کے اور باہر کے چند اُردو روزنامے الامان' جنگ' انجام' عصرِ جدید' خلافت' زمیندار' انقلاب وغیرہ ہندوستان کے وسیع طول و عرض میں آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ قائداعظمؒ نے اس تباہ کن خلا کو پُر کرنے کے لئے فوری فیصلہ کیا کہ انگریزی کا کم از کم ایک ہفتہ وار اخبار نکالا جائے جو آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان ہو۔ اس کا نام ''ڈان'' رکھا گیا۔ قائداعظمؒ کے دست راست نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب نے اس کے اجراء میں سرگرم دلچسپی لے کر دلی سے ایک صبح ''ڈان'' شائع کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخی' بنیادی اور ٹھوس خدمت انجام دی۔ پہلا اداریہ لکھ کر وہ ڈان کے سب سے پہلے اعزازی ایڈیٹر کہلائے۔ تنخواہ دار ایڈیٹر کی تلاش و تقرری ضروری تھی۔ یوں تو صحافت کے میدان میں بھی اِکے دُکے مسلمان صحافی کے سوا مسلمان بہت پیچھے تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ٹراونکور کے ایک عیسائی صحافی مسٹر پوتھن جوزف کا عارضی انتخاب کیا گیا۔ ان کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ بغیر شراب پیئے ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے تھے اور اس لئے وہ رات دن شراب کے نشہ میں دھت رہتے تھے لیکن ان کا یہ کمال تھا کہ وہ جتنی زیادہ شراب پیتے' اتنا ہی اچھا اداریہ لکھتے۔ کئی دن تک ان کے ساتھ سودا بازی ہوتی رہی۔ ان کی پریشانی صرف اتنی تھی کہ انہیں

اتنی رقم دی جائے کہ وہ اپنی دوزخ کی تشنگی کو جام پر جام چڑھا کر بجھا سکیں لیکن ان کی یہ ایسی بلانوش پیاس تھی جو کبھی بجھ نہ سکی۔ بقول شخصے

''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

وہ عجیب وغریب اہلِ قلم' صاحبِ دماغ لیکن بے اصولے انسان تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت میں ایسے ایسے اداریے لکھے کہ کانگریس اور ہندو پریس تلملا کر چیخ اٹھا۔ مسلم لیگ کا گزر اس مشرب کے آدمی کے ساتھ جس کا مقصدِ حیات صرف 'جام پر جام دیے جا ساقی'' ہو' کب تک ہوتا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب کہ حکومتِ ہند نے اسے زیادہ داموں میں خرید کر مئے ناب میں بالکل غرق کر دیا۔ مسلم لیگ کی بھی جان بچی اور مسلسل تشویش دور ہوگئی کہ یہ آدمی کسی وقت بھی مسلم لیگ کو چرکا دے کر اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ درحقیقت یہ آدمی جب چاہتا' صحافت کی بلند چوٹی پر چڑھ جاتا اور فوراً ہی اگر اس کو بڑا لالچ دیا جاتا تو وہ قعرِ مذلّت میں گر پڑتا یعنی وہ اپنے قلم کو جدھر چاہتا موڑ دیتا۔ وہ بیک وقت حمایت ومخالفت میں بہترین اداریہ لکھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ عرفِ عام میں بے پیندے کا لوٹا یا بھاڑے کا ٹٹو تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہوتا اور وہ اپنوں اور بیگانوں کی نظروں میں ہمیشہ ذلیل رہتا ہے۔ المختصر آل انڈیا مسلم لیگ کا کچھ بھی نہیں بگڑا کیونکہ اسے اپنے خریدے ہوئے یار کی خریدی ہوئی یاری سے غرض تھی۔

اللہ کے فضل کو دیکھئے کہ اس نے اس جگہ کو پُر کرنے کے لئے ایک بہترین اعلیٰ دماغ صحافی عطا کیا جو حب الوطنی' عقیدت مندی' جذبہ' خلوص اور خدمت میں یکتا تھا اور اس کا نام نامی الطاف حسین تھا۔ وہ ''شاہد'' اور ''عین الملک'' کے قلمی ناموں سے مسلمانوں کی تائید میں مضامین لکھ کر ہندوؤں اور کانگریس کی پول کھولتا تھا۔ اس نے قائداعظمؒ کی آواز پر سرکاری ملازمت کو لات مار کر لبیک کہتے ہوئے ڈان کے ایڈیٹر کی جگہ سنبھالی اور قائداعظمؒ کے حکم سے اور ان کی ہدایت پر مسلمانوں کی خدمت کرنے کے لئے فنافی الڈان'' ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کے جذبات' اشارات وارشادات کی بدرجۂ اتم ترجمانی کر کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنا گھر بنالیا۔ الطاف نگر کراچی میں ابدی استراحت فرمانے والے الطاف حسین اللہ تیرے مرقد پر نور برسائے۔ (آمین)

راکشسی راج

ہولی سی آ کے باغ میں کھیلی چلی گئی
دو روز خوب رنگ اچھالا بہار نے

(ناطقؔ گلاوٹھوو)

یقین کیجئے کہ یہ کوئی من گھڑت افسانہ یا قصہ کہانی نہیں ہے بلکہ یہ کانگریس کے مظالم کی دل خراش داستان ہے۔ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ان واقعات کو دیکھا یا کانوں سے سنا' اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس کا ذکر منافرت پھیلانے یا مزید دشمنی پیدا کرنے کے لئے نہیں کیا جا رہا ہے کیونکہ ہندوستان میں نیک ہندو اور ہندوستانی بھی بستے ہیں لیکن بدنصیبی سے ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ شر پسندوں کو روک سکتے اور اگر چند نے آواز اٹھائی بھی تو وہ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

موجودہ پاکستانی نسل اپنے ہولناک ماضی اور اپنے بزرگوں کی مشکلات' مصیبتیں' مظلومیت اور قیامِ پاکستان کی اشد ضرورت سے اس حد تک واقف نہیں ہے جتنا کہ اُسے ہونا چاہئے تھا۔ اکثر پاکستانی نوجوانوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ بلاوجہ ہندوستان کی تقسیم کرائی گئی جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ چند پرانے لوگ بھی جن کا مسلم لیگ سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا اور جنہوں نے سوائے اپنی یا سرکار کی خدمت کے کبھی بھول کر بھی کوئی قومی خدمت انجام نہیں دی اور جو ہم سے بہت کتراتے یا بالکل دور رہتے تھے' معترضین کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ چڑانے کی خاطر قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا پاکستان کا قیام درست تھا؟ اتفاق سے وہ لوگ پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ انہیں جواب دیا گیا کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو حضور انڈر سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ تک مشکل سے پہنچتے اور ہندوؤں کے غلام بنے

رہتے ۔ ہمیں چونکہ یہاں سکھ میسر ہے؛ چین سے میٹھی نیند سوتے ہیں؛ افراط سے اشیاء خوردنی ملتی ہیں؛ تن پوشی کے لئے نفیس کپڑے پہنتے ہیں؛ زندگی کے تمام شعبہ جات میں کسی ہندو سے مقابلہ نہیں ہے؛ اس لئے ہم اپنے پڑوسی کلمہ گو بھائیوں کی زبوں حالی اور بے چارگی سے ناواقف ہیں۔ اُن بے بسوں کی موجودہ حالت زندہ لاشوں جیسی ہے اور یہاں ہم اپنے حال میں مست ہیں اور یا وہ گوئی سے دل بہلایا کرتے ہیں۔ ہم گنہگار اللہ کی مصلحت کو کیا جانیں اور سمجھیں۔ وہ تو ہندوستان نے 6 ستمبر 1965ء کو پاکستان پر جارحانہ اور بزدلانہ حملہ کر کے چھوٹے اور بڑے پاکستانیوں کے ہوش وحواس درست کر دیے اور ہاتفِ غیبی نے ان کے کان میں چلا چلا کر زور سے کہا کہ قیامِ پاکستان تمہارے اور آنے والی نسلوں کے وجود اور آزادی کے لئے از حد ضروری ولازمی تھا۔

گزشتہ زمانہ کے مظالم کی خونیں داستان بہت طول طویل ہے۔ سب تفصیلات یا پوری داستان کو قلم بند کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ صوبہ وار بھی حالات نہیں بتلائے جا سکتے۔ قوم ایک، تنظیم ایک اور رہنما ایک تھا۔ دُکھ سکھ کے مسائل سب ایک تھے۔ اس لئے مشتے نمونہ از خروارے چند ایسے واقعات لکھوں گا جن پر شاید میں ذاتی مشاہدہ اور علم کی بنا پر اچھی طرح روشنی ڈال سکوں۔ ویسے تو کُل واقعات از بر ہیں اور جی چاہتا ہے کہ آپ کے سامنے بیان کئے جائیں لیکن کتاب کی تجویز کردہ ضخامت اجازت نہیں دیتی۔ علاوہ ازیں کئی کتابوں میں آپ اس زمانہ کے مظالم کے تفصیلی حالات پائیں گے۔ اس ہی سلسلہ کی ایک بڑی اہم اور تاریخی کتاب 'سی پی میں کانگریس راج'' ہے جو میرے دو مخلص بہی خواہ دوستوں نے جن کا مجھے شریکِ کار ہونے کا شرف حاصل تھا' مرتب فرمائی ہے۔ اس کے ایڈیٹر مولوی حکیم اسرار احمد کریوی اور ترتیب دینے اور مواد فراہم کرنے والے سید صلاح الدین صاحب ہیں۔ ان دونوں کی اَن تھک کوششیں؛ تصنیف وتالیف سے فکری لگاؤ اور اصلی دستاویزات حاصل کرنے کے لئے تگ ودوان کے حیرت انگیز کارنامے ہیں۔

ان دونوں دوستوں کا ذکرِ ماضی ان کے زمانۂ حال کو میری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا

کرتا ہے اور زبانِ حال سے کہلواتا ہے کہ یہ دونوں دوست مردم پرور کراچی میں مقیم ہیں۔ حکیم صاحب نے تو آج تک اپنے کسی دوست کو اپنے گھر کا پتہ نہیں بتلایا۔ غالباً اس کا یہ سبب ہے کہ سرے سے ان کا کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ بائیس سال سے سنا ہے کہ ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں اور قسم کھائی ہے کہ وہاں سے ان کی میت ہی نکلے گی تاکہ چشم عبرت نگاہ ان کی آخری رخصتی کو بھی دیکھ لے۔ باور کیجئے کہ وہ اس ہیرے کے مانند ہیں جو اب کوڑے میں پڑا ہوا ہے لیکن مسلم لیگی دَور میں اپنی چمک دمک سے نظروں کو خیرہ کرتا تھا۔

دوسرے دوست سید صلاح الدین صاحب ہیں جو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور جنہوں نے اپنی تمام ذہانت اور علمی قابلیت کو حصولِ پاکستان کے لئے خطباتِ صدارت، بیانات، اشتہارات، کتاب و کتابچے لکھنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ میری رائے میں انہیں اہل قلم بانیانِ پاکستان میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ آج کل وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ سنا ہے کہ کسی دفتر میں کلرکی کر کے حلال کی روزی کماتے ہیں۔ اس ملک میں کتنی ہی ایسی معروف و غیر معروف، بے بس، بے یارومددگار ہستیاں چپہ چپہ پر ملیں گی جنہوں نے قصداً موجودہ حالات میں اپنی ذات اور اپنے ماضی کو گمنامی کے پردہ میں چھپا دیا ہے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ کاتبِ غیبی نے ان کی خدمات و ایثار کو ان کے نوشتۂ تقدیر میں لکھ رکھا ہے جس کا بشارتِ خداوندی کے مطابق ان کو یقیناً اجرِ عظیم ملے گا۔

انکشافاتِ مظالم نے صرف سی پی و برار میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں کانگریس کی کرکری کر کے رکھ دی اور ایک تہلکہ مچ گیا۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کو کوئی جواب ہی نہیں سوجھا۔ ان کی معنی خیز چپ نے منصف مزاج لوگوں کو یہ یقین کرا دیا کہ تمام واقعات من و عن صحیح ہیں۔

تاریخ کے طالب علموں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ان مظالم کے متعلق قائداعظمؒ کے کئی بیانات اور تقاریر موجود ہیں۔ مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم لیگ، صوبائی لیگیں، شہری و ضلع لیگیں، اخبارات کی خبریں، متعدد اداریے، مضامین یہ سب ملا کر اتنا مواد ہے کہ ایک ضخیم کتاب تیار

ہوسکتی ہے۔مزید برآں آل انڈیا مسلم لیگ نے راجہ صاحب پیر پور کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس نے تمام اقلیتی صوبوں کا دورہ کر کے ہندوؤں کے مظالم کی داستانیں سنیں اور پیر پور کمیٹی رپورٹ مرتب کی جس سے دنیا والوں کو کانگریسی مظالم کا پہلی مرتبہ پتہ چلا۔ پوری قوم راجہ صاحب پیر پور کی رہین منت ہے کہ ان کی مساعیٔ جمیلہ خلوص ایثار ولگن کی بدولت کانگریسی مظالم کی لرزہ خیر داستانیں کتاب کی شکل میں مرتب ہوگئیں اور تاریخی حیثیت حاصل کرلی۔ قائداعظمؒ کے حکم سے برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین کو اس رپورٹ کی کاپیاں لندن بھیجی گئیں جسے پڑھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

کانگریسی حکومتوں نے جب یہ محسوس کرلیا کہ وہ زین پر جم کر بیٹھ گئی ہیں تو انہیں ایک خاص تہذیب اور ذہنیت کو سارے ہندوستان پر مسلط کرنے اور مسلمانوں سے بڑا پرانا سودا چکانے اور زیر کرنے کی سوجھی۔ ان کے پاس وقت کم تھا کیونکہ ان کا اقتدار اعلیٰ ذرا سی بات پر حکومت سے الجھ کر نا جائز دباؤ ڈالنے اور اسے مفلوج کرنے کے لئے کسی بھی وقت ان کو مستعفی ہونے کا حکم دے سکتا تھا جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کر دکھایا۔ اُنہوں نے عجلت کے ساتھ لیکن مستور ہو کر مسلمانوں کے خلاف تین بہت اہم بنیادی محاذ قائم کئے۔ یہ مہمات ایسی خطرناک تھیں کہ ان کی کامیابی سے دس کروڑ مسلمانوں کو مذہبی سیاسی تعلیمی اور اقتصادی شکست کا منہ دیکھنا پڑتا۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہتا۔ کانگریس کے لئے یہ سوال درپیش تھا کہ یہ محاذ کہاں کھولا جائے تا کہ اپنی تمام قوتوں کو جھونک کر آسانی کے ساتھ مسلمانوں کا قلع قمع کیا جائے۔ کسی جگہ بتلایا گیا ہے کہ چھ صوبوں میں زبردست اکثریت کی بناء پر ان کی حکومتیں قائم کی گئی تھیں۔ اُنہوں نے صوبہ ممالک متوسط و برار کو چنا کیونکہ بقول ایک ہندو کانگریسی وزیر ڈی کے مہتا مسلمان اتنی قلیل تعداد میں تھے کہ انہیں صرف خوردبین ہی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ مہتا صاحب نے مذکورہ گل افشانی سی پی اسمبلی میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہوئے کی تھی۔

علاوہ ازیں یہ صوبہ ہندو مہا سبھا' راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کا گڑھ اور اڈا تھا اور یہیں ان جماعتوں نے ڈاکٹر بی ایس منجے' ویر ساورکر' ڈاکٹر ہیڈ گیوار اور آر ایس گولوالکر کی کوششوں سے جنم لیا تھا اور یہیں یہ جماعتیں مسلمانوں کا خون پی کر پلی اور بڑھی تھیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی کانگریس نے اس صوبہ کو چنا۔ بعد کے حالات بتلائیں گے کہ کانگریس اور شیواجی کے چیلوں نے جتنا ظلم کیا' مسلمانانِ سی پی و برار نے اتنا ہی صبر کیا اور اپنے دفاع میں شجاعت کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ انہیں اللہ کا سہارا بس تھا اور اپنے سالار قافلہ (مسٹر جناح) کی رہنمائی پر کامل اعتماد جس کی بدولت انہیں کبھی زک نہیں اٹھانی پڑی۔

نہ دبے ہیں کبھی باطل سے نہ دب سکتے ہیں
گردن اللہ کے رستے میں کٹانے والے

(اقبالؒ)

مزید برآں انڈین نیشنل کانگریس نے اس ہی صوبہ کے شہر وردھا میں گاندھی آشرم قائم کر کے اس کو اپنی راجدھانی بنائی۔ مسٹر ایم کے گاندھی اس آشرم میں رہتے تھے جہاں ہندو جاتی کا شب و روز تانتا بندھا رہتا اور وہ اُسے یاترا کی جگہ سمجھتے تھے۔ غیر ملکی بھی وہاں جوتے اُتار کر زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھتے۔ گاندھی آشرم بالعموم ان کی نظروں میں پریاگ اور کاشی سے کم نہیں تھا کیونکہ اس کے مکیں کو وہ لوگ مہارِشی (عظیم انسان) اور بھگوان کا اوتار سمجھتے تھے اور اس ہی لئے ہندو قوم نے ''مہاتما'' کا لقب دیا تھا۔ ان کے فضائل و مناقب سے اخباروں کے کالم بھرے ہوتے اور رات دن اس کے چرچے ہوتے تھے۔ آیئے آپ بھی سنئے:-

1: وہ بکری کا دودھ پیتے تھے۔ 2: ہندوستان کی غربت سے متاثر ہو کر نیم برہنہ رہتے تھے۔ 3: چھوت چھات اور ذات پات کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ 4: نیچ ذات یعنی بھنگی' چمار اور مہاروں کو ہریجن کہتے اور اُن پر آشرم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ 5: روز شام کو پرارتھنا ہوتی تھی جہاں کی کارروائی قرآن پاک' مقدس انجیل' رِگ وید اور رامائن کے

پاٹ (سبق) سے شروع ہوتی تھی۔6: وہ اہنسا (عدم تشدد) کے پجاری تھے۔7: وہ ماہر ستیہ گرہ تھے۔8: وہ انفرادی ستیا گرہ کے موجد تھے۔9: وہ مرن برت (فاقہ کر کے مرجانا) رکھنا جانتے تھے لیکن مرتے نہیں تھے۔10: وہ سوموار کو چپ کا برت رکھتے تھے۔ بھلا بتلائیے تو سہی دنیا والے ان بے شمار خوبیوں کے انسان کو حالانکہ مسلمانانِ ہند کی یہ حتمی رائے تھی کہ ''من خوب می شناسم پیرانِ پارسارا'' ایک بزرگ ترین ہستی کیوں نہ مانتے اور یہ کیسے سمجھتے کہ ان کی موجودگی میں کسی پر ظلم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح بناوٹی تقدس کی چادر تمام فضا پر محیط تھی اور تمام صوبہ اس سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس ماحول میں پس پردہ مسلمانوں کا گلا گھونٹنا' انہیں قتل کرنا' ان کے مال اورعزت و آبرو کولوٹنا' ان کے مکانوں کو نذر آتش کرنا' ان کے پاک خون سے ہولی کھیلنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میں کسی جگہ بتا چکا ہوں کہ راجہ سید محمد مہدی والیٔ ریاست پیرپور نے اقلیتوں کے صوبہ کا دورہ کیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی رپورٹ کے صفحہ 53 پر صوبہ ممالک متوسط و برار کے بارے میں تحقیقات کے بعد جو کچھ ارشاد کیا ہے' وہ ناظرین کی معلومات کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں ''جب سے صوبائی خود اختیاری حکومتیں قائم ہوئی ہیں' اس وقت سے مسلمانانِ سی پی و برار دوسرے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ جور وستم کے شکار ہوئے ہیں اور وہ بہت ہی قلیل التعداد اقلیت ہیں' غریب ہیں اور تعلیمی لحاظ سے بہت پیچھے۔

یہ زراعتی صوبہ ہے لیکن مسلم مزارعین بہت کم ہیں۔ وہ کپڑے اور بیڑی کے کارخانوں میں کام کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔''

صوبہ کے چودہ اضلاع میں ہندی عام طور سے بولی جاتی ہے لیکن برار اور قسمت (ڈویژن) ناگپور میں اکثریت مرہٹی بولتی ہے۔ صوبہ کے مسلمانوں کی زبان اُردو ہے۔ برار کی برطانوی راج کو منتقلی سے قبل صوبائی درباری زبان اُردو تھی۔''

رپورٹ کی چند سطروں میں مسلمانانِ سی پی و برار کی زبوں حالی کی اتنی اچھی عکاسی اور

چند لفظوں میں ایسی واقعہ نگاری کی گئی ہے کہ گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔

چلئے اب آپ کو اختصار کے ساتھ بتلائیں کہ ہماری آنکھوں نے کیا کیا دیکھا اور کیا کیا نہیں دیکھا۔ کانگریس نے اپنے اوچھے حربے جہاں وہ برسر اقتدار تھی' بیک وقت بے بس لیکن پامرد مسلمانوں کے خلاف علی الاعلان استعمال کئے۔ جن صوبوں میں اس کا اقتدار نہیں تھا اور جن صوبوں میں چاہے یونیانسٹ یا کرشک پرجا پارٹی یا یونائیٹڈ فرنٹ کے نام سے مسلمانوں کی سرکردگی میں وزارت قائم تھی' اس کے ادھیڑ بن کا فریضہ بھی پرستارانِ کانگریس کے لئے گنگا اشنان اور کاشی کی یاترا سے زیادہ مقدس اور ضروری تھا۔ رات دن بغیر کسی جھجک کے وہاں وزارتوں کو توڑنے کے لئے جوڑ توڑ کئے جاتے تھے۔ کبھی کامیابی ہوتی اور کبھی منہ کی کھاتے لیکن وہ اپنے فعلِ بد کو بے شرمی سے جاری رکھتے۔

دو ایک اہم تاریخی واقعات بالتفصیل بتلانے سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کانگریس کے تشدد' کینہ پروری' اشتعال انگیزی اور اسلام دشمنی کے چند واقعات مختصر الفاظ میں بیان کر دوں تاکہ یہ باب ان کی شمولیت سے محروم نہ رہ جائے۔ بمبئی میں ہندو مسلم دشمنی اس حد تک تھی کہ بارہ مہینوں میں سے تقریباً پانچ مہینہ ہندو مسلم فساد بپا رہتا تھا۔

مسلمان اقلیت میں ضرور تھے لیکن اپنے مذہب' جان و مال اور عزت کی حفاظت کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے۔ بمبئی کے ہندو غنڈوں نے قتل کرنے کا بالکل انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ چھری کو بڑی صفائی کے ساتھ اس طرح استعمال کرتے کہ پیٹ کی انتڑیاں باہر آ جائیں۔ مقتول یعنی مسلمان وہیں ڈھیر ہو جاتا اور ہندو قاتل یہ گیا' وہ گیا۔ اپنی بقا کی خاطر مسلمان کو ''والسّنِ بالسّن'' پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ بمبئی کے چند محلوں نل بازار وغیرہ میں مسلمان قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ بمبئی کی حدود کے باہر قلابہ ضلع میں ان مسلمانوں کے جو جنوبی افریقہ میں رہتے تھے' خوبصورت مکانات نذر آتش کئے گئے اور نہتے بے گناہ مسلمانوں کو بڑی سفاکی کے ساتھ قتل کیا گیا۔

یوپی کے شہر مدراس کا شہر نیلور' سی پی کے شہر ناگپور' امراوتی' جبلپور' کٹنی وغیرہ کیونکر

تشدد پسند ہندوؤں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

آپ یقین کیجئے کہ قائداعظمؒ ہندوستان میں مسلمانوں پر جہاں کہیں کوئی ظلم کیا جاتا' اس سے باخبر رہتے اور ہر آئینی کوشش کرتے کہ مسلمان زیادتیوں اور ستم رانیوں سے بچ جائیں۔ جب قائداعظمؒ کو معلوم ہوا کہ امراؤتی میں ہندو مسلم فساد ہوا تو انہوں نے فوراً ایک خط صوبہ کے گورنر کو لکھا جس کا علم ہم لوگوں کو اس وقت ہوا جب کہ قائداعظمؒ نے از راہِ کرم اس کی اطلاع ہمیں دی۔ آپ خود ان کے سرفراز نامے اور گورنر کے جواب کو ملاحظہ کیجئے۔ اس سے ثابت ہوگا کہ قوم کے لئے ان کے دل میں کتنی تڑپ اور کتنا درد تھا۔

صوبۂ بہار کے مسلمانوں پر بھی جی کھول کر ظلم کئے گئے۔ ان کا ذکر ایس ایم شریف صاحب نائب صدر بہار صوبائی مسلم لیگ نے شریف رپورٹ میں کیا ہے۔ وہاں مساجد کی بہت بے حرمتی کی گئی۔ کسی مسجد میں سؤر کا گوشت' کہیں مرا ہوا کتا' کہیں غلاظت پھینک کر اپنی آتشِ انتقام کو بجھایا گیا۔ ذبیحہ گاؤ کو جبراً روک کر گؤ ماتا کی سیوا کی گئی۔ قبرستان میں قبروں کو زمین دوز کر کے فٹ بال میچ کھیل کر اپنے دل کو ٹھنڈا کیا گیا۔ باوجود ان مظالم کے مسلمان پیچھے نہیں ہٹے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ

''آن نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر خاک و خوں بینی سرے''

وہ ایقان کے سچے اور ایمان کے پکے تھے۔ انہیں تو بشارت دی گئی تھی۔

نہ لاؤ خوف دل میں تم کبھی باطل پرستوں کا
تمہارے واسطے ''انافتحنا لک'' ہے قرآں میں

صوبۂ بہار میں مسلمان پر تشدد کی تصدیق بھارت کے پہلے راشٹر پتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو اس زمانہ میں بہار میں صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے' اپنے اخباری بیان تحریر کردہ 27 جنوری 1939ء سے کی۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا: ''بقر عید آ رہی ہے۔ پرانے

زمانے میں بہار میں ایک سال میں ایک دن ایسا آتا تھا جو حکومت اور کام کرنے والوں کی پریشانی کا باعث ہوتا تھا اور وہ بقر عید کا دن ہوتا تھا لیکن اب فضا ایسی مکدر ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی دن خود کو خطرہ سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ ہندوؤں کو معلوم ہونا چاہئے کہ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اپنی مذہبی رائے اور رسم ورواج کو دوسروں پر ٹھونسیں۔''

مہاتما گاندھی نے بھی اپنے اخبار ہریجن کی 28 جنوری 1939ء کی اشاعت میں ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''میں کانگریس کے موجودہ دورِ حکومت میں ملک میں سوائے طوائف الملوکی اور انقلابی تباہی کے اور کچھ نہیں دیکھتا۔''

''کانگریسیوں میں بدنظمی ہر جگہ ترقی پر ہے۔ اُن میں سے بہت سے لوگ غیر ذمہ داران اور تشدد آمیز تقریریں کرتے اور بہت سے حکم عدولی کرتے ہیں۔''

''بہار کی مثال قابلِ ذکر ہے۔ بہار کے کسان کانگریسی کہلاتے ہیں۔ ان کے رہنما بھی کانگریسی ہیں لیکن بہار کے وزراء کو کسانوں کے دھاوا بولنے اور شورش کرنے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔''

ان چوٹی کے ہندو کانگریسی رہنماؤں کے بیان و مضمون سے عیاں ہوجائے گا کہ کانگریس اپنے صوبوں میں کیا کیا دھاندلی بازیاں کر رہی تھی اور کانگریسی رہنما اور وزراء ان کے سامنے خود کو کس طرح بے دست و پا پاتے تھے۔ ان حالات میں مسلمان چیونٹی کے جیسے کانگریسی ہاتھی کے پیر تلے تھے لیکن محافظ و مالکِ حقیقی نے انہیں وہاں سے بھی صحیح وسالم بچالیا۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسینؓ کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

(ظفر علی خان)

''بندے ماترم''

آگ ہے اولاد ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

(اقبالؒ)

انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی اکثریت اور طاقت یعنی فرقہ ورانہ اور پارلیمانی اکثریت کے بل بوتے ''بندے ماترم'' کے گیت کو مسلمانوں کے سراس طرح اسمبلیوں، سکولوں اور عام جلسوں میں تھوپنا چاہا کہ جب یہ گایا جائے تو ہندو حاضرین کے ساتھ مسلمان بھی تعظیماً کھڑے ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم طلباء کو بھی خاص طور سے مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اس حکم کو مانیں۔ ان کے نہ ماننے پر انہیں زدوکوب کیا گیا۔ اس سلسلے میں پٹنہ میں دو مسلم طلبا کو کسی اسلحہ سے زخمی کر دیا گیا اور ٹی کے گھوش اکادمی سے چھ مسلم طالب علموں کو نکال دیا گیا۔ یہ واقعات اور صدر بہار مسلم لیگ سید عبدالعزیز صاحب بیرسٹر کا بیان شریف رپورٹ کے صفحہ 38 پر درج ہیں۔

مسلمانوں کی ضد پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے ہندو طالب علموں نے محض فتنہ بپا کرنے کے لئے بندے ماترم کے سوال کو اٹھایا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہر روز صبح تعلیم شروع کرنے سے قبل بندے ماترم کا گیت گانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ ایک مذہبی گیت ہے لیکن حکومت حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ نے اس لئے اجازت نہیں دی کہ اس نئی شرارت سے جامعہ کی فضا مکدر ہو جائے گی اور طلبا کے باہمی برادرانہ تعلقات پر ضربِ کاری لگے گی۔ کچھ ہندو طالب علموں کو سرتابی کرنے کی پاداش میں جامعہ سے نکال دیا گیا۔ کچھ نے ان کی ہمدردی میں

رضا کارانہ طور پر جامعہ کو چھوڑ دیا۔ افسوس ہے کہ ان کی مہمان نوازی کے لئے ناگپور یونیورسٹی نے بغیر کسی پوچھ گچھ کے اپنے دروازے کھول دیے اور بڑی فراخدلی سے میزبانی کے فرائض ادا کئے۔ ان کے طعام، قیام، کتابیں اور فیس کا انتظام کیا گیا۔ ان کے لئے داخلہ کی گنجائش نکالنے کی خاطر ناگپور یونیورسٹی کے کانگریسی وائس چانسلر مسٹر ٹی جے کیدار نے یونیورسٹی کے قواعد میں ضروری ترمیمات کیں اور کئی نئے اساتذہ کو مقرر کیا۔ ناگپور کے متعصب ہندوؤں نے ان ہندو حیدرآبادی طالب علموں کا بڑا پرتپاک اور شاندار خیر مقدم کیا جیسے کہ یہ سورما لنکا ڈھا کر فاتح کی حیثیت سے ناگپور میں داخل ہوئے تھے۔

مسلمانوں کا بندے ماترم کے متعلق تجسّس بیجا نہیں تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر یہ کیا گیت ہے اور ہمارے کھڑے رہنے کے لئے کیوں سخت اصرار کیا جارہا ہے۔ پرانے زمانے میں تو کسی نے پرواہ تک نہیں کی لیکن موجودہ دور میں کانگریس کی مسلمانوں کے خلاف ہر چال مشتبہ اور مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ سخت تعجب ہے کہ ہندوؤں کی کثیر تعداد خود اس گیت کے بولوں کی زبان سے نابلد تھی کیونکہ اس میں کثرت سے سنسکرت اور بنگلہ زبان کے بہت دقیق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن چند بنگالی مسلمانوں، عصر جدید، الجمعیت، زمیندار وغیرہ اخباروں نے اس کا پول کھول کر مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور مشرکانہ اتباع سے بچا دیا۔

تحقیقات اور عمیق مطالعہ کے بعد پتہ چلا کہ اس مشرکانہ گیت کے مصنف بنکم چندر چٹرجی اپنے زمانہ کے مشہور اور مقبول بنگالی اہل قلم اور ناولسٹ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ناول گرم نان کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے اور ان کی ہردلعزیزی اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ وہ کٹر متعصب ہندو تھے اور صرف مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا جانتے تھے۔ ان کے ناولوں میں سے ایک ناول ''انندامٹھ'' بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ اس ناول میں ''بندے ماترم'' کا گیت درج ہے۔ اصل میں یہ ایک دعا اور نعرہ ہے۔ بنگالی ہندوؤں نے ایک سیاسی نما تحریک کا آغاز ہندو راج قائم کرنے اور مسلمانوں کی حکومت کو مٹانے کے لئے کیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ

اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوں گے، دم نہیں لیں گے۔ یہ گیت گایا جاتا تھا کہ ہندو مشتعل ہوکر اکٹھا ہو جائیں اور مسلمانوں کی بستیوں کو لوٹیں، جلائیں اور مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے خون سے اپنے تعصب کی آبیاری کریں۔ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے بہت سمجھایا کہ ''بندے ماترم'' کسی بھی حال میں مذہبی یا قومی ترانہ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کا احتجاج جب زیادہ بڑھا تو انڈین سوشل رفارمر کے ایڈیٹر مسٹر کے نٹ راجن نے کہا کہ ''بندے ماترم عام اجتماعات کے لئے موزوں نہیں'' اور مشہور سوشلسٹ لیڈر مسٹر ایم این رائے نے تبصرہ کیا کہ ''مسلمانوں کی نکتہ چینی صحیح بنیادوں پر قائم ہے۔'' کلکتہ کے اخبار اسٹیٹسمین کی یہ تنقید تھی کہ ''بندے ماترم تشدد اور فرقہ واریت میں ڈوبا ہوا ہے۔''

پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس کے کان پر جب ذرا جوں رینگی تو ان کے منہ سے پھول جھڑے اور انہوں نے ارشاد کیا کہ ''بندے ماترم'' کانگریس کا غیر سرکاری قومی ترانہ ہے۔ آج جبکہ بھارت کا سرکاری ترانہ ''جنا گنا منا'' ہے، پھر بھی ''بندے ماترم'' کا گیت اس سے چڑیل کی طرح چمٹا ہوا ہے کہ آپ اسے روزانہ صبح آکاش وانی احمد آباد، بڑودہ سے سن سکتے ہیں۔ جب تک اس ترانہ کو آپ کی آنکھیں نہ پڑھ لیں اور کان نہ سن لیں تو آپ کے لئے اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ اس میں کتنا سم قاتل اور کس حد تک بت پرستی ہے۔ گیت کو اصلی زبان میں شائع کرنا تو بے سود ہے کیونکہ نہ میں سمجھوں گا اور نہ آپ سمجھ سکیں گے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ایک شہرۂ آفاق ہندو بنگالی شری آر و بندو گھوش نے کیا ہے جو پروفیسر آر کوپ لینڈ کی کتاب ''دی کانسٹی ٹیوشنل پرابلم ان انڈیا'' کے صفحہ 322 پر درج ہے۔ میں تو صرف اُردو کا ترجمہ پیش کروں گا جو انگریزی ترجمہ سے بالکل مطابقت رکھتا ہے لیکن قبل ازیں یہ عرض کردوں کہ مسلمانانِ ہند نے اپنی حمیتِ اسلامی اور استقامتِ ایمانی کا تعظیماً کھڑے نہ ہوکر انتہائی حقارت ونفرت سے جواب دیا کیونکہ یہ ان کے دین کا مسئلہ تھا۔ ان کے قصرِ ایمانی کو کانگریس کفر اور شرک کی بارود کی سرنگ بچھا کر پامال کرنا چاہتی تھی۔ مسلمانوں کا ایمان تو اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اعلان

نہ کریں اور شہادت نہ دیں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔اس سے انحراف یا اللہ کی ذات میں مٹی یا پتھر کی مورتیوں کی شمولیت کرنے والے لاریب دوزخ کا ایندھن بن جاتے ہیں۔مسلمان کیسے دس مسلح ہاتھوں والی درگا دیوی (کالی مائی)، لکشمی دیوی اور سرسوتی دیوی کو ماں کہتا، قدم چومتا اوران کا بندہ ہونے کا اعلان کرتا؟ وہ تو صرف اللہ کا بندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔الحمدللہ! مسلمان اپنے اس جذبۂ ملی وایمانی سے دنیا میں بھی سرخرو ہوئے اور عاقبت میں بھی اللہ کے سامنے سرخرو اٹھیں گے۔

میں آپ کے مطالعہ اور غور وفکر کے لئے ''وندے ماترم'' کا اُردو ترجمہ محمد داور حسین صاحب بی اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) کی مرتبہ کتاب ''بندے ماترم اور اس کا تاریخی پس منظر'' سے انتہائی احسان مندی کے ساتھ نقل کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑ دوں گا کہ قائداعظمؒ نے اسلام کے بنیادی اصول اور اسلامی تعلیمات کے مطابق خود کو اور اپنی قوم کو بت پرستی سے بچایا یا نہیں؟

ترجمہ
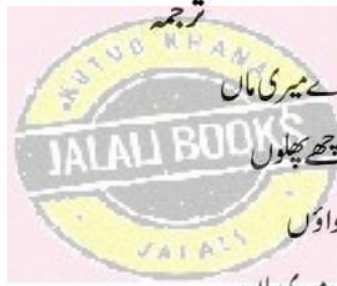
1- میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں
میرے اچھے پانی اچھے پھلوں
بھینی خنک جنوبی ہواؤں
شاداب کھیتوں والی میری ماں

2- حسین چاندنی سے روشن
رات والی
شگفتہ پھلوں والی گنجان درختوں والی
میٹھی ہنسی میٹھی زبان والی
سکھ دینے والی برکت دینے والی میری ماں

-3 سات کروڑ گلوں کی پر جوش آوازیں
سات کروڑ بازوؤں میں سنبھلنے والی تلواریں
کیا اتنی قوت کے ہوتے ہوئے بھی
اے ماں تو کمزور ہے؟
تو ہی ہمارے بازوؤں کی قوت ہے
میں تیرے قدم چومتا ہوں
تو دشمن کے لشکر کی غارت گر ہے میری ماں

-4 تو ہی میرا علم ہے تو ہی میرا دھرم ہے
تو ہی میرا باطن ہے تو ہی میرا مقصد ہے
تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے
تو ہی بازوؤں کی قوت ہے
دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے
تیری ہی محبوب مورتی ہے
ایک ایک مندر میں

-5 تو ہی درگا دس مسلح ہاتھوں والی
تو ہی کملا ہے کنول کے پھولوں کی بہار
تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی
میں تیرا غلام ہوں غلام کا غلام ہوں
غلام کے غلام کا غلام ہوں
اچھے پانی اچھے پھلوں والی میری ماں
میں تیرا بندہ ہوں
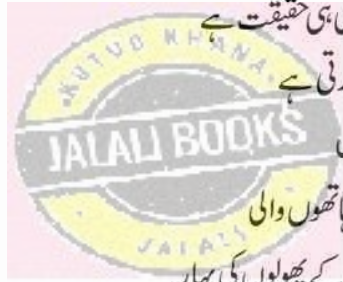
6- لہلہاتے کھیتوں والی مقدس
موہنی آراستہ پیراستہ
بڑی قدرت والی، قائم ودائم ماں
میں تیرا بندہ ہوں

☆☆☆☆☆
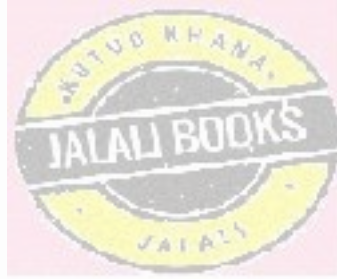
فنافی الاردو

جب مولوی عبدالحق صاحب کی حیدرآباد دکن میں میعادِ ملازمت ختم ہوگئی اوران کے درس وتدریس کا سلسلہ بند ہوگیا تو علم وادب وشرفا نواز حکومتِ عثمانیہ نے ان کا وظیفہ مقرر کردیا۔ اب تو ان کا تمام وقت اُردو کی خدمت کے لئے وقف ہوگیا تھا۔ اس خدمت کا دائرہ بہت کچھ حیدرآباد کی سرحدوں تک تھا اور اب یہاں کا یہ حال تھا کہ شہریار دکن کی سرپرستی اور گہری دلچسپی سے اُردو پروان چڑھ گئی تھی۔ قابلِ رشک عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کا قیام اُردو کی درباری' دفتری اور ملکی زبان کی مسلمہ حیثیت سے یہ سب اس کی ترقی اور بقا کی بڑی روشن دلیلیں تھیں۔ ان گنت ادارے بھی پہلے سے قائم اور بہت مفید کام کررہے تھے۔ اُردو کا قلعہ اب بہت مضبوط اور دشمنانِ اُردو کے حملوں سے بالکل محفوظ تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انجمن ترقی اُردو دکن سے باہر نکل کر نئے آسمان کے نیچے اور نئی زمین پر اپنا جہاد شروع کرے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ہر بڑے فاتح نے شمالی ہند کی طرف سے حملہ کیا اور اپنے قدم جمانے کے بعد جنوبی ہند پر قبضہ کیا یا اسے باجگذار بنایا لیکن اس فاتح اُردو نے جنوب کی طرف سے اپنے ساتھ لاؤلشکر لے کر شمال کی طرف روانہ ہوا۔ نادر کتابیں' کمیاب قلمی نسخہ جات' اعلیٰ حضرت کی خسروانہ سرپرستی' اُردو کے بہی خواہوں کی دعائیں اور عملی تعاون کا وعدہ' اپنا ذاتی سرمایۂ زندگی اور چوبیس پہر خدمت' مولوی صاحب کا لاؤلشکر اور سازوسامان تھا۔ اُنہوں نے دلی پہنچ کر دریا گنج میں ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کے مکان ''دارالسلام'' میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ اُن کا اُردو کا گڑھ اور مرکز تھا۔ اب مولوی صاحب کے لئے دنیا میں صرف اُردو کی خدمت باقی رہ گئی تھی۔ ان کی زندگی صرف اُردو تھی جس کے لئے اُنہوں نے سب کچھ تج دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف اُردو کے لئے جیتے تھے اور

اس ہی کے لئے مرے۔ پیرانہ سالی میں بھی اُردو کی خدمت جوان بن کر کرتے تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا چلنا پھرنا یہاں تک کہ ان کا اوڑھنا بچھونا بھی اُردو تھی۔ اگر یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ فنافی الاردو تھے۔

وہ بڑے قوم پرست تھے اور ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں مسلم لیگ' کانگریس یا کسی اور سیاسی جماعت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر انہیں کانگریس کی طرف سے یقین دہانی کرادی جاتی کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اُردو ملکی زبان بنادی جائے گی تو وہ کانگریس کے بڑے حامی ہوجاتے۔ ''عیاں راچہ بیان'' وہ تو صرف اُردو کے دیوانے اور متوالے تھے۔ اُنہوں نے اُردو کی ترویج وترقی کے لئے دہلی میں کوششیں شروع کردیں۔ سب سے پہلے اُنہوں نے اپنے اطراف ایسے لوگوں کو جمع کیا جو ان کے مقصد کے حصول میں ہاتھ بٹا سکتے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مولوی صاحب مسلم لیگ اور اس کے اکابرین کو سرکار پرست سمجھ کر اچھی نظروں سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کانگریس کی اُس جدوجہد کو جو اس نے آزادیٔ ہند کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کی تھی' متفق تھے اور مسلم لیگ کو بے علموں' خطاب یافتگان اور ٹوڈیوں کی جماعت قرار دیتے تھے۔ میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ابتدائی زمانہ میں قائداعظمؒ سے بھی بدظن تھے لیکن جب انہوں نے قائداعظمؒ کو ایک بڑا باعمل انسان اور اُردو کا ایسا حامی جس نے اُردو کو تقسیم ہند کا عظیم سبب بنایا تو وہ اُن کی طرف کھنچنے لگے۔ حال ہی میں بابائے اُردو کے یومِ وفات پر کراچی کے ایک موقر روزنامہ ''مشرق'' میں قائداعظمؒ کا خط بابائے اُردو کے نام مورخہ 17 اگست 1968ء کو شائع ہوا جس میں بابائے اُردو کو لکھنؤ کے آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ 15' 16' 17 اکتوبر 1937ء میں شرکت کرنے اور ہندی اُردو کے مسئلے کے بارے میں مخاطب کرنے کی دعوت دی گئی تھی تاکہ اراکین کونسل کوئی صائب رائے قائم کرسکیں۔ مولوی صاحب کو جو صرف ایک ڈگر پر چلنا جانتے تھے' اپنا ہمنوا بنانا قائداعظمؒ کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ اس

زمانہ کے جولوگ موجود ہیں یا وہ لوگ جو اُس زمانہ کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں‘ وہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان کیسے کٹھن دور سے گزر رہے تھے اور انہیں مسلم لیگ کے مطالبات کو منوانے کے لئے ہر ممتاز فرد کا تعاون حاصل کرنا بہت ضروری تھا اور خصوصاً مولوی صاحب کی جیسی گرامی ہستی کی عملی ہمدردی جو اپنے کندھوں پر اُردو کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے تھی‘ میسر ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔

علاوہ ازیں قائداعظمؒ نے ان کو ہموار کر کے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو بھی بڑی تقویت پہنچائی نیز اختلاف کے ایک ایسے دروازے کو بند کیا جس سے نکلی ہوئی آواز مسلم لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچاتی۔ مولوی صاحب میرے سابق وطن ناگپور کے حامیانِ اُردو سے بہت خوش تھے۔ ’’ناگ پور‘‘ کو ’جاگ پور‘‘ اس لئے کہتے تھے کہ بقول ان کے ناگپور نے انہیں اور ہمیں جگایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی ان کا مرکز تھا لیکن انہوں نے اپنی تمام توجہات سی پی و برار پر مرکوز کر دی تھیں کیونکہ اس ہی صوبہ میں کانگریس اور گاندھی جی نے اُردو پر سخت حملہ بول دیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جتنے لوگ مولوی صاحب کے اطراف جمع ہوئے‘ وہ سب کے سب باعمل مسلم لیگی تھے۔

مولوی صاحب نے تمام ہندوستان میں انجمن ترقی اُردو کی شاخوں کا جال پھیلا دیا لیکن چونکہ سی پی و برار میں ہندی اور اُردو کا سخت مقابلہ تھا‘ اس لئے یہاں انجمن ترقی اُردو کی سب سے زیادہ شاخیں اور مدارس قائم کئے گئے۔ محمد ابراہیم خان صاحب فنا کی سالانہ صوبائی رپورٹ کے مطابق سی پی میں 24 اور برار میں 2 انجمن ترقی اُردو کے مدارس تھے۔ برار کا علاقہ چھوٹا اور حیدرآباد کا جزو ہونے کی وجہ سے اُردو کی دولت سے مالا مال تھا‘ اس لئے وہاں صرف 2 مدرسے کھولے گئے۔ رپورٹ سے یہ پتہ لگتا ہے کہ صوبہ بھر میں انجمن ترقی اُردو کی 108 فعال شاخیں تھیں۔ ہمارے اعزازی سیکرٹری فنا صاحب سر پھرے انسان تھے جو مختلف طریقوں سے اُردو کی خدمت کیا کرتے تھے۔ وہ تو بس جس کام میں پڑ گئے‘ اس کے ہو کر رہ گئے۔ دوروں پر گئے‘ دیہات دیہات مارے مارے پھرے‘ کانگریسی نیتاؤں کے پاس وفود لے گئے‘ اُردو کی بقا

کے لئے دھواں دھار تقریریں کیں اور ان ہی کی ترغیب اور کوشش سے شعر و ادب کی محفلوں کی بھی شمع روشن رہتی تھی اور یہ شمع انکے سامنے بھی لا کر رکھی جاتی تھی۔ ان کا تخلص فنا تھا۔ اس کی مناسبت سے وہ فنافی القوم تھے اور آج بھی فنا فی القوم ہیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ سن لیجئے۔ وہ درحقیقت میرے محبِ صادق ہیں اور سیاسی زندگی میں میرے یارِ غار ثابت ہوئے۔ وہ آج کل کراچی میں اسلم روڈ پر ایک موٹر گیراج میں جو انہیں چار پائی بچھانے کے لئے عطا ہوا تھا' اپنے درخشاں ماضی کو یکسر فراموش کر کے بچی کھچی زندگی تاریکی میں گزار رہے ہیں۔ اب تو ان کی انسانیت اور عظمت کمال کو پہنچ گئی ہے یعنی وہ قناعت و صبر کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں۔ سچ مانئے' ایسے موتیوں کی اس ملک میں کمی نہیں ہے۔ وہ تو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں اور زمانہ کی کھرل میں اتنے پس گئے ہیں کہ وہ کور چشموں کے لئے سرمۂ بصیرت بن سکتے ہیں۔

صوبہ کے بے شمار اکابرین میں سے خصوصاً سید عبدالرؤف شاہ صاحب جو ایک زود گو' پُر مغز' کہنہ مشق شاعر تھے' سید وکیل احمد صاحب رضوی' مولٰینا مفتی برہان الحق صاحب' خان صاحب سید یٰسین صاحب' عبدالوہاب صاحب وکیل' خان صاحب عبدالرحمان خان صاحب' محبّ الحق صاحب' تاج الدین صاحب' یعقوب خاں پٹیل' قاضی افتخار علی صاحب' سید عبدالہادی صاحب' آغا عبدالجبار خاں' ضمیر الدین احمد سہروردی' نذیر احمد خاں مالگذار' عبدالستار خاں صاحب' میر غلام احمد حسن صاحب' قاضی سید کریم الدین صاحب' سید قاسم علی صاحب' سید عبدالشہید صاحب' حاجی عبداللہ عیسیٰ سیٹھ صاحب' عبدالمجید ٹھیکہ دار' ہدایت علی صاحب' شرف الدین صاحب' سرفراز خاں صاحب ہیڈ ماسٹر' مسعود میاں جاگیردار' سید عبدالحمید انجینئر' ابراہیم خاں صاحب فنا' محمد اصغر صاحب (ان کا ذکر باب ''سروں کی گنتی'' میں ہے) محسن بھائی صاحب' سیٹھ محمد ہارون صاحب' مرزا اسمٰعیل بیگ' حکیم اسرار احمد صاحب' عبدالسلام فاروقی صاحب' عباس علی کمال صاحب' عبدالستار فاروقی' سعید حیات صاحب' عبدالرحمٰن صدیقی صاحب' سید صلاح الدین صاحب وغیرہ چند رہنمایانِ قوم کے نام درج کئے جاتے ہیں جنہوں

نے بہت نمایاں مذہبی، سیاسی اور لسانی خدمات انجام دیں۔صوبہ اسمبلی میں بھی مسلم اراکین جن کے چند نام اوپر درج کیے گئے ہیں جنہوں نے اپنی تقریروں، تجاویز، سوالات اور تحریک التوا کے ذریعہ آئینی جنگ میں حصہ لے کر مسلمانوں اور مسلم لیگ کی عقیدت اور سچائی کے ساتھ خدمت کر کے کانگریس کی کمزوریوں اور چیرہ دستیوں کو طشت از بام کیا اور شاندار کامیابیوں کا باعث ہوئے۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ صرف ہمارے صوبہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر صوبہ، ضلع، شہر اور قریہ میں ممتاز و مخلص رہنما موجود تھے اور ان کے علاوہ اللہ پر بھروسہ رکھنے والی تمام قوم جو سینہ سپر اور سر پر کفن باندھے ہوئے تھی، اپنے قائداعظمؒ کے ذرا سے اشارہ پر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتی تھی۔تمام محسنین کے نام درجِ کتاب نہیں ہو سکتے۔ چند کے نام قصداً چھوڑ دیئے گئے ہیں اور چند کے سہواً رہ گئے ہوں گے۔ واللہ اعلم یہ لوگ کس حال میں ہیں۔اگرچہ یہ ہم سے کوسوں دور ہیں لیکن دل سے بالکل قریب ہیں۔ اللہ انہیں خوش اور اپنی امان میں رکھے اور آفاتِ ارضی وسماوی سے بچائے۔آمین
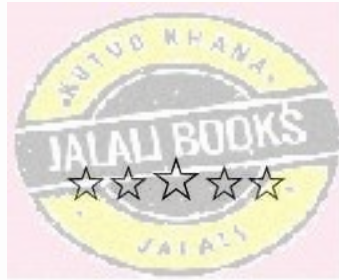
وڈّیا مندر

فانوس بن کے آپ حفاظت ہَوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

دنیا جانتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی فرمانروائی کے دور میں مذہبِ عیسائیت کی بغیر کسی مزاحمت کے خوب تبلیغ کی اور اپنی زبان' تہذیب وتمدن کو بھی خوب پھیلایا تھا۔ ہندوستان کے ہریجن جوق در جوق عیسائی ہونے لگے۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ چونکہ بادشاہ وقت عیسائی ہے' اس لئے بہت سی مراعات ملیں گی' نیچ ذات کا لیبل چھٹ جائے گا اور چھوت چھات کی لعنت دور ہو جائے گی۔ ہندو قوم نے برطانوی راج سے یہ سبق پہلی مرتبہ سیکھا کیونکہ مغلوں یا مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں اسلام کی تبلیغ کی طرف سے بہت کوتاہی کی گئی تھی اور سرد مہری کا ثبوت دیا گیا تھا۔ مسلمان بادشاہوں نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ کام صرف صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کا ہے۔ کاش ہمارے بادشاہ ''انی جاعل فی الارض خلیفہ'' کے فلسفے کو سمجھ کر اپنے فرضِ اولین یعنی تبلیغِ اسلام کو سب کاموں پر ترجیح دیتے تو شاید ہم ہندوستان میں اپنی تباہی وبربادی کے شاہد نہ ہوتے۔

کانگریس نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد انگریز حکمرانوں کی تاریخ اور ان کے سکھلائے ہوئے سبق کو دُہرانے کا طے کیا۔ انہوں نے سب سے پہلا سرکاری تحفہ مسلمانانِ سی پی وبرار کو ''وڈّیا مندر اسکیم'' کی شکل میں عطا کیا۔ اس کے موجد صوبائی وزیر اعظم پنڈت روی شنکر شکلا تھے۔ مسلمانانِ صوبہ نے حسب ذیل وجوہات کی بنا پر صدائے احتجاج بلند کیا:-

(1) ''وڈّیا مندر'' نام میں بقول شکلا جی ''ایک سے زیادہ کششیں ہیں اور دیہات کے رہنے

والے ننانوے فی صد لوگوں (ہندوؤں) میں اس نام سے روحانی ولولہ پیدا ہوتا ہے۔"

(2) وڈیا مندر اسکیم چونکہ "وردھا اسکیم کا بچہ ہے" اس لئے ہندی و مرہٹی ذریعۂ تعلیم ہوگی۔

(3) وڈیا مندروں کے نصاب میں صرف وہ کتابیں پڑھائی جائیں گی جن میں ہندو دیوتاؤں، ہندو سورماؤں اور ہندو کلچر کا ذکر ہے۔

مسلمانوں کے اس سلسلے میں تین مطالبات تھے کہ نام تبدیل کر دیا جائے، مسلمان بچوں کے لئے ہندی اور مرہٹی کے بجائے اُردو ذریعۂ تعلیم ہو یا مسلمانوں کو اجازت دی جائے کہ اگر انہیں بجائے چالیس بچوں کے 15 بچے میسر ہوں تو مدرسہ کھولیں اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر حکومت نصاب تعلیم میں وہ کتابیں بھی شریک کرے جس میں مسلم تہذیب اور مسلم بزرگوں کے حالات درج ہوں تاکہ ہندو مسلم طلبا ایک دوسرے کے بزرگوں اور تہذیب کو جان سکیں لیکن بیچارے مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

مسلمانوں سے جتنی آئینی کارروائیاں ہوسکتی تھیں، اس پر عملدرآمد کیا یعنی وزیر تعلیم کی خدمت میں وفود بھیجے اور صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے اراکین نے تحریک التواء پیش کی۔ 15 ستمبر 1938ء کو بیس ہزار نفوس کا ایک جلوس کونسل ہاؤس گیا لیکن ان بیچاروں کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی کیونکہ کانگریس ارباب حکومت مسلم آزار و مہاسبھائی ذہنیت کا شکار تھے اور اقتدار کی شراب سے بدمست۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو ٹھکرا کر بڑی ڈھٹائی سے اعلان کیا کہ ان کے یومِ آزادی یعنی 26 جنوری 1939ء کو سو (100) وڈیا مندروں کا افتتاح ہوگا۔

میں اس سلسلے میں صرف اس تاریخی خط کی بعینہٖ نقل پیش کر کے اکتفا کروں گا جسے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے رسوائے زمانہ ودیا مندر اسکیم اور مسلمانانِ صوبہ کی تعلیمی شکایات کو تحریر کر کے کانگریس کی اسلام کش پالیسی کا تار و پود بکھیرا اور کانگریسی زہر آلود تیروں سے بچنے کے لئے ہشیار کیا۔ اس اہم خط کے مطالعہ کے بعد صاف ہو جائے گا کہ (1) مسلم عامتہ الناس کتنے بے بس تھے (2) کانگریسی اور قوم پرست مسلمانوں کا اپنوں یعنی مسلم لیگ سے کٹ جانے

کے بعد کانگریس کی وسیع وعریض دنیا میں نہ کہیں مقام تھا اور نہ کوئی آواز۔ چوٹی کے کانگریسی ہندو رہنماؤں نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کو تسلیم کر کے اور اس کو دور کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے مجرمانہ خاموشی اختیار کی۔ اس سے یہ بھی صاف صاف عیاں ہو جائے گا کہ کانگریس کی کتنی عریاں مسلم کش پالیسی تھی اور وہ کتنی عیاری سے اپنے وزیروں کے ذریعہ اُسے رُوبکار لانا چاہتی تھی۔ بابائے اُردو کی ''کھلی چٹھی بنام مہاتما گاندھی'' ملاحظہ فرمائیے۔ اس کا متن ہے: ''مسلمان اور وڈیا مندر اسکیم''

''ڈیئر گاندھی جی

میں آپ سے تھوڑی دیر کے لئے دو چار صاف صاف اور سیدھی سیدھی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آپ چونکہ دوسروں کو سنتے ہیں اور ہر مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے مجھے اُمید ہے کہ آپ ہماری مشکل کو بھی آسان کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

آپ وڈیا مندر اسکیم سے بخوبی واقف ہیں اور آپ کو اس کا علم بھی ضرور ہوگا کہ صوبے کے مسلمان اس اسکیم سے سخت ناراض ہیں۔ اُن کو اس کے نام اور اس کی بعض تفصیلات پر اعتراض ہے۔ اس کی اطلاعیں آپ تک بھی پہنچتی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس مسئلے کی اہمیت اور اس ناراضی کی گہرائی کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ناراضی معمولی نہیں۔ صوبے کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت میں کوئی جائز کوشش اٹھا نہیں رکھی اور اب تک یہ جدوجہد جاری ہے۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس اور اس کی حکومتیں آپ کی رہنمائی میں ہیں اور یہ صورت ایسے صوبے میں پیدا ہوئی ہے جسے آپ کے قیام کا شرف حاصل ہے اس لئے یہ توقع بیجا نہیں کہ آپ اس مشکل کے حل کرنے میں مدد دیں گے۔ اس خیال سے میں اس کھلی چٹھی میں اُن تمام کوششوں کی نہایت مختصر روئیداد عرض کرتا ہوں تاکہ اس مخالفت اور ناراضی کی صحیح کیفیت آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔

صوبۂ متوسط و برار میں جب کانگریس کا اقتدار قائم ہوا تو اس کی پہلی برکت ''وڈیا مندر اسکیم'' کی صورت میں نازل ہوئی۔ وڈیا مندر کے نام اور اس کی بعض تفصیلات سے مسلمانوں

میں بہت اندیشہ اور اضطراب پیدا ہوا۔ چنانچہ سب سے اوّل انجمن ترقی اُردو ناگپور نے اس اسکیم پر غور کرنے کے لئے 23 جنوری 1938ء کو اپنا خاص اجلاس صدر مسلم لائبریری ناگپور میں منعقد کیا۔ بعد کامل غور و بحث کے مجلس نے اس اسکیم کے نام اور اس کی بعض تجویزوں سے شدید اختلاف ظاہر کیا۔ اس قرارداد کی نقل آنریبل وزیر تعلیم اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمت میں بھی بھیجی گئی۔

صرف اسی کاغذی کارروائی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ اس کے بعد ہی انجمن ترقی اُردو ناگپور کے رکن حکیم اسرار احمد صاحب نے سی پی کے سابق وزیر قانون مسٹر یوسف شریف کی معیت میں آپ سے شیگاؤں میں ملاقات کی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد آپ نے یہ تسلیم کرلیا کہ واقعی وڈّیا مندر نام بعض حیثیت سے قابلِ اعتراض ہے اس کے بجائے ''ودیالا'' یا ''پاٹ شالا'' زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔ آپ نے صریح الفاظ میں وعدہ کیا کہ آپ آنریبل مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبہ متوسط و برار سے گفتگو کرکے کوئی ایسی راہ نکالنے کی کوشش کریں گے کہ یہ اعتراض رفع ہو جائے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کو اپنا وعدہ یاد نہ رہا یا کسی وجہ سے آپ نے مسٹر شکلا سے اس کا تذکرہ مناسب نہ سمجھا ورنہ ممکن نہ تھا کہ وڈّیا مندر نام باقی رہ جاتا۔

اس ملاقات کے بعد 17 مارچ 1938ء کو مسلمانوں کا ایک عام جلسہ انجمن ہائی اسکول ناگپور کے میدان میں ہوا۔ ان کی دعوت پر میں خاص طور پر ناگپور پہنچا اور جلسے میں شریک ہوا۔ اس میں بالاتفاق وڈّیا مندر اسکیم کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی۔ دوسرے روز انجمن ترقی اُردو ناگپور کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں اس قرارداد کی تائید کی گئی۔ نیز یہ طے پایا کہ انجمن کا ایک وفد حکومت کی مقرر کردہ نصاب کمیٹی کے سامنے بھی اپنی شکایات اور مطالبات پیش کرے۔ چنانچہ وفد نے حکیم اسرار احمد صاحب کی قیادت میں 31 مارچ 1938ء کو ناگپور کے سکرٹریٹ میں 1/2 8 بجے صبح ارکان سے ملاقات کی اور ایک تحریری بیان پیش کیا۔

یہ مخالفت روز بروز بڑھتی گئی اور انجمن ترقی اُردو ناگپور کے علاوہ صوبے کی دوسری انجمنوں نے بھی اس اسکیم کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ یہاں تک کہ لیجسلیٹو اسمبلی کے

مسلمان ممبروں نے بھی اپنے دستخطوں سے اعلان کر دیا کہ وہ وڈیا مندر اسکیم سے متفق نہیں۔

اس اسکیم کی مخالفت صرف انہیں لوگوں کی طرف سے نہیں ہوئی جنہیں کانگریسی حلقوں میں فرقہ پرست کہا جاتا ہے بلکہ اُن مسلمانوں نے بھی جو قوم پرست یعنی نیشنلسٹ کہے جاتے ہیں، اس سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ چنانچہ جب مسٹر سوباش چندر بوس ہری پور کے سالانہ اجلاس کانگرس سے واپسی پر ناگپور تشریف لائے تو مسلم ماس کنٹیکٹ کمیٹی ناگپور کے ایک وفد نے مسٹر پی کے سالوے ایڈووکیٹ (مسیحی) کی قیادت میں مسٹر بوس سے آنریبل مسٹر مصرا کے بنگلے پر ملاقات کی اور ''وڈیا مندر'' کے متعلق تفصیلی گفتگو کر کے انہیں صوبے کے مسلمانوں کے خیالات اور اختلاف سے پورے طور پر آگاہ کیا۔ مسٹر بوس نے وفد کے مطالبات سے کامل اتفاق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اسی وقت وردھا جا رہے ہیں جہاں وہ آپ سے مشورہ کر کے اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ مسٹر بوس وردھا گئے بھی اور آئے بھی مگر افسوس کہ وڈیا مندر اپنی جگہ پر قائم اور اٹل ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ حال ہی میں صوبے کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں بھی وڈیا مندر کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کانفرنس برار نے بھی اپنے ایک اہم اجلاس منعقدہ امراؤتی میں وڈیا مندر کے خلاف سخت رنج وافسوس کا اظہار کیا۔ غرض کہ اُن مسلمانوں نے جو کانگرس سے بے تعلق ہیں اور نیز انہوں نے جو کانگرس میں شریک ہیں، متفقہ طور پر وڈیا مندر اسکیم کو نا قابل قبول ٹھہرایا۔

آپ کو غالباً یہ بھی معلوم ہے کہ صوبۂ متوسط و برار کے مسلمان سیاسی حیثیت سے کئی ٹکڑیوں میں منقسم ہیں لیکن جہاں تک وڈیا مندر اسکیم کا تعلق ہے، سب فریق متحد ہیں۔ ایک ایسی مخالفت جس میں کانگریسی، لیگی، فرقہ پرست، قوم پرست، غیر جانب دار، عامی و عالم سب شریک ہوں، معمولی اور بیجا مخالفت نہیں کہی جاسکتی۔ یہ امر آپ کے غور کے قابل ہے۔

مسلمانوں کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وڈیا مندر اسکیم کے متعلق جتنی کمیٹیاں بنائی گئیں،

ان میں صوبے کا کوئی مسلمان شریک نہیں کیا گیا حالانکہ ایسے مسلمان موجود تھے جو صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت سے پورے واقف تھے۔مسٹر شکلا کو خود اس کا خیال کرنا چاہئے تھا۔ یہ اسکیم کے حق میں بھی مفید ہوتا اور انہیں بھی معلوم ہو جاتا کہ اُن کی اسکیم کو ان کے مسلمان ہم وطن کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے کیا مطالبے ہیں' سو اس کے متعلق اس قدر لکھا جا چکا اور کہا جا چکا ہے کہ ان کا دہرانا ایک فضول سی بات معلوم ہوتی ہے۔تاہم یاددہانی کے لئے میں ان کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں:-

ودّیا مندر کا نام بدل دیا جائے

آپ فرمائیں گے کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ نہیں' نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔نام کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مسئلہ ہے اور آپ جیسے ماہر نفسیات سے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔مندر کے معنے اَور جو کچھ بھی ہوں لیکن عام طور پر جو اس کے معنے سمجھے جاتے ہیں' وہ ایک ایسے مذہبی مقام کے ہیں جہاں بتوں کی پوجا ہوتی ہے۔اس نام میں مذہب اور فرقہ پرستی کا گہرا رنگ موجود ہے۔اس بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔اسکیم کے فاضل مصنف آنریبل مسٹر شکلا کے اپنے الفاظ علی الاعلان اس کی شہادت دے رہے ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

''اس نام میں ایک سے زیادہ کششیں موجود ہیں۔دیہات میں ننانوے فی صدی کے لئے یہ نام روحانی ولولہ پیدا کرے گا۔''

وہ ایک سے زیادہ کونسی کششیں ہیں؟ روحانی ولولہ سے کیا مطلب ہے؟ یہ ایسی کھلی بات ہے کہ اس میں بحث و تکرار کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔کانگریسی حکومت کو جو قوم پرستی کا دعویٰ رکھتی ہے' اپنے کاموں اور ناموں کو مذہبی اور فرقہ پرستی کا رنگ دینا کسی طرح جائز نہیں۔میں نے مسٹر شکلا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس وقت جو نام رائج ہیں' انہیں میں سے کوئی نام اختیار کر لیں اور اگر وہ اپنی محبوب اسکیم کے لئے کوئی نیا نام ہی رکھنا چاہتے ہیں تو ''پڑھائی گھر'' رکھ لیں۔یہ خالص

ہندی لفظ ہے اور کسی کو اعتراض بھی نہ ہوگا لیکن انہیں کچھ ایسی ضد آ پڑی ہے کہ کیسی ہی معقول بات ہو،ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔شاید آپ سمجھائیں تو وہ سمجھ جائیں۔

تعلیم کی زبان

بیان کیا جاتا ہے کہ ودیا مندر اسکیم وردھا اسکیم کا بچہ ہے اور وہ وردھا اسکیم کے رواج دینے کے لئے ابتدائی تیاری کا کام دے گی۔ وردھا اسکیم اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔اس کی آخری صورت میں یہ طے پایا ہے کہ صوبے کی زبان لازمی طور پر ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے گی۔ سی پی نیز دیگر صوبوں میں کئی کئی زبانیں رائج ہیں۔مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ اُن کے بچوں کے لئے اُردو کا انتظام لازمی طور پر کیا جائے۔

نصاب کی کتابیں

اس وقت سی پی کے مدرسوں میں جو کتابیں رائج ہیں، اُن میں تمامتر ہندو دیومالا، ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال درج ہے۔ مسلم تہذیب و آداب یا مسلمان بزرگوں کا نام تک نہیں۔اس پر اعتراض نہیں کہ ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال کیوں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کے بزرگوں یا اُن کے کارناموں کا ذکر کیوں نہیں۔اگر آپ ملک میں قومیت اور محبت و آشتی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہ طریقہ نہیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہماری نصاب کی کتابوں میں ہندو اور مسلم تہذیب اور ہندو اور مسلم بزرگوں کے حالات ساتھ دیے جائیں تاکہ ہمارے طالب علموں کو ایک دوسرے کی تہذیب اور ایک دوسرے کے بزرگوں سے واقفیت ہو اور ان میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہو۔مثال کے طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اُردو ہند نے جو ریڈریں ریاست حیدرآباد کے مدرسوں کے لئے تیار کی ہیں، ان میں اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور وہ ایسی ہیں کہ کسی فرقے یا طبقے کو مطلق اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مسلمان اس امر کو گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے بچے اپنی تہذیب و آداب سے محروم رہیں اور کچھ اَور ہی ہو جائیں۔ یا تو مسلمان بچوں کے لئے ریڈروں کا الگ سلسلہ ہو یا پھر وہ ریڈریں ایسی

ہوں کہ وہ مسلمان بچوں کی تہذیبی ضرورت کو پورا کرسکیں۔

مدرسوں کے قیام کی شرط

وڈیا مندر اسکیم کی رو سے کسی گاؤں میں مدرسہ جاری کرنے کے لئے یہ شرط لازمی قرار دی گئی ہے کہ ایک میل کے گردے میں چالیس قابل تعلیم لڑکے اور لڑکیاں فراہم ہونے پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی آبادی سی پی میں اس قدر کم ہے کہ وہاں کے کسی گاؤں میں شاید ہی چالیس مسلمان پڑھنے والے بچے مل سکیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ جاہل رہیں گے یا ہندی اسکولوں میں شریک ہوکر اپنی زبان اور تہذیب دونوں کھوبیٹھیں گے۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں پانچ بچے اُردو پڑھنے والے ہوں، وہاں اُردو رسم الخط میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور جہاں دس یا دس سے زیادہ ہوں، وہاں ان کے لئے مدرسہ قائم کردیا جائے۔

موجودہ اُردو مدرسے

ایک مطالبہ مسلمانوں کا یہ ہے کہ صوبے میں اس وقت جو اُردو مدرسے موجود ہیں، وہ بحالہٖ قائم رہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ حال ہی میں صوبے کی حکومت نے بیتول کا اُردو مدرسہ بند کردیا حالانکہ سارے ضلع میں صرف یہی ایک اُردو سکول تھا۔ جہاں تک میں نے تحقیق کیا ہے، یہ عذر کہ طالب علموں کی تعداد کافی نہ تھی، اس لئے بند کردیا گیا (یا دوسرے لفظوں میں ہندی اسکول میں ضم کردیا گیا) صحیح نہیں۔ طالب علموں کی تعداد کافی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض دوسرے مقامات کے اسکول بھی بند کردیے گئے ہیں۔ اس سے صوبے کے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ جب میری انجمن کا نمائندہ قصبہ پانڈھرنا (ضلع چھندواڑہ) کے مدرسے میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکول شروع ہونے سے پہلے ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کر رہے ہیں۔ مسلمان

لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک بھول گئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ ''نمستے'' اور ''رام جی کی جے'' کہتے ہیں۔ کیا زبان وتہذیب کی حفاظت کے یہی معنی ہیں؟

مہاتما جی! ہم نے ہر جائز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا۔ ہماری تحریروں اور تقریروں، ہمارے جلسوں اور قراردادوں، ہمارے وفدوں اور گزارشوں کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

سی پی کے مسلمانوں نے اب تک صبر کیا ہے لیکن اب اُن کے صبر کے جام لبریز ہوتا نظر آتا ہے۔ آپ سے یہ آخری گزارش ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بصد عاجزی کے متنبہ کرتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہے گا کہ وہ آپ ہی کے ہتھیار آپ کے مقابلہ میں استعمال کریں۔

آپ کا مخلص
شرح دستخط عبدالحق
آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اُردو

☆☆☆☆☆

مدینۃ العلم

یہاں سے جب گئی تھی تب اثر پر خار کھائے تھی
وہاں سے پھول برساتی ہوئی پلٹی دعا میری
(مضطرؔ)

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کھلی چٹھی میں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کی تعلیمی شکایات رفع نہ ہوئیں تو وہ کانگریس کے خلاف کانگریس ہی کے حربے استعمال کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ جب مسلمان اپنی ہر آئینی و مصالحتی کوشش میں بری طرح سے ناکام ہو گئے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کا ارادہ کیا جو بہت نیک تھا لیکن بہت سی مشکلات تھیں جن پر بغیر قابو پائے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱) کانگریس کی مسلم رابطہ کمیٹی نے بڑے زور وشور سے زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا کہ مسلم لیگ بے عملوں کی جماعت ہے جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں اور جنگ کا موقعہ آئے تو میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔

(۲) ناگپور مسلم لیگ وڈیا مندر اسکیم کی مسلم کش مضرت رساں تعلیمی پالیسی کو ختم کرنے کی اس حد تک پابند ہو گئی تھی کہ اگر وہ خاموش تماشائی بن جاتی تو اس کا وقار اور وجود دونوں خطرہ میں پڑ جاتے۔

(۳) قائداعظمؒ کی آئین پسندی اور جنگجوانہ نہیں بلکہ مصالحانہ آئینی پالیسی کی وجہ سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس موقعہ پر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اسے واحد قومی متنازعہ فیہ مسئلہ بنائیں گے۔

(۴) یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ کانگریسی مسلم رابطہ کمیٹی جو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔ صرف اپنے بل بوتے اپنے کانگریسی ہائی کمان سے ٹکر لے کر اس اسکیم کو مسترد کرا سکے گی۔ علاوہ ازیں ہم اس مہم کو اپنے گھر میں خاموش بیٹھ کر انہیں سونپ نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی یقینی ناکامی سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے بڑی ضربِ کاری لگتی۔

(۵) مسلم لیگیوں کو قائداعظمؒ اور اقتدارِ اعلیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی سا بھی اقدام موردِ عتاب و تادیبی کارروائی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ہر نقطۂ نظر سے میری اور میرے رفقائے کار کی بڑی آزمائش کا وقت تھا۔

میری بڑی جواب داری تھی کیونکہ مسلم لیگ کے عہدوں اور بر بنائے رکنیت مرکزی اسمبلی مجھے اس مہم کو مسلم لیگ کو الگ تھلگ رکھ کر کامیاب بنانے یا پیچھے ہٹ جانے کا فوری فیصلہ کرنا تھا۔ میں تو بسم اللہ توکلت علی اللہ تعالیٰ'' کہہ کر اس دہکتی آگ میں اپنے مسلم رفقا کے ساتھ کود پڑا۔ لوگوں کا جوش اور پُر امن تنظیم قابل دید تھی۔ ہم نے کانگریسی ہتھیار سول نافرمانی کو کانگریسی حکومت کے خلاف استعمال کیا۔ قوم کا معتمد علیہ ہونے کی وجہ سے مجھے پہلے ستیہ گرہی جتھہ کی کمان سنبھالنی پڑی۔ سب ستیہ گرہی گرفتار ہوئے۔ دوسرے جتھے کی رہنمائی ابراہیم خاں فنانے کی۔ کانگریسی حکومت نے دھڑا دھڑ گرفتاریاں جاری رکھیں اور اس مہم نے طول کھینچا اور یہ تحریک صرف مسلمانوں کو جگانے کا ہی باعث نہیں ہوئی بلکہ اس نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور وقار کو چار چاند لگایا۔ روزانہ گرفتاریاں اس کثرت سے ہونے لگیں کہ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو ناگپور بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ حسن ریاض صاحب کو لے کر آئے۔ نواب زادہ صاحب کی آمد پر مسلمانانِ ناگپور نے ان کے شایانِ شان استقبال کیا اور شاندار جلوس نکالا۔ نواب زادہ صاحب بہ نفس نفیس اس دن ستیہ گرہ کی مختلف جھلکیاں اور گرفتاریاں ریسٹ ہاؤس اور سول سیکرٹریٹ سے دیکھ کر مطمئن اور خوش ہوئے۔ ان کی معاملہ فہمی، تدبر اور اعلیٰ سیاست دانی ''لیاقت شکلا معاہدہ''

کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی جس کی رُو سے مسلمانوں کو وڈّیا مندر اسکیم کے نفاذ سے صرف مستثنٰی ہی نہیں قرار دیا گیا بلکہ انہیں ایک خاص اسلامی ''مدینتہ العلم اسکیم'' حاصل ہوگئی۔ اس طرح نوابزادہ صاحب نے ہردواری اسکیم کی بجائے یثربی اسکیم دلوائی جس سے کانگریس کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور مسلم لیگ اور نوابزادہ صاحب کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

اس تعلیمی مہم کو سر کرنے کے بعد نوابزادہ صاحب موٹر کار سے جبلپور کے لئے روانہ ہوئے۔ موٹر چلانے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ پچھلی نشست پر حسن ریاض صاحب اور سیٹھ عبدالطیف صاحب بیٹھے تھے۔ نواب زادہ صاحب نے دورانِ سفر کامٹی اور سیونی میں دو بہت بڑے جلسوں کو مخاطب کیا۔ شام کے وقت جب دھوپ پیلی پڑ گئی تھی اور درختوں کے سائے بڑھ بڑھ کر تاریکی کو اذنِ عام دے رہے تھے' اس وقت ہم نربدا ندی کے اس پار گنجان جنگل اور بل کھاتے ہوئے پہاڑی راستہ سے گزر رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی ساٹھ ستر قدم کے فاصلہ پر جنگل کا بادشاہ یعنی ایک بڑا اپٹے والا شیر نہایت تزک واحتشام کے ساتھ سینہ تانے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے سڑک کو پار کر رہا ہے۔ میں نے نواب زادہ صاحب کو اس سین کی طرف متوجہ کیا۔ اس بادشاہ کا شاہانہ خرام' جلال' پرہیبت وپرشکوہ انداز الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ شاذونادر ہی ایسے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔

جبلپور پہنچنے پر نواب زادہ کا بہت بڑا جلوس لاٹھیاں بلند کر کے نکالا گیا جو مسلمانانِ جبلپور کے جلوس کی خصوصیت تھی۔ جبلپور بہادر مسلمانوں کی بستی ہے جسے بہادر پور کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا تھا۔ نواب زادہ صاحب کی رواداری اور مسلم لیگیوں کی قدردانی کی بدولت ہم لوگوں کو جلسہ کے اختتام پر یعنی گیارہ بجے رات کے بعد دو جگہ دو مرتبہ دو ڈنروں سے شکم پری کرنی پڑی۔ خوب مرغن غذائیں کھا کر آدھی رات کے بعد نوابزادہ صاحب عازمِ الٰہ آباد اور میں عازمِ دہلی اور بیچارے لطیف سیٹھ صاحب میری موٹر چلا کر عازم ناگپور ہوئے۔

یہ نہ سمجھئے کہ ''مدینۃ العلم'' کی کاغذی اسکیم کے منظور ہو جانے کے بعد اُردو کا مسئلہ حل ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کو مٹانے کی تحریک نے اَور زور پکڑا۔ اُردو دشمن ہندوؤں کے سینوں میں مخالفت کی آگ اور زیادہ بھڑکی۔ ان کی نئی چال یہ تھی کہ اُردو میں سنسکرت، ہندی، مرہٹی اور گجراتی کے دقیق الفاظ جابجا، محل بے محل زبردستی ٹھونسنے لگے حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو جن کے گھر میں اُردو بولی جاتی تھی، اگرچہ انہوں نے اُردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن وہ بھی اُردو کی اس ہیئت کذائی سے چیخ اٹھے اور آل انڈیا ریڈیو والوں پر بہت لال پیلے ہوئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل جو نشر و اشاعت کے وزیر اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے مانے ہوئے دشمن تھے، انہوں نے بھی بحیثیتِ حاکم ہندی کو فروغ دینے اور اُردو کی مسلمہ عوامی حیثیت کو گھٹانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ یو پی کے پنڈت سمپورنانند جی اور دیگر متعصب ہندی نواز جو مسلمانوں اور اُردو کو ایک آنکھ نہیں دے سکتے تھے اور جو سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے، انہوں نے ''آداب عرض'' پر سخت اعتراض کیا اور اصرار کیا کہ اس کے بجائے ''نمستے''، ''نمسکار''، ''جے رام جی کی جے'' کے جیسے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اُردو کے ساتھ جو جو زیادتیاں کی گئیں، اگر انہیں ضبطِ تحریر کیا جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑیں گے۔ مرکزی حکومت کے سپرد کردہ اختیارات کی آڑ میں شری پٹیل نے احکامات صادر کئے کہ یو پی اور دوسرے صوبوں میں ستر فی صدی ہندی کے الفاظ عربی، فارسی کے الفاظ کے بجائے استعمال کئے جائیں۔

ہمارے گھر کی حالت یہ تھی کہ مولوی عبدالحق صاحب مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی اُردو کی حمایت سے بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے اور شاید قائداعظمؒ سے صاف وصریح الفاظ میں کہلوانا چاہتے تھے کہ پاکستان کے بن جانے کے بعد وہاں کی ملکی زبان بجائے انگریزی کے اُردو ہو گی کیونکہ ہندوستان میں اُردو دشمنی کی وجہ سے وہ مایوس ہو کر اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ اب اس ملک میں اُردو کا صرف ماضی رہ جائے گا اور مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے اطمینانِ خاطر اور یقین دہانی کی غرض سے قائداعظمؒ کے اعزاز میں اپنی قیام گاہ ''دارالسلام'' میں

ظہرانہ ترتیب دیا۔ دراصل وہ دل کھول کر قائداعظمؒ سے ان کے دست راست نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی موجودگی میں بات چیت کرنا اور وعدہ وعید لینا چاہتے تھے۔ مجھے بھی دعوت میں شرکت کی عزت بخشی گئی۔ مولوی صاحب دیکھنے اور ملنے میں نرے زاہدِ خشک تھے لیکن بہت مہمان نواز۔ ہمیشہ ہی انواع و اقسام کے کھانے کھلاتے تھے لیکن اُس دن تو قائداعظمؒ مہمانِ خصوصی تھے، اس لئے کھانے کا اہتمام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ چونکہ مسئلہ بہت سادہ اور طے شدہ تھا، اس لئے بلاوجہ بحث و تمحیص میں وقت ضائع کر کے خوش ذائقہ ولذیذ کھانوں سے بے انصافی نہیں کی گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے قراردادِ لاہور کے پاس ہونے سے بہت پہلے اُردو کو متنازعہ فیہ مسئلہ بناتے وقت ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ اُردو مسلمانوں کی قومی زبان ہے، اس لئے وہ پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ پھر ظاہر ہے کہ ''در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست'' قائداعظمؒ نے فوراً اپنے فیصلہ کو دہرا دیا۔ اب تو مولانا بغیر چون و چرا کے قائداعظمؒ کے ہو گئے اور انہیں دنیا کا بہت بڑا سیاستدان اور مدبر تسلیم کرلیا۔ قائداعظمؒ کی حیات تک ان کے ہو کر رہے اور بعد میں ان کے تسلیم کردہ جانشین نوابزادہ لیاقت علی خاں کے ہو گئے جنہوں نے برسراقتدار آنے پر اپنے پیش رو کی اُردو پالیسی میں بال برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کا بھی ہمارے نئے ملک پاکستان پر بڑا احسان ہے۔ اس نے مطالبۂ پاکستان کو صرف تقویت ہی نہیں بخشی بلکہ حصولِ پاکستان کا بھی باعث بنی۔

قیامتِ صغریٰ

وہ جو سو رہا ہے مدینہ میں کوئی جا کے اُس کو یہ خبر دو
چلی آ رہی ہیں وہ آندھیاں کہ چمن حضورؐ کا اڑ چلا

(ظفر علی خاں)

جب کانگریسی حکمرانوں نے مسلم اقلیتی صوبوں میں اپنی طاغوتی طاقت اور بہیمانہ اکثریت کی بناء پر خوف وہراس کے ذریعہ مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی خاطر روح فرسا مظالم کا آغاز کیا تو اُس وقت سی پی و برار میں کانگریسی حکمران پارٹی کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ سی پی و برار ویسے ہی اپنے جنگلوں اور محفوظ شکار گاہوں کے لئے جہاں بکثرت بڑا شکار ملتا ہے، بہت مشہور ہے لیکن کانگریس راج جو ہر زاویۂ نگار سے کسی بھی حالت میں جنگل راج سے کم نہیں تھا' مزید شہرت کا سبب بنا اور ساتھ ہی ساتھ یہ صوبہ سفاکی کا مرکز بن گیا۔ گزارش ہے کہ دل تھام کر اس سانحۂ عظیم کی روئیداد غور سے سنیئے۔

تھم ذرا بیتابیٔ دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے

ایک درندہ صفت کہنے کو انسان لیکن حقیقتاً حیوانِ مطلق چاند ور بسوہ میں رہتا تھا۔ یہ قصبہ بسوا برج اصل میں نا ندورا اور ملکاپور کے درمیان جی آئی پی کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے جہاں یہ گرگ منش اپنی شیواجی ذہنیت اور برسر اقتدار کانگریس پارٹی کا رکن ہونے کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ مزید برآں تعلقہ کانگریس کمیٹی کا صدر ہونے کی وجہ سے وہ برار کے مشہور

کانگریسی لیڈر آنریبل مسٹر برج لال بیانی رکن کونسل آف اسٹیٹ کا چہیتا پٹھو بھی تھا۔ اس بھیڑیئے صفت انسان کو جگد یوراؤ پٹیل کہتے تھے۔ مسلمانوں کی دل آزاری اور اسلام دشمنی اس کا مقصدِ حیات تھا۔ چونکہ یہ تک بندی کیا کرتا تھا' اس لئے ہندو اسے کوی (شاعر) کہا کرتے تھے۔ اس کے شائع شدہ کلام ''قرآن کی غزلیں'' کو انگریزوں کے دورِ حکومت میں جسے معلّم الملکوت کے کانگریسی چیلے چپاٹے شیطانی حکومت کہا کرتے تھے' ضبط کرلیا گیا تھا اور اس کا دوسو روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی اشتعال انگیز حرکتوں یعنی تعزیہ پر گوبر' مسجد اور لائبریری میں غلاظت پھنکوانے سے باز نہیں آتا تھا۔ آخر کار ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ چند بے گناہ مسلمانوں کو صدقہ کا بکرا بنا کر بہت دنوں تک زیرِ حراست رکھا گیا۔ چونکہ ماخوذین معصوم اور سخت جان تھے' اس لئے انہیں عدالت نے بری کردیا۔

اب تو کانگریسی دور اور ہندو راج قائم ہوگیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام نے خطرناک حربے استعمال کرکے اور اپنی بے پناہ اکثریت سے مرعوب کرکے نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مزید برآں سیاں کوتوال ہوگئے تو جگد یو نے اپنے غنڈے دوستوں اور شریر لونڈوں کے ساتھ روزانہ ''پربھات پھیری'' کا جلوس مسلمانوں کے محلے اور مسجد کے سامنے سے بلا ناغہ نکالنا شروع کیا۔ اس ''پربھات پھیری'' میں بھجن کے بجائے'' قرآن کی غزلیں' گائی جاتی تھیں۔ بستی کے صلح کل اور سمجھدار مسلمانوں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ باز نہیں آیا کیونکہ وہ تو دشمنی اور طاقت کی شراب کے نشہ سے بدمست ہوگیا تھا۔ مجھے خوفِ خدا اجازت نہیں دیتا ورنہ میں تو اس کی قافیہ وردیف سے عاری تک بندی سنا کر یہ ثابت کرتا کہ ٹھنڈا سے ٹھنڈا دل رکھنے والا اور بزدل سے بزدل مسلمان بھی اس شاتمِ رسول اکرمؐ کی دشنام طرازی سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ 'نقلِ کفر' کفر نباشد' لیکن دل اجازت نہیں دیتا کہ خود بھی گنہگار بنوں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گنہگار بناؤں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا' جگد یو کا جوشِ انتقام اور جوشِ دل آزاری ٹھنڈا ہونے کے بجائے تیز تر ہوتا گیا۔ اس کی چھیڑ خانی بڑھتی گئی۔ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر ''اسلام مردہ باد'' نظام مردہ

باد'' مسلم لیگ مردہ باد'' کے نعرے لگاتا اور الاپ الاپ کر اونچے سروں میں عین باجماعت نماز کے وقت مسجد کے دروازے کے سامنے اپنے چیلوں کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کی شان میں گستاخی کرتا۔ مسلمانوں نے تقریباً بارہ سال تک بڑی لمبی ڈوری چھوڑی تاکہ یہ مفسد و متفنی لوگ اپنے گلوں میں پھندے ڈال کر خودکشی کرلیں یا راہِ راست پر آ جائیں لیکن یہ دوزخی کیونکر دوزخ سے بچتے۔ مسلمان خون کے گھونٹ پی پی کر بہت دنوں تک برادشت کرتے رہے اور آخر کب تک اپنے خدا' پیغمبر' مذہب اور ناموس کی بے حرمتی دیکھا کرتے آخر وہ گھڑی اور دن آ ہی گیا جب ان کے صبر کا لبریز پیمانہ چھلک گیا ؎

تعجب کیا جو مظلوموں کو جوشِ انتقام آئے
کہ بجلی بھی تو آخر پرورش پاتی ہے پانی میں

ہوا یوں کہ 17 مارچ 1939ء کو جب کہ چاندور بسوا کی مسجد میں نمازِ عصر باجماعت ادا کی جاتی تھی' اس وقت ننگِ انسانیت جگد یوراؤ اپنے بدقماش رفقاء کے ساتھ مسجد کے سامنے گستاخانہ گیت دوگانہ کے انداز میں گانے لگا۔ عصر کی نماز میں چند ہی مسلمان شریک تھے۔ وہ مشتعل ہوکر باہر نکل آئے۔ فریقین میں تصادم ہوا۔ جگد یو زخم کاری کی تاب نہ لاکر ''فی النار والسقر'' ہوا۔ یہ خبر آگ کی طرح ناگپور تک پھیل گئی۔ وزیرِاعظم پنڈت روی شنکر شکلا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اسمبلی کا اجلاس چھوڑ کر بمعہ پولیس فورس جگد یو کی آرتھی پر تعزیتی تقریر کرنے گئے اور ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے والی بڑی جوشیلی اور مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرانے والی شرارت آمیز تقریر کی۔ پولیس عام خطوط پر جیسا کہ قتل کے معاملہ میں تفتیش ہوتی ہے' کر رہی تھی لیکن اب تو نقشہ ہی بدل گیا۔ وزیرِاعظم نے ناگپور سے سی آئی ڈی کے کٹر ہندو مہا سبھائی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رائے صاحب پرمیشور دیال کو تفتیش کا کام سپرد کیا۔ انہوں نے اپنی ترکش سے پہلا تیر چھوڑا اور تفتیش کنندہ افسروں میں سے واحد مسلم داروغہ کو فوراً ہٹا کر دور دراز کے پولیس تھانہ میں منتقل کر دیا۔ دوم' تعزیراتی پولیس مقرر کر کے اس کے تمام اخراجات کا بار مسلمانوں پر ڈالا گیا اور

اس تعزیری جرمانہ کی سزا کو ناکافی سمجھ کر بے گناہ مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اس سے پہلے گیارہ مسلمان گرفتار کئے گئے تھے۔ چونکہ ہندو ڈپٹی صاحب کے سر پر پنڈت شکلا کا ہاتھ تھا' اس لئے انہوں نے پانچ سو کی مسلم آبادی میں سے ایک سو چھیالیس مزید گرفتاریاں کر ڈالیں جن میں دولڑکے بارہ اور چودہ سال کی عمر کے' ایک پچھتر سالہ بوڑھا' ایک اندھا' ایک قریب المرگ صاحبِ فراش جسے چارپائی پر ڈال کر تھانہ لے گئے' زیرِ حراست تھے۔ موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں نہ تو پانی کا انتظام تھا اور نہ بھوکے پیٹوں میں روٹی کا ٹکڑا ڈالنے کا بندوبست تھا۔ یہ انسانیت سوز سلوک اس لئے روا رکھا گیا کہ کانگریسی حکومت کی نظر میں وہ تمام لوگ صرف ایک ہندو کے قاتل قرار دیے گئے تھے۔ پولیس دفعات کے مطابق قاتلوں کو ہتھکڑی پہنانا لازمی تھا لیکن وہ اتنی ہتھکڑیاں کہاں سے لاتے۔ اس لئے ان بھیڑ بکریوں یعنی ان حیواناتِ ناطق کی کلائیاں رسیوں سے باندھ دی گئیں۔ جب رات آئی تو حوالات کا کمرہ یعنی سرکاری مہمان خانہ بہت چھوٹا پایا گیا جس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ اتنے قیدی بند کئے جاتے۔ لہٰذا مقامی مدرسہ کا ایک کمرہ جو 20x30 فٹ تھا' ان ایک سوستاون ناطق مویشیوں کے لئے موزوں کانجی ہاؤس سمجھا گیا۔ ماہ اپریل کی شدید گرمی اور یہ بھیڑ بھاڑ جس سے یقیناً کلکتہ کی کال کوٹھری کو بھی رشک آ رہا ہوگا' بیچارے مسلمان خوف دہراس سے کانپ اٹھے۔ ان کے رشتہ داروں پر بھی ستم ڈھایا گیا کہ ہندو پبلک نے ان کا حقہ پانی بند کر دیا یہاں تک کہ کسی دکاندار نے سودا سلف بھی نہیں دیا اور کفن کے لئے کپڑا بیچنے سے بھی انکار کر دیا۔

بمصداق ڈوبتے کو تنکے کا سہارا' بابو سوباش چندر بوس صدر کانگریس کو تار بھیجا گیا جن کی صدارت کی نیا اس زمانہ میں کانگریسی سازشوں کی بدولت غرق ہوا چاہتی تھی۔ اُنہوں نے چپ کی سادھی۔ کانگریس کے کرتا دھرتا مسٹرایم کے گاندھی نے بھی تار کے ملنے کے بعد چپ کا برت رکھ لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ستم بر ستم اس سنگین معاملہ کو جب ان کی توجہ مبذول کرائی گئی تو مہا منتری پنڈت روی شنکر شکلا کی طرف رجوع کیا۔ گویا بھیڑیئے سے کہا کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرو۔

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

(فیض)

نائب خداونائب رسولؐ یعنی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد سے جنہیں کانگریسی ہائی کمان میں شعبۂ اسلام کا قلمدانِ وزارت سپرد تھا' انصاف کرنے کو کہا گیا لیکن وہ بیچارے ہندو دیوتاؤں کے غیظ وغضب سے ایسے سہمے کہ ان کی گھگی بندھ گئی اور وہ بے دست و پا ہوکر رہ گئے۔ اب صرف اللہ کا سہارا اور قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی حمایت کی توقع باقی رہ گئی تھی۔صوبائی مسلم لیگ اور بالخصوص مسلمانانِ ناگپور نے ان مصیبت زدگان کی دامے درمے قدمے اور سخنے عرصے تک خدمت کرکے اسلامی اخوت کا ایک بہترین قابلِ یادگار مظاہرہ کیا۔

برار کے چند مقتدر مسلم لیگی اور مسلم رہنماؤں کا ایک وفد انگریز ڈی آئی جی پولیس مسٹر ٹیلر سے ملا۔کوششِ بسیار کے بعد انہوں نے ایک سو چودہ مسلمانوں کو رہا کرایا اور باقیماندہ تینتالیس مسلمانوں کا صوبہ کی راجدھانی ناگپور میں سیشن جج مسٹر ایم این کلارک آئی سی ایس کی عدالت میں چالان پیش کیا گیا۔ناگپور میں اس مقدمہ کی بلڈانہ (برار) سے منتقلی کے بعد ناگپور کے مسلمانوں کی جواب داریاں بہت بڑھ گئیں۔مقام مسرت ہے کہ وہ اس سے بڑی اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے۔

صوبائی مسلم لیگ نے مقدمہ کی پیروی کے لئے اپنے صوبہ کے قابل و تجربہ کار مشہور مسلم لیگی وکلاء سید وکیل احمد صاحب رضوی' محمد محب الحق صاحب اور کھام گاؤں کے وکیل اصغر علی صاحب کو مقرر کیا۔موخر الذکر ملزمین کی گرفتاری' ابتدائی عدالت' سیشن اور ہائی کورٹ سے بریت تک تمام قانونی خدمات انجام دیتے رہے۔ان ممتاز وکلاء نے رات دن محنت کرکے تن دہی اور خلوص کے ساتھ بے گناہ ملزمین کو رہا کرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بیچارے مسلمانوں کا ہندوؤں کی جانب سے سماجی مقاطعہ اتنا مکمل تھا کہ مسلم ملزمین کی طرف سے ایک بھی صفائی کا گواہ پیش نہ کیا جاسکا۔توقع تھی کہ چونکہ جج انگریز ہے' اس لئے اس پر کانگریسی

حکومت کا جادو نہیں چلے گا اور وہ اس کے ہاتھ میں نہیں کھیلے گا۔ بہرحال شومئ قسمت دیکھئے کہ ایک ہندو کے قتل کے الزام میں چھ مسلمانوں کو پھانسی کی سزا' چوبیس کو حبسِ دوام اور ایک کو قید تا نشستِ عدالت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزائیں سنائی گئیں۔ بارہ کو رہا یا بری کر دیا گیا۔ اس فیصلے نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی اور ضرب المثل برطانوی انصاف پر سے ان کا اعتماد اُٹھ گیا اور وہ گندم نما جو فروشوں کو خوب پہچان گئے۔

یہ صحیح ہے کہ انگریز جج کے ایک یکطرفہ فیصلے نے برطانوی قصر انصاف کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیا لیکن وہ جج بھی ایک سو ستاون مسلم قیدیوں کو اسکول کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں مقید کئے جانے سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا اور تڑپ کے اپنے فیصلہ میں جو 24 فروری 1940ء کو سنایا گیا' لکھا ہے: ''یہ واقعہ موجودہ زمانہ میں سلطنتِ برطانیہ کے ایک مہذب علاقہ میں نازی جرمنی کی بربریت کی عکاسی کرتا ہے۔'' اس فیصلے نے مسلمانانِ ہند کے دل ہلا دیئے اور وہ آنے والی مصیبتوں کے خیال سے ''واعتصمو بحبل اللّٰہ جمیعا'' پر سختی کے ساتھ کاربند ہو گئے۔

مرکزی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے قائداعظمؒ دہلی میں فروکش تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ مجھے طلب فرما کر مقدمہ کی روئیداد بہت توجہ سے سنی۔ اس موقع پر میرے نوجوان دوست مسٹر سرفراز خاں مالک سرفراز آٹوز میرے ساتھ تھے۔ قائداعظمؒ نے مرکزی اسمبلی میں میری مسلمانانِ سی پی و برار کی واحد نمائندہ حیثیت جتلا کر فوراً چاندور بسوا جانے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا: ''اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود پیروی کرتا لیکن میں موجودہ سیاسی حالات کی وجہ سے دہلی سے باہر نہیں جا سکتا۔'' اُنہوں نے مزید ہدایت کی کہ موقعہ پر جائزہ لینے کے بعد میں ان کے بمبئی ہائی کورٹ کے چار انتخاب کردہ وکلا میں سے حسب ترتیب ایک وکیل سے جو راضی ہو جائے' ناگپور ہائیکورٹ میں پیروی کراؤں۔

میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ فہرست کے مطابق چوتھے وکیل مسٹر سوجمی کی دو سطریں لکھ دیں کہ یہ ایک بڑی قومی خدمت ہے' فیس میں رعایت کریں۔ قائداعظمؒ کو میری یہ

بات کچھ بھلی نہ لگی۔ انہوں نے فرمایا ''یاد رکھو! جس سے کام لو اُسے پوری اُجرت دو۔'' میں نے اس بات کو ابھی تک گرہ میں باندھ رکھا ہے۔

اگرچہ اس اہم خدمت کی سپردگی میرے لئے قائد اعظمؒ کے کمال اعتماد و قدر دانی کا بین ثبوت تھا لیکن میرے ناتواں کندھوں کے لئے بڑا بارِ گراں۔ میری تقرری سے باہمی شکر رنجیاں اور غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کے بہت احتمال تھے لیکن خدا بھلا کرے میرے اکابرین اور مسلمانانِ صوبہ کا جنہوں نے قائد اعظمؒ کے اس حکم کو بھی اپنی عادت کے مطابق سراہا اور میرے اس بھاری بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ہر ہر قدم پر عملی تعاون کر کے قائد اعظمؒ کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کا ثبوت دیا۔ البتہ ابتدائی زمانہ میں ہمارے کچھ احباب خصوصاً چند ملزمین کے عزیزوں کی رائے ہوئی کہ اگر کوئی کانگریسی وکیل عدالت عالیہ میں ملزمین کی پیروی کرے تو ان کی بریت کے امکانات بہت زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے خود ہی مشہور کانگریسی بیرسٹر آصف علی صاحب کا نام تجویز کیا۔ اس زمانہ میں وہ مرکزی اسمبلی کے رُکن اور میرے جاننے اور ملنے والے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ تجویز ایک دودھاری تلوار ہے جو استغاثہ کو بلاشک کاٹ کر رکھ سکتی ہے لیکن اگر صفائی کے خلاف چل پڑے تو صفایا کر کے رکھ دے گی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بہت خطرناک اقدام ہوگا کیونکہ کانگریسی وزیر اعظم ہی کے حکم سے پکڑ دھکڑ ہوئی تھی اور ان ہی کے ایماء و مشورہ سے مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ بہرحال میں نے آصف علی صاحب کو داستانِ غم کا کچا چٹھا لکھ کر پیروی کرنے کی درخواست کی۔ اُنہوں نے بحیثیت انسان و مسلمان میرے اور میری قوم کے آنسوؤں کے سیل رواں سے ایک دو قطرے بھی پونچھنے گوارا نہیں فرمائے اور ایک روکھا سوکھا کاروباری جواب لکھ مارا۔ اس طرح اللہ نے میری گلوخلاصی کرائی ورنہ کچھ عرصہ کے بعد قائد اعظمؒ کی گہری دلچسپی اور خصوصی توجہ کے بعد میں تو کہیں کا نہ رہتا۔ کانگریسی بیرسٹر آصف علی صاحب کا جواب بغیر کسی مزید تبصرہ کے حاضر خدمت ہے۔ حقیقتاً صوبہ کے ممتاز وکلا جنہوں نے سیشن جج کی عدالت میں پیروی کی تھی ناگپور ہائی کورٹ میں پیروی کرنے کے بالکل اہل تھے

لیکن میری ناقص رائے میں قائداعظمؒ اُسے کل ہند مسئلہ بنانا چاہتے تھے تاکہ ہندوستان سے باہر بھی اس کا چرچہ ہو اور دنیا کانگریس کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھ سکے۔ اس لئے بمبئی کے بیرسٹر کو مقامی وکلاء پر ترجیح دی۔

میں نے چاندور بسوا میں اپنی آنکھوں سے جو قیامتِ صغریٰ بپا تھی، جا کر دیکھی اور نااندوراوالے مرزا بسم اللہ بیگ صاحب کی معیت میں عازمِ بمبئی ہوا جہاں قائداعظمؒ کے ایلچی کی حیثیت سے سرجمشید جی کانگا، سر پی این انجینئر اور ایک انگریز بیرسٹر سے ملا۔ ان سب نے تعطیلات گرما اور موسم گرما کی شدت کی وجہ سے یورپ جانے کا عذر کیا۔ حسبِ فہرستِ قائداعظمؒ مسٹر کے اے سوجی کا آخری نام تھا۔ یہ خود قائداعظمؒ کے عقیدت منداور مسلم لیگ کے بڑے حامی تھے۔ فوراً راضی ہو گئے۔ وہ بمبئی ہائی کورٹ کے ایک نامور فوجداری بیرسٹر تھے۔

صوبہ مسلم لیگ نے میرا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کا نام چاندور بسوار یلیف کمیٹی تھا۔ صوبہ کے ممتاز عالم دین، کُل ہند شہرت کے مالک و نائب صدر صوبہ مسلم لیگ مولانا مفتی محمد برہان الحق صاحب اس کمیٹی کے صدر تھے اور صدر صوبہ مسلم لیگ حضرت سید عبدالرؤف شاہ صاحب جن کا قوم کی خدمت کرنا اور اُن پر مرمٹنا مقصدِ حیات تھا، اپنی اعلیٰ شخصیت اور صوبائی مسلم لیگ کے اپنے سب سے بڑے عہدہ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے مصیبت زدوں اور بے گناہ کو تختۂ دار سے صحیح و سالم اُتارنے کے لئے کمیٹی کے معمولی رکن بن کر خدمت کرنے کے لئے میدان میں آ گئے تاکہ ان کی اطمینان بخش خدمت کی جا سکے۔ نااندورہ کے مرزا بسم اللہ بیگ صاحب کو جو بلڈانہ کے ایک بااثر متمول رئیس اور چند ملزمین کے قریبی رشتہ دار تھے، کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ خازن کے عہدہ کی اہمیت کو بڑھانے اور تنگدستی پر دولت مندی کا زرّیں خول چڑھانے کے لئے کامٹی کے ایک مخیّر رئیس اور بزرگ انسان الحاج خواجہ میاں پٹیل کو خازن بنایا گیا۔ آپ کا تابعدار سیکرٹری کے فرائض انجام دینے پر مامور کیا گیا۔ مذکورہ بالا بزرگوں کی توجہ، گہری دلچسپی اور سرپرستی سے کمیٹی کے تمام کام صرف آسان ہی نہیں بلکہ کامیاب ہوئے۔

بیرسٹر سوجی کے انتخاب کے بعد ایک اور کافی پریشان کن اور مشکل مسئلہ درپیش ہوا۔ چند پھانسی پانے والے اور حبس دوام کے قیدیوں نے ناگپور سنٹرل جیل سے بذریعہ خط مجھ سے تندو تیز انداز میں مطالبہ کیا کہ عدالت عالیہ میں ان کی پیروی صرف ان کے پسند کے وہ صوبائی وکلا کریں گے جو سیشن جج کی عدالت میں ان کی طرف سے پیروی کر رہے تھے۔ انہوں نے صاف صاف الفاظ میں مجھے اس امر سے بھی متنبہ کر دیا کہ اگر میں ان کی خواہش پوری نہیں کروں گا اور اگر ان کی سزائیں بحال رہیں تو قیامت کے دن وہ سب اللہ کے روبرو میرا دامن پکڑیں گے۔ اتنا بڑا مواخذہ اور میں تنہا صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ عقبیٰ میں بھی باز پرس کے ڈر سے لرز گیا۔ بہرحال میں نے قائداعظمؒ کے حکم، قومی مسئلہ کی نزاکت اور قیدیوں کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر ان سے علیحدہ علیحدہ جا کر ملاقات کی اور قائداعظمؒ کی ذاتی دلچسپی اور مفید مشوروں کا ذکر کیا جس نے طلسم کا کام کیا اور وہ موم ہو گئے اور مجھے بھی دامن گیری کے خوف سے نجات ملی اور قائداعظمؒ سے میری والہانہ عقیدت میں بھی حیرت انگیز رفتار سے اضافہ ہو گیا۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ میرے بمبئی جانے سے چند ہفتہ قبل حکیم اسرار احمد صاحب کریوی اور میرے عزیز دوست سید اکرام الدین صاحب کسی نامور فوجداری وکیل کی تلاش میں بمبئی گئے تھے جہاں ہمارے مسلم لیگی رہنما اور مزدوروں کے مسلمہ لیڈر ایڈووکیٹ مرزا اختر حسین صاحب نے اس وفد کا ازراہِ کرم ہاتھ بٹانے میں ہر ممکنہ امداد کی۔ میرا دل اپنی ذمہ داری اور اپنے قائداعظمؒ اور اپنی قوم کو جوابدہ ہونے سے بہت لرزاں تھا۔ علاوہ ازیں قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے وقار کا بھی سوال تھا لیکن میں نے تو اپنی چھوٹی سی کمزور کشتی کو ؎

تو ہی بھروسہ تو ہی سہارا
پروردگارا پروردگارا

(حفیظ)

"بِسمِ اللّٰہِ مجرٖھَا وَ مُرسٰھَا" کہہ کر بھنور میں ڈال دیا تھا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بزرگانِ دین و اولیائے کرام کی دعائیں قائداعظمؒ و مسلم لیگ کے ساتھ تھیں اور اسے ثابت کرنے

کے لئے تاکہ آپ کا بھی ایمان تازہ اور مضبوط ہو جائے' کرامت کا ایک واقعہ سنادوں۔ ہم پاکستانی ویسے بھی ولیوں کی اُن کرامات سے بہت اچھی طرح واقف اور قائل ہیں جو ستمبر 1965ء کی بھارت کی جارحانہ وبزدلانہ جنگ کے دوران رونما ہوئیں۔ عجب اتفاق ہے کہ جب عدالت عالیہ کے اخراجات کے لئے فراہمیٔ چندہ کی مہم جاری تھی' اس وقت ناگپور میں حضرت بابا تاج الدین رحمتہ اللہ علیہ کا عرس شریف ہورہا تھا۔ مجھے صغیر سنی سے بابا صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی جب کہ میرے والد مرحوم ان سے ملنے اور مجھے ملانے کے لئے ناگپور کے پاگل خانے یا اس کے اکناف میں لے جایا کرتے تھے جہاں بابا صاحب کو ایک روایت کے مطابق کامٹی میں متعین مدراس رجمنٹ سے پاگل قرار دے کر فوج سے علیحدہ کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں پاگل خانہ کا سب سے بڑا ڈاکٹر ناگپور کا انگریز سول سرجن ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ ہی چیف کمشنر اور بعد میں گورنر کا ذاتی معالج ہوتا تھا۔ پرانے زمانہ کے حالات سے جو لوگ باخبر ہیں' وہ اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اس زمانہ میں نیٹو ڈاکٹروں کو اہم عہدے سپرد نہیں کئے جاتے تھے اور نہ انگریز افسر اُن سے علاج کرواتے تھے۔ بابا صاحب کو رات کے وقت کوٹھری میں بند کر کے لوہے کے دروازے میں بڑا سا قفل ڈال دیا جاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ پاگل خانہ کے باہر انتہائی آزادی کے ساتھ گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ماتحت حکام اور بالخصوص پاگل خانہ کے انچارج ڈاکٹر عبدالمجید خاں اپنے بالا افسر سول سرجن کو رپورٹ کرتے جو الٹا ان لوگوں کی خبر لیتا اور بابا صاحب کے پاگل خانہ کے باہر پھرنے کو ان کے فرائض سے غفلت اور لاپرواہی پر محمول کرتا۔ وہ ہمیشہ اس امر واقعی کے ماننے سے منکر تھا کہ بابا صاحب مقفل کمرہ اور پاگل خانہ کے مقفل کمپاؤنڈ سے باہر جا سکتے ہیں۔ ایک دن اس نے اپنے ہندوستانی افسرانِ زیریں کو جھٹلانے کیلئے بابا صاحب کو اپنے سامنے کوٹھری میں بند کر کے خود قفل لگایا اور چابی جیب میں ڈال کر چلا گیا اور نصف شب کے بعد معائنہ کے لئے آیا تو کوٹھری خالی لیکن مقفل تھی۔ خوب جانچ پڑتال کی اور حیرت زدہ اپنے بنگلہ کو چلا گیا۔ جب صبح آیا تو بابا

صاحب کو کوٹھری میں جیسے شام کو چھوڑ کر گیا تھا' بند پایا۔ اس دن سے بابا صاحب پر سے تمام پابندیاں اٹھالی گئیں اور وہ اس پاگل خانہ میں ایک عرصہ تک مقیم رہے۔ معلوم نہیں انہوں نے اس پاگل خانے میں کتنوں کو معرفت کے سبو سے مئے عرفان پلائی اور کتنوں ہی کے بگڑے ہوئے مقدر کو بنادیا۔

دراصل یہ پاگل خانہ اب ولی خانہ بن گیا تھا۔ ایک کرامت ہو تو بیان کی جائے۔ یہاں تو شب و روز کرامتوں کا ظہور ہوتا تھا لیکن ایک ایسی کرامت کا حال سناؤں جس کے راوی میرے والد مرحوم تھے۔ وہ حضرت کے معتقد ضرور تھے لیکن عقیدت کی پختگی غالباً اس حد تک نہیں ہوئی تھی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ ایک مرتبہ انہیں عالم تذبذب میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے وہ بہت دلگیر اور نادم ہوئے لیکن اس کے بعد سچے عقیدتمند بن گئے اور تازیست رہے۔

ایک دن وہ بابا صاحب کے لئے نہایت اہتمام سے انڈے کی مٹھائی جسے پیوسی کہا جاتا تھا' بنوا کر لے گئے۔ بابا صاحب پاگل خانے کے باہر سڑک کے کنارے گٹی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند حاجت مند لوگ منّت اور مرادوں کے کشکول لئے ہوئے دربار میں موجود تھے۔ والد نے مٹھائی پیش کی جسے حضور بہت شوق اور رغبت سے کھانے لگے۔ والد صاحب کے دل میں معاً یہ خیال آیا کہ حضور کو ایسی مٹھائی کہاں ملتی ہوگی۔ حضور نے فوراً ہاتھ روک لیا اور پتھر اٹھا کر اس طرح آسانی سے کھانے لگے جیسے بڑا لذیذ حلوہ کھا رہے ہوں۔ جب والد نے ندامت کے آنسو بہائے اور دل سے توبہ کی تو حضور نے پتھروں کا کھانا بند کردیا۔

الحمدللہ بابا صاحب سے میری عقیدت اور قدم بوسی کا سلسلہ بہت دیرینہ اور قدیم تھا۔ میرے عزیز دوست ابراہیم خان فنا کے شدید اصرار سے یہ طے پایا کہ میں تاج آباد میں عرس شریف کے ثواب بخش موقعہ کا فائدہ اٹھاؤں۔ چنانچہ بابا صاحب کی آخری آرام گاہ کے باہر جلسہ کا انتظام ہوا۔ عرس میں شرکت کے لئے دور ونزدیک یہاں تک کہ ہندوستان کے دور دراز صوبوں سے بھی حاجت مند' دعاؤں کے طالب ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے تھے اور ویسے

بھی عام دنوں میں یہ مقدس سراپا نور مقام مرجع خلائق بنا رہتا تھا۔ جلسہ کا دن اور وقت آ گیا۔ فنا صاحب نے بحیثیت صدر ناگپور شہر مسلم لیگ جلسہ کی صدارت کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ میز کرسی کو دیکھ کر اور اپنی صدارت کا سن کر میری جذباتی حالت ناقابل بیان ہوگئی۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور روضہ کی طرف دیکھ کر باآواز بلند کہا: ''یہاں بابا صاحب صدر نشین ہیں۔ اس لئے ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص صدر جلسہ نہیں ہوسکتا۔'' الغرض میں نے تقریر شروع کردی۔ موضوعِ تقریر درد بھرا تھا۔ لوگوں کے اور میرے جذبات دامنِ صبر کو چھوڑ چکے تھے اور میں تو کمال بے خودی میں احتیاط و ادب کے دائرہ سے باہر نکل چکا تھا۔ دربار میں فریادی بن کر گیا تھا اور بقول استاد ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نالہ پابندِ لے نہیں ہے

اس لئے عرض مدعا کا انداز انتہائی جوش و خروش میں حدود و ادب کو توڑ کر افسوس صد افسوس گستاخانہ ہوگیا تھا۔ شکر ہے کہ میرا بے باکانہ اندازِ فریاد مستوجبِ گرفت نہیں ہوا۔ مجھ جیسا سیہ کار عقیدت مند اور ذلیل ناز کنان ان کے فیوضِ جاریہ پر تکیہ کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اُٹھا: ''اس صوبہ میں آپ کی روحانی حکومت قائم ہے اور یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ آپ کی حکومت میں ان بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ ظلم وستم بنایا جائے اور کانگریسی حکومت انہیں تختۂ دار پر چڑھا کر سینکڑوں معصومین کی زندگیاں تباہ و برباد کردے۔ پھر کسی قدر تلخ لہجہ میں مزید سوئے ادبی کا مرتکب ہوکر عرض کیا۔ اگر دنیاوی حکومت نے ایسا ظلم ناروا کیا تو میں قیامت کے دن شافع محشر کے سامنے آپ کے سبز لمبے کرتے کو پکڑ کر فریاد کروں گا۔ واقعی یہ بڑی گستاخی تھی جس کے لئے میں نادم اور خوش بھی ہوں جو مجھ سے وفور و شدتِ جذبات میں سرزد ہوئی۔ عین اُس وقت میرے کلیجہ میں کرب انگیز درد شروع ہوا۔ میں کلیجہ تھام کر اور میرے تمام محسنین میری حالتِ زار کو دیکھ کر دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ماہ اپریل 1940ء کی ابتدائی تاریخوں میں ناگپور ہائی کورٹ کے بینچ کے سامنے جو چیف جسٹس سر گلبرٹ اسٹون، آئی سی ایس اور مسٹر ویوین بوس (ناگپور کے بہت مشہور وکیل

سر پن کرشنا بوس کے پوتے اور بھارت کے فیڈرل کورٹ کے سابق چیف جسٹس) پر مشتمل تھا' اپیل کی تاریخ سماعت مقرر ہوئی۔ مسٹر قاسم علاؤ الدین سوجی بمبئی سے ایک دن قبل تشریف لائے۔ ان سے مل کر ہمارے تو ہوش وحواس جاتے رہے کیونکہ وہ خفیف حرارت میں مبتلا تھے اور ان کی آواز اتنی پست کہ حلق سے نہیں نکلتی تھی۔ طبی معائنہ کرا کر کئی قسم کے فوری علاج شروع کرا دیے گئے۔ میں آدھی رات کے بعد اپنی مونس وغمگسار رفیقۂ حیات خورشید آراء بیگم کے ساتھ جو اس دنیائے دوں میں میرا اور میں ان کا تنہا سہارا ہیں اور جنہوں نے میری سیاسی اور ملی زندگی کو بنانے کے لئے بڑے بڑے ایثار کئے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' تاج آباد گئے اور اللہ کے اس پیارے سے کہا کہ قربت خداوندی کی بدولت آپ کی دعائیں فوراً مستجاب ہوتی ہیں تو آپ دعا کیجئے کہ سوجی صاحب کے دلائل اور بحث سے دونوں جج پوری طرح مطمئن ہو جائیں اور مظلومینِ چاندور بسوا کو رہا کر دیں۔ دوسرے دن بحث شروع ہوئی۔ دوا اور دعا نے اثر دکھلایا۔ سوجی صاحب کے حلق کے ساز نے کچھ دیر تک اونچے نیچے مدہم اور تیز سر نکالے۔ پھر تو ان کی آواز بالکل کھل گئی۔ مسلم لیگ کے چند بدخواہوں نے بددلی پھیلانے اور مسلم لیگ کی صفوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے ایک خاموش مہم چوری چھپے شروع کی کہ سوجی کے دلائل ٹھوس نہیں ہیں اور مقامی وکلاء کو جوان سے بدرجہا بہتر ہیں پیروی کرانے سے محروم کیا گیا۔ عدالت کے کمرہ میں بحث ہو رہی تھی اور باہر املی کے پیڑوں کے گھنے سایہ تلے ناگپور کے بہت سے مسلمان فرش بچھا کر آئیۃ کریمہ کا وظیفہ اور گڑگڑا کر ارحم الراحمین سے رحم کی درخواست کر رہے تھے۔

اللہ اللہ کر کے مسٹر سوجی کی بحث کا چوتھا دن ختم ہوا۔ رات تمام مخلوق کے لئے پیغام استراحت لے کر آئی لیکن ہم پریشان حالوں کے لئے رات اور دن یکساں تھے۔ جوابداری کا بوجھ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ فکریں' پریشانیاں' مایوسی کی تاریکیاں اور ہزاروں انجانے وسوسے دل کو سخت بے چین کئے ہوئے تھے۔ ہماری دوڑ تو مسجد اور بابا صاحب کے دربار تک تھی۔ میں ڈھائی بجے شب میں اپنی دُکھ سکھ کی ساتھی کے ساتھ روحانی سکون کی تلاش میں بابا صاحب کے آستانہ

سعادت وفیض کدہ پر گیا۔ ہرطرف رات کی تاریکی میں خاموشی وسناٹا چھایا ہوا تھا۔ سچ پوچھئے تو ہر سو ہُو کا عالم تھا۔ موٹر کو بہت دور پارک کر کے پگڈنڈی سے ہم تہی دامان وارفتگی وعقیدت کے تحفے لئے ہوئے روضۂ اقدس کی طرف روانہ ہوئے اور باہر بیٹھ گئے۔ اگر روضۂ اقدس مقفل نہ بھی ہوتا تو باباصاحب کی برتری اور میری کمتری' ان کا جلال اور میرا خوف' ان کی ولایت اور میری تہی دستی' ان کی بے نیازی اور میری بے پناہ عقیدت' ان کی حضوریٔ رسولؐ اور میری دوریٔ رسولؐ، ان کی فنافی اللّٰہی اور میری دنیاداری' ان کی نکوکاری اور میری سیاہ کاری' ان کی بلندی اور میری پستی' الغرض ان تمام حقیقتوں نے میرے اوران کے درمیان ایک حدفاصل مقرر کی ہوئی تھی۔ بھلا میں اپنے ہوش وحواس کی سلامتی کے ساتھ کیسے سوئے ادبی کرتا۔ میں تواس مرتبہ بھی حسب سابق اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو دل میں چھپائے حمدونعت' درودوسلام پڑھتا ہوا عالمِ استغراق میں ایسا کھو گیا کہ دنیاومافیہا کی خبر نہیں رہی۔ یہاں تک کہ اس عالمِ سکوت میں ہرطرف سے کئی آوازیں آنی شروع ہوئیں جنہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر چوکنا کردیا۔ وہ آوازیں آج تک ہم دونوں کے قلب ودماغ میں محفوظ ہیں اور یقین ہے کہ کرۂ ارض کی بسیط فضا میں بھی محفوظ ہوں گی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ کوئی بآواز بلند حکم دے رہا ہے کہ ''کھولی (کوٹھری) کا دروازہ کھول دو۔'' ''بیڑیاں توڑ دو'' اور ''لڈو بانٹو۔'' میری بیوی یہ آوازیں سن کر خوف سے کانپنے لگیں لیکن میں بابا صاحب کے کرامتی اشاروں کو ان کے دنیا سے پردہ کرنے کے قبل سے سمجھتا تھا۔ میرے لئے تو یہ بشارت تھی کہ باباصاحب کے توسط سے ہماری دعائیں اجابت پذیر ہوگئیں اور ہمارا خالی دامن کامیابی کے موتیوں سے بھر دیا گیا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب تک پگڈنڈی پر گامزن رہے' یہ آوازیں ہمیں برابر مژدہ بگوش کرتی رہیں۔

دوسرے دن عدالت کا اجلاس شروع ہوا۔ جوں ہی سوجی صاحب نے ججوں کو ''مائی لارڈ'' کہہ کر مخاطب کیا کہ ایڈووکیٹ جنرل مسٹر والٹر دت نے مداخلت کرتے ہوئے عدالت عالیہ سے گزارش کی کہ انیس (19) ملزمین کے خلاف چونکہ کوئی شہادت نہیں ہے' اس لئے انہیں

رہا کردیا جائے۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ جنرل نے باقیماندہ ملزمین کی سازش میں شمولیت اور ارتکاب جرم کے جواز میں دوسرے دن کے دوپہر تک بحث جاری رکھی۔ سوجی صاحب حقِ جواب کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن چیف جسٹس نے یہ کہہ کر کہ اب مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے' مقدمہ کو فیصلے کے لئے ملتوی کر دیا۔ احسان مند لوگوں نے سوجی صاحب کو پھولوں کے ہار پہنائے اور بمبئی میل میں سوار کر کے بدیدۂ تر خدا حافظ کہا۔

2 مئی 1940ء کو عدالت نے فیصلہ سنایا۔ لوگوں کے دل آس ویاس کے ملے جلے جذبات' اُمید وبیم' اضطراب و پریشانی سے بلّیوں اچھل رہے تھے۔ ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ لب پر مسلسل دعائیں تھیں۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآء ط بِيَدِكَ الْخَيْر ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ورد زبان تھا۔ الحمدللہ! تمام ملزمین جنہیں پھانسی اور حبسِ دوام کی سزادی گئی تھی باعزت طریقہ پر رہا کر دیے گئے لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ فاضل ججوں نے کیا کہا۔ یقین ہے کہ حسبِ ذیل چند اقتباسات کانگریس کی عیاری' دروغ بافی' سفاکی اور مسلم آزاری کے پردہ کو چاک کر کے انہیں دنیا کے سامنے عریاں کر دیں گے۔

چیف جسٹس سر گلبرٹ اسٹون آئی سی ایس نے کہا:-

1- یہ مقدمہ بہت اذیت دہ ہے۔ اس میں گواہوں نے عدالت میں پے در پے جھوٹی شہادت' سدھاری ہوئی یا سکھلائی ہوئی شہادت دے کر تینتالیس آدمیوں کو قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

2- اس مقدمہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے۔

3- صوبائی اسمبلی میں تحریک التواء پر تقریر کرتے ہوئے کئی ممبروں نے حتمی طور پر جرم کی نوعیت طے کر دی اور ایک ممبر تو یہاں تک کہہ گئے کہ قاتل کون تھا۔ دورانِ بحث وزیراعظم مسٹر شکلا نے تو یہ کہنے میں بھی پس وپیش نہیں کیا کہ یہ بلوہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا ہوا قتل تھا۔ اس کے ذکر کی دو وجوہات ہیں: پہلے تو ان بیانات کے بعد پولیس اور استغاثہ کی

مشکلات، دوسرے اُن آراء کی مذمت جن کی وجہ سے جھوٹی شہادتیں بنائی گئیں اور اصلی مجرم بچ نکلے۔ 4، 6 اور 7 اپریل 1939ء کو بسوا کے کل دوسوتیں بالغ مسلم مردوں کی شناختی پریڈ جبکہ آفتاب نصف النہار پر تھا کرائی گئی جس کے نتیجہ میں کئی آدمی بیمار ہو گئے۔

مسٹر جسٹس ویوین بوس کا دلچسپ تبصرہ ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) شناختی پریڈ کے اعداد وشمار کا پیش کرنا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتلایا جاسکے کہ اس المناک واقعہ نے بالآخر سوانگ کی شکل اختیار کر لی اور اس کی بنا پر ایک سو پینتالیس (145) آدمیوں اور لڑکوں کو گرفتار کر کے تیس فٹ لمبے اور بیس فٹ چوڑے کمرے میں رات بھر مقید کیا گیا۔

(۲) استغاثہ چاہتا ہے کہ ہم اس افسانہ کو جس میں مسخرے پن کے سوا کچھ نہیں ہے، سچ مان لیں۔

(۳) یہ اُن کہانیوں کی چند مثالیں ہیں جو جذباتی رَن بیروں (سورماؤں) نے بیان کی ہیں۔''

اس طرح اللہ کے بے پایاں فضل اور بابا صاحب کی دعاؤں اور نظرِ کرم سے اس چنگیزی داستان کا خونیں باب بخیر ختم ہوا۔

مرحبا اے تاج والے مرحبا
آپ ہیں لاریب تاج الاولیا
آپ نے اے آفتاب اصفیا
خطۂ سی پی منور کر دیا
مرحبا اے تاج والے مرحبا

(خورشیدؔ)

قائداعظمؒ نے ملزمین کی رہائی پر اپنے شیدائی اور ادنیٰ خادم کی ایک لاسلکی پیغام بھیج کر عزت اور حوصلہ افزائی کی۔ برقیہ کا عکس اس لئے پیش کیا جارہا ہے کہ وہ میرا ایک ایسا گراں مایہ سرمایہ ہے جس کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا اعزاز بھی ہیچ ہے۔ دوئم اس کے زیب کتاب

ہونے سے یہ کتاب جو مجاہدین اسلام کی خاکِ پا کی بھی برابری نہیں کر سکتی، رشکِ ثریا ہو جائے گی۔ سوئم یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ قائداعظمؒ قوم کے افراد سے کام لینا جانتے تھے اور ان کی حسنِ کارکردگی پر اپنی خوشی کا مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ میں اظہار فرمایا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆
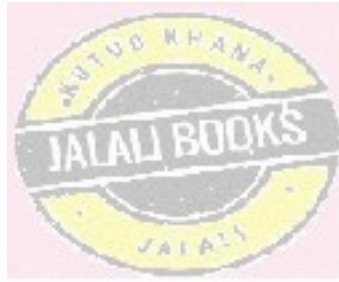
فریاد

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی

قائداعظمؒ اور اکثر اراکین آل انڈیا مسلم لیگ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمان اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی حالتِ زار سے بالکل ناواقف ہیں اور نہ انہیں اس کا علم ہے کہ وہاں برسرِاقتدار پارٹی یعنی کانگریسی حکومت ان کے نہتے اور غریب مسلمان بھائیوں کو قانون اور اکثریت کی آڑ میں کتنا تنگ اور پریشان کر رہی ہے۔ ان مظالم کو طشت از بام کرنے اور جملہ مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے قائداعظمؒ نے کئی اقدامات کئے جن میں سے یہ بڑا اہم عملی اقدام تھا۔ ظاہراً اس کا دائرۂ عمل اکثریتی صوبوں تک ہی محدود تھا لیکن اس کی نشرواشاعت کل ہند تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ بیرون ہند بھی ہوئی اور جو امن پسند غیر مسلم یعنی ہندو، عیسائی، ہریجن، پارسی اور سکھ ان صوبوں میں آباد تھے، انہیں بھی اپنے صوبوں کے کثیر الاشاعت اخباروں سے یہ معلوم ہوا کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف کیا کیا دھاندلیاں اور زیادتیاں کر رہی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی خوف لاحق ہوا اور اپنی فکر میں مبتلا ہو گئے کہ اگر ان کے صوبہ کے مسلمان اپنے پسماندہ اور مظلوم بھائیوں کا انتقام لینے کی ٹھان لیں تو پھر ان کا کیا حشر ہوگا۔ شروع میں تو ہندو پریس نے سخت مخالفت کی اور زمین آسمان کے قلابے ملا کر اسے منافرت کی مہم سے تعبیر کیا اور پھر خانہ جنگی کا پیشہ خیمہ کہا۔ بہرحال پریس اور پلیٹ فارم سے جتنی مخالفت ہوئی، اتنی ہی اکثریتی صوبہ کے مسلمانوں کی ہمدردیاں بڑھتی گئیں۔ صوبائی مسلم لیگیوں کی حسن کارکردگی اور ہمارے اکابرین کی شرکت اور

ہمدردی نے اس عملی اقدام کو چار چاند لگائے اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی بڑی ڈھارس بندھی کہ اکثریت کے صوبوں کے مسلمان اُن کی پشت پناہی اور عملی مدد کے لئے تیار ہیں۔ اس جذبہ سے ان میں مظالم کے مدافعت کی مزید قوت عود کر آئی اور تمام مسلمانانِ ہند سمٹ کر آل انڈیا مسلم لیگ کے دامن میں آ گئے۔

جس عملی اقدام کا اوپر ذکر کیا گیا ہے' وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی تجویز مورخہ 4 دسمبر 1938ء کے مطابق شروع کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی ہوئی تھی جو غیر ممالک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پروپیگنڈا کے لئے وقتاً فوقتاً اکابر رہنماؤں کو بھیجا کرتی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے کونسل کی ہدایت پر اندرون ملک وفد بھیجنے کا طے کیا۔ اس ذیلی کمیٹی کے صدر اور اراکین مسلم لیگ کے صف اول کے رہنما تھے۔ حاجی سر عبداللہ ہارون اس کے صدر اور پیر علی محمد راشدی صاحب اُن کے ہمہ تن مصروف اور سرگرم سیکرٹری تھے۔ اس کمیٹی کے ممتاز اراکین راجہ صاحب محمود آباد' نواب سر محمد شاہنواز خاں آف ممدوٹ اور سردار محمد اورنگ زیب خان تھے۔ چونکہ راجہ صاحب محمود آباد کا ذکر اور کہیں آ چکا ہے' اس لئے یہاں اُن ہی حضرات کا ذکر کروں گا جن کا نام پہلی مرتبہ آیا ہے۔ مرحوم نواب صاحب ممدوٹ بڑے مخلص' سادگی پسند' نیک مسلمان اور علامہ محمد اقبالؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ باوجود پنجاب کے والیٔ ریاست ہونے کے یونینسٹ گورنمنٹ کے مضبوط چنگل سے باہر اور قائداعظمؒ کے دلدادہ اور مسلم لیگ کے مخلص حامی تھے۔ سردار اورنگزیب خان صاحب نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا نعرہ اُس زمانہ میں بلند کیا جب مسلم لیگیوں کو حریت پسند سرجوشوں کے مقابلہ میں انگریزوں کے ٹوڈی کہا جاتا تھا اور ان کے لئے عرصۂ حیات کے ساتھ سیاسی میدان بھی تنگ کر دیا گیا تھا لیکن وہ بڑی پامردی کے ساتھ اپنے چند مخلص رفقائے کار مثلاً خان بہادر سعد اللہ خان صاحب' خواجہ اللہ بخش صاحب' میاں ضیاء الدین صاحب' ایس ایم خان صاحب' ابراہیم خاں صاحب جھگڑا' ارباب شیر علی خاں صاحب' ارباب نور محمد' محمد علی ہوتی' خان شیر پاؤ وغیرہ وغیرہ کے ساتھ مقابلہ

کرتے رہے اور مسلم لیگ کے پرچم کو بلند رکھا اور ابتدائی مساعی جمیلہ سے میدان ایسا ہموار کیا کہ بالآخر صوبہ سرحد پاکستان کا جز ولاینفک بن گیا۔

حاجی سر عبداللہ ہارون جنھوں نے اس دنیا میں جنم لے کر غربت وافلاس کا منہ دیکھا تھا لیکن باہمت اور مستقل مزاج باپ اور اللہ پر توکل رکھنے والی ماں کی گود میں پلے پوسے بڑھے اور اپنی جواں عزمی، محنت و جفاکشی سے صرف دنیاوی دولت ہی نہیں کمائی بلکہ عاقبت کی دولت کمانے کے لئے اور اپنی پرانی غربت کا خیال کر کے دنیاوی دولت کو حقداروں، مستحقین، غربا، مساکین اور یتامیٰ پر موسلادھار بارش کی طرح برسایا۔ وہ بہت سے اداروں کی فراخدلی سے مدد کرتے تھے۔ بگڑے ہوئے رئیسوں، خادمانِ قوم، پرانے خلافتی اور علمائے کرام کی ہمیشہ چپکے چپکے دستگیری کرتے رہے۔ بڑے مہمان نواز اور خوش خلق تھے۔ وائسرائے کی کونسل کے رکن سے لے کر کراچی میں ہر نووارد کے لئے ان کی سیفیلڈ کوٹھی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ مقام مسرت ہے کہ لیڈی عبداللہ ہارون نے اپنے ذی شان خاوند کی درخشاں روایاتِ داد و دہش اور مہمان نوازی میں سر مو کمی نہیں آنے دی اور ان کی سعادت منداولاد بھی اس گرانقدر میراث کو پا کر اپنے عالی شان ماں باپ کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اس خاندان نے قائداعظمؒ کی قیادت میں انتہائی خلوص ومحبت سے حصول پاکستان میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حاجی صاحب قائداعظمؒ کے سچے عقیدت منداور مسلم لیگ کے باعمل رہنما تھے۔ خوش نصیبی سے وہ اس کمیٹی کے صدر تھے۔

مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے اختتام پر میں ناگپور پہنچا ہی تھا کہ مجھے حاجی صاحب کا انگریزی زبان میں ایک مکتوب موصول ہوا جو اس وفد میں میری شمولیت کا باعث بنا۔ اس خط کو بھی تبرک سمجھ کر شائع کر رہا ہوں۔

اگرچہ میرے صوبہ کے حالات بہت ناگفتہ بہ تھے لیکن میں نے حاجی صاحب کے شدید اصرار پر مجبور ہو کر دعوت قبول کر لی۔ اس وفد میں میری اہلیہ کی عدم شرکت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اس وفد میں تنہا خاتون تھیں اور ان کے لئے دور دراز کے صوبوں کا ایک طویل

دورہ ٹرین اور موٹر سے کرنا دشوار تھا۔ علاوہ ازیں وہ سنٹرل کالج فار ویمن ناگپور میں فارسی اور اُردو کی پروفیسر ہونے کی وجہ سے شہر سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔

میری اہلیہ اور میرے علاوہ سی پی و برار سے مولانا مفتی محمد برہان الحق صاحب اور وکیل محمد اصغر صاحب منتخب کئے گئے تھے۔ یو پی کی نمائندگی کیلئے چودھری اختر حسین صاحب' مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی' سید ذاکر علی صاحب اور مولانا کرم علی صاحب ملیح آبادی مقرر کئے گئے۔ بہار سے حضرت مولانا سید حسین میاں صاحب پھلواری شریف' نواب سید محمد اسماعیل صاحب' مولانا محمد قمر صاحب دربھنگوی اور مظہر امام صاحب وفد کے اراکین تھے۔ اس طرح کل بارہ اراکین پر یہ وفد مشتمل تھا۔

صوبہ پنجاب میں کئی بڑے شہروں کا پانچ چھ دن کا دورہ کیا گیا۔ جالندھر' امرتسر' گوجرانوالہ' ملتان' منٹگمری' لائل پور' اوکاڑہ اور راولپنڈی وغیرہ میں عظیم الشان جلسے ہوئے جہاں مظالم کی داستانیں سنائی گئیں۔ نشر و اشاعت کا کام صوبائی لیگوں نے بڑے اچھے طریقے سے کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثیر تعداد میں مسلمان اور ہندو اور سکھ بھائی شریکِ جلسہ ہوتے تھے اور ہر طبقہ کے لوگ پائے جاتے تھے۔ پنجاب کے مسلمان پہلوانوں کو ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ رستم زماں گاما پہلوان پٹیالہ سے آکر امرتسر کے جلسے میں شریک ہوئے۔ حمیدا پہلوان جو ناگپور میں پانچ چھ مہینہ رہ چکے تھے' میرے بہت اچھے مخلص دوست تھے۔ وہ بھی کسی جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ ہم لوگ گوجرانوالہ اس دن پہنچے جب وہاں بڑا دنگل ہونے والا تھا جس میں چراغ پہلوان کی کشتی ہونے والی تھی۔ ہمیں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں گونگا پہلوان اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے۔ ان کے ایک ساتھی نے میرا تعارف کرایا اور اشاروں اشاروں میں ان کو ہمارے دورے کا مقصد سمجھایا۔ جب وہ سمجھ گئے تو فوراً پینترا بدل کر خم ٹھوکنے لگے۔ ان کے ساتھی نے بتلایا کہ وہ ہر طرح سے مدد دینے کو تیار ہیں۔ وہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے۔

پنجاب کا دورہ ختم کرنے کے بعد ہم لوگ صوبہ سرحد کے ایک ہفتہ کے دورہ پر روانہ

ہوئے۔ دورہ کی بسم اللہ مہابت خان کی مسجد سے عشاء کی نماز کے بعد ایک جلسہ سے ہوئی۔ اس زمانہ میں سرخپوشوں کا بڑا زور تھا اور ہمارے ساتھ صرف مٹھی بھر اکابرین تھے لیکن چند چاہنے والے جاں نثار مخلص مسلم لیگی رات دن ہمارے ساتھ رہے اور جلسوں کا انتظام کرتے رہے۔ مخالفین کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ جلسہ درہم برہم ہو جائے۔ یہ بھی اکثر ہوا ہے کہ ہم لوگوں کے آنے کی خوشی میں اور کئی مرتبہ خوف و ہراس پیدا کرنے اور بھگدڑ مچانے کے لیے رائفلوں کا رخ آسمان کی طرف کر کے داغی جاتی تھیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ جب میری تقریر ہو رہی تھی تو محض ہلڑ مچانے کے لئے ایک زندہ سانپ چھوڑ دیا گیا۔ حاضرین نے منظم سازش سے بے خبر ہونے کی وجہ سے پیٹھ کو پیر لگا کر بھاگنا شروع کیا۔ چونکہ پٹھان پٹھان کو خوب سمجھتا ہے' اس لئے تھوڑی ہی دیر میں ہم نے دیکھا کہ لوگ واپس آ گئے اور جلسہ پھر شروع ہو گیا۔ ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مہمانوں کے ساتھ کبھی کوئی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ ہر جگہ ہم لوگوں کو روائتی مہمان نوازی میسر تھی۔ دو تین جلسوں کے بعد تو فضا بالکل ہی بدل گئی۔ ہم نے دیکھا کہ پٹھان کا دل اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے دُکھنے لگا اور وہ ان کے ہمدرد اور غمگسار بن گئے' یہاں تک کہ اس صوبہ میں پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے لئے میدان ہموار ہو گیا اور ایک سال کے بعد نواب بہادر یار جنگ کا صوبۂ مذکور کا دورہ تو گویا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔

ہم نے بہت سے مقامات کے علاوہ ایبٹ آباد' نوشہرہ' مردان' کوہاٹ' بنوں' ڈیرہ اسماعیل خاں' ڈیرہ غازی خان وغیرہ کا دورہ کیا۔ صوبہ سرحد کے قیام میں روزانہ چھ سات جلسے ہوا کرتے تھے۔ ہم نے یہ تمام سفر موٹر سے کیا۔

کامیابی کے ساتھ جب صوبہ سرحد کا دورہ ختم ہوا تو ہم لوگ پیروں' میروں اور حروں کے ملک یعنی صوبہ سندھ گئے۔ وہاں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ لیکن کراچی تو مقابلتاً جنت تھی اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر حیدر آباد تھا۔ نواب شاہ' شکار پور' گڑھی یاسین جیکب آباد وغیرہ میں گرد و غبار و گرمی تھی لیکن اس کا مداوا لوگوں کی خوش خلقی' مہمان نوازی اور ہمارے اکابرین شیخ

عبدالمجید سندھی صاحب، آغا بدرالدین صاحب، نعمت اللہ قریشی صاحب، سید خیر شاہ صاحب، مولانا حقانی صاحب، مولوی سید علی اکبر شاہ صاحب، قاضی محمد مجتبیٰ صاحب، اسماعیل برہانی صاحب، عبدالخالق صاحب، محمد ہاشم گزدر صاحب، غلام نبی پٹھان صاحب وغیرہ کی رفاقت اور کرم سے ہو جاتا تھا۔ ہمارے اکثر جلسوں میں پیر صاحبان اپنے سینکڑوں مریدین کے ساتھ سعادت بخشنے، رونق بڑھانے اور جلسوں کو کامیاب کرنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی موجودگی سے سب طرف ہمدردی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ستم زدوں کے ہمدرد اور پرسان حال ہر جگہ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ واقعی مسلم لیگ کا یہ عملی اقدام ہر نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہا۔ اس کے ثبوت میں نواب زادہ صاحب کا اُردو کا خط پیش کیا جاتا ہے جو میرے لئے روشن تحریر ہی نہیں بلکہ بہت مقدس ہے۔

☆☆☆☆☆

"یومِ نجات"

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(اقبالؒ)

جب کانگریسی حکومتیں حسب دلخواہ نہتے اور بیکس مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھا کر زیر نہ کر سکیں اور جب تقدیر کے لکھے کے سامنے ان کی تمام تدبیریں اوندھی پڑ گئیں تو مزید روسیاہی کے لئے انہوں نے ایک راہِ فرار یہ اعلان کر کے اختیار کی کہ چونکہ ہماری رضا مندی کے بغیر دوسری جنگ عظیم کا اعلان کیا گیا تھا اور جب تک کہ ہمیں مکمل اختیارات سونپے نہیں جاتے، ہم جنگ کو کامیاب کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتے اور نہ کسی طرح کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ دراصل ان کی نیت یہ تھی کہ جنگ کے ایسے نازک مرحلے پر حکومت برطانیہ کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے۔ دورانِ جنگ جبکہ موت اور تباہی بھیانک شکل میں اتحادیوں کو منہ چڑھا رہی تھی اور جبکہ برطانیہ ہر قدم اتحادیوں کے مشورہ سے اٹھاتا تھا تو یہ مطالبہ کرنا کہ بیچ دریا گھوڑے بدلے جائیں، کس قدر عیارانہ تھا۔ کانگریس کی یہ پہلی حرکت نہیں تھی۔ اس سے قبل بھی وہ کئی وقت گھوڑے کی دُم میں لگام لگانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

کانگریس کی پسپائی اور رضا کارانہ اخراج کے اعلان سے مسلمانوں کے دلوں کو ایک عرصہ کے بعد حقیقی مسرت ہوئی۔ اُنہوں نے اسے رحمتِ ایزدی سے کم نہیں سمجھا۔ سابق کانگریسی صوبوں میں بڑی آسانی سے گورنر راج قائم ہوگیا۔ اب مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ راکشسی راج اپنی آرتھی کو نذرِ آتش کر کے بھشم ہوگیا تھا اور اس کی راکھ گنگا وجمنا

میں بہہ کر مہاساگر (بحر ہند) کے نمکین پانی میں گھل مل کر "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کو پہلے دور (راؤنڈ) میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی جو ان کی جدوجہد' کامیاب مدافعت اور فضلِ ربی کا نتیجہ تھا۔ اُن کے سب سے بڑے مسلمان سالار مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ 22 دسمبر 1939ء کو کل ہند میں مسلم لیگیں یوم نجات منائیں اور بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو کر اس کے بیکراں رحم و کرم کی طالب ہوں۔ انہوں نے روائتی اسلامی رواداری اور امن پسندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس بات کو قطعی طور پر واضح کر دیا کہ اس مظاہرہ سے ہندو بھائیوں سے ہرگز مخالفت مقصود نہیں ہے۔ ہمیں تو کانگریسی اقتدار اعلیٰ کے سیاہ کرتوت سے جو نجات ملی ہے' اس پر اظہار اطمینان کرنا ہے۔ اعلان کے مطابق مقررہ تاریخ پر یہ دن انتہائی کامیابی سے منایا گیا۔ اقلیتوں اور ان کے رہنماؤں نے بالخصوص مہار' پارسی' آدی باسی وغیرہ نے جلوس و جلسوں میں شرکت کر کے اور مسلم لیگ کا ہاتھ بٹا کر یوم نجات کو کامیاب کرنے میں برابر کا حصہ لیا۔ مسلم لیگ کو اس اقدام سے باز رکھنے کے لئے مہاسبھا کی طرف سے کچھ ڈھکی چھپی اور کچھ کھلی دھمکیاں بھی دی گئیں تھیں اور ہندو اخبارات نے ہندو مسلم فسادات کے اندیشے بھی ظاہر کئے تھے لیکن چونکہ کانگریسی سیاں کوتوال نہیں رہے تھے' اس لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کا ڈر کاہے کا تھا۔

مسلمانوں میں اب اتحاد و نظم کی بدولت سلیقہ اور تمیز آ گیا تھا اور وہ منظم بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے احتیاط اور امن کو برقرار رکھتے ہوئے کام کرتے تھے۔ اللہ کا احسان ہے کہ بخیر و خوبی یہ دن گزرا اور ہندوستان بھر میں کسی بھی جگہ معمولی سی جھڑپ یا خفیف سی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں ہوئی۔ اس یوم کے منانے سے عیاں طور پر مسلم لیگ کو چند فائدے ضرور پہنچے:-

1۔ مسلم لیگ کی اہمیت بڑھ گئی۔

2۔ کانگریس کی چیرہ دستیوں سے دنیا روشناس ہوگئی۔

3۔ کانگریس کا بھرم ختم ہوگیا اور چوراہے پر اس کی ہنڈیا ٹوٹ گئی اور

4۔ مسلم لیگ کا حق بحیثیت واحد مسلم نمائندہ جماعت مسلّم ہوگیا۔ الغرض یہ ایسی کامیابی تھی جس پر جتنا ناز کیا جائے' کم ہے۔

داتا کی نگری

خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام
شہریوں کو غازیوں کو شہسواروں کو سلام

(رئیس امروہوی)

تاریخ بتلاتی ہے کہ داتا کی مقدس نگری میں جہانگیر اور نور جہاں کو آخری آرام گاہ ملی اور انار کلی بھی اس ہی پاک سرزمین کی آغوش میں آخری نیند سوگئی۔ معلوم نہیں یہاں کتنے بنے اور کتنے بگڑے، کن کن کا عروج اور کن کن کا زوال ہوا' کتنے ہی سریر آرائے سلطنت اور کتنے ہی معزول ہوئے۔ الحاصل لاہور نے بہت مدّ و جزر اور انقلاباتِ زمانہ دیکھے اور اس ہی سرزمین سے اقبالؒ نے اپنے صوفیانہ' قلندرانہ' مفکرانہ' فلسفیانہ اور انقلابی کلام سے مسلمانانِ ہند کو بالخصوص اور مسلمانانِ عالم کو بالعموم جگایا۔ اقلیم سخن کا بادشاہ ہونے کی مناسبت سے اب وہ بادشاہی مسجد کے بائیں حصہ میں استراحت کناں ہیں۔ الحاصل داتا کی نگری کے چپہ چپہ پر تاریخ بنی اور بگڑی۔ جب اقبالؒ کی زندگی کا مشن کامیابی کے ساتھ ختم ہوا' جب ان کے نالہ ہائے نیم شبی رنگ لائے اور دعاہائے سحری مستجاب ہوئیں اور جب انہوں نے قائداعظمؒ جیسی ملک ساز ہستی کو مسلمانوں کی قیادت کے لئے منتخب کر لیا تو انہوں نے اطمینان کا آخری سانس لیا۔ زمانہ بھی کروٹ لے کر بیدار ہو گیا اور خدائے لم یزل نے ''کن فیکون'' ارشاد فرمایا۔ بس کیا تھا۔ قدرت کی طرف سے نئی تاریخ کی بسم اللہ ہوئی اور عملی اقدامات یکے بعد دیگرے کئے جانے لگے۔ زندہ دلانِ پنجاب کی زمین بڑی مردم خیز' غریب نواز' مسافر نواز اور مہمان نواز رہی ہے۔ یہاں راہ نمایانِ سیاست و مذہب بہت پیدا ہوئے۔ سیاست میں تو اُنہوں نے اپنا وہ سکہ جمایا کہ عالمگیر شہرت کے مالک ہو گئے۔ پرانے سیاستدانوں میں سے میاں سر محمد شفیع' میاں سر فضل حسین اور

ان کے دیگر ہمعصروں کے ہاتھ سے راہوارِ حکومت وسیاست کی باگ ڈور دوسری نسل کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یہ جانشین اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر خوب چلنا جانتے تھے اور اپنے اکابرین سے ورثہ میں شہرت بھی پائی تھی۔ درحقیقت یہ زمین جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بڑی مردم خیز ہے اور واقعی اس کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے۔

کشور پنجاب ہے وہ سرزمینِ بے نظیر
آ کے بنتے ہیں جہاں خضر و سکندر بھی وزیر

دوسرے نمبر کی یہ قیادت بھی مشتمل بہ سرفیروز خاں نون، سر سکندر حیات خاں، میاں عبدالحیٰ، میجر خضر حیات خاں وغیرہ بدلتے ہوئے حالات اور آنے والے زمانہ کو گلے سے لگانے تیار نہیں تھی کیونکہ اس کی گھٹی میں خود بینی، خود پرستی اور قدامت پسندی پڑی تھی اور وہ اپنا پرانا چولا اتار کر نئے چولے کو برضا ورغبت زیب تن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہ قیادت بھی دورِ جناح میں موت وزیست کی کش مکش میں مبتلا تھی۔ اب زمانہ اور حالات نئے خون اور نئی قیادت کے لئے چشم براہ تھے۔ چنانچہ اس کے نقوش دھیرے دھیرے اس ہی طرح اُبھرنے لگے جیسے عزیز کارٹونسٹ کے ٹی وی پروگرام ''پہچانئے'' میں ابھرتے ہیں لیکن وقت اور زمانہ کے فی الفور تقاضے نے اُن میں روپ رنگ بھر کر ان کو حقیقت کے پردۂ سیمیں پر آشکار کیا۔ وہ بالکل نئے لوگ تھے لیکن جانے پہچانے کیونکہ ان کے بزرگوں کو زمانہ جانتا تھا۔ وہ زمانہ کی پکار، عنفوان شباب اور جوش قومی کی وجہ سے شعلہ نوا، بے باک و دلیر، باعمل اور حق پرست تھے۔ اُنہوں نے خلوص، خدمت اور راست گوئی کی بدولت صف اوّل میں ممتاز ترین مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان میں سے چند نوجوان نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ، میجر شوکت حیات خاں، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، میاں افتخار الدین، محبوب احمد قریشی، سید خلیل الرحمٰن، سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی، عطاء اللہ جہانیاں، ابوسعید انور، حمید نظامی، عبدالستار خاں، میاں محمد شفیع اور بشیر اخگر صاحب وغیرہ سرفہرست تھے۔ حمید نظامی صاحب نے ''نوائے وقت'' کا اجرا کر کے بہت بڑی ملی خدمت انجام دی،

خصوصاً اس زمانہ میں جب پنجاب میں صرف مسلم لیگ کی ترجمانی کرنے کے لئے کوئی ممتاز اور موثر جریدہ نہیں تھا۔ حمید نظامی صاحب کو قائداعظمؒ سے اتنی زیادہ عقیدت تھی کہ اُنھوں نے محض قائداعظمؒ کی خواہش کی تکمیل کی خاطر نامساعد حالات میں اپنے کندھوں پر اخبار نکالنے کا بہت بڑا بوجھ اٹھایا۔ ان کے خلوص، نیک نیتی اور دلی لگن نے ان کے صحافتی مشن کو بڑے شاندار طریقہ پر کامیاب کیا۔ ان نوجوانوں سے قائداعظمؒ اور قوم نے جو توقعات وابستہ کی تھیں، بحمد للہ انھوں نے اپنے قول اور فعل سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ان کے تاریخ ساز صوبہ کے سچے ایثار کیش اور جواں ہمت باشندوں نے بھی اس اسلامی ملک کے قیام اور تشکیل میں وہ نمایاں حصہ لیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ ان سرمستوں کے ذکر سے ہم اپنے ان مخلص زعماءِ سیاست کو جدا نہیں کر سکتے جن کے فیضِ صحبت وحسنِ تربیت سے ہمارے یہ نوجوان رہنما پروان چڑھے۔ میری مراد مولٰینا ظفر علی خاں صاحب، سر محمد اقبال، شیخ صادق حسن صاحب، شیخ محمد صادق صاحب، خان بہادر نواب الہ یار خاں دولتانہ، نواب سر شاہنواز خاں آف ممدوٹ، ملک برکت علی صاحب، راجہ غضنفر علی خاں صاحب، میاں امیر الدین صاحب، میاں بشیر احمد صاحب، مولوی غلام محی الدین قصوری، شیخ کرامت علی صاحب، مولٰینا میاں عبدالباری صاحب، پیر سٹر تاج الدین اور صوفی عبدالحمید خاں صاحب وغیرہ سے ہے۔ اُس دور میں ان بزرگوں نے مسلم لیگ کے ساتھ ناتا جوڑا جب وہ برائے نام تھی۔ اس کے پاس نہ دولت، نہ طاقت تھی، جس کے بل بوتے پر اپنے اراکین کو عہدہ یا جاہ وحشم تقسیم کر سکتی جیسا کہ دوسری سیاسی جماعتیں خود غرض اور ترقی خواہاں لوگوں کو ان کی حاجت روائی کر کے سمیٹ رہی تھیں۔ یہ لوگ بڑے دیانت دار، بہی خواہانِ قوم اور عقیدتمندانِ قائداعظمؒ تھے، خصوصاً ملک برکت علی صاحب جن کے قدموں میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ بعض اوقات وہ صوبائی قانون ساز ایوان میں اور اس کے باہر تن تنہا مخالفینِ مسلم لیگ کا بہت استقلال اور پامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ طوالت کے خوف سے اس کتاب میں جہاں کہیں چھوٹے یا بڑے قائدین کا ذکر آیا ہے، بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف

چند ہی لوگ قابلِ ذکر وستائش ہیں۔ جی نہیں بلکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان محسنین کے زمرہ میں شامل ہیں۔ یہ تمام اپنی جگہ ایسی بڑی قوت تھے جس کے سامنے طاغوتی طاقتیں جھک گئیں۔ استعماری طاقتوں نے ہتھیار ڈال دیے اور برطانیہ کا نوآبادیاتی نظام تتر بتر ہو گیا۔ لہٰذا قوم کا ہر فرد' چاہے اس کا انفرادی طور پر ذکر آئے یا نہ آئے' ہمیشہ واجب التعظیم رہے گا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی پوری حاجت مند قوم کے ساتھ حضرت داتا گنج بخشؒ کی نگری کو چلیں اور دیکھیں کہ اس مظلوم' جوشِ ایمانی سے سرشار بت شکن اور خدا پرست قوم کو داتا اپنے توسط سے ربّ العالمین کے دربار سے کیا بخشواتے ہیں اور ان کی قسمت اور تاریخ کس طرح بنتی ہے۔

صوبۂ ممالکِ متوسط و برار سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اراکین جن میں چند ممتاز خواتین بھی شریک تھیں' اپنے پرانے خلافتی پیکر' ایثار و خلوص' بوڑھے لیکن جواں ہمت رکھنے والے قائداعظمؒ کے متوالے کھدر پوش سالار قافلہ حضرت سید عبدالرؤف شاہ صاحب کی معیت میں عازمِ دہلی ہوئے تا کہ قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی اسپیشل ٹرین میں لاہور جائیں۔ شاہ صاحب کا ذکر خیر جب تک خان صاحب عبدالرحمٰن خان صاحب کا ذکر نہ ہو' نامکمل رہ جاتا ہے' وہ شاہ صاحب کے دستِ راست اور ہر خدمت میں ان کے برابر کے شریک تھے۔ وہ ہندوی ذہنیت و ہندوی سیاست کے مہا ساگر کے بڑے شناور تھے۔ ان کے پس ماندگان اور ان کے رفیق ان کی خدماتِ سیاسی و تعلیمی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ عرصہ ہوا وہ دربارِ خداوندی میں پاکستان سے طلب کئے گئے۔ چونکہ ان کو اُخروی نعمتوں سے نوازا جانے والا تھا' اس لئے زندگی کے آخری ایام میں وہ بزرگانِ سلف کی طرح دنیاوی دولت اور احتشام سے محروم تھے۔

ناگپور مسلم نیشنل گارڈز کا ایک دستہ لاہور جانا چاہتا تھا لیکن تہی دستی کی وجہ سے ان کے لئے اخراجات کا بار اٹھانا قطعی ممکن نہیں تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کے خزانہ میں بھی رقم بالکل کم تھی' اس لئے مالی امداد کا یہ دروازہ بھی بند تھا۔ بمصداق ''مردے از غیب برون آید و کارے بکند'' صوبائی

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طالبعلم جنرل سیکریڑی عبدالستار صدیقی نے جن کا آبائی پیشہ تجارت تھا' اپنے رفقائے کار کے مشورہ کے بعد ہندوستان (وبعد میں پاکستان) کے مشہور قوال عظیم پریم راگی کو اجمیر شریف سے مدعو کر کے قوالی کرائی اور اس کی آمدنی سے رضا کاروں کو لاہور بھجوایا۔

دہلی پہنچنے پر ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ لاہور میں سر سکندر حیات خاں صاحب کی صوبائی حکومت اور خاکساروں کے درمیان سخت تصادم کی وجہ سے کئی خاکسار ہلاک ہوئے اور کئی شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑے ہیں اور صورت حال یہاں تک قابو سے باہر ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب کی جان خطرہ میں ہے۔ ان حالات میں صوبائی حکومتِ پنجاب نہیں چاہتی تھی کہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہو۔ وائسرائے اور حکومتِ ہند بھی صوبائی حکومت کی ہم خیال تھی۔ چونکہ جنگِ عظیم کا ابتدائی ہولناک زمانہ تھا' اس لئے بھی حکومتِ ہند کسی سیاسی جماعت سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتی تھی' لہٰذا اس نے میانہ روی اختیار کی۔ وائسرائے کی کونسل کے ممبر چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب وائسرائے ہند کے ایلچی بنا کر قائداعظمؒ کو سمجھانے بھیجے گئے کہ لاہور کے اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ نے ان کی رائے کو درخورِ پذیرائی نہ سمجھا اور مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق وہ اسپیشل ٹرین سے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لوگوں کی والہانہ عقیدت اور ان کا کم نہ ہونے والا جوش و خروش' ہر اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم اور قائداعظمؒ کے دیدار کی تڑپ' یہ ایسے جذباتِ عقیدت تھے جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ باوجود شب بیداری و کلفتِ سفر مشتاقانِ دید و عقیدتمندوں سے خندہ پیشانی سے رات بھر ملتے رہے۔ لاہور پہنچ کر انھوں نے ایک عظیم رہنما اور اعلیٰ انسان ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ وہ سب سے پہلے اسپتال گئے اور زخمی خاکساروں کی مزاج پرسی اور ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کی۔ ان کے اس شریفانہ' برادرانہ و ہمدردانہ اقدام کا عوام پر اور خصوصاً خاکساروں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ مکدّر فضا سے بڑی حد تک کشیدگی اور مخاصمت عیاں طور پر کم ہو گئی۔ مزید برآں قائداعظمؒ نے شام کے وقت مسلم لیگ کا پرچم لہراتے ہوئے نہایت صلح جو و صلح کل تقریر کی جس

نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور رہی سہی کھچاوٹ بھی دور ہوگئی۔ یہ تمام اقدامات اخوتِ اسلامی اور مسلم لیگ کی پالیسی کے تحت اور آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے تاریخی اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے کئے گئے تھے کیونکہ مرکزی وصوبائی حکومتوں نے انعقادِ جلسہ کی مخالفت کی تھی اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب آل انڈیا اجلاس میں امن وامان قائم رکھنے کی ہماری کوئی جواب داری نہیں کیونکہ وہاں تو فساد کا برپا ہونا لازمی وضروری ہے۔ ہمارے رہنما کو یہ بھی دکھلانا تھا کہ جو بات با اختیار حکومت نہیں کرسکتی' اسے عوام کا ایک ہر دلعزیز مسلمان لیڈر بڑی آسانی سے منواسکتا ہے۔ آخر کار اجلاس ہوا۔ قائداعظمؒ نے بڑی معرکتہ الآراء تقریر کی جس کا خلاصہ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی تقریر میں فصاحت وبلاغت کے جوہر دکھلا کر لوگوں کے ذہن نشین کرایا اور جس تصادم اور بدامنی کے اندیشے ظاہر کئے گئے تھے' اسے یک لخت ختم کردیا۔ تقسیمِ ہند کی تجویز کو مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب نے جنھیں مسلمانانِ ہند پیار سے ''شیر بنگال'' کہا کرتے تھے' پیش کرتے ہوئے بڑی موثر ودلنشیں تقریر کی اور ان کے ٹھوس دلائل سے جو چند شکوک وشبہات لوگوں کے دلوں میں تھے' دور ہوگئے۔ اس تاریخی تجویز کے چند اہم پہلو پیش کئے جاتے ہیں:-

''وہ علاقے جہاں مسلمان بلحاظ تعداد اکثریت میں ہیں مثلاً شمالی مغربی اور شمالی مشرقی ہندوستان کے منطقوں میں' ان کی اس طرح گروپ بندی کی جائے کہ وہ آزاد خودمختار ریاست کی صورت اختیار کرلیں جس میں ملحقہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر رہیں۔''

ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں' مناسب' موزوں' اطمینان بخش' موثر اور قانوناً تفویض شدہ تحفظات ان کے لئے اور دیگر اقلیتوں (ہریجن عیسائی وغیرہ) کے لئے دستور میں فراہم کئے جائینگے تاکہ ان کے مذہبی' ثقافتی' معاشی' سیاسی' انتظامی اور دیگر حقوق ومفادات کا خود ان کے مشورے سے تحفظ کیا جاسکے۔''

ایسی ہی تجویز شمال مغربی وشمال مشرقی منطقوں کی رہنے والی اقلیت کے لئے پاس کی گئی۔ اقلیت کے صوبوں کے اکابرین نے بڑے حوصلے اور دلجمعی کے ساتھ اس تجویز کو اچھی

طرح سمجھتے ہوئے کہ ان کے صوبے کے مسلمانوں کے کچھ پلے نہیں پڑے گا' پُر زور تائید کی۔ اُن کا تو صرف یہ نظریہ تھا کہ اس خطے کے مسلمان آزاد ہو جائیں اور یہاں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم ہو جائے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ اقلیتی صوبوں کو اس نیک اور ضروری کام کے حصول میں محض اپنی خودغرضی میں کہ ہمیں کچھ نہیں ملے گا' حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کی یہ بلند فکری ایثار واعلیٰ ظرفی سے مملو تھی۔ مولوی فضل الحق صاحب نے اپنی بصیرت افروز تقریر سے حاضرین کے دل موہ لئے۔ ان کی اور نواب بہادر یار جنگ کی تقریروں کے بعض جملے تو ایک عرصہ تک زبان زدِ عام رہے اور جو لوگ زندہ ہیں' ان کے حافظہ کے کسی نہ کسی گوشہ میں ہنوز محفوظ ہیں۔ اللہ ان دونوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ یہ تجویز ''قراردادِ پاکستان'' کے نام سے مشہور ہوئی حالانکہ اس میں آپ پاکستان کا لفظ کہیں بھی نہ پائیں گے۔ اس تاریخی واہم تجویز کی روشنی میں 1941ء کے اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ مدراس میں پرانے نصب العین کو جو مختلف عنوانات کے تدریجی و مشروط مطالباتِ آزادی پر مبنی تھا' قلم زد کر کے نیا نصب العین قرار دیا گیا اور اس طرح ایک زریں اور درخشندہ مکمل آزادی کی تاریخ کا آغاز ہوا۔

ہمیں اس بحث میں الجھنا نہیں ہے کہ پاکستان کا نام کس نے تجویز کیا لیکن تاریخ اور واقعات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ذیل کی باتیں سامنے آتی ہیں:-

1- سرسید احمد خان صاحب کی تحریروں اور تقریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید پہلے مسلمان تھے جنھوں نے دوقوموں کا نظریہ پیش کیا۔
2- ڈاکٹر عبدالستار خیری نے 1917ء میں تقسیمِ ہند اور مسلمانانِ ہند کے لئے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا۔
3- ڈاکٹر سر محمد اقبال نے 1930ء میں اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اس مجوزہ ملک کا اظہار کیا۔
4- چوہدری رحمت علی صاحب کے 1933ء کے بیان کے مطابق وہ اس کے موجد ہیں۔

میں تو نہ نقاد ہوں اور نہ میرا ارادہ تنقیدی جائزہ لینا ہے لیکن اختصار کے ساتھ عرض کردوں کہ اس کے متعلق دستاویزات میں کیا کہا گیا ہے۔ شریف الدین پیرزادہ صاحب نے اپنی کتاب ''پاکستان: منزل بہ منزل'' میں سیر حاصل بحث کی ہے کہ یہ اصطلاح کس کے ساتھ منسوب ہے اور اس کے لغوی معنے کیا ہوتے ہیں اور کس نے سب سے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا۔

اس سلسلے میں کسی ایک کے سر سہرا باندھنے سے قبل اوائل صدی کی تاریخ پر ضرور نظر رکھنی پڑے گی۔ ہم اس تاریخی واقعہ کو بھی کیسے بھلا سکتے ہیں کہ 1906ء میں اس مسلم لیگی وفد نے جس کے سربراہ ہز ہائی نس دی آغا خاں تھے، وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں مسلمانوں کے لئے حقِ جداگانہ انتخاب منوالیا تھا اور جو حقیقتاً سرسید احمد خاں علیہ الرحمتہ کے بتلائے ہوئے دو قومی نظریہ کے عین مطابق تھا۔

بہر حال ان چاروں بزرگوں میں کسی کو اول ؔ اور کسی کو آخر کہنا ہمارا منصب نہیں ہے۔ ہم تو دل سے ان سب کے مرہون منت ہیں اور یہ سب ہمارے دلی شکریہ اور دعائے خیر کے جائز حقدار ہیں۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے، یقیناً ان کی عظمت، خدمت، تجربہ اور زمانہ سابق میں مسلمانوں کے حقوق دلوانے کے لئے پہلی آواز بلند کرنے کی وجہ سے ان تینوں پر ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانانِ ہند پر ان کو فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے پہلے کانگریس نے قائداعظمؒ کی دشمنی میں یہ شر انگیز بات اٹھائی کہ وہ علاقہ جہاں مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک قائم کرنا چاہتی ہے، ''پاک'' ہے اور وہ حصہ جہاں ہندوؤں کی حکومت قائم ہوگی ''ناپاک'' ہے۔ برطانوی اخبار ہندو اور کانگریسی اخباری پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے اور ایک طویل نام ''شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے'' کے بجائے اسے مخفف کرکے ''پاکستان'' کہنے لگے۔ حتیٰ کہ 1947ء کے آزادیٔ ہند کے ایکٹ میں اس مملکت کا نام ''پاکستان'' رکھ کر وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے اس نام کی توثیق بھی فرمادی۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے اس نام کو محض اپنی بدذوقی اور اظہارِ منافرت میں بہت

ہوا دی۔ وہ پاکستان کو انتہائی حقارت کے ساتھ ''قبرستان اور گورستان'' کہتے تھے۔ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پاکستان آئندہ گلستان اور بوستان بنے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نام دنیا بھر میں اپنی پاکیزگی کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ اسے بالآخر مسلم لیگ کو اپنانا ہی پڑا۔

قرار دادِ پاکستان کی تفہیم ونشر واشاعت کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے پورے ہندوستان میں ''یوم پاکستان'' بڑے بڑے جلسے کر کے اور جلوس نکال کر منانے کا حکم دیا۔ جلسے اور جلوس کا ذکر کرتے ہی آنکھوں کے پردوں پر دو شکلیں ابھر آتی ہیں۔ لاہور کے نقیبِ ملّت میاں فیروزالدین اگرچہ وہ ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے ہیں لیکن ان کے پرانے رفقائے کاران کے دل کو گرمانے والے عقیدت آفریں نعروں کو نہیں بھولے ہیں اور نہ کبھی بھولیں گے۔ مسلم لیگ کے جلسوں کو ان کے ساتھ کامیاب بنانے والے ان کے دوسرے رفیق انور غازی آبادی تھے جو اپنے دل کش لیکن پر جوش ترنم سے تلاوت کلام پاک کے بعد قومی ترانے سنا کر حاضرین کو صرف بیدار ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں مستعدی، عزم اور نظم ونسق کے ساتھ منزل کی طرف بڑھنے کی امنگ پیدا کرتے تھے۔ یہ دونوں ہمارے دلوں میں موجود ہیں۔ پرانے ساتھیوں اور احسان مند قوم کو ان دونوں پر سے موتی اور ہیرے نچھاور کرنے چاہیے تھے لیکن ان کے غریب ساتھیوں اور غریب قوم کے پاس سوائے عقیدت کے پھولوں کے اور کیا رکھا تھا۔

کانگریس اور ہندوؤں نے اپنی عادت کے مطابق بہت کیڑے ڈالے۔ ہندومہا سبھا نے جو کچھ کہا اور کیا، وہ سمجھنے کی جیسی بات تھی کیونکہ انھوں نے بغیر لگی لپٹی کے ہمیشہ کھل کر مخالفت و دشمنی کی تھی لیکن شری راجگو پال اچاریہ جیسے ایک معمر، مدبّر، معاملہ فہم کانگریسی کی حرکت بڑی ناشائستہ اور نازیبا تھی۔ انھوں نے اپنی باطنی مخاصمت کو یہ کہہ کر طشت از بام کیا کہ تقسیمِ ہند کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسا کہ گئو ماتا کے دو ٹکڑے کئے جائیں۔ یہ بڑی اشتعال انگیز دلیل تھی جس نے ہندوؤں کے مذہبی عقیدہ کو مجروح کر کے مشتعل کیا لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کانگریسی ذہنیت بخوبی اجاگر ہوئی اور اس کی مزید تصدیق ہوگئی کہ وہ حق تلفی کے معاملہ میں کتنے

پانی میں ہے۔ قائداعظمؒ نے مزید نشر واشاعت کے لئے بمبئی سے ایک وفد کا اعلان کیا جس کے راجہ صاحب محمود آباد، راجہ صاحب پیر پور، سر کریم بھائی ابراہیم، مرزا ابوالحسن صاحب اصفہانی، مولٰینا جمال میاں صاحب فرنگی محلی اور راقم الحروف رکن تھے۔ سب سے پہلے اس وفد نے صوبہ بہار کا وسیع دورہ کیا اور گھر گھر پاکستان کی افادیت وضرورت کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اس زمانہ میں بہار صوبائی مسلم لیگ کے صدر نواب سید اسماعیل صاحب عرف نواب جحن ہوتے تھے۔ وہ بڑے قاعدہ کے بزرگ اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ان دنوں بڑے منظم جلسے ہوا کرتے تھے۔ مجال ہے کہ جلسہ گاہ میں ذرا سا بھی شور وشغب ہو۔ غالباً پٹنہ یا بھاگل پور کے جلسہ میں جبکہ نواب جحن ایک طویل صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حاضرین میں سے ایک صاحب کچھ تفنن طبع کے لئے صاحب صدر کو مخاطب کر کے ہاتھ جوڑ کر فرمانے لگے۔ ''حضور! بس کیجئے! ہمارا بھیجہ پلپلا ہوگیا۔'' تھوڑی دیر کے لیے نواب جحن کا مزاج برہم ہوا اور فرمایا ''تم کو سننا پڑے گا۔ اگر تم نہیں سنو گے تو ہم در و دیوار کو سنائیں گے۔ جلسہ گاہ زعفران زار بن گیا لیکن نواب جحن نے تو سب کو مات دی یعنی اپنی پوری تقریر ختم کئے بغیر دم نہیں لیا۔

جیسے ہی صوبہ کا دورہ ختم ہوا، ہم لوگ الٰہ آباد پہنچے اور ایک عظیم الشان جلسہ کو مخاطب کر کے ہم نے اپنی اس مہم کا آغاز کیا۔ دو ایک جگہ جانے پائے تھے کہ دہلی سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے طلب کیا گیا اور بعد میں آئندہ دورہ کا پروگرام اس لئے ملتوی کرنا پڑا کہ حکومت ہند نے یہ محسوس کیا کہ جنگ عظیم کے اس نازک مرحلے پر جلسوں کے انعقاد کی وجہ سے جنگی تیاریوں پر مضر اثر پڑتا ہے۔ چونکہ مسلم لیگ جنگی تیاریوں میں حائل نہیں ہونا چاہتی تھی جیسا کہ کانگریس کر رہی تھی اور نہ کانگریس کی طرح اتحادیوں کے دشمن کے ساتھ پسِ پردہ کوئی ساز باز کر رہی تھی اور نہ پستول دکھا کر مجبور کو مجبور کر کے سودا کرنا چاہتی تھی، اس لئے حکومتِ ہند کی دلجوئی کی گئی۔ یہ ہی پالیسی کو قائداعظمؒ نے مسلمانانِ ہند کے مفاد میں سمجھا۔

اس تجویز کے پاس ہو جانے کے بعد گاندھی جی نے بھی بہت رخنے ڈالے جوان کی

عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ قائداعظمؒ کو خطوط لکھے۔ بال کی کھال نکالی اور تجویز میں وہ وہ معنے پروئے اور وہ وہ مطالب نکالے کہ عقل حیران رہ گئی۔ الحمدللہ! ہمارا قائد تو ہمیشہ کے مطابق سیر کے لئے سوا سیر ثابت ہوا۔ ایک خط میں گاندھی جی پوچھ بیٹھے کہ کیا تمھیں مسٹر جناح یا قائداعظم کہہ کر مخاطب کروں۔ قائداعظمؒ نے شیکسپیئر کے الفاظ میں جواب دیا: ''اگر گلاب کو اس کے نام سے پکارا جائے یا نہ پکارا جائے تو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔'' یہ خط و کتابت بڑی دلچسپ ہے۔ اس سے قراردادِ پاکستان کا بڑا پروپیگنڈہ ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اس خط و کتابت کے مطالعہ سے تاریخ کے طالبعلموں کو قراردادِ پاکستان کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

میرے خیال میں اس باب کی اسوقت تک تکمیل نہیں ہوسکتی جب تک پنجاب کے پہلے اور بعد کے کچھ حالات پر روشنی نہ ڈالی جائے۔ انگریز حکمران ایک عرصہ سے صوبہ پنجاب کی وفاداری، اس کے ممتاز باشندوں کی رفاقت اور میدان جنگ میں اس کے سپوتوں کی حمایت اور دلیری سے اتنے متاثر تھے کہ وہ یقین کرنے لگے کہ پنجاب ان کا ہے اور ہر حالت میں ان کا رہے گا۔ ویسے بھی انگریزوں اور برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر سے پنجاب کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہ ہندوستان کے ہر صوبہ پر بھاری تھا۔

سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ پنجاب ایسا غلہ خیز خطہ تھا کہ اسے ہندوستان کا صحیح طور پر اناج کا گودام کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کے کچھ صوبوں میں ہمیشہ آفات آسمانی کی وجہ سے قحط سالی رہتی تھی اور اگر وہاں پنجاب سے غلہ نہ بھیجا جاتا تو رعایا فاقے پر فاقہ کر کے مرجاتی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اور اس کے زیر نگیں ملکوں کی بقاء، سلامتی اور اقتدار کے لئے مضبوط ہندوستانی فوج کی ضرورت تھی۔ ہندوستانی افواج میں پنجابی شیر دِلوں اور جنگجوؤں کی ان کی فنی اور جنگی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیشہ غالب اکثریت ہوتی تھی۔ علاوہ بریں پہلی یا دوسری جنگ عظیم ہو یا کوئی بھی جنگ ہو، پنجابی سپاہی اپنے سر کی بازی لگا کر انگریزوں کی فتح کا پرچم بلند کرتا تھا۔ انگریز اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ زندہ دلانِ پنجاب کے

سینوں میں آزادی کا شعلہ فروزاں نہیں ہوا ہے اور وہ ہمیشہ ان کی غلامی کے جوئے کو اپنے کندھوں پر رکھے رہیں گے۔ان کو پنجاب کے مسلمان رؤسا پر بالخصوص بڑا ناز اور اعتماد تھا جنھیں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ایک جماعت میں منسلک کر کے اپنے تسلط کو قائم رکھنے اور حکمرانی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔اس پارٹی کا نام یونینسٹ تھا۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر زوال پذیر پارٹی یا حکومت اپنے آخری دنوں میں عقل و بصارت سے محروم ہو جاتی ہے اور وہ ایک ہی لکڑی سے ہر ایک کو ہانکنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب ہندوستانی مسلمان ذہنی طور پر پوری طرح بیدار ہو کر اپنی غلامی کی زنجیروں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے توڑ دینا چاہتے تھے'انھیں کس طرح سبز باغ دکھلا کر'لالچ دے کر یا گمراہ کر کے خریدا جاسکتا یا ظلم کے لئے دبایا جاسکتا تھا۔

آپ بھولے نہیں ہوں گے کہ خضر حیات خاں کی وزارت نے صوبائی مسلم لیگ کی دن دونی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے اور تحریک سول نافرمانی کو دبانے کے لئے مسلم نیشنل گارڈز جیسی ایک آئینی نہتی رضا کار جماعت کو غیر قانونی قرار دے کر جلسہ جلوس میں شرکت اور ان کے یونیفارم پہننے کو منع کر دیا تھا۔درحقیقت حکومت کی یہ جابرانہ دست درازی مسلم لیگ اور مسلم نیشنل گارڈز کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا۔پنجاب صوبائی مسلم لیگ نواب صاحب ممدوٹ کی قیادت میں ایک بہت طاقتور جماعت بن گئی تھی اور مسلم نیشنل گارڈز بھی مقابلہ کے لئے بالکل منظم اور تیار تھے۔بمبئی'اجمیر'یو۔پی وغیرہ وغیرہ کے مسلم نیشنل گارڈز نے لاہور پہنچ کر سول نافرمانی کرنے کی اجازت طلب کی لیکن اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اسے کل ہند مسئلہ بنانا مقصود نہیں تھا۔ دوئم پنجاب مسلم لیگ تنہا مقابلہ کر کے صوبائی حکومت کو کیفر کردار تک پہنچا سکتی تھی۔

سب سے پہلے دہلی سے نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب نے 25 جنوری 1947ء کو ایک اخباری بیان دے کر اور صوبائی حکومت کو تنبیہہ کر کے چیلنج قبول کیا۔ یہ بیان اس وجہ سے بھی بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ اس میں مسلم نیشنل گارڈز کی مختلف خدمات کا اعتراف اور صوبائی

حکومت میں ہندوؤں کی اکثریت و چند مسلم غداروں کی ہندونوازی کا ذکر ہے۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری صاحب کا بیان ملاحظہ فرما کر لطف اندوز ہوں:۔

''یہ بات کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ لیگ نیشنل گارڈز ایک خانگی فوج ہے۔ وزارت نے یہ نا قابلِ تائید رویہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کی آڑ میں مسلم لیگ کا زور توڑ دے۔

حکومت پنجاب کی کارروائی کی مکمل رپورٹ دوبارہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور سرکاری اعلان میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

مسلم لیگ کی کوئی خانگی فوج نہیں ہے۔ نیشنل گارڈز مسلم لیگ کی تنظیم کا ایک جزو ہیں۔ اس لئے ان پر حملہ مسلم لیگ پر حملہ کے مترادف ہے۔ پنجاب حکومت کی اس عذر خواہی سے کہ یہ کارروائی مسلم لیگ کے خلاف نہیں ہے' کوئی دھوکہ نہیں کھا سکتا۔

1938ء سے جب نیشنل گارڈز عالم وجود میں آئے' آج تک وہ کسی بھی غیر قانونی حرکت یا تشدد کے مجرم نہیں ٹھہرائے گئے۔ ان کی تمام تر سرگرمیاں مسلمانوں کو منظم کرنے' جلسہ جلوس کا انتظام کرنے' امن و امان قائم رکھنے اور مصیبت زدوں کی امداد کرنے پر مشتمل رہی ہیں۔ دورانِ جنگ نیشنل گارڈز نے برما کے پناہ گزینوں کی خدمت کر کے' سول حکام کا ہاتھ بٹا کر اہم کردار ادا کیا تھا۔ بنگال میں قحط کے زمانہ میں انھوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر امدادی کام کیا اور بہار میں قتل عام کے موقعہ پر لاثانی انسانی خدمات انجام دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ صوبائی وزارت جو سرشت میں ہندو اور چند مسلم غداروں کی تائید سے برسر اقتدار آ گئی ہے' پنجاب کی ایک غیر فطری حکومت ہے کیونکہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

صوبائی حکومت جب سے گدی نشین ہوئی' اس نے نیشنل گارڈز کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر پنجاب کے معزز و ذمہ دار مسلمانوں کو گرفتار اور مسلم لیگیوں کے خلاف مسلسل تعدی و ظلم کر کے استبداد کے سمت الراس کو پہنچ گئی ہے۔

وزارت پنجاب نے مسلم لیگ کو صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ کل ہندوستان میں دعوتِ جنگ دی ہے اس لئے اس کو اس مجنونانہ فعل کے تمام نتائج کا بھگتان بھگتنا پڑے گا۔''

دنیا نے پنجاب میں صوبائی وزارت اور مسلم غداروں کا حشر دیکھ لیا۔ نواب صاحب ممدوٹ نے مسلم لیگ کی شاندار کامیابی پر ایک برقیہ ارسال کر کے اپنے جذباتِ انبساط کا اظہار کیا تھا۔ جب یہ سطریں ضبطِ تحریر کی جا رہی تھیں کہ اچانک ریڈیو پاکستان نے ایک ہوش ربا اور الم انگیز خبر کا اعلان کیا کہ نواب صاحب ممدوٹ کی بھی شمعِ حیات گل ہوگئی۔ ضلع فیروز پور میں ممدوٹ رہ گیا لیکن اس صابر، قالغ اور نیک بندۂ خدا نے جو ممدوٹ کا نواب تھا، کبھی بھی اپنی زبان پر ایک حرفِ شکایت نہیں لایا۔ وہ دنیا میں آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ اب صرف ان کی خدمات اور یاد باقی رہ گئی ہے۔

شمع گل، انوار غائب، صرف باقی ایک داغ
چاند ڈوبا ، چاندنی کا پھر نہیں ملتا سراغ
کارنامے مردِ مومن کے مگر روشن سدا
گرچہ بجھ جاتا ہے اس کی زندگانی کا چراغ

(خورشید)

میں بھی اس کتاب میں کم از کم کیوں نہ ان کی ایک قومی اور ملی خدمت اور یاد کو ان کے برقیہ کو شائع کر کے محفوظ کر لوں۔

پنجاب کے مسلمان رؤسا اور یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں میں انگریزوں کے پرستار ضرور تھے لیکن حق گو، حریت پسند اور اسلام کے شیدائیوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ صوبائی مسلم لیگ، اس کے حامی، خواتین، طلبا اور مسلم نیشنل گارڈز نے سول نافرمانی کر کے برطانوی استعماریت کا جنازہ نکال دیا اور یونینسٹ پارٹی کو یہاں تک مفلوج کر دیا کہ اس کی حکومت کے پرخچے اڑ گئے۔ مردوں نے چاہے وہ لیڈرانِ قوم ہوں، طالب علم ہوں یا مسلم نیشنل گارڈز ہوں

’آل انڈیا مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو منوانے‘ اس کا وقار اور حکومت قائم کرنے میں تن من دھن سے حصہ لیا لیکن ہماری بہنوں نے تو غضب کیا۔ انھوں نے مردوں کو کئی فرسنگ پیچھے چھوڑ کر سیکرٹریٹ کی عمارت پر ’’اللہ اکبر‘‘ ’’اسلام زندہ باد‘‘ ’’قائداعظم زندہ باد‘‘ اور ’’مسلم لیگ زندہ باد‘‘ کے فلک شگاف نعروں میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پرچم لہرا کر پاکستان کے وجود کو اس کے حقیقی قیام سے بہت قبل منوا دیا ۔

اللہ کے وعدے پہ مجاہد کو یقیں ہے
وہ فتح مبیں فتح مبیں فتح مبیں ہے

(رئیس امروہوی)

☆☆☆☆☆
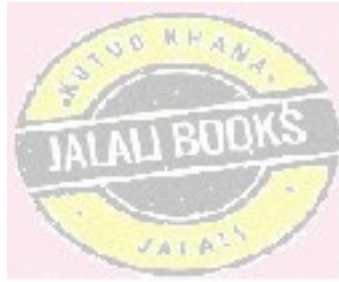
سحبانُ العصر

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(ظفر)

آتش بیاں وشعلہ نوا بہادر خاں' اقبال کا ماننے والا بہادر خاں' اقبالیات کا درس دینے والا بہادر خاں' ہفتہ وار درسِ اقبالیات دے کر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی معیت میں اپنے قوم پرست دیرینہ دوست ہاشم علی خاں کے گھر کھانا کھانے جاتا ہے جہاں کچھ لوگ پہلے سے مدعو تھے۔ اُن میں سے حیدرآباد ہائی کورٹ کے ایک سابق جج انصاری صاحب نے جو کراچی میں مقیم ہیں' فرمایا کہ وہاں پہلے سے حقہ کا دور چل رہا تھا اور جب نواب بہادر تشریف لائے تو انہوں نے بھی دو تین کش لگائے لیکن واحسرتا کہ حقہ کا آخری کش ان کی سانس کا آخری کش ثابت ہوا۔

پہاڑ جیسی طاقت رکھنے والا انسان' پہاڑ کے جیسے مضبوط ارادوں کا انسان' پہاڑ کی جیسی رفعت والا انسان' پہاڑ کے جیسا اٹل انسان' پہاڑ کے جیسے باد وطوفان' سرد وگرم کا مقابلہ کرنے والا انسان آناً فاناً زمیں دوز ہوگیا۔ حیف صد حیف ؎

گل ہوا عہدِ جوانی میں چراغِ زندگی
ہائے کیسا نیند کا جھونکا سرِ شام آ گیا

ظاہر ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے کہا بڑی گہری سازش تھی۔ کسی نے کہا زہر کھلوا دیا۔ کسی نے کہا حقہ میں زہر تھا۔ الغرض زہر خورانی کا چرچہ عرصہ تک ہوتا رہا۔ اگرچہ اس یقین کو

وہم دے کر پالنے والی اکثریت تھی لیکن افسوس اس کے پاس اس فرد جرم کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت یا شہادت موجود نہیں تھی۔ حیدر آباد کے لوگ ہوں، ریاستوں کے لوگ ہوں یا برطانوی ہند کے، وہ اپنی بیکسی پر چار آنسو بہا کر ونوحہ وگریہ کر کے صبر وخاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آخر کرتے بھی کیا، حکومت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ زہر نہیں دیا گیا، وہ فطری موت مرے لیکن عقیدتمندوں کے شکوک وشبہات دور نہیں ہوئے۔ وہ تو برابر یہ ہی رٹ لگائے رہے کہ نواب بہادر فطری موت نہیں مرے بلکہ ان کو مارا گیا ہے۔

وقت بہت گزر گیا اور تا قیامت گزرتا رہے گا۔ اب تو ان کو داغِ مفارقت دیے ہوئے پچیس سال گزر گئے لیکن ہنوز دل میں خلش باقی ہے اور تا زیست باقی رہے گی۔

ہمارے جواں مرگ وجواں سال رہنما کی دائمی جدائی سے علم وفضل اور سیاست کی وہ شمع جو انہوں نے زمینِ دکن میں فروزاں کی تھی اور جو مخالف ہواؤں کے تیز جھکڑوں میں بھی ہمیشہ روشن رہی، اچانک بجھ گئی جس سے ملک وقوم کو نقصانِ عظیم پہنچا۔ مسلمانانِ ہند نے تو یہ سمجھا کہ ایک چراغ جس کی تیز روشنی سے صرف ظلمت کدۂ دکن ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستان منور ہو رہا تھا، ایک پھونک سے بجھا دیا گیا۔

سحبان العصر ہم سے جدا ہو گئے اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ یہ ہی اللہ کا حکم تھا جس کے سامنے ہم عاجز بندوں کا سر تسلیم خم ہے لیکن یاد رکھئے، ہمیں ایک فرض ادا کرنا ہے جسے انہوں نے ہم پر عائد کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ:-

1- ملتِ اسلامیہ کو تنظیم اور اتحاد کے سانچے میں ڈھالو اور

2- اپنی مردہ قوم کے قالب میں ساڑھے تیرہ سو برس قبل کی روح پھونکو تا کہ وہ اللہ کی ہو کر ساری دنیا کو اُس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کر دے۔

میاں بشیر احمد نے جو بڑے ادیب وشاعر باپ کے بڑے ادیب وشاعر بیٹے اور قائداعظمؒ کی مجلس عاملہ کے رکن ہونے کی وجہ سے ہمارے بھی بڑے ہیں اور جو مجسمۂ سادگی و

شرافت اور ایثار پیکر انسان ہیں، اس سانحۂ عظیم کی روح فرسا خبر سن کر بعنوان ''بہادر یار جنگ'' اپنے منفرد انداز اور نہایت سلیس زبان میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ وہ حاضر خدمت ہے کیونکہ میرے خیال میں اس سے بہتر الفاظ میں نواب بہادر یار جنگ کی خدمات، شخصیت، حقیقت و صداقت کا دلی اعتراف نہیں ہو سکتا۔

دریا فصاحتوں کے بہا کر چلا گیا
نعرہ صداقتوں کا لگا کر چلا گیا
دنیائے نو کی جس میں جھلک آشکار تھی
انساں کو وہ نظارہ دکھا کر چلا گیا
اے قوم! تو نے نہ کچھ اس کی قدر کی
وہ دل شکستہ منہ کو چھپا کر چلا گیا
منصب کو چھوڑ جاہ سے منہ اپنا موڑ کر
ملت کی رہ میں جان گنوا کر چلا گیا
خوشبو سے اُس کی باغِ محمدؐ مہک اُٹھا
اِک پھول تھا بہار دکھا کر چلا گیا
فرصت ملی بس اتنی کہ اس درسگاہ میں
اللہ کا کلام پڑھا کر چلا گیا
رحمت خدا کی اس پہ جو اس عہدِ کفر میں
اسلام کا پیام سنا کر چلا گیا

عملی اقدامات

نقارہ بجا پھر شوکت کا
نظارہ دکھا پھر حکمت کا
چھلکا دے پیالہ اخوت کا
چمکا دے ستارہ شریعت کا
اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

(ظفرؔ علی خاں)

قائداعظمؒ کی افتادِ طبع اوران کی آئینی اور عملی زندگی نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ آئین، صداقت، بے باکی، دیانت اور حق گوئی کے مجسمہ تھے۔ وہ ''سول نافرمانی'' ''قانون شکنی'' اور ''مرن برت'' کو چاہے وہ عدم تشدد کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، لغو سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا جس کی تصدیق کانگریس کی کئی ستیاگرہوں کی المناک ناکامیوں کے بعد ہوئی کہ عدم تشدد حکومت اور سیاسی پارٹی کی باہمی تلخی، کشیدگی اور غیر ارادی تصادم وتشدد میں تبدیل ہوکر خون خرابے کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس سے پارٹی کے مفاد کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور حکومت عرصہ تک اپنے وقار کی خاطر جبر وظلم کرتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے جذباتی مزاج، ظلم وزیادتی کا شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنا، اسلام کے نام پر سینہ سپر وسر بکف ہونا الغرض وہ مسلمانوں کی اِن تمام قومی خصوصیات سے اچھی طرح واقف تھے، لہٰذا انہوں نے مسلم لیگ کو ہر تصادم سے بچایا اور ہر وقت اشارۃً کنایۃً اور

جب ضرورت سمجھی تو فوراً ایسی تحریکوں کی علانیہ بری طرح مذمت کی تا کہ مسلمان اسے حصولِ مقصد کا ذریعہ نہ سمجھیں اور اکثر اوقات ان کی توجہ ہٹانے اور مصروف رکھنے کے لئے معقول اور مفید کام کرنے کا حکم دیا۔ یقین محکم، متحدہ عمل کی قوت، اخوت اسلامی، سالار قافلہ کی بے چون و چرا اطاعت، یہ تمام خوبیاں قائداعظمؒ کی قیادت کی وجہ سے قوم میں پیدا ہو گئی تھیں۔

شروع میں دو طبقوں کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے قائداعظمؒ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تو ان کا تدبر اور قوتِ برداشت تھی جس نے ان کو کامیاب کیا۔ پہلا طبقہ اُن مسلم امراء اور خطاب یافتگان کا تھا جن کی رسائی چھوٹے بڑے انگریز حکام اور وائسرائے تک تھی۔ یہ لوگ باہمی اور ارتباط کی وجہ سے ایک دوسرے کو دوست اور بہی خواہ سمجھتے تھے۔ انگریز نے ان لوگوں میں سے بہت سوں کو ہمیشہ اپنا آلۂ کار بنایا لیکن یہ سادہ لوح ایسی خدمت کو اپنا فرضِ اولین اور دلیلِ وفاداری سمجھتے تھے۔ انگریز اپنی جگہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ چونکہ مسلمان ہمارے وفادار دوست ہیں، اس لئے قائداعظمؒ اور حکومت کے درمیان سودا کرانے میں مددگار ثابت ہوں گے اور کئی وقت اس قسم کے لوگ حکومت سے زیادہ قریب ہونے اور اپنے لئے مزید مراعات حاصل کرنے کے لئے اونٹ پٹانگ باتیں کرتے اور انگریزوں کو یقین دلاتے کہ ہم بہت با اثر ہیں اور قائداعظمؒ سے کہہ کر یہ کرا دیں گے اور وہ کرا دیں گے۔ دوسرا طبقہ ان قوم پرست مسلمانوں کا تھا جو کانگریسی لیکن خلافتی تھے اور جو بعد میں کانگریس کو بدنیت، ہندو نواز اور مسلم دشمن سمجھ کر مسلم لیگ کا دست راست بن گئے تھے۔ یہ حضرات کانگریس سے دیرینہ تعلقات اور چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ پرانی دوستی کی وجہ سے دیانت داری کے ساتھ سمجھتے تھے کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کرا سکتے ہیں۔ پہلا طبقہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انگریز کی ڈپلومیسی کتنی گہری اور عیارانہ ہے۔ دوسرا طبقہ بھی کانگریس کی چکنی چپڑی اور فریب دہ باتوں کا عمیق مطالعہ کئے بغیر جھانسہ میں آ جاتا تھا۔ دشمنوں کی چالوں کو سمجھنا اور جو گڑھے مسلمانوں کو دفن کرنے کے لئے کھودے جاتے تھے، ان سے بچنے اور قوم کو حفاظت کے ساتھ صحیح و سالم منزلِ

مقصود تک پہنچانے کے لئے نظم وضبط قائم کرنے اور برقرار رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ قائداعظمؒ نے تجاویز' تقاریر اور بیانات کے ذریعہ ان ہر دو طبقہ کے افراد پر یہ کہہ کر سخت پابندی لگا دی کہ صرف مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اس امر کی مجاز ہے کہ وہ گفت وشنید کرے اور آئندہ کوئی بھی فردِ واحد حکومت اور سیاسی جماعتوں سے مسلم لیگ کی طرف سے بات چیت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ جب ان دونوں طبقوں پر انہوں نے مکمل قابو پالیا اور اب پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ان کی پشت پر کھڑی ہوگئی جس میں رخنہ ڈالنے یا عبور کرنے کی مجال نہ رہی تو وہ اندرونی تنظیم کی طرف رجوع ہوئے تا کہ موقعہ آنے پر قوم ہر چیز کے مقابلے کے لئے تیار رہے۔

سب سے پہلے اُنہوں نے مجلسِ عمل قائم کی اور اس سب کمیٹی کی باگ ڈور یعنی صدارت نواب اسماعیل خاں صاحب کے سپرد کی جنہیں وہ بہت چاہتے اور عزت کرتے تھے۔ نواب صاحب شرافت' اسلامی تہذیب وکلچر کا نمونہ اور مسلم لیگ کے دلارے تھے۔ نہایت کم سخن' خوش اخلاق' ملنسار اور ہر دلعزیز تھے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب' نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب اور مسلم نیشنل گارڈز کا سربراہ (صدیق علی خاں) سب کمیٹی کے اراکین تھے۔ قائداعظمؒ کثرتِ کار اور ان کے بیشتر رفقاء کی جماعتی مصروفیت کی وجہ سے مجلس عاملہ کا وقتاً فوقتاً انعقادِ اجلاس کرنا اور ان کی شرکت کی توقع رکھنا مشکل تھا۔ اس لئے روزمرہ کے بڑھتے ہوئے کام جن کا تعلق مسلم لیگ کی پالیسی سے نہیں بلکہ اکثر وبیشتر انتظامی امور اور مجلس عاملہ کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا تھا' مجلس عمل کے سپرد کئے گئے تا کہ قائداعظمؒ کا کام کچھ کم ہوجائے اور ان کی اہم مصروفیات میں خلل نہ واقع ہو۔

سب سے پہلے مجلس عمل نے مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم نو کی۔ ویسے تو ہر زمانہ میں رضا کاروں کی مختلف ناموں سے جماعت قائم رہی ہے اور اس کا وقتی تعلق مختلف مذہبی' سیاسی اور سماجی اداروں سے رہا ہے۔ علاوہ ازیں کانفرنسوں' جلسوں اور جلوس کے موقعہ پر بھی ان جماعتوں نے بہت نمایاں واہم خدمات انجام دی ہیں لیکن جب سیاسی جماعتوں نے مضبوطی سے مستقلاً جڑ پکڑ

لی تو رضا کاروں کی بھی مستقل بنیادوں پر تنظیمِ نو ضروری ہوگئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے قومی سطح پر رضا کاروں کی ایک فعال جماعت بنانے کا طے کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس کی کونسل و مجلس عاملہ نے 1938ء' 1939ء' 1940ء' 1941ء اور 1942ء میں پانچ تجاویز پاس اور ضروری کارروائی کر کے اور مجلس عمل نے 13 مئی 1944ء اجلاس منعقدہ دہلی میں بالآخر مسلم نیشنل گارڈز کی باقاعدہ تنظیم نو آل انڈیا مسلم لیگ کے خطوط پر کی۔ چونکہ یہ ادارہ کل ہند بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا' اس لئے اس کا بھی دائرۂ عمل اتنا ہی وسیع تھا جتنا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا۔ مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم کچھ اس طرح کی گئی کہ پہلے سالارِ اعلیٰ آل انڈیا مسلم نیشنل گارڈز مقرر کیا گیا۔ نواب زادہ صاحب کا ارسال کردہ تقرری نامہ زیبِ اوراق کیا جا رہا ہے۔ اس عہدۂ جلیلہ پر راقم الحروف کو فائز کر کے صرف اسے عزت ہی نہیں بخشی گئی بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اعتماد و کرم کا مظاہرہ کیا گیا۔ سالارِ اعلیٰ کے لئے ایک سہ رکنی مشاورتی کمیٹی جس کا اصلی نام ''مجلس اعلیٰ'' تھا' نامزد کی گئی۔ اس کے اراکین جو ناظم کہلاتے تھے' اپنے صوبوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:-

1- ایس ایم اے اشرف صاحب بیرسٹر (یو پی) 2- سید خلیل الرحمٰن صاحب (پنجاب) اور 3- آغا غلام نبی خان صاحب (سندھ)۔ مجلس عمل نے آئین کے مطابق دو نائب سالارِ اعلیٰ میجر خورشید انور صاحب اور مرزا اعتماد الدین احمد صاحب (کیپٹن شاہجہاں) کو مقرر کیا تھا۔ صوبائی سالار بھی بڑے مستعد' ایثار کیش' مخلص مسلم لیگی ہوتے تھے۔

سالارِ صوبہ کو صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی سفارش پر سالارِ اعلیٰ نامزد کرتا تھا اور سالارِ صوبہ کی شش رکنی صوبائی مجلس ہوتی تھی۔ ان اراکین کو صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ ضلع یا شہر کے سرداروں میں سے نامزد کیا کرتی تھی۔ اس ہی طرح ضلع اور شہر سالاروں کو سالارِ صوبہ اپنے صوبہ کے صدر کی منظوری سے نامزد کرتا تھا۔ مسلم نیشنل گارڈز کے بڑے افسروں کے نشاناتِ امتیاز کا بھی حال سن لیجئے:-

1- سالارِاعلیٰ: دونوں شانوں پر دؤ دو آڑی تلواریں' ایک ایک ہلال اور دؤ دو ستارے
2- نائب سالارِاعلیٰ: دونوں شانوں پر دؤ دو آڑی تلواریں' ایک ایک ہلال اور ایک ایک ستارہ
3- سالار صوبہ: دونوں شانوں پر ایک ایک ہلال اور دؤ دو ستارے
4- سردار: دونوں شانوں پر ایک ایک ہلال
5- کپتان: دونوں شانوں پر مثلث کی شکل میں تین تین ستارے۔

وردیوں کے لئے خاکی' گہرا سبز اور خاکستری کپڑا تجویز کیا گیا تھا۔ صوبائی' اضلاعی اور شہری سالاروں کے چند نام پیش کئے جاتے ہیں:-

1- خواجہ نور الدین صاحب 2- عزیز لالجی صاحب 3- حبیب اللہ صاحب 4- ہاشم علی انعامدار صاحب 5- محمد سلیمان جان صاحب 6- کرنل آئی اے ایس دارا 7- سید امیر حسین شاہ صاحب 8- محمود ہارون صاحب 9- جمال محی الدین صاحب 10- خان فیض محمد خان صاحب 11- عبدالجلیل صاحب 12- منظور الحق صاحب 13- ڈاکٹر بشیر الحق صاحب 14- ایس ایس اے قادری صاحب 15- خان صاحب مظہر امام صاحب 16- نوابزادہ ولایت علی خاں صاحب 17- آئی اے مہاجر صاحب 18- سابق ایم این اے ظہیر الدین صاحب مرکزی وزیر 19- محمد صدر الانام خاں صاحب 20- محمد اعظم صاحب 21- امام علی صاحب 22- ایف ربی صاحب 23- عبدالمنعم خاں (سابق گورنر) 24- مولانا نور الزماں صاحب 25- مظفر احمد صاحب سابق ایم این اے 26- خیرات حسین صاحب (سابق وزیر) 27- حسن رضا صاحب 28- عبدالکریم صاحب 29- ایم اے یمنی صاحب 30- آدم منہار صاحب 31- عبدالحمید صاحب 32- قاضی محمد اکبر صاحب 33- قاسم ہوت صاحب 34- سعید ہارون صاحب 35- سید عبدالرزاق حسینی صاحب 36- اسماعیل تابش صاحب 37- تاج علی خاں صاحب 38- فدا محمد بابوزئی صاحب 39- سید بدر الحسن صاحب 40- محمد ایوب خان صاحب 41- عبدالصمد صاحب 42- عبدالوحید صاحب 43- محمد قاسم صاحب 44- عبدالعلیم صاحب 45- مولٰینا اسد القادری 46- شمشیر خاں صاحب وغیرہ۔

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جماعت کی اہمیت اور خدمت کی نوعیت بھی سامنے آ جائے تو بہت بہتر ہے۔ مسلمانانِ ہند کی یہ ایک باوردی نہتی فوج تھی۔ اس کے فرائض ہر قسم کی قومی خدمت پر مشتمل تھے جیسا کہ شائع شدہ آئین وضوابط آل انڈیا مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی دفعہ 4 (الف) اور (ب) سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) مسلمانوں کی معاشرتی اور جسمانی ترقی اور ملک میں نظم و امن قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں میں متحدہ مساعی کی ترتیب وتنظیم

(ب) مسلمانوں میں اپنے ملک وملت اور انسانیت کے لئے خدمت وایثار کا جذبہ پیدا کرنا۔

علاوہ ازیں جلسے جلوس کا انتظام کرنا' دفاعی اور حفاظتی کام کرنا' آسمانی وسلطانی مصیبت نازل ہو تو ہر خدمت انجام دینے کے لئے میدانِ عمل میں آنا۔ یہاں تک ہوا ہے کہ صوبہ بمبئی کے قلابے ضلع میں جب ہندوؤں نے مسلمانوں کے مکانوں کو جلانا اور قتل کرنا شروع کیا تو مسلمانوں کی چار چار پانچ پانچ دنوں کی سڑی ہوئی لاشوں کو مسلم نیشنل گارڈز نے مکانوں سے نکال کر خود اپنے ہاتھوں سے بڑے بڑے گڑھے کھود کر دفن کیا۔ آیئے! ہم سب مل کر ان مظلومین کی موت پر چار آنسو بہائیں اور ان کی مغفرت کے لئے دست بدعا ہوں۔ حقیقتاً ان ہی جیسے لاکھوں شہیدوں کے پاک خون سے قائم ہونے والے پاکستان کی آبیاری ہوئی اور پاکستان کا پودا سرزمین ہند سے نکلا اور اللہ کے فضل سے آج ایک بڑا سایہ دار تناور درخت بن گیا ہے۔ آپ کی یہ قومی فوج اعزازی خدمت انجام دیتی تھی۔ بسا اوقات یہ اپنے تمام اخراجات کا بار خود اٹھاتی اور ملازمت سے غیر حاضری کی وجہ سے تنخواہ کٹنے سے جو مالی نقصان ہوتا' برداشت کرتی تھی۔ ان جیالے نوجوانوں نے قوم و ملک کی بڑی خاموشی کے ساتھ ہر صبر آزما گھڑی میں شاندار خدمات انجام دیں جسے قوم اور ہمارے اکابرین نے بہ نظر استحسان دیکھا۔

ناگپور مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم نے آل انڈیا مسلم لیگ کو بڑے پیمانہ اور عوامی سطح پر دیہاتی عوام سے روشناس کرانے کے لئے گیارہ جفاکش' سر پھرے اور منچلے سائیکل سواروں کا ایک جتھا شہر ناگپور سے پٹنہ کے آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ کیا تھا۔ اس

کے سالار ایک جوشیلے' بے باک' مخلص خادم قوم نوجوان تھے۔ ان کا نام عبدالمجید کھام گانوی ہے جن کی قومی زندگی جنگ و امن کے دوران یعنی ہندوستان و پاکستان میں بڑی طوفان خیز رہی ہے۔ جناب ابراہیم خاں صاحب فنا نے جتھے کے دو ممبروں کے ناموں کی تصدیق کی۔ اس کے بعد فنا صاحب کی خزاں دیدہ کھٹارا گاڑی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی حالانکہ وہ ابھی تک ''ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے'' کے مصداق الحمدللہ جیسے کے ویسے ہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ نے اب ان کا ساتھ چھوڑنے کی ٹھان لی ہے۔ وہ سیاسی آدمی ہیں' اس لئے انہوں نے مجھے گول مول جواب دے کر خاموش کر دیا کہ باقی ماندہ سائیکل سوار مومن پورہ کے رہنے والے تھے۔ اس معاملہ پر کھام گانوی صاحب ضرور روشنی ڈال سکتے لیکن افسوس ہے کہ اس کا موقع نہیں میسر آ سکا۔

قصہ مختصر اس جتھے نے اپنے اس طول طویل سفر میں ہر دیہہ' ہر قریہ اور ہر شہر میں مسلم لیگ کا زور و شور کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی جفاکشی اور ایثار کیشی سے مسلم لیگ کا نام بہت روشن ہوا اور اُس کا پیغام اُن گھروں میں پہنچ گیا جہاں گاؤں کے چودھری' خشک سالی' لگان کی وصولی' مویشیوں کی بیماری' تہواروں اور شادی بیاہ کے ذکر کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن اب گھر گھر جناح صاحب اور مسلم لیگ کے چرچے ہونے لگے۔

قائداعظمؒ و آل انڈیا مسلم لیگ کی خاص توجہ و سرپرستی کی بدولت اس جماعت نے بہت ترقی کی۔ اس ضمن میں یہ امر بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ہمارے چند اکابرین بالخصوص نوابزادہ صاحب لوگوں کے دلوں میں شوق پیدا کرنے اور مسلم نیشنل گارڈز کے حوصلے بڑھانے کے لئے کئی مرتبہ یونیفارم زیب تن کر کے شریک جلسہ ہوئے۔ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب نے بحیثیت صدر یوپی' مسلم لیگ طے کر دیا تھا کہ صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ہر رکن یونیفارم پہن کر مجلس عاملہ میں شریک ہوا کرے۔ چھوٹے چھوٹے قریوں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ باوردی بے وردی' باقاعدہ بے قاعدہ مسلم نیشنل گارڈز کی تعداد ہندوستان بھر میں

صوبائی ہیڈکوارٹرز کی موصول شدہ مصدقہ رپورٹوں کے مطابق دس لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ مسلم نیشنل گارڈز بنگال میں تھے۔ان کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ تھی اور وہاں سند یافتہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی ماتحتی میں مسلم نیشنل گارڈز ایمبولینس بریگیڈ قائم کی گئی تھی۔

ہماری قومی فوج نے جو بے تیغ تھی، ہر محاذ پر مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے اقبال منداور پُر شکوہ قائداعظمؒ کی بے لوث قیادت میں ہر معرکہ کو سر کیا۔قائداعظمؒ سے ہر کس و ناکس کو بے پناہ محبت تھی اور ان کی عزت و احترام کا یہاں تک پاس تھا کہ ان کے قومی خطاب کی وحدانیت کو برقرار اور ان کی قیادت کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ مسلم لیگی عہدہ کے ساتھ اعظم کا لفظ منسوب کیا جائے۔اس کا ثبوت اس وقت ملا جب مسلم نیشنل گارڈز کے سربراہ کے لئے ''سالار اعظم'' کا لقب تجویز کیا گیا لیکن آپ یقین فرمائیں کہ سوئے ادبی کے پیش نظر پھر کسی نے دوبارہ اس کا نام تک نہیں لیا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر مسلم لیگی کو قائداعظمؒ سے کیسی بے پناہ عقیدت تھی۔

مسلم نیشنل گارڈز کی تنظیم کو مضبوط کرنے کے سلسلے میں چند کانفرنسیں بھروچ، بنگلور اور پٹنے ویلی وغیرہ میں منعقد کی گئیں۔بھروچ کانفرنس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی تھی۔اس کا مختصر سا ذکر اس امر کی تائید کرے گا کہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے بزرگانِ دین دعائیں فرمایا کرتے تھے۔جب بھروچ میں مسلم نیشنل گارڈز کی کانفرنس ہو رہی تھی، اس وقت ایک بزرگِ کامل حضرت سید معصوم ضیاء شاہ صاحب کا بلیمورا سے ایک پیغام موصول ہوا جس کی رو سے انہوں نے مجھے ازراہِ شفقت وتلطف بمبئی جاتے ہوئے میرے چند رفقا کے ساتھ ظہرانہ پر مدعو فرمایا تھا۔حضرت موصوف اپنے خاندان کے ساتھ بادشاہ امان اللہ خاں کی معزولی کے بعد جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے، بلیمورا ہجرت کر کے آ گئے تھے۔حضرت نے انواع واقسام کے لذیذ کھانے کھلانے کے بعد قائداعظمؒ کی درازیٔ عمر وحصولِ پاکستان کی

دعاؤں سے بھی نوازا۔ انہوں نے قائداعظمؒ کی خدمات کو بہت سراہا اور پاکستان کی حمایت میں باوجود گوشہ نشین ہونے کے کئی سیاسی نکات بیان فرمائے۔ یہ خدا رسیدہ بزرگ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کراچی تشریف لائے اور ملیر میں کچھ عرصہ تک کوئٹہ والے سیٹھ کی عمارت میں فروکش ہوئے۔ اب تو ماڈل کالونی کی مسجد کے صحن کے ایک گوشہ میں جہاں نور ہی نور برستا ہے' استراحت فرمارہے ہیں۔ اللہ ان بزرگ اور دوسرے بزرگوں کو جن کی پاک دعائیں قبول ہوئیں' اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

صوبہ سرحد و صوبہ بنگال کے مسلم نیشنل گارڈز پر عام خدمت کرنے کے علاوہ ریفرنڈم کا بھی بڑا بوجھ پڑا۔ ان کا ہاتھ بٹانے' اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے دوسرے صوبوں کے بھی مسلم نیشنل گارڈز وہاں پہنچ گئے۔ صوبہ سرحد کا ریفرنڈم اور وائسرائے کا تحقیقاتی دورہ بھی بہت اہم اور معرکتہ الآرا تھا۔ اس کا بھی کچھ ذکر سن لیجئے۔

سچ تو یہ ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ صوبہ سرحد میں سیاسی جنگ نظریاتی اور بنیادی تھی یعنی سرخ پوش کانگریس کے حامی اور قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ یہاں دوسرے صوبوں کے جیسے کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی۔ ایک خدا کے ماننے والے اور ایک رسولؐ کے امتی ایک دوسرے سے اس لئے دست و گریبان تھے کہ خان برادران کے سرخ پوش جو اصل میں خدائی خدمتگار کہلاتے تھے' کعبہ سے صنموں کو نکال پھینکنا نہیں چاہتے تھے۔ مسلم لیگ کہتی تھی کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اب کعبہ میں بت رہیں۔ سرخ پوشوں کی دو بہت بڑی مورتیاں جن سے وہ جدا نہیں ہونا چاہتے تھے' وہ گاندھی اور نہرو تھے۔ یہ سیدھے سادھے پٹھان ان دونوں ہندو نیتاؤں کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور وہ ان کے اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ذریعہ بڑی کامیابی سے مسلم لیگ کے دعوے کو کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے' باطل کررہے تھے۔ ان دونوں ہندو رہنماؤں کو اس صوبہ میں بلا کی مقبولیت حاصل تھی اور پٹھانوں کی کانگریس کے ساتھ بے پناہ عقیدت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ خان عبدالغفار خان کو ''سرحدی گاندھی'' کا لقب بخشا گیا تھا۔

قدرت خداوندی کے قربان جایئے کہ اس نے قائداعظمؒ کے لئے مقدر کر دیا تھا کہ وہ ان دونوں بڑے دیوتاؤں یعنی گاندھی اور نہرو کی یہاں تک زیست تنگ کر دیں کہ وہ اس کعبہ کو چھوڑ کر خود نکل بھاگیں گے اور نئی دہلی کے برلا مندر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیں گے۔ قسامِ ازل نے اس کے خود انتظامات کئے۔ پہلے تو پنڈت جواہر لال نہرو کی شامت آئی اور وہ بھی ڈاکٹر خان صاحب اور سرحدی گاندھی کے ہاتھوں۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے زعمِ باطل اور مفروضہ مقبولیت کے پیش نظر جب صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت ان کے زیرِ نگیں تھی، پنڈت جی ممبر وائسرائے کونسل اور قائد ایوانِ زیریں کو صوبہ سرحد بلوایا اور صرف ان ہی کی قبر نہیں کھودی بلکہ اپنے بیڑے کو بھی غرق کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پنڈت جی کا یہ دورہ جتنا تاریخی اور اہم تھا، اس کا اتنا ہی شرمناک حشر ہوا جس نے قصر کانگریس کی گہری بنیادوں کو بالکل ہلا کر رکھ دیا۔ ڈپٹی کمشنر خان بہادر محبوب علی بیگ صاحب نے خان برادران کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ پنڈت جی کو اپنے صوبہ میں بلوا کر رسوا مت کرو لیکن بیچارے ڈپٹی کمشنر کی ان کانگریسی اجارہ داروں کے سامنے کیا چلتی۔ بہرحال جو ہونا تھا سو ہوا۔

بعد میں پنڈت جی کے ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو سوجھی کہ وہ پشاور جا کر بذاتِ خود اس امر کا اندازہ لگائیں گے کہ صوبہ سرحد کے باشندے لیگ کے ساتھ ہیں یا کانگریس کے اور خان برادران اپنے دعوے کے مطابق پٹھانوں کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ قائداعظمؒ اور آل انڈیا مسلم لیگ چاہتی تو اس خاص موقعہ پر رائے ہموار کرنے کی کوئی مہم شروع کرتی یا اکابرین کو بھیجتی لیکن یہ کام تنہا صوبائی مسلم لیگ اور میری جماعت مسلم نیشنل گارڈز کو کرنا پڑا۔

صوبہ سرحد کی مسلم لیگ اس زمانہ میں بہت منظّم اور طاقتور ہو گئی تھی۔ ہماری خوش بختی سے پیر صاحب مانکی شریف معہ اپنی روحانی طاقتوں، مریدوں اور جاں نثاروں کے مسلم لیگ کے پرچم کو تھامے ہوئے قائداعظمؒ کی قیادت میں منزلِ مقصود کی طرف بڑے بڑے ڈگ بھرتے

ہوئے چلے جا رہے تھے۔ شمین جان خان صاحب اب سرخ پوش سے سبز پوش ہو گئے تھے۔ جہاں غلام محمد خاں لونڈ خور کی چھا جانے والی شخصیت مشکل سے مشکل کام کو بھی اپنے اٹل عزم و ارادہ سے آسان بنا رہی تھی۔ نوجوان بیرسٹر یوسف خٹک صاحب بھی سرگرم عمل تھے اور ہمارے نوجوان دوست فدا محمد خان اپنے جوان عزم و جوش کے ساتھ ہمارے ہمسفر تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مٹھی بھر مخلص رہنماؤں اور رفقائے کار کی تنہا کوششوں' سلامت روی اور ثابت قدمی سے وہ روزِ سعید بھی آیا کہ صوبائی مسلم لیگ پروان چڑھی اور صوبہ سرحد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی امداد کے بغیر وائسرائے کی آمد پر اس نے کامیاب اور پرامن مظاہرہ کر کے قوم کی نمائندہ جماعت ہونے کا لوہا منوالیا۔ کیوں نہ ہو اب مسلم لیگ ٹوڈیوں کی جماعت نہیں بلکہ دو آنے کے ممبروں کی یعنی عوام کی جماعت بن گئی تھی۔ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قائداعظمؒ نے مستقل صدر بننے کی پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں ایک مرتبہ دو آنے کے ممبروں کی اصلی طاقت اور اہمیت کو واضح کر کے اس کو محفوظ رکھنے کی ہدایت کی اور یہاں تک فرمایا کہ اگر ضرورت پڑے تو اُسے ان کے خلاف بھی استعمال کرنے میں دریغ نہ کریں۔

تقاضائے ادائیگی فرض نے مجھے وائسرائے سے چوبیس گھنٹے پیشتر پشاور پہنچا دیا۔ وائسرائے کی آمد سے کئی گھنٹہ قبل شہروں کے باسیوں کے علاوہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہر درہ اور ہر پہاڑ سے پٹھانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ شاہی باغ میں جمع ہونے لگے اور سبز وردیوں میں ملبوس ہو کر سرخ پوشوں کی اہمیت اور بڑے بول کو مٹی میں ملا دیا۔ ان سبز پوشوں نے اپنے فعل سے وائسرائے پر ثابت کر دیا کہ وہ تمام کے تمام قائداعظمؒ کے سپاہی ہیں اور اس حقیقت کو ریفرنڈم کے وقت اپنے عمل سے مزید تقویت پہنچا کر سرخ پوشوں کی جماعت کو تابوت میں بند کر کے آخری کیل ٹھونک دی۔ یہ بڑی مسرت کی بات تھی کہ ہر جری پٹھان چاہے وہ بوڑھا ہو یا جوان' اپنے کو مسلم نیشنل گارڈز کہتا تھا۔

مسلم نیشنل گارڈز کی یہ مختصر سی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو گی جب تک میرے عزیز

دوست سیٹھ عبدالطیف عثمان کے ماموں زاد بھائی محمد سلیمان بی اے ایل ایل بی کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ نوجوان سالارِ اعلیٰ کے دفتر کے انچارج تھے اور سالارِ اعلیٰ کے ساتھ ہر دورہ میں ہمراہ ہوتے تھے۔ وہ اپنی فطری فرض شناسی و چہرہ پر مستقل مسکراہٹ کے ساتھ بغیر کسی پس و پیش یا جھنجھلاہٹ کے ہر وقت سالارِ اعلیٰ کے دفتری کاموں کے بھاری بوجھ کو بہت ہلکا کیا کرتے تھے اور ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف کار رہتے۔ میری زبان میں اتنی گویائی اور قلم میں اتنی روانی نہیں ہے کہ شکریہ کے الفاظ پوری طرح ادا کرسکوں۔ افسوس ہے کہ یہ پھول دو دن تو کیا ایک دن بھی بہارِ جانفزانہ دکھلا سکا اور ایک دن اچانک کراچی میں مرجھا گیا۔ جن لوگوں نے اس کا آخری دیدار کیا' وہ میرے اس بیان کی تائید کریں گے کہ جب یہ نوجوان اس دنیا سے انتقالِ مکانی کر کے اپنی آخری آرام گاہ کو سدھارا تو اس کے چہرہ پر مسکراہٹ اور ہماری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

آخر میں اُن تمام مسلم نیشنل گارڈز' معاونین' موئدین اور سرپرستوں کو جنہوں نے اسلام اور اپنی ملت کی لافانی اور بے بہا خدمات انجام دیں' ایک مسلم نیشنل گارڈ کا عاجزانہ سلام قبول ہو۔

گر قبول اُفتدز ہے عز و شرف

مسلم خواتین

قائداعظمؒ نے مسلم خواتین کو جو ایک عضوِ معطل بن کر رہ گئی تھیں' بیدار کیا اور ان کی ایک علیحدہ سب کمیٹی بنائی۔ اس سے پہلے انہوں نے خواتین میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے بیگم محمد علی کو اپنی مجلس عاملہ کا رکن بنایا اور وہ اس کی تاحین حیات سرگرم رکن رہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ طوالت کے ڈر سے میں خواتین کی کارگزاریوں کا ذکر اجمال کے ساتھ کر رہا ہوں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قائداعظمؒ نے مسلم خواتین کو بیدار کر کے سوسائٹی میں ان کا صحیح مقام جو رسالت مآبؐ نے انہیں عطا کیا تھا اور جو گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ان سے چھن گیا

تھا' دوبارہ دیا۔ وہ یہ کیونکر گوارا کرتے کہ خواتین جنگ آزادی میں خاموشی کے ساتھ تماشہ دیکھا کریں۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ ان کی تمام خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوجائیں اور وہ مردوں کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ بڑا مشکل لیکن بہت ضروری کام تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے مردوں کی عدم توجہی اور مخالفت کو دلچسپی اور حمایت میں تبدیل کیا اور مردوں پر یہ ظاہر اور ثابت کردیا کہ انہوں نے عورتوں کو کاہل الوجود بنا رکھا تھا۔ عورتیں مردوں کی طوطے جیسی رٹ سے کہ وہ ناقص العقل ہیں' احساس کمتری کا شکار ہوکر خود اعتمادی کھوبیٹھی تھیں۔ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع کا فقدان تھا اور جب کبھی کوئی موقع ہاتھ آئے تو مرد یہ کہہ کر انہیں مرحوم کردیتے کہ ہمیں لڑکیوں سے نوکری نہیں کرانی ہے۔ الحاصل عورتیں مردوں کی بے اعتنائی اور حوصلہ شکنی سے بے عمل اور بے زبان ہوکر رہ گئی تھیں۔ پردہ کی افادیت یا بے پردگی کی قباحت کے متعلق کوئی دلچسپی نہیں چھیڑنی ہے لیکن اس زمانہ میں مسلم خواتین کی بہت بڑی اکثریت پس پردہ رہتی تھی۔ جہالت اور سماج کی جکڑ بندیوں کی وجہ عورت خود کو مرد کا نصف بہتر ثابت کرنے سے معذور تھی۔

بہرحال اس قاعدہ کلیہ سے چند صوبوں کی کچھ بہنیں بڑی حد تک مستثنیٰ تھیں۔ وہ تعلیمی میدان میں پہلے سے ہی بہت آگے بڑھ گئی تھیں اور ان میں سیاسی شعور جاگ اٹھا تھا لیکن یہ بیداری اور تعلیم کل ہند سطح پر جنگ آزادی فتح کرنے کیلئے ناکافی تھی۔

بہرحال ان مشکل حالات میں بھی یعنی مسلم لیگ کی نشاۂ ثانیہ کے وقت کچھ خواتین مختلف صوبوں میں انفرادی طور پر اور کہیں کہیں جماعتی شکل میں پس پردہ رہ کر مسلم لیگ کی حمایت میں کام کرتی رہی ہیں اور اُنہوں نے ضمنی انتخابات اور ممبر سازی میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا۔ ناسازگار ماحول میں عورتوں کی تنظیم کرکے سودمند بنانا اور ملکی اور ملّی کاموں میں مردوں کا شریک کار کرنا کچھ آسان بات نہیں تھی۔ جنگ آزادی ایک قومی مسئلہ تھا جس کی کامیابی کے لئے ہر فرد کا تعاون ضروری تھا۔ ان حالات میں ایک طبقہ کی عدم شرکت قومی تحریک کی کمزوری کا باعث ہوتی۔ قائداعظمؒ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ایک علیحدہ مہم شروع کریں اور قوم کو اپنا

ہم خیال بنائیں۔ایسا کرنے سے اغلب ہے کہ قوم کی توجہ مقصدِ اعلیٰ سے ہٹ کر تعلیمی بحث میں بٹ جاتی اور کیا عجب ہے کہ اختلاف رائے سے اتحادِ ملیّ کو ٹھیس لگتا۔قائداعظمؒ کے سامنے یہ تمام نشیب وفراز موجود تھے۔انہوں نے بہت بڑا زیرکی کا کام کیا جس سے ہر ذی ہوش خوش ہوا اور مخالفت کا دروازہ بند ہو گیا اور خواتین کی نمائندگی' حقوق نسواں کا اعتراف اور ان کے عملی تعاون کا مسئلہ بھی بغیر کسی ردّوکد کے حل ہو گیا۔اُنہوں نے اپنی مجلس عاملہ کا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بیگم مولٰینا محمد علی کو رکن نامزد کیا۔

قائداعظمؒ نے رائے عامہ کا ہمیشہ احترام کیا اور اس لئے آل انڈیا زنانہ سب کمیٹی کی تشکیل صرف خواتین ہی تک محدود رکھی تا کہ وہ آزادی سے اپنی قوم اور ملک کی خدمت اپنے طور پرانجام دے سکیں اور حصولِ پاکستان میں ہاتھ بٹائیں۔اس کارروائی سے وہ صاحبان بھی جو پردہ کے سخت حامی تھے' کوئی اعتراض نہ کر سکے اور اس طرح قائداعظمؒ نے خواتین کا تعاون حاصل کیا اور انہیں بعد میں کل ہند کی بنا پر نمائندگی دی جس کی رو سے ہندوستان کے ہر صوبہ سے ممتاز نمائندہ خواتین کو نامزد کیا گیا۔ان کے اسمائے گرامی صوبہ وار کسی اور جگہ درج کئے گئے ہیں تا کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں ان تمام قابل احترام خواتین کو نہ بھولیں جنہوں نے جنگ آزادی میں اپنی ہزاروں اور لاکھوں بہنوں کی قیادت کی اور ان کی ہمراہی میں مردوں سے پیچھے نہیں رہیں اور ان سب کے متعلق خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا ارشاد گرامی صادق آتا ہے ۔

"اے ماؤ' بہنو' بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے"

اب میں اُس تجویز نمبر 11 کا حوالہ دوں گا جو 1943ء میں دہلی کے آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس میں زیر صدارت مسٹر ایم اے جناح پاس ہوئی جس میں ان معزز خواتین کے صوبہ وار نام درج ہیں جنہیں ہندوستان کی مسلم خواتین کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ان میں اکثر وہ بھی خواتین ہیں جو سب کمیٹی خواتین آل انڈیا مسلم لیگ کی ابتدا ہی سے یعنی 1938ء میں رکن منتخب ہوئیں۔مثلاً بیگم محمد علی' بیگم حبیب اللہ' بیگم اعزاز رسول' لیڈی ہارون' مس ایف جناح' بیگم

حفیظ الدین، مسز حکم، بیگم صدیق علیخان، فاطمہ بیگم، بیگم بشیر احمد، بیگم تصدق حسین وغیرہ وغیرہ اور پاکستان کے قیام تک بحیثیت رکن مسلسل خدمت کرتی رہیں۔ ممبر خواتین کے نام ملاحظہ کیجئے:۔

ممبران سب کمیٹی خواتین آل انڈیا مسلم لیگ

پنجاب: 1- بیگم بشیر احمد، 2- بیگم عبدالعزیز، 3- فاطمہ بیگم منشی فاضل، 4- بیگم تصدق حسین، 5- بیگم رحمان

بمبئی: 1- مس ایف جناح، 2- بیگم حفیظ الدین، 3- مسز جیراز بھائی، 4- مسز محمد حسین، 5- مسز سوم جی

بنگال: 1- بیگم شہاب الدین، 2- بیگم ایم اے اصفہانی، 3- مسز حکم

ممالک متحدہ: 1- بیگم حبیب اللہ، 2- بیگم محمد علی، 3- بیگم محمد وسیم، 4- بیگم محمد اختر خاں، 5- راحیلہ خاتون صاحبہ، 6- بیگم اعزاز رسول، 7- بیگم سعید الدین، 8- مسز رضا اللہ بیگ

ممالک متوسط: 1- بیگم صدیق علی خان، 2- مسز افتخار علی، 3- سلیم الزہرہ بیگم

بہار: 1- بیگم اختر
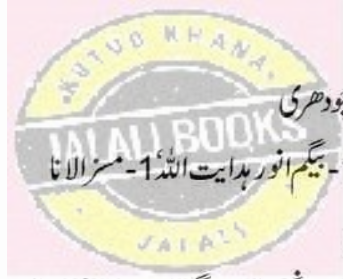
آسام: 1- مسز عبدالمتین چودھری

سندھ: 1- لیڈی ہارون، 1- بیگم انور ہدایت اللہ، 1- مسز الانا

بلوچستان: 1- بیگم قاضی عیسیٰ

دہلی: 1- مسز حسین ملک، 2- انجمن آراء بیگم، 3- مسز محمد حسین، 4- مسز اکرام اللہ، 5- مسز زاہد حسین، 6- مسز بخاری

شمالی مغربی سرحدی صوبہ: 1- بیگم وہاب، 2- مسز کمال الدین

مدراس: 1- مسز کریم اصفہانی، 2- مسز ملنگ احمد بادشاہ، 3- مسز حمید خاں

اس سلسلے میں یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ چند ممتاز خواتین مثلاً بیگم شاہنواز، مسز رشیدہ

لطیف، لیڈی جمال خاں اور لیڈی عبدالقادر پنجاب کی خواتین کی کچھ مدت تک نمائندگی کر چکی ہیں۔ بمبئی سے مسز فیض طیب جی، مسز سوجی، سی پی سے مس نادر جہاں، بہار سے لیڈی امام، سندھ سے لیڈی ہدایت اللہ، بیگم شعبان اور مسز حاتم طیب جی، دہلی سے مسز نجم الحسن اور بیگم رحمٰن، صوبہ سرحد سے بیگم حاجی سعد اللہ خاں اور مسز خواجہ اللہ بخش، یوپی سے بیگم نواب محمد اسماعیل خاں، آسام سے مسز عطاء الرحمٰن مذکورہ بالا کمیٹی کی کچھ عرصہ تک رکن رہ چکی ہیں۔

مذکورہ بالا اسمائے گرامی تو اُن معزز خواتین کے ہیں جنہیں آپ بجا طور پر ہائی کمان کہہ سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی ایسی ہزاروں اور لاکھوں خواتین تھیں جو سرگرم عمل رہی ہیں۔ سب کے ناموں کا اندراج غیر ممکن سا ہے، اس لئے صرف اُن ہی چند خواتین کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے مسلم لیگ کے کارناموں میں کل ہند سطح پر نمایاں حصہ لیا اور آل انڈیا اجلاس میں شریک ہوا کرتی تھیں۔

میں آپ کی اجازت سے اس افتخار نامہ کو اس تیقن کے ساتھ درج کتاب کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں کہ اس سے اس باب کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ یہ کرم نامہ بیگم مولٰینا محمد علی نے آج سے اکتیس سال قبل میری رفیقۂ حیات کو ارسال کیا تھا جس کے مطالعہ کی میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔

ہم مردوں کی گردنیں ان بھاری احسانوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہیں جو غیر منقسم ہندوستان میں مسلم خواتین نے خندہ جبینی کے ساتھ خدمات انجام دے کر کیں اور جماعتی تنظیم میں مردوں کے ساتھ صرف برابری کا ہی حصہ نہیں لیا بلکہ اپنے ہر فعل وقول سے قائداعظمؒ کے اس دعوے کو کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ ثابت کر کے اور پاکستان قائم کر کے دکھلا دیا۔ ہماری نگاہیں اس وقت ندامت اور شرم سے جھک جاتی ہیں جب ہم سوچتے ہیں کہ مسلم خواتین نے کتنی عظیم قربانیاں اپنی عزت، خون، اپنی اولاد اور اپنی جان سے درندوں کی تشنگی کو بجھا کر اور گرسنگی کو مٹا کر دیں اور ہم بے بسی سے اس تاریخی خونیں دور میں ان بے زبان

مظلوموں کی خاطر خواہ حفاظت اور مدد نہ کر سکے۔

ان تمام نہتی، بے بس اور بیکس بہنوں اور بیٹیوں کو سلام اور بار بار سلام کہ ان کی عرش بریں کو ہلا دینے والی پاک دعائیں ان کی بغیر نمائش کی خاموش کوششیں اور ان کی عظیم سے عظیم تر قربانیاں آخر رنگ لائیں اور پاکستان قائم ہوا۔ بانئ پاکستان کو بھی ہمارا عاجزانہ سلام جنہوں نے بہنوں کو بیدار کر کے اپنی دور اندیشی اور فرض شناسی کا عملی ثبوت دیا اور حضورؐ کی تعلیمات کی پیروی کی۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن

اب جو کچھ لکھا جائے گا وہ حقیر خراجِ عقیدت ہے بالخصوص اُس مسلم نوجوان اور بالعموم اس کے ساتھیوں کے لئے جنہوں نے "پاکستان لے کے رہیں گے" کی صدا علمی دنیا میں بے خوف و خطر لگائی تھی اور جنہوں نے اپنی جواں نظری اور جواں ہمتی سے قائداعظمؒ کی مخلصانہ تقلید اور خدمت کر کے پاکستان کو عالم وجود میں لانے میں ہاتھ بٹایا تھا۔ دراصل اس تحریک کے بانی مبانی محمد نعمان صاحب تھے۔ سب سے پہلے ان کے دلِ بیدار میں مسلم طلباء کی تنظیم کا خیال پیدا ہوا کیونکہ ان کی دور بین نظروں نے دیکھا کہ نوجوان غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے بہت مضطرب ہیں اور کانگریسی پروپیگنڈا ان کے شیشہ جیسے صاف و شفاف دلوں اور نیم پختہ حساس دماغوں پر اس بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے کہ وہ مسلم لیگ اور اس کے اکابرین سے مایوس ہو کر اشتراکیت پسند پنڈت جواہر لال نہرو اور بکری کا دودھ پینے والے "نیم برہنہ فقیر" مہاتما گاندھی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اس کا جلد سد باب نہ کیا گیا تو نوجوان ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس ملّی ضرورت کے پیشِ نظر اُنہوں نے اپنے چند ہم خیال دوستوں اور بیدار مغز نوجوانوں کے اشتراک سے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کر کے قائداعظمؒ کو صدارت پیش کی۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کی وجہ سے اپنی نیک تمناؤں کی خواہش اور تعاون کا یقین دلا کر راجہ صاحب محمود آباد کو اپنے بجائے صدارت کی ذمہ داریاں سپرد کیں۔ راجہ صاحب کی شرکت اور محمد نعمان صاحب کی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتیں اور ان کی رات دن کی دوڑ دھوپ

نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور اس جماعت کا کل ہندوستان میں جال بچھ گیا اور یہ جماعت بلا مبالغہ قائداعظمؒ اور آل انڈیا مسلم لیگ کا دست راست بن گئی۔ ان کی مسلم لیگ میں وہ ہی حیثیت اور اہمیت تھی جو انسان کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوا کرتی ہے۔ ان نوجوان دوستوں نے ضمنی صوبائی اور مرکزی انتخابات میں اپنا قیمتی وقت دے کر اپنے سرپرستوں کا پیسہ خرچ کیا اور تعلیم کا ایثار کر کے بڑا عملی اور موثر حصہ لیا اور مسلم لیگ کی مہم کو کامیاب بنایا۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

(اقبالؔ)

قائداعظمؒ نے ہمیشہ ان نوجوانوں کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ان کی دعوتوں کو قبول فرماتے۔ انہیں ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا کرتے۔ ان کے حوصلے بڑھاتے اور ان کے ساتھ یہاں تک گھل مل گئے تھے کہ اپنی نفاست پسندی اور خوش پوشی کو بالائے طاق رکھ کر ان کے ساتھ کبھی کبھی زمین پر بیٹھنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

بانی تحریک محمد نعمان صاحب نے اپنے ایک کامیاب قائد ہونے کا ثبوت مخلص، حریت پسند، جوشیلے نوجوان طالب علموں کو جن کے سینوں میں حبِ ملّی کے خزینے محفوظ تھے، مختلف صوبوں سے اکٹھا کر کے دیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ جماعت مسلم لیگ کا داہنا بازو تھی۔ اس لئے کئی ممتاز مسلم لیگی رہنما اس میں مثلاً نوابزادہ لیاقت علی خاں، میاں بشیر احمد، حسین بیگ محمد وغیرہ صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے۔ لہٰذا مسلم لیگ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے باہمی تعاون واشتراک عمل سے نوجوانوں کی تنظیم ہوئی اور ان کی بے لوث خدمات سے مسلم لیگ پوری طرح مستفیض ہوتی رہی۔ نعمان صاحب نے اپنی اَن تھک کوششوں سے قائداعظمؒ کا لب ولہجہ، طرز واندازِ بیان وخوش پوشی کو یہاں تک اپنا لیا تھا کہ ہم چند لوگ اُنہیں قائدِ کوچک کہتے تھے۔ چونکہ وہ علی گڑھ کے اولڈ بائے تھے، اس لئے ہمیں مسلم یونیورسٹی سے بے شمار

صاحبِ سمجھ اور مخلص کارکن مل گئے تھے اور غالباً یہی سبب تھا کہ قائداعظمؒ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مسلم لیگ کا اسلحہ خانہ کہتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ویسے تو ہر دور میں کئی طالب علم ملک کے ممتاز رہنما بنے اور اُنہوں نے اسلام اور قوم و ملک کی خدماتِ عظیم کیں۔ چونکہ میں مسلم لیگ کی نشاۃٔ ثانیہ کے دور کا ذکر کر رہا ہوں' اس لئے میں صرف ان چوٹی کے چند طالب علموں کے ذکر پر اکتفا کروں گا جو اس مادر درسگاہ سے میدانِ عمل میں آئے اور کارہائے نمایاں کئے۔ اس کے ساتھ ان چند اساتذہ کا بھی ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو مسلم لیگ کے عملی حامی اور اُس کے حکم پر کاربند تھے۔ محمد نعمان صاحب' منظر عالم انصاری صاحب' واجد بخش قادری صاحب' واحد بخش قادری صاحب' شاکر حسین خان صاحب' مختار آزاد صاحب' عبادت یار خان صاحب' محمد ہاشم آزاد صاحب' ہادی نقشبندی صاحب' ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب اور جمیل الدین احمد صاحب وغیرہ۔

میرے صوبہ سے بھی مختلف اوقات میں طالب علموں نے جامعہ علی گڑھ کی زندگی میں بلند مقام' مقبولیت اور شہرت حاصل کی لیکن میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں' اس میں بالخصوص دو طالب علم ہادی نقشبندی اور محمد ہاشم آزاد مسلم جامعہ میں اپنی حسن کارکردگی اور باہمی خوشگوار تعلقات سے اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں پر پہنچنا ''ایں سعادت بزور بازو نیست۔'' ان دو نوجوانوں کی ترقی اور ہر دلعزیزی سے ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے تھے۔ یہ بھی خوش نصیبی تھی کہ مسلم لیگ کو ہر صوبہ سے بڑے ہونہار' مخلص اور اچھے نوجوان طالب علم مل گئے تھے۔ صفِ اوّل کے چند نوجوانوں کے نام گنوائے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن حاشا وکلا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی ماندہ اَن گنت نوجوانوں کے نام درج نہ کرنے سے مجھے جو عقیدت اور محبت ان سے ہے' اس میں بال برابر بھی فرق آیا ہو لیکن حقیقتاً ان نونہالانِ قوم کے نام قسامِ ازل کی مرتب کردہ مجاہدین اور بانیانِ پاکستان کی فہرست میں درج ہوں گے کیونکہ انہوں نے قائداعظمؒ کا ہاتھ بٹایا اور ہمیں بندِ غلامی سے آزاد کرا کر پاکستان قائم کیا۔ چوٹی کے چند طلبا کے نام حسب ذیل ہیں:-

محمد نعمان صاحب' محسن صدیقی صاحب' مختار زمن صاحب' صلاح الدین قریشی

صاحب، عبدالستار صدیقی، حمید نظامی، عبدالستار خاں نیازی، مونس خاں، یامین زبیری، تزئین حبیب اللہ، بلقیس بیگم، محمود سلیمان، ضیاء الاسلام، سید محمد قاسم رضوی، آفتاب احمد قرشی، پیرزادہ عبدالوحید، بدیع الزماں، مودی عبدالسبحان، اسمٰعیل تابش، عبدالجبار بنٹوری وغیرہ۔

ان نوجوانوں نے مسلم لیگ کے اصولوں پر چل کر کئی صوبائی، اضلاعی اور ایک آل انڈیا کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ ان میں سے چند صوبائی کانفرنسیں مثلاً جالندھر، الہ آباد، ناگپور، کانپور، مدراس، بنگلور بڑی اہم تھیں۔

جیسے ہی بنگلور کا ذکر آیا اور بس وہاں کی پرانی یادوں نے تڑپایا اور تنظیم کا نقشہ سامنے آ گیا۔ پھلواری شریف کے خانوادۂ سادات کا ایک روشن چراغ دینی دولت سے مالا مال، حب الوطنی سے سرشار اور پیکرِ عزم و استقلال اس زمانہ میں بنگلور کے ایک رئیس جناب عبدالغفور مودی کے گھر جو پھلواری شریف کے حلقہ بگوش تھے، جلوہ افروز تھا۔

پھلواری شریف کے ذکر سعادت بخش کو میں اس وقت تک مکمل نہ سمجھوں گا۔ جب تک میں اپنی طالب علمی کے زمانہ کے اس واقعہ کا ذکر نہ کروں جب مجھے حضرت سید شاہ سلیمان صاحبؒ کے نورانی چہرہ کا شرفِ دید حاصل ہوا تھا اور جس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی تھی۔ آپ ندوۃ العلما کے جلسے میں شرکت کے لئے ناگپور تشریف لائے تھے اور صدر بازار کی زیرِتعمیر جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھائی اور وعظ فرمایا تھا۔ ان کے ہمراہ مولینا حسین میاں صاحب بھی تھے جو سیٹھ عبدالشکور صاحب، سعید اللہ خاں صاحب اور میرے، ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم سے بہت گھل مل گئے تھے اور ہم لوگوں نے ان کے دورانِ قیام ناگپور بہت کافی وقت ان کے ساتھ گزارا تھا۔ افسوس اُن چار رفیقوں میں سے صرف میں تنہا شخص اس زمانۂ طفلی کے یادگار واقعہ کو اس کتاب میں دُہرا کر اپنے داغ ہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے لئے زندہ ہوں۔

آپ کو بتلا ہی دوں کہ وہ مہمان عزیز'' جناب مولانا حسن مثنیٰ صاحب تھے جنہوں نے اپنے چند قابل ذکر رفقائے کار عبدالعزیز صدیقی، پروفیسر محمد حسین صاحب، مودی عبدالسبحان

صاحب، اسماعیل تابش صاحب، ڈبلیو عبدالرحمٰن صاحب، عبدالجبار بنثوری صاحب، سید عبدالرزاق حسینی صاحب، ظفر علی صاحب، عبدالرحمٰن صدیقی صاحب وغیرہ کے ساتھ صرف طلباء ہی کو جگا کر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم نہیں کیا بلکہ مسلم نیشنل گارڈز کی تشکیل بھی کی اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں مضبوطی کے ساتھ منسلک کر دیا۔ اس ہی زمانہ میں ماہر القادری صاحب بقول شخصے جب آتش جوان اور مولوی نہیں تھا، اپنے سحر آفریں کلام سے بنگلور اور سی پی میں لوگوں کے دلوں کو مسحور کر کے اپنی قادر الکلامی کے جواہر پارے بکھیرتے ہوئے ہماری تمام تنظیموں کی نشر و اشاعت کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے میری یاد کے مطابق قائداعظمؒ نے جالندھر میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی۔ اس کانفرنس میں مسلم طلباء کے علاوہ چند سکھ طالب علموں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس حقیقت کے اظہار کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہ کانفرنس ہر نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہی۔

سی پی و برار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ناگپور کانفرنس میں نواب بہادر یار جنگ بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور اس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی۔ مدراس کانفرنس کی صدارت نوابزادہ صاحب نے کی تھی جس کی رونق کو دوبالا کرنے کے لئے چودھری خلیق الزماں صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ کانفرنسیں بہت کامیاب رہیں۔ کانپور میں ایک کانفرنس کے موقعہ پر مجھے سید الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کی صداقت، دیانتداری، خودداری، بے باکی، حق گوئی، کسر نفسی کے صدہا واقعات میں نے سنے تھے لیکن ان کی ملاقات سے محروم تھا۔ ان بوریا نشین درویش منش گاڑھے کا کپڑا پہننے والے عاشق رسولؐ نے ہماری جماعت میں شریک ہو کر مسلم لیگ کو صرف چار چاند ہی نہیں لگائے بلکہ اپنے جیسے ہزاروں حریت پسندوں کو ہماری صفوں میں لا کھڑا کیا۔ مولانا ایسے اصولی آدمی تھے کہ انہوں نے مکمل آزادی کے معاملہ میں تن تنہا مہاتما گاندھی

سے ٹکر لے لی اور کانگریس کو لات ماردی۔ مزاج میں اس بلا کی سادگی تھی کہ اپنے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کے دوست وزیر ہند مارکوئیس آف زیٹ لینڈ کو پوسٹ کارڈ لکھا کرتے تھے۔ خدمت کرنا، سچ کہنا، جیل جانا، ایثار کرنا ان کا شعارِ زندگی تھا جس میں الحمدللہ وہ مرتے دم تک پیش پیش اور ثابت قدم رہے۔ میں نے ان کے جیل جانے کا اشارہ کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولٰینا جیسے باغی سیاسی قیدی کے لئے اے بی کلاس نہیں ہوتا تھا۔ مولٰینا کے لئے چکی پر روزانہ آٹا پیسنا جزوِ قیدِ سخت اور شعر کہنا افتادِ طبع تھا۔ ان کا مشہور شعر سنیے ؎

اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

افسوس ہے کہ وہ پاکستان تشریف نہیں لائے۔ اگر آتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر شخص اپنی آنکھیں بچھاتا لیکن وہ بھارت ہی میں رہے اور وہیں سے جنت الفردوس کو سدھارے جہاں یقیناً انہیں قربتِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نصیب ہوئی ہوگی۔ ؎

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
(عدمؔ)

ہندوستان میں سی پی و برار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن وہ خوش نصیب ادارہ تھا جس نے ناگپور میں پانچواں اور آخری آل انڈیا اجلاس 1941ء میں منعقد کیا۔ یہ بڑا اہم اور تاریخی اجلاس تھا جسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی کیونکہ قائداعظمؒ بہ نفسِ نفیس ناگپور تشریف لائے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور اس کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ یہ اجلاس اس وقت منعقد ہوا تھا جب نیشنل ڈیفنس کونسل میں صوبائی وزرائے اعظم کی قومی و سیاسی حیثیت سے شرکت کے متعلق وائسرائے ہند لارڈ لن لیتھ گو اور قائداعظمؒ کے درمیان کھلم کھلا قیل وقال کا سلسلہ جاری تھا اور سر سکندر حیات خاں قائداعظمؒ کی ہدایت پر اور اپنی خودداری اور قومی وقار کی خاطر مستعفی ہوگئے

تھے لیکن مولوی فضل الحق صاحب ضد میں آ کر اپنی پچھلی شاندار خدمات' ایثار و قربانی' حریت پسندی' مقبولیت اور شہرت کو طاقِ نسیان میں رکھ کر وائسرائے کو اپنا دان دے کر مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت اور قائداعظمؒ سے باغی ہوگئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظمؒ نے 25 دسمبر 1941ء کو ناگپور میں اپنی سالگرہ اور کرسمس کے موقع پر اپنے بیان کے ذریعہ مولوی صاحب کو کرسمس کا تحفہ کہہ کر وائسرائے کو پیش کیا تھا۔

یہ کانفرنس تمام طالب علموں اور نعمان صاحب کی زیر ہدایت و سرپرستی اور بالخصوص ناگ پور مسلم لیگ اور دوسری مسلم لیگوں کی انتھک کوششوں سے خلافِ توقع بے حد کامیاب رہی۔ صوبائی و مقامی طور پر اس کو کامیاب بنانے میں عبدالستار صدیقی (یکے از مالکان الائز بک کارپوریشن کراچی) کا ذکر لازمی وضروری ہے' اس لئے بھی کہ وہ دراصل اس ادارہ کے بحیثیت جنرل سیکرٹری کرتا دھرتا تھے۔ میں سیاست و اسمبلی کے کاموں میں بے پناہ حد تک مصروف اور مہینوں اپنے شہر اور صوبہ سے غیر حاضر رہتا تھا' لہٰذا میں برائے نام صدر تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے اس فرض کی ادائیگی سے بالکل بے فکر بھی ہوگیا تھا جس کا خاص سبب یہ تھا کہ میرے یہ نوجوان دوست باوجود اپنی کم عمری کے انتہائی عقل مند' سرگرم عمل اور مخلص کارکن تھے۔ اس زمانہ کے ذی ہوش نوجوانوں کی طرح یہ بھی قائداعظمؒ کے دیوانے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ ہمیں اپنی مہم کو سر کرنے کے لئے ایسے ہی فرزانہ دیوانوں کی ضرورت تھی۔ آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی طویل ملی و سیاسی زندگی میں آج تک ان کے جیسا سچا' خاموش' شہرت سے کوسوں دور بھاگنے والا' منکسر المزاج اور خوش خلق انسان نہیں دیکھا۔ بظاہر ڈھیلے ڈھالے لیکن مستعدی و تیزی سے کام کرنے والے آدمی ہیں۔ اچھے کپڑے پہننے سے تو نفرت ہے۔ زندگی اتنی سیدھی سادہ بنا رکھی ہے کہ اگر میں ان کا کسی صاحب سے یہ کہہ کر تعارف کراؤں کہ ان صاحب نے ناگپور یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا تھا تو سننے والا حیرت اور شک سے میری طرف دیکھ کر برہمی سے کہے گا: ''مذاق مت کیجئے۔''

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور ڈاکٹر ممتاز علی صاحب تاج نشر واشاعت کے سیکرٹری تھے۔ دیگر نوجوان رفقاء جنہوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں رات دن ایک کر دیا تھا' ان گنت تھے۔ سب کے نام گنوانا مشکل ہے لیکن چند ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا لازمی ہے:۔

تاج الدین احمد صاحب' عارف محمد خاں صاحب' احمد اللہ خاں صاحب' سراج احمد صاحب' اسماعیل رضا صاحب' شاکر حسین صاحب' خان محمد خان صاحب' شبیر احمد عثمانی' ایس ایم جلیل' مرزا خاقان بیگ وغیرہ۔ اس تاریخی اجلاس کا ذکر اور اس کی کامیابی بالکل بے معنی اور تشنہ رہ جائے گی اگر میں اپنے اُن سر پھرے اور دیوانہ دوستوں کا ذکر نہ کروں جو قائداعظمؒ پر اپنی جان چھڑکتے تھے اور میری عدم موجودگی میں کانفرنس کی کل ذمہ داری کے واحد ضامن بن گئے تھے۔ وہ رات دن دیوانہ وار اجلاس کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خلوص' خدمت' دل کی لگن اور میری محبت نے ان سے وہ کارہائے نمایاں انجام دلوائے کہ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید میں اس حد تک اس خوبی اور کامیابی سے کام نہ کر سکتا۔ آج بھی اتنے عرصے کے بعد میرے دل کو ان کا نام لے کر بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی پاک دعاؤں' نیک تمناؤں' عملی تعاون' خطاپوشی اور سرپرستی سے مجھے اس مقام پر لے جا کر بٹھلا دیا تھا جس کا میں ہرگز اہل نہیں تھا۔ میرے ان محسنین میں ناگپور کے تمام مسلمان شریک ہیں۔ ان میں سے چند سے آپ بھی متعارف ہو جائیے جنہوں نے بغیر کسی ذاتی غرض کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ عباس علی کمال صاحب' مرزا اسماعیل بیگ صاحب' سید عبدالحمید صاحب انجینئر' چاند میاں صاحب اُستاذ' عبدالمجید لیڈر' مولوی حکیم تاج محمد خاں صاحب' مولوی عبدالقادر صاحب' سیٹھ حاجی عبداللطیف' تفضل حسین قریشی' قاضی بدرالدین' امجد علی' محمد حبیب سوداگر' شیخ لعل قوال بقرعیدن پنڈت' حبیب اللہ' سعید حیات وکیل' محسن بھائی' عبدالرحمٰن صدیقی' سید موسیٰ وکیل' حبیب اللہ خاں' گل محمد خاں' لطیف میمن' شیر خاں' حمید خاں' نذیر خاں' غلام جیلانی' کریم الدین بجلی والے وغیرہ وغیرہ۔

میرے ان تمام عزیزوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ظاہراً ان سے بہت دور ہوں لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ وہ میرے قلب اور میری دعاؤں میں ہمیشہ موجود ہیں اور آخری سانس تک موجود رہیں گے۔

تتمہ کے طور پر میں اپنے عزیز مرحوم دوست یامین زبیری صاحب کا وہ خط پیش کروں گا جو انہوں نے اس کانفرنس کی کامیابی کے متعلق لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ ہمارے دوست ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر خود جنت بسانے چلے گئے لیکن ان کی تحریر اور ان کی ہر حلقہ میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی اور ان کی بذلہ سنجی ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے گی:۔

مکرمی و معظمی نواب صاحب، تسلیم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ پھر ہم میں واپس آ گئے اور آپ کو کام شروع کرنے کا موقعہ حاصل ہو گیا۔ رسمی طور پر تو آپ کو مبارکباد دینی چاہیے مگر دراصل قابل مبارکباد تو ہیں ہم لوگ کہ آپ کے بغیر ہمارے دل بہت افسردہ تھے اور اب گوہر مراد ہم کو واپس مل گیا ہے۔ آپ کو اس کا افسوس تھا کہ جب قائداعظمؒ ناگپور تشریف لا رہے تھے تو آپ جیل میں تھے مگر قائداعظمؒ اور ہم سب کو اس کا افسوس تھا کہ ہم آئے تو آپ نہ تھے۔ کانفرنس کی کامیابی کا سہرا آپ کے سر ہے اور آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی دعاؤں کا نتیجہ لیکن سب حسرت و یاس سے نظر ڈالتے اور آپکی شبیہہ مبارک جو ہر طرف آویزاں تھیں، اس پر جا کر لوٹ آتی۔ سب کے دل افسردہ تھے کہ جس کو ہونا چاہئے، وہ نہیں۔ برات تو تھی مگر دولہا نہ تھا۔

وسیم صاحب لکھنؤ اور نواب بہادر یار جنگ اور میں نے بہت کوشش کی مگر ابراہیم خانصاحب اور بھائی جان کی مصروفیت کے سبب آپ سے ملنے نہ آ سکے اور پھر آخر دن وہ دونوں چلے گئے اور میری طبیعت خراب ہو گئی اور اس لئے مجھے بھی لوٹنا پڑا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کل حیدر آباد جا رہے ہیں۔ واپسی پر آپ بھی ان کے ساتھ تشریف لائیے تو کتنا اچھا ہو۔ بیگم صدیق علی خاں کو میرا نہایت مؤدبانہ سلام اور مزاج پرسی۔

شرح دستخط

آپکا خادم

6 جنوری 1942ء

محمد یامین زبیری

ہمارے منجھلے بھائی عمران بھی آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔

کانفرنس کے کامیاب اختتام پر ہمارے چھوٹے قائد لیکن مسلم طلبا کی جماعت کے روحِ رواں محمد نعمان صاحب نے حیدرآباد سے بذریعہ خط مجھے نوازا تھا جسے میں ان کی مہربانی کا مرقع سمجھتا ہوں۔ اس کتاب میں اس کی اشاعت سے میں صرف اتنا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ ان کی ان بیش بہا خدمات کا جو انہوں نے تعلیم یافتہ اور زیرِ تعلیم بیدار دل نوجوانوں کی تنظیم کر کے انہیں مسلم لیگ کا زبردست حامی بنایا' احسان مندی اور صدق دل کے ساتھ اپنی اور اپنے ہم خیالوں کی طرف سے اعتراف کروں۔ میں انہیں یہ بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ انہوں نے ناسازگار ماحول کی وجہ سے گوشۂ گمنامی اختیار کیا ہے لیکن ان کا کارنامہ ایسا ہے جو تاابد زندہ رہے گا اور اسے ہر نسل' چاہے وہ موجودہ یا آنے والی ہو' ہمیشہ یاد رکھے گی۔

حیدرآباد

میرے کرم فرما

جیل سے رہائی پر مبارکباد' اپنی خوشی کا اظہار ناممکن۔ آپ کی خدمات اور جذبۂ قومی کی کتنی داد دی جائے۔ مجھ کو کتنی خوشی ہے' میں بیان نہیں کر سکتا۔ 3 جنوری میں نے جس بے چینی سے بسر کی' اس کا علم میرے خدا کو ہے۔

صرف آپ کو باہر دیکھنے کی خوشی میں مَیں نے ارادہ کیا ہے کہ ناگپور آؤں اور آپ کو دیکھوں' انشاءاللہ 11 یا 12 کو حاضر ہوں گا اور آپ کو مبارکباد دے کر روانہ ہو جاؤں گا۔ کاش آپ اجلاس میں ہوتے لیکن خدا کو منظور یہ ہی تھا۔ اس کا رنج مجھے ہے' اپنے خدا سے شکایت نہیں۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے۔

خادم

شرح دستخط نعمان

کانفرنسیں جلوس وغیرہ

آل انڈیا مسلم لیگ کو فروغ دینے، مسلمانوں کو منظم کرنے اور مسلم لیگوں کو قائم کرنے کے لئے صوبائی لیڈروں نے اپنے اپنے صوبوں میں رات دن تگ و دو کی۔ شہری، ضلعی اور صوبائی سطحوں پر کانفرنسیں کیں۔ کل ہند و شہرت رکھنے والے اکابرین کو خاص خاص جلسوں میں کبھی مہمانِ خصوصی بنا کر مدعو کیا گیا اور کبھی کانفرنسوں کا صدر بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کے کئی وفود نے دورے کئے اور اس کے تمام عہدیداروں نے بھارت ورش کی خاک چھانی۔ قائداعظمؒ باوجود اپنی اہم گوناگوں مصروفیات کے لوگوں سے ملنے اور ان کو منظم کرنے کا کوئی بھی موقعہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ میرا صوبہ چونکہ کانگریس کا سب سے بڑا محاذ تھا اور یہیں مسلم لیگ کی تمام بڑی لڑائیاں کامیابی کے ساتھ لڑی گئیں، اس لئے ہم لوگوں کو ہمیشہ چوکس اور کیل کانٹے سے لیس رہنا پڑتا تھا۔ ہم اپنے کو تیار رکھنے اور اپنی تنظیم کو مضبوط تر بنانے کے لئے جلسے جلوس اور بڑے پیمانہ پر کانفرنسیں کیا کرتے تھے۔ اختصار کی خاطر میں صرف اپنے صوبہ کی دو کانفرنسوں اور ایک جلوس کا ذکر کروں گا۔ ظفر الملت والدّین مولٰینا ظفر علی خاں صاحب ممبر مرکزی اسمبلی کی صدارت میں شہر ناگپور میں دوروزہ ناگپور ڈیویژنل مسلم پولیٹیکل کانفرنس 10 و 11 جون 1939ء کو منعقد کی گئی تھی۔ مولٰینا کی قلمی و عملی خدماتِ جلیلہ، بے باکی، حق گوئی، مسلسل قید و بند، زمیندار اخبار کی بار بار ضمانتِ زر کی ضبطی اور سرکارِ مدینہ سے والہانہ عشق و عقیدت ان کے ایسے بلند کارنامے تھے جس کی وجہ سے ان کے کام میں ایسی جاذبیت پیدا ہو گئی تھی کہ جس نے سنا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں تو وہ کچے دھاگہ سے بندھا کھچا چلا آیا۔ ہمارے رہنما چودھری خلیق الزماں صاحب رُکن مجلس عاملہ اور مولٰینا جمال میاں صاحب فرنگی محلی نے لکھنؤ

سے بہ نفس نفیس تشریف لا کر اس کانفرنس کو زینت بخشی تھی۔ان بزرگوں کی تشریف آوری سے یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی اور بہت سے لوگ جو ساحل پر بیٹھے ہوئے ہمارا تماشہ دیکھا کرتے تھے، ہماری کشتی میں سوار ہو گئے جس سے غیر متوقع طور پر ہمارا بڑا فائدہ ہوا اور جماعت کو بڑی تقویت پہنچی کیونکہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کا یہ ابتدائی دور تھا۔

میں صدر کانفرنس کے اس جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا چاہتا ہوں جو ان کے ورودِ مسعود پر نکالا گیا تھا۔ ہمارے اکثر جلوس ہندوؤں کے گنجان محلوں سے گزرا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ چھیڑ خانی کبھی مقصود خاطر نہیں رہی کیونکہ مسلم لیگ کی پالیسی صلح جویانہ اور امن پسندانہ تھی۔ مجبوری اور محض مجبوری تھی کہ ان کی آبادی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ناگپور شہر میں صرف ایک ایسا محلّہ تھا جسے خالص مسلمانوں کا محلّہ کہا جا سکتا تھا اور وہ مومن پورہ تھا۔ ویسے تو اور بھی محلے تھے جس میں قلیل تعداد میں مسلمان آباد تھے یا ہندو محلوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مولٰینا کا مومن پورہ سے جہاں کانفرنس کا پنڈال تھا، جلوس نکالا گیا۔ بحیثیت ایک نیشنل گارڈ میں دوسرے رضا کاروں کے ساتھ مارچ کر رہا تھا۔ جب گشت کرتے ہوئے ہم لوگ میونسپل ٹاؤن ہال کے قریب پہنچے تو مقابل سمت سے ایک چھوٹا سا جلوس آیا۔ مولٰینا کو کھلی گاڑی میں ابراہیم خاں صاحب فنا اور تاج الدین صاحب نمائندہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ مولانا کے استفسار پر فنا صاحب نے بتایا کہ کانگریسی پارٹی لیڈر جنرل آواری شراب بندی کے لئے کانگریسی والنٹیئر وں کا اپنی سرکردگی میں روزانہ جلوس نکالا کرتے ہیں۔ مولٰینا کو ان کے ایثار، قربانی اور انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا تھا تو جنرل آواری کیوں نہ جانتے۔ جنرل آواری نے مولٰینا کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کانگریسی نمستے کیا اور زور سے نعرہ لگایا ''شراب حرام ہے۔'' مولانا صاحب ایک غیر مسلم اور وہ بھی کانگریسی کی زبان سے یہ اسلامی نعرہ سن کر فوراً متاثر ہو گئے۔ فنا صاحب سے کہا کہ جلد کاغذ پنسل نکالو اور فی البدیہہ چند شعر کہہ ڈالے جو سوائے ایک کے سب ذہن سے اُتر گئے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اگر تمیزِ حلال و حرام ہو جائے
تو برہمن بھی ہمارا غلام ہو جائے

دوسری کانفرنس کا مولٰینا مفتی برہان الحق صاحب نے جبلپور میں انعقاد کیا۔ صوبہ کے رہنماؤں کے علاوہ آل انڈیا لیڈروں میں سے شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق صاحب وزیراعظم بنگال اور مجلس عاملہ کے رُکن عزیز ملت سید عزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ تشریف لائے۔ جبلپور کی مسلم لیگ ہمیشہ سے بہت مضبوط اور منظّم تھی کیونکہ اس میں بڑے شجیع مسلمان جو گھٹنے ٹیکنا اور پیٹھ دکھانا نہیں جانتے تھے، شریک تھے۔ بنگال کے وزیراعظم نے مسلمانوں کی داستانِ غم سن کر کانفرنس میں بڑی جوشیلی تقریر کی اور راست گوئی پر اُترے تو بہت بے باکی سے مسلمانوں کے دو حقیقی حریفوں کے متعلق صاف صاف الفاظ میں مثال دی کہ ہندو مہاسبھا ایک کتا ہے جو مسلمانوں کو بھونک کر کاٹتا ہے لیکن کانگریس ایک ایسا کتا ہے جو دم ہلاتا ہوا پیروں کے پاس آتا ہے اور بغیر بھونکے کاٹ لیتا ہے۔ پھر کیا تھا کانگریسی حلقوں میں آگ لگ گئی۔ وزیراعظم پنڈت روی شنکر شکلا تلملا اٹھے اور گاندھی آشرم وردھا کے کانگریسی نیتاؤں سے فریاد کی جنہوں نے مولوی فضل الحق صاحب کو اخباری بیانات کے ذریعہ برملا برا کہا اور ان کی بُری طرح خبر لی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی انفرادیت کو نمایاں طور پر جتانے اور منوانے کے لئے جھٹ پٹ ایک عدد بیان داغ دیا اور شیر بنگال کو کھلا چیلنج دیا کہ سی پی میں مسلمانوں پر کانگریسی مظالم کو ثابت کریں کیونکہ وہ سراپا جھوٹ ہیں۔ کیا خوب ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اس کانفرنس سے ایک اور واقعہ کا تعلق ہے، وہ بھی گوش گزار کردوں۔ مولٰینا مفتی برہان الحق صاحب نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کی تھی کہ میں اجلاس میں اپنے ان دو واجب التعظیم معزز مہمانوں کی موجودگی میں چاندور بسوا کا خونیں واقعہ سنا کر حاضرین اجلاس سے مقدمہ کی

پیروی اور مظلومین کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کروں۔ جب میں ارشاد تعمیل کر کے بیٹھ گیا تو دیکھا کہ عزیز ملت مضطرب خاطر مائک تھامے ہوئے کھڑے ہیں۔فرمایا میرے پاس پٹنہ جانے کے لئے صرف فرسٹ کلاس کا کرایہ ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ تیسرے درجہ میں بیٹھ کر پٹنہ جاؤں، جتنا پیسہ بچ رہتا ہے وہ چندہ میں پیش ہے۔ رہے وزیر اعظم بنگال تو ان کی ایسی قلندرانہ حالت تھی کہ ان کے پیروں کی دونوں ایڑیاں موزوں میں سے جھانک نہیں رہی تھیں بلکہ اپنا پورا درشن کرا رہی تھیں۔ میں نے ان درویش سیرت بزرگ کو پہلی مرتبہ کلکتہ میں اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اپنی بے بضاعتی اور ان کی عظمت کے پیش نظر بہت فاصلے سے دیکھا تھا جب وہ ہزار پندرہ سو شیداؤں کے جھرمٹ میں پاپیادہ میدان میں محمڈن اسپورٹنگ کلب کا فٹ بال میچ دیکھنے تشریف لے جاتے تھے۔ پھر میری زندگی میں ایک ایسا بھی دن آیا کہ جب وہ چند ماہ کے لئے مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو کر دہلی تشریف لائے اور آگرہ ہوٹل دریا گنج میں میرے کمرہ کے برابر والے کمرہ میں مقیم ہوئے اور ہم روزانہ دونوں مل کر اسمبلی جایا کرتے تھے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں بزرگ داد و دہش میں ایک دوسرے کا ثانی تھے۔ وکالت میں پیسے خوب کماتے اور ویسے ہی فراخدلی سے غریبوں اور طالب علموں پر خرچ کرتے تھے۔ دونوں فقیر منش تھے۔ عزیز ملت نے جب پٹنہ میں اجلاس ہوا تو کمال ہی کر دیا۔ انہوں نے یہ خیال کر کے کہ ان کا مکان قائداعظمؒ کے رہائش کے شایان شان نہیں ہے۔ اجلاس سے قبل عجلت کر کے فوراً نیا مکان بنا ڈالا۔ یہ تھے ہمارے اوّل درجہ کے اکابرین جنہوں نے بے لوث شاندار خدمات انجام دے کر قائداعظمؒ کے ہاتھوں کو پاکستان حاصل کرنے کے لئے صرف مضبوط ہی نہیں کیا بلکہ حاصل کر کے دکھلا دیا۔

وعدہ کے مطابق جلوس کا بھی حال بیان کر دوں۔ کانگریسی دور اپنے ساتھ مسلمانوں کے لئے مصیبتیں ہی مصیبتیں لے کر آیا۔ اس لئے روزانہ ہم لوگوں کو نت نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ظالم کے خلاف کس سے فریاد کرتے۔ وہ تو خود ہی حکمران تھا۔ انگریز گورنر نے کانوں

میں روئی ٹھوس لی تھی تا کہ وہ کچھ سن ہی نہ سکے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی تا کہ وہ دیکھ بھی نہ سکے اور اس کے کانگریسی وزیروں کے خلاف کوئی تحریری شکایت کی جائے تو اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ ان حالات میں ناگپور مسلم لیگ نے تنگ آ کر احتجاج کا نیا طریقہ اختیار کیا یعنی یہ طے کیا گیا کہ کالی جھنڈیوں کے ساتھ ایک جلوس نکالا جائے جو انگریز گورنر صوبہ کی رہائش گاہ (گورنمنٹ ہاؤس) پر ختم ہو اور گورنر کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرے۔ ضلع حکام نے بہتیری کوشش کی کہ ان کے کانگریسی آقاؤں کے خلاف کوئی جلوس نہ نکالا جائے۔ حکومت کے اشارے پر ہندو غنڈوں نے دھمکیاں بھی دیں کہ بلوہ کرا دیں گے، مکانوں کو جلا دیں گے اور جلوس کو تو کسی بھی حالت میں نہیں نکلنے دیں گے۔ کانگریسی حکومت کے لئے دفعہ 144 کا نفاذ کر کے جلوس کو روک دینا بہت آسان تھا لیکن کانگریسی حکومتوں نے جمہوریت کا ڈھول پیٹنے کے لئے کسی بھی صوبہ میں مسلم لیگ کی ان تحریکوں کے خلاف جو کانگریسی حکومت کے خلاف کی گئیں تھیں، کبھی اس قسم کی کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی لیکن کارکنوں کو پریشان کرنے کے لئے انہیں گرفتار کیا جاتا اور ان کے خلاف مقدمے چلائے جاتے۔ ہمارے اعلان کے مطابق کالی جھنڈیوں کا بہت بڑا جلوس نظم وضبط کے ساتھ تاریخ 23 جولائی 1939ء کو نکالا گیا۔ عام ہدایت کے مطابق ایک بھی دل آزار نعرہ نہیں لگایا گیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ جلوس کی کامیابی کا دارومدار صرف امن وامان قائم رکھنے میں ہے۔ شہر وضلع کے علاوہ تمام صوبہ سے ذمہ دار عہدہ داروں نے شرکت کی۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے جو محلوں میں رہ گئے تھے ان کے لئے ہر محلے میں حفاظت کا معقول انتظام کیا گیا کہ دشمن عناصر کی دستبرد سے یہ لوگ محفوظ رہ سکیں۔ جب جلوس ریذیڈنسی پہنچا تو انجمن ہائی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کے وسیع کمپاؤنڈ میں اُسے ایک عظیم الشان جلسہ کی صورت میں منتقل کر دیا گیا اور چند مختصر تقریروں کے بعد وفد کی تشکیل کی گئی۔ گورنر صاحب نے کانگریس کے خوف سے وفد کو شرف باریابی نہ بخشا لیکن اپنے اے، ڈی، سی کو ریذیڈنسی کے بڑے پھاٹک پر بھیج دیا۔ ہمارے وفد نے وہ عرضداشت جو دراصل کانگریسی حکومت کے خلاف فرد جرم

تھی، پیش کر دی تا کہ وہ گورنر صاحب تک پہنچا دی جائے۔ اس امن پسند کامیاب جلوس اور کانگریسی مظالم کی ہندوستان بھر میں تو خوب نشر واشاعت ہوئی لیکن بیرون ملک کے اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوئی۔لنڈن ٹائمس نے جلی حروف میں یہ خبر شائع کی اور اداریہ بھی لکھا۔اس زمانہ میں وزیر ہند کے ہندو مشیر ڈاکٹر رگھویندر راؤ نے جو ہمارے صوبہ کے ہوم ممبر، گورنر اور بعد میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر کئے گئے، لندن سے عرضداشت کی نقل منگوائی۔اس طرح مسلم لیگ نے اس شہرۂ آفاق کارروائی سے کانگریس کے رہے سہے بھرم کو مٹی میں ملا دیا۔

آپ جانتے ہیں کہ انگریزوں کے دور حکومت میں سرکاری خطابات کو ہندوستان میں ایک خاص طبقہ اور بھولے بھالے عوام بڑی اعزاز کی چیز سمجھتے تھے۔خطاب یافتگان تو ایسے گورکھ دھندے میں پھنستے تھے کہ ان کی لالچ بڑھتی ہی جاتی تھی اور وہ بڑے سے بڑے اعزاز کے خواہشمند اور طالب ہو جاتے تھے اور اُس کے حصول کے لئے بہت زیادہ انگریزوں کی چاپلوسی کیا کرتے اور پاپڑ بیلا کرتے تھے۔یہ لوگ بڑی بے چینی سے ہر سال ان دو دنوں کا انتظار کیا کرتے جب ملک معظم شاہ انگلستان کی طرف سے خطابات بخشے جاتے تھے: ایک تو سالگرہ اور دوسرا نئے سال کا پہلا دن۔ ہندوستان کے خوددار تعلیم یافتہ حریت پسند لوگ ان خطاب یافتگان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں ضمیر فروش، ملک فروش، سرکار پرست اور ٹوڈی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ان میں اکثر لوگ تو واقعی بہت گھٹیا قسم کے ہوتے تھے۔کچھ اچھے بھی ضرور ہوتے تھے لیکن ان کی اچھائی کو کثیر التعداد بدکردار خطاب یافتگان ڈھک دیتے تھے۔انگریزوں کے پاس بہت سے طلب گارانِ شہرت کو اپنانے کے لئے خطابات دینے سے بہتر کوئی دوسرا حربہ نہیں تھا۔ جیسے جیسے سیاسی بیداری اور انگریز مالکوں سے نفرت بڑھتی گئی، سمجھدار حریت پسند طبقہ خطابات کو کلنک کا ٹیکہ سمجھنے لگا۔تحریک خلافت اور کانگریس کی مقبولیت اور احساسِ خودداری نے ان اعزازات کو پہلے ہی بڑی ضرب کاری لگائی تھی اور اب کانگریسی دورِ حکومت میں تو خطاب یافتگان کی بالکل ہی مٹی پلید ہوئی جب وہ فریاد لے کر سفید فام آقاؤں کے پاس گئے تو انہوں

نے کانگریس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انہیں منہ نہیں لگایا اور کہا کہ تم بھی اس ہی طرح ان سے تعاون کرو جیسا ہم کر رہے ہیں۔

قائداعظمؒ تو ہمیشہ سے ان خطابات کو لعنت کا طوق سمجھتے تھے اور جو لوگ اس کو حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتے' انہیں وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ مسلم لیگ اتنی منظم اور طاقتور ہوگئی تھی کہ سوائے اُن مسلمانوں کے جنہیں قائداعظمؒ اور مسلم لیگ سے بغض تھا یا وہ نیشنلسٹ مسلمان جو کانگریس میں تھے یا وہ جو انگریزوں کو حق پر سمجھتے تھے اور کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکوں کو غلط تصور کرتے تھے' ان کے علاوہ باقی تمام مسلمان مسلم لیگ میں تھے۔ غالبًا قائداعظمؒ حکومت برطانیہ پر یہ بھی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جن خطاب یافتہ مسلمانوں کا دامن مسلم لیگ سے وابستہ ہے اور جنہیں تم اپنا سمجھتے ہو' وہ دراصل تمہارے نہیں ہیں۔ وہ اتنے بلند کردار کے لوگ ہیں کہ مفادِ ملی اور ملکی کے لئے وہ اپنی جان جیسی عزیز چیز دینے میں بھی دریغ نہیں کریں گے تو پھر وہ تمہارے عطا کردہ غلامی کو مستحکم کرنے والے خطابات کی کیا پرواہ کریں گے۔

چنانچہ بمبئی میں جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس 1946ء کے وسط میں ہوا' اُس میں یہ طے پایا کہ بطور احتجاج مسلم لیگی خطاب یافتگان اپنے خطابات کو فوراً واپس کردیں۔

بمبئی کا نام آتے ہی یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ میں مسلم لیگ کے صف اوّل اور ایک صوبائی بزرگ کا کچھ ذکر کروں۔ جناب اسمٰعیل ابراہیم چندریگر صاحب بمبئی صوبہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ وہ بڑے کم سخن لیکن دیدہ ور' مخلص مسلم لیگی رہنما اور قائداعظمؒ کے جاں نثار دوست تھے۔ انہوں نے راجکوٹ کے معاملہ میں قائداعظمؒ کی ہدایت پر بڑا کارنمایاں انجام دیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں وزارت تجارت کے کاموں کو اس عمدگی اور خوش سلیقگی سے نبھایا کہ ان کے پیش رو انگریز ماہرین کے کام ماند پڑ گئے۔ اُنہوں نے جبلپور کے ہندو مسلم فسادات کے چند مسلم مواخذین اور ظالم تانگہ والا کو مولینا مفتی برہان الحق صاحب کی پرزور سفارش اور شدید اصرار پر ناگپور ہائی کورٹ میں پیروی کر کے تختۂ دار سے صحیح سلامت اتار کر اپنی قانون دانی کا ڈنکا بجوادیا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظمؒ نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کے لئے چندریگر صاحب کو نگران کار مقرر کیا تھا۔ ان کی اس تقرری سے یقینی طور پر حکومت کی بے قاعدگیوں اور غیر سرکاری جماعتوں کو ریفرنڈم میں بیجا دخل اندازیوں اور دھاندلی بازیوں کا دروازہ بند ہوگیا۔ ان کی رفاقت کے لئے ہمارے واجب القدر دوست سید واجد علی شاہ صاحب دہلی سے پشاور گئے۔ وہ مسلم لیگ کے خزانہ کے جس میں واجبی ہی واجبی رقم تھی' انچارج تھے۔ یہ تقرری بھی بہت منفعت بخش ثابت ہوئی کیونکہ ہمارا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوا۔ سید صاحب اپنے وسیع تجارتی تجربہ کی بنا پر بڑی احتیاط کے ساتھ ریفرنڈم کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے قومی اور اپنا پیسہ خرچ کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل اور ناخوشگوار تھا لیکن شاہ جی نے اپنی سدا بہار مسکراہٹ اور روائتی خوش خلقی سے کسی کی پیشانی پر ذرا سا بل بھی نہ آنے دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد چندریگر صاحب وزارت کے عہدہ کے علاوہ سفارت اور گورنری کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ انہوں نے جس کسی بھی عہدہ کو زینت بخشی' وہاں اپنی حسن کارکردگی سے ہر کس و ناکس سے بھرپور داد لی۔

آمدم برسر مطلب اس جلسہ کی کارروائی کے مناظر قابل دید تھے۔ جس نے دیکھا' وہ تا عمر یاد رکھے گا۔ قائداعظمؒ صدارت فرما رہے تھے اور جب تک یہ کارروائی جاری رہی' وہ برابر زیر لب مسکراتے اور خوش ہوتے رہے۔ اس دن خطاب یافتگان ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتے تھے۔ ایک دو ہی نے نہیں بلکہ سینکڑوں نے خندہ جبینی و خندہ لبی سے جوق در جوق آکر خطابات کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ حالت یہ تھی کہ ایک لامتناہی تانتا بندھا ہوا تھا جیسا آپ نے سینما ہاؤس میں جب کوئی اچھی فلم دکھلائی جا رہی ہو یا نلکے پر جب پانی کا قحط ہو' دیکھا ہوگا۔ ہر شخص مکبر الصّوت کے سامنے آکر اپنا خطاب کچھ جھینپ کے ساتھ بتلاتا تھا لیکن فوراً ہی سر کو فخر کے ساتھ بلند کر کے بڑے جوش کے ساتھ اپنے خطاب کو چھوڑنے کا اعلان کرتا تھا۔ ہر اعلان پر اراکین کونسل نعرۂ تحسین بلند کرتے اور بڑی دیر تک تالیاں بجایا کرتے تھے۔ ہمارے اکابرین میں سے خواجہ ناظم الدین صاحب اور ملک فیروز خاں نون صاحب کو بہت زیادہ خطابات ملے

تھے۔ غالباً ملک صاحب کا خواجہ صاحب سے ایک خطاب زیادہ تھا۔ ہر فرد بہت مسرور تھا اور خصوصاً سابق خطاب یافتگان جن کا نام اس دن سے حریت پسندوں کی فہرست میں درج کر لیا گیا۔ قائداعظمؒ نے اپنی قوم کو خودداری کا سبق خوب سکھایا اور برطانیہ اور دنیا کو یہ بتا دیا کہ ہر کلمہ گو اول مسلمان اور آخر مسلمان ہے۔

''قائداعظم زندہ باد''

☆☆☆☆☆
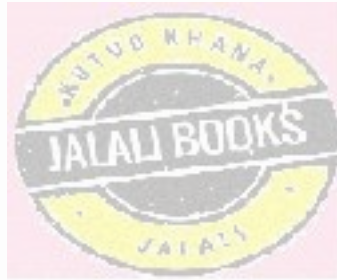
کِنگ کوٹھی

مسٹر حسین ملک صدر صوبائی مسلم لیگ دہلی نے مجھے ٹرنک کال کر کے ناگپور میں اطلاع دی کہ قائداعظمؒ دکن ایئرویز سے 8 جولائی 1946ء کو حیدر آباد کے لئے روانہ ہو رہے ہیں اور 9 بجے صبح ان کا ہوائی جہاز ناگپور پہنچے گا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ پریشان کن خبر سنائی کہ وہ تنہا سفر کر رہے ہیں اور ان کے اسٹاف میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ میں نے بحیثیت سالارِ اعلیٰ مسلم نیشنل گارڈز اپنی عظیم جوابداری کا خیال کرتے ہوئے ان کے ہمراہ جانے کے لئے فوراً حیدر آباد کا ٹکٹ خریدا اور اپنے احباب و رفقائے کار اور بالخصوص ابراہیم خاں صاحب فنا کے مشورہ سے طیران گاہ پر شاندار استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوسرے دن صبح سونے گاؤں میں باوجود شہر سے دوری کے ہزار ہا مسلمان اپنے قائد کو خوش آمدید اور زندہ باد کہنے موجود تھے۔ وہ مشتاقانِ دید اور عقید تمندوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مختصر سی اُردو تقریر میں اُن سب کا شکریہ ادا کر کے گھر لوٹ جانے کی ہدایت کی۔ فرطِ جوش میں ابراہیم خاں صاحب فنا نے ''شاہنشاہ پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا جسے سن کر قائداعظمؒ سخت برہم ہوئے اور میرے دوست کو ایسی زوردار ڈانٹ پلائی کہ وہ بے چارے اپنی پٹھانیت کے باوجود روپوش ہو گئے۔ میں قائداعظمؒ کے ہمراہ ریفرشمنٹ روم میں گیا جہاں انہوں نے ناشتہ کیا۔ وہیں کیپٹن آغا تراب آ گئے جو قائداعظمؒ کے عقیدت مند اور میرے کرم فرما تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں قائداعظمؒ کے ساتھ حیدر آباد جا رہا ہوں تو اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ ''الحمدللہ! میری جوابداری ختم ہوئی'' اور میری آنکھوں میں آنکھ ڈال کر کہا: ''سپردم بتو مایۂ خویش را'' میرے

دریافت کرنے پر آغا تراب صاحب نے بتلایا کہ ہوائی جہاز کے ناگپور پہنچنے میں آدھ گھنٹہ کی تاخیر اس وجہ سے ہوئی کہ جس ہوائی راستہ سے گوالیار پہنچنا تھا' اُس راہ میں سخت آندھی اور بارش تھی اور یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ وہ اس راستہ سے آتے جہاں قائداعظمؒ کی قیمتی جان کو رتی برابر بھی خطرہ یا تکلیف کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا طوفان سے بچنے کے لئے وہ پھیرے کے راستہ سے گوالیار پہنچے۔ قائداعظمؒ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی بصیرت آفریں آنکھوں سے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ آغا تراب صاحب کی طرف دیکھ کر صرف ''شکریہ'' کہا۔ آغا تراب صاحب کو اس لفظ ''شکریہ'' سے گویا کونین کی دولت مل گئی۔ وہ کتنے فرحاں و نازاں نظر آتے تھے۔ اللہ اللہ! کیسے کیسے مخلص لوگ تھے۔ اللہ اُن کو اور قائداعظمؒ کے دوسرے فدائی قاضی محمد اسماعیل صاحب (برادرِ عزیز قاضی محمد عیسیٰ) کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ یہ دونوں غیر منقسم ہندوستان کے پہلے نمبر کے ہواباز مانے جاتے تھے اور ان دونوں نے قیام پاکستان کے بعد ملتان کے قریب ایک ہوائی حادثے میں شہادت پائی۔

قائداعظمؒ نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ میں حیدرآباد کیوں جا رہا ہوں۔ وہ ناراض نہیں تھے لیکن شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں بلاوجہ زیر بار ہوں۔ اللہ اللہ کر کے پرواز شروع ہوئی۔ مجھے قائداعظمؒ کے بازو بٹھلا کر عزت بخشی گئی۔ جب ہوائی جہاز پر تول رہا تھا' اس وقت انہوں نے پھر سوال اٹھایا کہ میں حیدرآباد کیوں جا رہا ہوں۔ میں نے حیدرآباد سے موصول شدہ دعوت نامہ کی آڑ لے کر عرض کی کہ مجھے بھی آپ کی بدولت بلوایا گیا ہے۔ دورانِ پرواز میں نے دو تین مرتبہ دیکھا کہ قائداعظمؒ پیچھے مڑ مڑ کر کچھ دیکھتے ہیں۔ میں نے ہمسفروں پر ایک غائر نگاہ ڈالی تو یہ محسوس کیا کہ دو ایک پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بیساختہ میرے سیدھے ہاتھ نے ٹٹول لیا کہ ریوالور آسانی اور تیزی سے ضرورت کے وقت نکالا جا سکتا ہے۔ بالآخر ہمارا ہوائی جہاز بخیریت تمام بیگم پیٹ کے ہوائی اڈہ پر جو حیدرآباد شہر سے تقریباً پندرہ میل دور واقع ہے' ہوا کے دوش سے نیچے اُترا۔ بے پناہ ہجوم والہانہ محبت سے سرشار قائداعظمؒ کو دیکھنے

مضطرب تھا۔ لوگ کیا تھے' ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جدھر دیکھو' اُدھر لوگوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ چند لوگ دیوانہ وار جان لیوا خطرہ سے بے نیاز ہو کر ہوائی جہاز کی طرف لپکے۔ اگر آغا تراب صاحب چابکدستی نہ دکھلاتے تو کئی لوگ ہوائی جہاز کے چلتے ہوئے پنکھوں اور پروں سے شدید مجروح ہو جاتے۔ قائداعظمؒ کا ہوائی جہاز سے اترنا بھی ایک بڑا مرحلہ تھا۔ سواری کی موٹر کا سیڑھیوں تک پہنچنا محال ہو گیا تھا۔ ہوائی جہاز کے اندر گرمی اور باہر کی ہوا نہ ملنے سے دم گھٹنے لگا تھا۔ کسی کو خوب سوجھی کہ برماشیل پٹرول کی گاڑی سیڑھیوں تک لے آئے۔ لوگ سمجھے کہ ہوائی جہاز میں پٹرول ڈالا جائے گا۔ وہ ذرا سمٹ گئے اور راہ دے دی۔ قائداعظمؒ اس پر سوار ہو گئے اور اس طرح انہوں نے تھوڑا سا راستہ اپنی کار تک طے کیا۔

ہوائی جہاز سے اُترنے سے قبل قائداعظمؒ نے اپنے سامان کا عمیق جائزہ لیا اور مزید اطمینان کی خاطر ہر سوٹ کیس پر انگلی رکھ کر نمبر شماری کی۔ جب میں نے حفاظت سے سامان لے جانے کی پیش کش کی تو میری طرف متفکر نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگے کہ دیکھو بہت قیمتی دستاویزات ہیں۔ انہیں حفاظت سے خود لے کر آنا۔ مجھ پر اب پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کا عقدہ کھلا۔ راک لینڈ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قائداعظمؒ کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ کے لئے حکومت حیدرآباد کی طرف سے معقول حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے لیکن انجمن اتحاد المسلمین نے مزید حفاظت کے لئے قائداعظمؒ باڈی گارڈز کی بھی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ بمبئی مسلم نیشنل گارڈز بھی جو خاص اس ہی مقصد کے لئے آئے تھے' اپنے سالار صوبہ سید ہاشم علی صاحب انعامدار کی سرکردگی میں قائداعظمؒ باڈی گارڈز کے ساتھ مل کر ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہ بھی بتلاتا چلوں کہ یہ گیسٹ ہاؤس صرف قائداعظمؒ ہی کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہاں اور بھی مہمان ٹھہرائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ ناگپور کے مسٹر نٹراجن سپرنٹنڈنٹ سی۔ پی۔ پرنٹنگ پریس تھے جو کسی سرکاری کام سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور حکومت کے مہمان تھے۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر نے ازراہِ

تلطف مجھے بھی مہمان خانہ میں ٹھہرنے کے لئے فرمایا لیکن میں نے دارالسلام (دفتر انجمن اتحاد المسلمین) کو مختلف مصلحتوں کی وجہ سے مہمان خانہ پر ترجیح دی حالانکہ میرا تمام وقت رات کے سوا قائداعظمؒ کی معیت و قربت میں گزرتا تھا تا کہ انہیں ان کے اسٹاف کے نہ ہونے سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

قائداعظمؒ کا سامان لے جانے کے لئے ایک بند گاڑی موجود تھی۔ اس میں سامان رکھا گیا اور دروازہ بند اور مقفل کیا جانے لگا تو میں نے روک دیا اور اندر سامان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں بمبئی کے سالار صوبہ سید ہاشم علی صاحب انعامدار آ گئے جو بمبئی سے مسلم نیشنل گارڈز کا ایک دستہ لے کر حیدر آباد آئے ہوئے تھے۔ یہ بہت نیک اور مخلص آدمی تھے۔ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی بے ریا خدمت ان کا نصب العین تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں باہر ڈرائیور کے پاس بیٹھوں لیکن ہم دونوں نے اندر ہی بیٹھ کر مسافت طے کی۔ گیسٹ ہاؤس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر حیدر آباد کے صدر اعظم قائداعظمؒ سے باتیں کرتے بیٹھے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ قائداعظمؒ اپنے بیش بہا سامان کے لئے پریشان ہوں گے اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کے لئے میں اجنبی نہیں تھا، میں کمرہ میں چلا گیا۔ قائداعظمؒ سے عرض کیا کہ چل کر سامان دیکھ لیجئے۔ فوراً اُٹھے اور پھر انگلی چھو کر دو مرتبہ اپنے سامان کی نمبر شماری کی۔ قائداعظمؒ نے شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بے حد شکریہ ادا کیا اور یہ کام بخیر و خوبی ختم ہوا۔

قائداعظمؒ کے حضور نظام بار بار حیدر آباد آنے کی دعوت دے چکے تھے لیکن وہ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس سے قبل نہ جا سکے۔ جب شدت کے ساتھ طلبی کا اصرار ہونے لگا اور یہ کہا گیا کہ سر مرزا اسماعیل کے متعلق مشورہ کرنا ہے تو قائداعظمؒ کیوں کر نہ جاتے۔ علاوہ ازیں حیدر آباد کے مسلمان نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وجہ سے قائداعظمؒ کے دل سے بہت قریب تھے اور وہ حیدر آباد جیسی ذی شان مسلم ریاست کے صرف سچے بہی خواہ ہی نہیں بلکہ دل سے چاہتے تھے کہ یہ ریاست زمانہ اور دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ دوئم وہ بیگم بہادر یار

جنگ اور مسلمانان حیدر آباد کو نواب بہادر یار جنگ کی بے وقت وفات حسرت آیات سے جو نا قابل تلافی نقصانِ عظیم ہوا تھا' خود حیدر آباد جا کر پُرسا دینا چاہتے تھے اور سوئم نواب بہادر یار جنگ کی دائمی مفارقت اور ان کی فعال قیادت کی محرومی سے حیدر آباد کی سیاست میں جو ایک بحران پیدا ہو گیا تھا' اس کو دور کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں قائداعظمؒ کا حیدر آباد میں ورودِ مسعود ریاستی مسلمانوں کے لئے حقیقتاً حوصلہ افزا' ولولہ خیز اہم تاریخی واقعہ تھا۔ وہ اپنی تمام خوش آئند اُمیدیں وابستہ کر کے قائداعظمؒ کو اپنا اصلی اور واحد سیاسی نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ ان کو ان مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں تھا جو قائداعظمؒ کو شخصی حکومت' درباریوں اور برطانوی ریشہ دوانیوں کی بدولت قدم قدم پر پیش آنے والی تھیں۔

پہلا مرحلہ جو درپیش ہوا' وہ حیدر آباد کے ریذیڈنٹ سے ملاقات کا تھا کہ آیا قائداعظمؒ ان سے جا کر ملیں یا وہ قائداعظمؒ سے آ کر ملیں۔ یہ بات ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ جن بڑی ریاستوں میں ریذیڈنٹ کا تعین ہوتا تھا' وہاں اس کے بہت وسیع اختیارات ہوتے تھے اور والیٔ ریاست اپنی ذاتی بقا کی خاطر ریذیڈنٹ کو خوش رکھنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے لیکن نظام حیدر آباد جیسے معدودے چند والیانِ ریاست ریذیڈنٹ تو کیا وائسرائے سے بھی ٹکر لینے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ بہرحال چند ریذیڈنٹ حکومت کے نشے میں اور وائسرائے کی سرپرستی کی بدولت کبھی کبھی بہت بددماغ ہو جاتے تھے اور ریاستی ماحول میں رہ کر فراعنہ بن جاتے۔ قصہ مختصر قائداعظمؒ کو ریذیڈنٹ سے ملنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ اعلیٰ حضرت سے نجی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ خیر یہ طے ہوا کہ ریذیڈنٹ سر آرتھر لوتھین قائداعظمؒ سے ملنے آئیں گے۔ پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر خورشید کی عدم موجودگی کی وجہ طے پایا کہ سالارِ اعلیٰ ریذیڈنٹ کا استقبال کر کے انہیں قائداعظمؒ کی نشست گاہ میں لائیں اور ملاقات کے بعد قائداعظمؒ ریذیڈنٹ کے ہمراہ برساتی تک جائیں۔

پروگرام کے مطابق یہ محض رسمی ملاقات تھی۔ غالباً مسٹر خورشید بمبئی سے قائداعظمؒ کے

قیام کے آخری دن حیدر آباد پہنچے اور ان کے ساتھ بمبئی واپس ہو گئے۔

اعلیٰ حضرت سے کنگ کوٹھی میں مہمان عظیم کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ ملاقات کے دن صبح میں قائداعظمؒ نے مجھ سے دریافت کیا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس سر مرزا اسماعیل کے متعلق کتنے اہم دستاویزات ہیں؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت سر مرزا اسماعیل کو صدر اعظم مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن قائداعظمؒ اس تقرری کو ریاست اور وہاں کے مسلمانوں کے مفاد میں نہیں سمجھتے تھے۔ مجلس اتحادالمسلمین ہمیشہ سے اس تقرری کے خلاف تھی۔ اصل میں نظام نے اس مسئلہ کو نواب بہادر یار جنگ کی زندگی میں اُٹھایا تھا لیکن ان کی اور اتحادالمسلمین کی مخالفت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکے اور نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری صدر اعظم رہے جن کو حیدر آباد سے نکالنے اور تنگ کرنے کے لئے بہت سی حرکتیں کی گئیں۔ سب میں نمایاں شرارت ان کی سجی سجائی قیام گاہ ''شاہ منزل'' کو جلوانا تھا۔ آخر کار نواب صاحب چھتاری صدر اعظم کے عہدہ سے مستعفی ہو کر چلے گئے۔ قائداعظمؒ ان تمام حالات سے واقف تھے۔ مولانا احمد عبداللہ المسدوسی اور یامین زبیری صاحب دہلی میں قائداعظمؒ سے اس سلسلہ میں بات چیت کر چکے تھے۔ اعلیٰ حضرت اس خوف سے کہ سر مرزا کی تقرری سے جو ہندو نواز اور کانگریس دوست مشہور ہیں' کہیں ریاست میں فتنہ وفساد بپا نہ ہو جائے اس لئے انجمن اتحادالمسلمین کا منہ بند کرنے کے لئے قائداعظمؒ کی مہر حمایت ثبت کرانا چاہتے تھے۔ وقت مقررہ سے کچھ قبل قائداعظمؒ اعلیٰ حضرت سے ملنے روانہ ہوئے۔ قائداعظمؒ کی ہر دلعزیزی' بے پناہ شہرت' مشن کی افادیت اور اعلیٰ حضرت سے دیرینہ قریبی خوشگوار تعلقات و ملاقات ایسے ناقابل تردید امور تھے جن سے ہر کس و ناکس واقف اور پُر امید تھا۔ وفورِ شوق دید و کامیابی مقصد کی اُمید نے سینکڑوں کیا ہزاروں عقیدتمندوں کو کنگ کوٹھی کے باہر لا کھڑا کیا تھا اور راستہ میں بھی لوگوں کے پرے کے پرے نظر آتے تھے۔ جہاں جہاں سے اس بے تاج کے بادشاہ کی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے قلوب پر حکومت کرتا تھا' سواری گزری تو لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور چیخ چیخ کر زندہ باد کے نعرے لگائے۔

کنگ کوٹھی میں سواری پہنچی اور فوراً باریابی ہوئی لیکن چند منٹ کے بعد دیکھنے والوں پر سکتہ طاری ہوا کہ یاالٰہی اتنی جلدی یہ سواری کیوں لوٹ رہی ہے۔ یہ کیسی ملاقات جو اتنی مختصر سی مدت میں ایک دم ختم ہوگئی۔ لاکھوں لوگ لاکھوں زبانیں' افواہ آگ کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی کہ اعلیٰ حضرت قائداعظمؒ کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آئے۔ میں ان باتوں سے بے خبر مہمان خانہ میں اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اگر ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت گزر جاتا تو میں ان کا انتظار کرنا شروع کر دیتا۔ ایک کار اچانک رونما ہوئی اور سائبان میں آ کر ٹھہر گئی۔ قائداعظمؒ کو کار سے اُترتا ہوا دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میری متلاشی اور پریشان نگاہوں نے دیکھا کہ ان کا ستواں چہرہ کچھ متغیر سا تھا اور اس پر ناگواری اور بیزاری کی جھلکیاں دھوپ چھاؤں کی طرح جلوہ دکھلا رہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں خوف زدہ ہو کر بے ساختہ 'الٰہی خیر' کی رَٹ لگا دی۔ قائداعظمؒ نے میری اضطرابی کیفیت کا خیال نہ فرما کر غیر متزلزل لہجہ میں کہا کہ دوپہر کی بمبئی کی پرواز میں ایک نشست محفوظ کر کے ٹکٹ خرید لاؤ۔ یہ سن کر میرے پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ ''بہت اچھا جناب'' کہہ کر سامنے سے ہٹ گیا اور وہ اپنے کمرہ میں عزم و استقلال کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ ڈالتے ہوئے چلے گئے۔ فوراً ہی چند اکابرین متوحش چہروں کے ساتھ پہنچے اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کی عقل ماؤف ہوگئی ہے کیونکہ وہ بت بنے بیٹھے تھے۔ کس کی مجال اور کس کی ایسی حالت تھی کہ وہ قائداعظمؒ کے کمرہ میں جاتا اور ان سے بات چیت کرتا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے قائداعظمؒ کی بزرگانہ شفقت اور ان کی معاملہ فہمی کا سہارا لے کر ہمت کی اور ان کے کمرہ کے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ اندر طلب فرمایا اور مجھ پر سوالیہ نگاہ ڈالی۔ میں نے کچھ نڈر ہو کر ادب سے عرض کیا کہ آپکے حسب منشاء تمام انتظامات ہو سکتے ہیں لیکن باور کیجئے کہ جس وقت مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ آپ بمبئی کے لئے روانہ ہوگئے تو یہاں قیامت خیز ہنگامہ بپا ہو جائے گا اور صحیح یا غلط مخالفین آپ کو اس کا ذمہ دار قرار دیں گے۔ میری معروضات سن کر وہ خاموش رہے۔ یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے بمبئی جانے کا ارادہ

ترک کر دیا تھا۔

ناظرین یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہوں گے کہ قائداعظمؒ واعلیٰ حضرت سے کیا بات چیت ہوئی اور قائداعظمؒ کیوں ایک دم لوٹ آئے۔ سلام وہاتھ ملانے کے بعد دونوں مقتدر ہستیوں نے اپنی اپنی کرسیوں کو زینت بخشی اور ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ اہم بات چیت شروع کرنے سے قبل قائداعظمؒ نے غیرارادی طور پر اپنے چاندی کے کیس سے سگریٹ نکال کر جلائی۔ اس کا ردعمل ملاحظہ کیجئے کہ نظام کا دل جل کر رہ گیا۔ وہ یہ سمجھ کر سخت برہم ہوگئے کہ قائداعظمؒ نے ان کی شاہانہ موجودگی میں دیدہ ودانستہ سگریٹ نوش کر کے ان کی توہین کی۔ اعلیٰ حضرت اپنی قدیم عادت سے مجبور ہو کر چیخنے چلانے لگے۔ قائداعظمؒ موقعہ کی نزاکت اور اپنی بزرگی وعظمت کے پیش نظر سگریٹ کو پھینک کر معذرت خواہ ہوئے اور سمجھے کہ بات آئی گئی ہوگئی لیکن حضور نظام موقعہ کی تلاش میں بھرے بیٹھے تھے کہ دل کھول کر دل کا اُور زیادہ بخار نکالیں۔ اس ملاقات میں سرمرزا اسماعیل کا ذکر چھڑنا لازمی تھا کیونکہ قائداعظمؒ دلی سے اس ہی کے لئے تشریف لائے تھے۔ قائداعظمؒ نے زبان کھولی ہی تھی کہ اعلیٰ حضرت نے ترش رو ہو کر تیز تیز تحکمانہ لہجے میں فرمایا:-

''دیکھئے مسٹر جناح! آپ کو میرے امور مملکت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

یہ تھا واقعہ جس نے ہلچل مچادی۔ نظام نے سرمرزا اسماعیل کے ذکر جیسی چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا کر شاہی تدبر کا چولا اُتار پھینکا اور غصہ کی حالت میں وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ اپنی' اپنی رعایا اور اپنی مملکت کی قبر کھود رہے ہیں۔ تاریخ بیں حضرات شاہد ہیں کہ اس گھڑی سے نظام اور حیدرآباد کا زوال شروع ہوا۔ افسوس ہے کہ نظام یکسر بھول گئے کہ (۱) قائداعظمؒ ان کے ایک واجب التعظیم مہمان تھے (۲) قائداعظمؒ نے اعلیٰ حضرت کے شدید اصرار کے بعد اپنے اہم قومی کاموں کو چھوڑ کر حیدرآباد آنے کی دعوت قبول کی تھی اور (۳) قائداعظمؒ کو ریاست کی گتھیاں سلجھانے' سرمرزا کے متعلق مشورہ کرنے اور ان کے توسط سے انجمن اتحاد المسلمین کا مکمل تعاون حاصل کرنے کے

لئے بلوایا گیا تھا۔حضور نظام اس وقت یہ بھی بھول گئے کہ قائداعظمؒ حیدر آباد کے جاگیردار یا ریاستی ملازم نہیں تھے اور نہ انہیں حیدر آباد کے متعلق مالی معاوضہ دے کر قانونی مشورہ حاصل کرنے بلوایا گیا تھا اور نہ انہیں شاہی دربار میں درباری کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا بلکہ بحیثیت ایک ہمدرد دوست نجی ملاقات اور مشورہ کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ ویسے بھی سگریٹ پینا کوئی جرم نہیں تھا بلکہ نظام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ خود سگریٹ پیش کرتے یا کسی ملازم کو حکم فرماتے۔ ان حالات میں بات چیت کو جاری رکھنا غیر دانشمندانہ تھا۔ اس لئے قائداعظمؒ اعلیٰ حضرت سے اجازت لے کر مہمان خانہ لوٹ آئے۔ اس فعلِ ناشائستہ کو خوشامدی درباریوں نے زباں زد عام خبروں کے مطابق بہت سراہا کیونکہ یہ صحیح ہے کہ یہ ہی خوشامدی جو سر مرزا اسماعیل کی تقرری کی موافقت میں تھے' ایک بنے بنائے منصوبہ کے تحت اس ملاقات کو پہلے ہی سے ناکام بنانے کے درپے تھے۔ انہوں نے پہلے ہی سے اعلیٰ حضرت کے کان بھر دیے تھے اور یہ باور کرا دیا تھا کہ قائداعظمؒ انگریزوں اور کانگریس کے خلاف مسلسل کامیابیوں سے بہت مغرور اَور مدّمغ ہو گئے ہیں۔ حیدر آباد کے چند ذی ہوش برسراقتدار بہی خواہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ نظام اپنے شاہی مہمان کو بلوا کر اس خوشگوار معاملہ کو رفع دفع کر دیں لیکن افسوس ہے کہ وہ نہ پسیجے اور معاملہ جوں کا توں رہا۔

اس سلسلے میں بمبئی کے مسٹر کانجی دوار کا داس کے اس خط کے چند اقتباسات کا اُردو ترجمہ نقل کروں گا جو بمبئی کے مشہور انگریزی روزنامہ ''ٹائمس آف انڈیا'' مورخہ 9 نومبر 1953ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جسے حکومت پاکستان کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے اطلاع نامہ نمبر 180 میں دوبارہ شائع کیا۔ یہ خط دراصل سر مرزا اسماعیل صاحب کے خط کے جواب میں ہے جو انہوں نے اعلیٰ حضرت کی قائداعظمؒ سے ملاقات اور سگریٹ نوشی کے بارے میں انتقامی جذبہ کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سر مرزا اسماعیل ایک عرصہ تک میسور کے دیوان رہے اور ان کی حیدر آباد کی تقرری کو قائداعظمؒ حیدر آباد کے مفاد میں نہیں سمجھتے تھے'

اس لئے مخالفت کرر ہے تھے۔ تعجب ہے کہ اعلیٰ حضرت اور سر مرزا اسماعیل نے رائی کا پربت بنا دیا اور سر مرزا نے تو بہت ہی گھٹیا کام کیا کہ قائد اعظمؒ کے انتقال کے پانچ سال بعد اُن پر گندگی اچھال کر اپنی آتشِ مخاصمت کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ میں اس خط کے نفس مضمون کے متعلق مزید کچھ لکھنا نہیں چاہتا اور نہ وائسرائے ہند لارڈ لنلیتھ گو کی غیر دانشمندانہ دورُخی پالیسی پر روشنی ڈالوں گا جس کی بنا پر سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کو مسلم لیگ کی ممانعت کے باوجود قومی دفاعی کونسل کا رکن نامزد کیا گیا یا قائد اعظمؒ سے اپنی فریب دہی کی صفائی پیش کرنے کی اہانت آمیز حرکت کی گئی کیونکہ مَیں اَور کہیں ان متنازعہ معاملات پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کر چکا ہوں۔ میرا مقصد ان اقتباسات کو پیش کرنے سے صرف اتنا ہے کہ آپ پر بھی ایک ہندو ہندوستانی کے خیالات جو وہ قائد اعظمؒ کے متعلق رکھتا تھا' ظاہر ہو جائیں اور قائد اعظمؒ کے کردار کا ایک اور پہلو اُجاگر ہو جائے جسے سب دیکھ سکیں۔ مسٹر کانجی دوارکا داس فرماتے ہیں:-

''مسٹر مرزا اسماعیل مسٹر جناح اور نظام کے واقعہ کا حوالہ دینے سے دوسری مثالوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن سے پاکستانی رہنما کچھ اور ہی روشنی میں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اینی بیزنٹ مدراس سے دہلی جاتے ہوئے ایک دن کے لئے یکم نومبر 1929ء کو میری مہمان تھیں۔ میں نے اس کا ذکر مسٹر جناح سے کیا تھا۔ اُنہوں نے ہائیکورٹ جاتے ہوئے دس بجے صبح ڈاکٹر اینی بیزنٹ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ٹھیک دس بجے وہ منہ میں سگریٹ دبائے چہل قدمی کرتے ہوئے آئے۔ ہم تمام اور خود مسٹر جناح اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ڈاکٹر بیزنٹ کو سگریٹ پینا سخت ناپسند تھا۔ میں چلایا۔''جناح! سگریٹ پھینک دو۔'' ''مجھے بہت افسوس ہے کانجی! تمہارا بہت شکریہ۔'' انہوں نے کہا اور سگریٹ پھینک دیا۔ ڈاکٹر بیزنٹ نے ہماری بات چیت اتفاقاً سن کر جناح سے کہا:''کوئی بات نہیں' تم سگریٹ پیئو۔'' جناح نے کہا۔''نہیں! ڈاکٹر بیزنٹ نہیں! کانجی اخلاقی طور پر بالکل درست ہیں۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔'' مسٹر کانجی دوارکا داس کے خط کا آخری جملہ بہت دلچسپ و بصیرت

افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''کم ازکم مسٹر جناح جیسے بے باک' بلند کردار والے ایک ہندوستانی میں اتنی جرأت و دیانتداری تھی کہ وہ برطانوی وائسرائے ہند (لارڈ لنلتھگو) کو برملا کہہ سکا کہ وہ اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے جبکہ دوسرے ہندوستانی رہنما بالخصوص مہاتما گاندھی اور کانگریس کا اقتدار اعلیٰ وائسرائے کو یہ کہہ کر ''معزز ترین شریف انگریز''، ''بہترین عیسائی'' رطب اللسان ہوتے تھے۔ میں مسٹر جناح سے پہلی مرتبہ جون 1916ء میں اور آخری مرتبہ دسمبر 1946ء میں ملا۔ اس تیس سالہ گہری دوستی کے دوران باوجودیکہ مَیں عمر میں کم اور سیاسی اعتبار سے پیچھے تھا لیکن وہ ہمیشہ مہربانی' دوستانہ اخلاص اور التفات سے پیش آئے۔

مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈووکیٹ جو بہادر یار جنگ کی اچانک رحلت کے بعد انجمن اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے اور تقریباً دو سال تک اپنے عہدہ پر فائز رہے' عدم اعتماد کی تجویز پاس ہوجانے کے بعد علیحدہ کردیے گئے تھے کیونکہ مجلس عاملہ (1) ان کی پالیسی کو جماعت اور ملک کے لئے نقصان دہ سمجھتی تھی اور (2) وہ سرمرزا اسماعیل کی تقرری کے حامی تھے۔ ان کی علیحدگی کے بعد ایک کامل بزرگ جو اسم بامسمّیٰ تھے یعنی جن کا نام نامی مظہر علی کامل تھا' وہ اپنی جماعت کے اعتماد کلی کے ساتھ چھ مہینے سے صدارت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔ یامین زبیری صاحب جنہوں نے بہادر یار جنگ کے وسیع دل کے ایک گوشہ میں اپنے خلوص اور خدمت کی وجہ سے جگہ محفوظ کرلی تھی' بہادر یار جنگ کی حینِ حیات سے مسلسل اعزازی سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ مجلس اتحاد المسلمین کی خوش نصیبی تھی کہ متعدد مخلص سرگرم کارکن بحیثیت ایک منظم ٹیم کے خدمت کررہے تھے جن میں سے چند مولانا مناظر احسن گیلانی' مولوی ابوالحسن سید علی' نور اللہ حسینی افتخاری' مولوی احمد عبداللہ صاحب المسدوسی' محمد اعظم صاحب' کلیم الدین انصاری صاحب' عبدالرؤف صاحب' بدر شکیب صاحب' سید محمد احسن صاحب' خان بہادر علاؤ الدین صاحب' سید محمود علی ہاشمی صاحب' سید قاسم رضوی صاحب اور اکرام اللہ

صاحب وغیرہ وغیرہ ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ یہ تمام بزرگ نواب بہادر کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے اور انہیں ان کی قربت اور رفیق کار ہونے کی سعادت حاصل تھی۔ الحاصل، حیدرآباد میں سب کچھ جیسے کا ویسا تھا لیکن نواب بہادر نہیں تھے اور یہ خلا اتنا بڑا تھا جسے کوئی بھی پُر نہ کر سکا۔

قائداعظمؒ کے دورانِ قیام کا پروگرام بڑی دوراندیشی سے مرتب کیا گیا۔ کوشش کی گئی کہ ان کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے کیونکہ ان کا دوبارہ حیدرآباد آنا بہت مشکل تھا اور یہ ہی ہوکر رہا۔ دو جلسۂ عام، ایک دارالسلام اور دوسرا سکندرآباد میں منعقد کیا گیا۔ دوسرے جلسے میں قاضی محمد عیسیٰ جو سکندرآباد میں اپنے بھائی قاضی محمد اسماعیل (ڈکن ایئرویز) سے ملنے آئے تھے، شریک ہوئے۔ ہر دو جلسوں میں قائداعظمؒ نے تاکید کی کہ امن و امان برقرار رکھتے ہوئے اپنے مطالبات منوانے کے لئے آئینی جدوجہد جاری رکھیں۔ اس پر مسلمانوں نے عمل کیا اور چھ مہینہ کے عرصے میں سر مرزا اسماعیل کو حیدرآباد سے چلا جانا پڑا اور نواب صاحب چھتاری دوبارہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ دوران قیام جمعہ کے دن قائداعظمؒ نے مکہ مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد مولوی تقی الدین صاحب کے گھر ظہرانہ میں جو ان کے اعزاز میں دیا گیا تھا، شریک ہوئے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بھی شریک تھے۔ مجلس کی طرف سے ایک بڑا شاندار عصرانہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

قائداعظمؒ تعزیت کے لئے ''بیت الامت'' گئے۔ خاکسار بھی ہمرکاب تھا۔ وہاں ہر طرف اداسی ہی اداسی تھی۔ در و دیوار گریاں تھے کہ قائداعظمؒ کو خوش آمدید کہنے (نواب بہادر یار جنگ) موجود نہیں ہیں۔ اس موقعہ پر خویش و اقارب غمزدہ تھے کیونکہ ان کا غم عود کر آیا تھا۔ اس غمگین فضا میں اَور جتنے لوگ موجود تھے، سب کے سب ملول خاطر نظر آتے تھے۔ قائداعظمؒ کا مغموم چہرہ بھی غمازی کر رہا تھا۔ کیوں نہ ہو، جب نواب بہادر یار جنگ کی اچانک وفات کی ہوش ربا خبر ملی تھی تو آپ نے تڑپ کر فرمایا تھا: ''نواب بہادر یار جنگ میرے عزیز دوست تھے اور ان

کی موت میرے لئے ایک جانگداز صدمہ ہے۔نواب مرحوم مومن صادق تھے اور اسلام کے بہت بڑے داعی۔ اُنہوں نے اسلام اور مسلمانانِ ہند کی زرّیں خدمات انجام دیں۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ وہ ہمارے لئے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھے۔''یقین کیجئے کہ قدرت کے اس بیش بہا عطیہ کو قائداعظمؒ نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ ان کی عدم موجودگی کے احساس سے ہر ہر قدم پر ان کو زیادہ یاد کرتے تھے۔

میں اپنے دلِ حزیں کو کچھ سکون پہنچانے کے لئے شہرِ خموشاں کی طرف جہاں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں، چل کھڑا ہوا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاف ستھرا، سادگی میں یکتا، گنبد آرائشی پچی کاری سے بے نیاز، پُر جلال وشوکت ہیئت میں سامنے موجود ہے۔ قریب پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ ہر چار سو روحانیت ہی روحانیت بکھری ہوئی ہے۔ آنکھوں کے پردوں پر مجاہد اعظم سلطان شہید حضرت ٹیپو سلطان کے مزار کا منظر اُبھر آیا جہاں میں حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب کے ساتھ جنوبی ہند کے دورہ کے موقعہ پر سرنگا پٹم فاتحہ خوانی کے لئے گیا تھا۔ وہاں بھی یہی روحانی کیفیت طاری وساری تھی کیونکہ سلطان شہید نے بھی اپنی جانِ عزیز اسلام کی سربلندی اور حق کا بول بالا کرنے کے لئے دی تھی۔ محمد بہادر خاں شیر دل مجاہد جن کے ادنیٰ سے اشارے پر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان سربکف ہوجاتے، منوں مٹی تلے آرام فرما رہے تھے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

(اقبالؔ)

جب میں نے اپنے تڑپتے اور دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پایا تو مزار کے ایک گوشہ میں ایک ننھی سی قبر پر نظر پڑی جس کا تعویذ قبر سے جدا ہوکر کٹہرے کی جالی میں الجھا پڑا تھا۔ اس تعویذ میں گھڑی نما سنگِ مرمر پر لکھا تھا:''نواب بہادر یار جنگ کی اُمیدوں کی ناشگفتہ کلی۔'' یہ ہی ایک بچی ماں اور باپ کی نورِ نظر اور لختِ جگر تھی۔ اب بیگم بہادر یار جنگ ظاہراً تنہا ہیں اور ان کا شغلِ

زندگی شوہر کی یاد میں اشک فشانی اور قرآن خوانی ہے لیکن میرا ایقان ہے کہ وہ اس سوگ میں تنہا نہیں ہیں کیونکہ قوم نے بہادر یار جنگ کو فراموش نہیں کیا ہے اور ان کی یادوں میں وہ زندہ ہیں۔ مانیے گا کہ جب کبھی نواب بہادر یار جنگ کا ذکر خیر ہوتا ہے تو پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اور دل میں درد ہونے لگتا ہے اور شدت کے ساتھ اس امر کا احساس ہونے لگتا ہے کہ کاش آج وہ اس دورِ ابتلا اور انتشار میں ہماری قیادت کے لئے موجود ہوتے لیکن حیف صد حیف' وہ اتنی مختصر سی زندگی لے کر آئے تھے کہ آنکھ جھپکتے ہی ان کی زندگی کے دن بیت گئے۔ جن لوگوں کو ان کی قربت کا شرف حاصل رہا ہے' وہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اس قلیل عرصہ میں مذہب' ملک اور قوم کی لافانی خدمات انجام دی ہیں۔ بظاہر وہ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے جس کا صدر دفتر ناگپور میں تھا' صدر تھے لیکن ان کا دائرہِ خدمت بہت وسیع تھا جس میں بلاشک برطانوی ہند بھی شامل تھا کیونکہ انکا ایمان تھا کہ ''ملک خدا ملک ما است۔'' وہ ناگپور اَن گنت بار تشریف لائے اور اس لئے وہ اسے حیدرآباد کے بعد اپنا دوسرا وطن کہتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ کی اُن بیش بہا خدمات کو جو انہوں نے حصول پاکستان کے سلسلے میں سرانجام دیں' اس چھوٹی سی کتاب میں بیان کرنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے برابر ہے۔ انہوں نے اپنی تمام علمی' ذہنی اور لسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس مقصد اعلیٰ یعنی قیامِ پاکستان کو جسے وہ مسلمانانِ ہند کی بقا کا واحد حل سمجھتے تھے' اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ اس کی خاطر انہوں نے تمام ہندوستان کی خاک چھانی۔ اپنی سحر بیانی اور زورِ خطابات سے مسلمانانِ ہند کے دل گرمائے اور ان کے جوشِ ایمانی کو جھنجوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے ہمیشہ ''لسان الامت'' ہونے کا ثبوت دیتے رہتے لیکن قرارداد لاہور یعنی عرف عام میں تجویز پاکستان کے پیش ہونے کے موقعہ پر اور دلی کے رام لیلیٰ گراؤنڈ کی تقریریں ایسی معرکتہ الآراء تھیں کہ اسلامی مملکت پاکستان کا عالم وجود میں آنا یقینی ہو گیا تھا۔ لاہور میں حکومتِ سرسکندر حیات خاں کی خاکساروں سے خونیں جھڑپ' دوسری ہولناک جنگ عظیم کی وجہ سے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی سخت مخالفت کے پیش نظر اگر آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس نہ ہوتا تو خدارا بتلایئے آج پاکستان

کہاں ہوتا۔ انہوں نے ہی اس آڑے وقت میں قائداعظمؒ کا ہاتھ بٹا کر پاکستان بنا دیا لیکن افسوس ہے کہ وہ پاکستان کی بہاریں دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہے۔ نواب بہادر یار جنگ دنیا میں آئے اور بہت جلدی منہ موڑ کر چلے گئے۔ ہر شخص نے یوں محسوس کیا کہ گلشن میں بادِ نو بہار پاؤں پھیری کے لئے آئی اور چلی گئی لیکن ہمارا ایمان ہے کہ جب تک یہ گلشن قائم ہے' ان کی مہک موجود رہے گی۔

دوسری تقریر کا بھی حال سن لیجئے۔ رات ڈھل چکی تھی۔ تھکے ہارے قائداعظمؒ نے دہلی کے اجلاس کے اختتام پر نواب بہادر کو جلسہ کو مخاطب کرنے کا کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے مائک کے سامنے آئے اور لوگوں کی ٹکٹکی بندھ گئی۔ قائداعظمؒ بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنی ٹھڈی رکھ کر متوجہ ہو گئے یہاں تک کہ فجر کی نماز کا مؤذن نے آواز بلند بلوا دیا۔ اس وقت وہ قائداعظمؒ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے کہ ''حصولِ پاکستان کے لئے آپ کی زندگی از بسکہ ضروری ہے۔'' پھر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ دست بدعا ہوئے کہ ''الٰہی میری زندگی کے جتنے دن' مہینہ اور برس باقی ہوں' وہ میرے بوڑھے قائد کی عمر میں بڑھا دیے جائیں۔'' مشاہدہ شاہد ہے کہ نواب بہادر یار جنگ کو دو ہستیوں سے والہانہ عقیدت اور بے اندازہ محبت تھی۔ پہلے ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے جن کے کلام کو وہ بڑے مزے لے لے کر اور جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور دوسرے قائداعظمؒ تھے جن کے سامنے وہ زانوئے ادب تہہ کر کے درسِ سیاست لیا کرتے تھے۔

ان کا رنج وغم پوری ملت کا رنج وغم ہے۔ زاہد حسین صاحب وزیر خزانہ اور ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی قیام گاہ پر قائداعظمؒ کو ظہرانہ پر مدعو کیا۔ یہ بہت مخصوص نشست تھی۔ دونوں میزبانوں کے علاوہ ان کے ایک پرانے پنجابی عیسائی دوست جنہوں نے امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی' دعوت میں شریک تھے۔ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے بھی اس نجی محفل میں شریک کر کے عزت دی۔ قائداعظمؒ اور میں ڈیڑھ بجے کے قریب دعوت میں پہنچے اور علیک سلیک کے بعد کھانے کی میز پر گئے۔ باوجود گونا گوں مصروفیات کے قائداعظمؒ اس دن خاص طور پر ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ دورانِ گفتگو امریکی مہمان نے کانگریسی ہندوؤں کی دلیل کا ذکر کیا

جو پاکستان کے قیام کی مخالفت میں پیش کی جاتی تھی یعنی پاکستان اپنی زبوں مالی حالت کے پیش نظر ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکے گا۔ یہ بات سنتے سنتے ہم سب کے بھی کان بہرے ہوگئے تھے اور جواب دیتے دیتے زبان تھک گئی تھی لیکن آج تو قائداعظمؒ کی طبیعت بات چیت کے لئے بہت ہی موزوں تھی۔ ہم سب کی خوش بختی تھی کہ وہ اس موضوع کو اس طرح سمجھانے بیٹھ گئے جیسے ایک بہت بڑا وکیل اپنے کیس کی کامیابی کی خاطر جج کے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر دلیل پیش کرتا ہے۔ جج تو کبھی کبھار وکیل کو لقمہ دیتے ہیں یا کسی نکتہ کی وضاحت طلب کرتے ہیں لیکن یہاں تو ایک نرالا ہی سین تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلاس میں ایک قابل استاد اپنے ایک ہمہ تن گوش شاگرد کو سمجھا رہا ہے کہ پاکستان کسی کا دست نگر نہیں ہوگا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا رہے گا اور اس کی اقتصادی حالت بہت مضبوط ہوگی۔ سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ قدرت نے اس کی بقا اور استحکام کے لئے بہت سی نعمتوں کے علاوہ معدنی ذخائر بھی محفوظ کئے ہیں جو قیامِ پاکستان کے بعد دریافت کئے جائیں گے۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں ایک بہت بڑے اور اہم راز کا بھی انکشاف کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادیوں کا حال پتلا ہو رہا تھا اور ہٹلر کی فوجیں یوروپی ممالک پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر رہی تھیں اُس وقت موجودہ مغربی پاکستان کی حدود میں کسی نامعلوم مقام سے اس خوف کے پیش نظر کہ پٹرول کی رسد قائم نہیں رہ سکے گی' پٹرول نکالا اور استعمال کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون میں جو ماہِ نو 1950ء کی آخری اشاعت میں شائع ہوا تھا' کیا ہے۔ بقول قائداعظمؒ میرا پختہ یقین ہے کہ ہمارے ملک میں پٹرول موجود ہے اور حکم ربی سے وقت آنے پر پٹرول کی دریافت سے انشاءاللہ ہمارا ملک مالا مال ہوجائے گا۔ گفتگو نے کھانے کی میز پر اور بعد میں ورانڈے میں وہ طول کھینچا کہ میری دستی گھڑی نے جس پر میری اچانک نظر پڑی' ہشیار کیا کہ شام کے ساڑھے چار بجنے والے ہیں۔ قطعِ کلام کی معافی مانگتے ہوئے میں نے قائداعظمؒ سے عرض کیا کہ آدھ گھنٹہ کے بعد یعنی 5 بجے ''دارالسلام'' میں آپ کو ایک بہت بڑے جلسے کو مخاطب کرنا ہے۔ وہ فوراً کھڑے ہوگئے اور ذی عزت و مخلص میز بانوں کا شکریہ ادا کر کے ''خدا حافظ'' کہا۔

سروں کی گنتی

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

(اقبالؔ)

تاریخ ہند بتلاتی ہے کہ سمندر پار انگلستان کی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی مالکی کا قبالہ اپنے نام لکھوالیا تھا جو بعد میں حکومت برطانیہ کے نام منتقل ہوگیا۔اس کارروائی سے ہمارے لئے تو کوئی فرق نہیں ہوا سوائے اس کے کہ ہم بجائے کمپنی کے غلام کہلانے کے انگلستان کے تخت وتاج کے غلام ہوگئے۔انگلستان کا نظامِ حکومت دنیا کے اور ملکوں سے بالکل نرالا تھا۔ وہاں ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت سریر آرائے سلطنت تھیں۔جس سیاسی پارٹی کا بس چل گیا اور جس کے ساتھ اکثریت ہوئی اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آ گئی اور بادشاہ بھی پابند ہوگیا۔تاریخ اس قاعدہ کلیہ کی تائید کرتی ہے کہ بادشاہ یا ملکہ اس ہی وقت گدّی سے ہٹتے جب حضرت عزرائیل ان کی روح قبض کر لیتے یا ایڈورڈ ہشتم کے جیسے بادشاہ حکومت یا ارکانِ پارلیمنٹ کی رائے کوٹھکرا کر اپنی مرضی کی شادی کرنے کے لئے اپنے تاج کواتار پھینکتے اور تخت کو چھوڑ دیتے۔انگلستان میں اس عجیب وغریب بادشاہت وجمہوریت کا امتزاج صدیوں سے قائم ہے اور اس قدیم روایت پر انگریز قوم فخر کرتی ہے۔

جب ہماری غلامی کا طوق اُتار پھینکنے کا وقت قریب آیا تو ہمارے قائداعظمؒ نے محسوس کیا کہ کہیں ہمارے کندھوں پر ہندوؤں کی غلامی کا جوا نہ رکھ دیا جائے جس کے لئے ہندو اور

کانگریس عرصہ سے یہ اعلان کر کے کہ ہندو اور مسلم ایک قوم ہیں اور کانگریس سب کی نمائندہ جماعت ہے، کوشاں تھے۔ مسلمانوں کی بدنصیبی تھی کہ ہمارے حاکم اور انگریز قوم ہندوستان میں دوقوم کے نظریہ کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی لیکن حکومت 1909ء میں مسلمانانِ ہند کے لئے جداگانہ انتخاب قبول کر کے سخت مخمصے میں مبتلا ہوگئی تھی اور وہ اس چھچھوندر کو نہ نگل اور نہ اُگل سکتی تھی۔ سب سے پہلے سرسید احمد خانؒ نے اور بعد میں ان کے رفقاء کار نے مسلمانوں کے اس پیدائشی حق کو انگریزوں سے تسلیم کرا کر حقیقی معنوں میں اُس پاکستان کی داغ بیل ڈال دی تھی جو اکتالیس سال کے بعد دُنیا کے نقشہ پر اُبھرا۔ غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق نہ ملا ہوتا تو بتلائیے کہ کس بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر آپ تجزیہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دوقوموں کا نظریہ اُس دن غیر دانستہ طور پر قبول کرلیا گیا جس دن مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا۔ اگر انگریز ہندو اور مسلمانوں کے لئے مخلوط انتخاب طے کر دیتے اور مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ان کے لئے چند نشستیں مخصوص کر دیتے تب بھی میری حقیر رائے میں دوقومی نظریہ کا اعتراف ہوتا لیکن پاکستان کے مطالبہ کے وقت اس میں بے شمار دقتیں پیدا ہوسکتی تھیں۔ بہرحال اب اس غیر ضروری بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے قائداعظمؒ جو ایک بڑے نکتہ دان اور نکتہ رس تھے، اس بنیادی مذہبی نکتہ کو لے کر کھڑے ہو گئے جس کی ذیلی چیزیں زبان کلچر وغیرہ تھیں۔ آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے اس مرکزی نظریہ کو ہندوؤں اور انگریزوں سے منوانے کے لئے ایک مقدس فریضہ سمجھ کر شب و روز کوشش کی۔ ضمنی انتخابات اس اصول کے تحت کامیابی کے ساتھ لڑے گئے لیکن کانگریس نے ہٹ دھرمی اور ضد میں اس حقیقت کو ماننے سے انکار کردیا۔ بہرحال اس بیسویں صدی میں یہ بال ہٹ کب تک چلتی۔ مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات لابدی تھے اور کب تک توسیع دی جاتی۔ جنگ عظیم بھی ہٹلر و مسولینی کی شکست فاش اور ان کی جبری موت اور ہیروشیما کی تباہی کے بعد ختم ہوچکی تھی۔ ان حالات میں قانون ساز جماعتوں کی مدت میں مزید توسیع دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لئے انتخابات کی

تاریخوں کا اعلان ہوا۔ قائداعظمؒ نے اپنے دعوے کو آخری مرتبہ دھرایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا ثبوت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلم نشستوں کے لئے مسلم لیگیوں کو نامزد کر کے اور انہیں انتخاب میں کامیاب کر کے دے گی۔ درحقیقت یہ سیاسی جنگ تھی جس کی کامیابی یا شکست پر دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی آزادی یا غلامی کا انحصار تھا۔ اس جنگ کا فیصلہ تیغ و تفنگ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے سروں کی گنتی سے ہونے والا تھا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قائداعظمؒ کی زبردست قیادت میں مسلم قوم اللہ کے فضل سے بغیر کسی اسلحہ کے پوری طرح منظم ہو چکی تھی اور ان کے ادنیٰ سے اشارۂ ابرو پر ہر وقت قربان ہونے کے لئے تیار تھی۔ قائداعظمؒ کا مسلکِ زندگی آئینی جدوجہد رہا ہے۔ انہیں کسی بھی طرح کا مضرت رساں یا ہلاکت آفریں تصادم ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ان کا ہر قدم آئینی و پرامن ہوتا تھا۔ ان کا جہاد بالسیف نہیں بلکہ بالدماغ و بالقلم تھا۔ کئی طاقتور مخالف جماعتوں کا مقابلہ اپنی قلیل التعداد جماعت سے اس ہی طرح کیا جا سکتا تھا۔

اُنہوں نے قوم سے اپیل کی کہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دو اور ہر اس مسلم لیگی امیدوار کو جسے ٹکٹ دیا گیا ہے، منتخب کر کے ثابت کر دو کہ صرف مسلم لیگ مسلمانوں کی واحدہ نمائندہ جماعت ہے۔ تم اُمیدوار کو مت دیکھو۔ اگر تمہیں لیمپ پوسٹ کو رائے دینے کے لئے کہا جائے تو بغیر پس و پیش کے حکم کی تعمیل کرو۔ مسلمانان ہند بھی اس تاریخی انتخاب کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ قومی مسئلہ ہے۔ اس میں انفرادیت، صوبائیت، ذاتی نفع و نقصان کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر چند افراد کے بھینٹ دینے سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس کا مستقبل سنور جاتا ہے تو یہ قربانی ہمیں بخندہ پیشانی قبول ہے۔ آج بھی اس ہی جذبہ کے تحت مسلمانان بھارت محض ہمارے لئے اپنی عزت، مال و جان دے کر بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں اور معلوم نہیں ہماری خوشحالی اور بقا کے لئے وہ کب تک اس مستقل مصیبت اور مسلسل صبر آزما

حالت میں مبتلا رہیں گے۔

یہ معرکتہ الآ را انتخاب عام انتخابات کی طرح نہیں تھا اور اس کی نوعیت بالکل جدا تھی۔ اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے کوئی انتخابی منشور جاری نہیں کیا اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ متنازعہ فیہ مسئلہ اور تنقیح طلب امور صرف دو تھے جن کا فیصلہ اس انتخاب سے ہونے والا تھا کہ مسلمانانِ ہند ایک مستقل بالذات قوم ہیں اور دوسرا یہ کہ قیامِ پاکستان کا متفقہ مطالبہ ہے جسے وہ حاصل کئے بغیر چین نہیں لیں گے۔ مسلمان اس ضمن میں اس امر سے بھی بخوبی واقف تھے کہ مسلم لیگ کی طاقت اور استحکام سے ہی مسلمانانِ ہند اور اسلام کو فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ ان نیک اور دوررس نتائج کی توقعات کو لے کر مسلمان آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے انتخابی مہم سر کرنے عزم واستقلال کے ساتھ جمع ہو گئے۔

صوبائی و مرکزی پارلیمانی بورڈ مقرر کئے گئے تاکہ موزوں آدمیوں کو درخواست کنند گان میں سے چن کر مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے۔ خارج کردہ اُمیدواروں کو حق اپیل بھی دیا گیا تھا لیکن امیدواروں کی درخواست کے ساتھ ایک حلفیہ تحریر لے لی گئی تھی کہ ٹکٹ نہ ملنے کی صورت میں درخواست گزار مسلم لیگ کے منتخب کردہ امیدوار کے خلاف کھڑا نہیں ہوگا بلکہ اسے کامیاب کرنے میں ہر طرح کی مدد دے گا۔ مرکزی اسمبلی اور بعد میں صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب ہوا۔ میں اپنے نیک، مخلص اور غیور دوست عبدالواحد قریشی رکن دہلی مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی کتاب ''تاریخی فیصلہ'' سے شکریہ کے ساتھ استفادہ کر کے انتخابی نتائج پر روشنی ڈالوں گا۔ کسی جگہ مرکزی اسمبلی کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ اس کے ایک سو بیالیس ممبر ہوتے تھے جس میں جداگانہ انتخاب کی رو سے مسلمانوں کی تیس نشستیں ہوتی تھیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے مرکزی اسمبلی کی کل مسلم نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں جن میں سے آٹھ نشستیں ایسی تھیں جو بلا مقابلہ ہاتھ آئیں۔

واقعہ تاریخی ہے اور اس کا بہت قریبی تعلق دو اہم چوٹی کے انتخابات سے ہے جن کے متعلق آگے چل کر کچھ عرض کیا جائے گا۔ سب سے پہلے مرکزی اسمبلی میں سی پی و برار مسلم لیگی

امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوا اور اس طرح مسلم لیگ کو پہلی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بسم اللہ ایسی اچھی ہوئی کہ قائداعظمؒ بہت خوش ہوئے اور صوبائی مسلم لیگ اور امیدوار کو برقیہ بھیج کر مبارکباد دی۔ اس سلسلے میں بہت سے مکتوب موصول ہوئے لیکن ایک کرم نامہ خاص طور سے زیب ورق کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ اس بیسویں صدی کی ایک مایۂ نازہستی کا شہ پارہ ہے جو صرف نام ہی کا نہیں بلکہ اقلیم ادب کا بھی شاہ تھا۔ اس تاریخی تبریک نامہ کو تبرکاً پیش کر رہا ہوں۔

چوٹی کے دو انتخابات جن کا میں اشارہ کر چکا ہوں' وہ قائداعظمؒ صدر آل انڈیا مسلم لیگ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے انتخابات تھے۔ قائداعظمؒ کا انتخاب تو یوں سمجھئے کہ حسب ماسبق بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ تو انتخاب سے بے نیاز دہلی میں مسلم لیگ کے ضروری کاموں میں مستغرق رہے اور اس کے بعد صوبۂ سرحد تشریف لے گئے جہاں کے شاہانہ جلوس کا میں کسی جگہ ذکر کر چکا ہوں۔ اُدھر بمبئی شہری حلقہ سے قائداعظمؒ کے خلاف شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے ٹکٹ پر حسین بھائی لالجی مقابلہ کر رہے تھے۔ دراصل شیعہ پولیٹیکل کانفرنس حسین بھائی لالجی کی خانہ ساز جماعت تھی' اس لئے اس کا دائرہ محدود تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی حلقۂ انتخاب میں ایک سے زیادہ امیدوار ہوں تو انتخاب کے قواعد کے مطابق رائے دینا اور رائے شماری کے ضابطہ کی خانہ پری لازمی ہوتی ہے۔ اس لئے بمبئی کے مایۂ ناز' ہمدرد ینی نوع انسان اور متمول تاجر بیگ محمد صاحب' ان کے صاحبزادگان اور بالخصوص حسین بیگ محمد صاحب قائداعظمؒ کی انتخابی مہم کے پہلے کی طرح انچارج تھے اور ان کے بیشمار مددگار شب و روز دوڑ دھوپ کر کے انتخابی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ ان بہی خواہوں میں سے سیٹھ محمد علی منہار' ان کا خاندان' خان بہادر حاجی حسن علی ابراہیم پیر بھائی' مسٹر حسن اے' شیخ سیٹھ فخر الدین ولیکا اور ان کا خاندان اور میرے محترم اور مخلص دوست سالار صوبہ سید ہاشم علی انعام دار بمعہ مسلم نیشنل گارڈز و مسلم طلبہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر این اے فاروقی آئی سی ایس بمبئی کے اس علاقے کے کلکٹر تھے جہاں قائداعظمؒ کا انتخاب ہونے والا تھا۔

میں قائداعظمؒ کوصوبہ سرحد مسلم لیگ کانفرنس کے اختتام پر پشاور میں چھوڑ کر بمبئی پہنچا اوران کے انتخاب میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کی۔ یہ انتخاب عجیب وغریب تھے کہ اُمیدوار شروع سے آخر تک غیر حاضر رہا لیکن شاندار کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ قسمت کا لکھا تھا کہ حسین بھائی لالجی کو شکست فاش ہوگی جو ہوکر رہی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ساتھ اپنی ضمانت بھی ضبط کرائی۔ قائداعظمؒ کی مخالفت تو انہوں نے للّہی بغض کی وجہ سے کی تھی جیسا کہ اُنہوں نے علانیہ کہا تھا کہ وہ قائداعظمؒ کو بلا مقابلہ منتخب نہیں ہونے دیں گے۔

پونہ کے مسلم رائے دہندگان بھی قابل صد آفریں ہیں کہ انہوں نے حسین بھائی لالجی کو قائداعظمؒ کے ساتھ گستاخی کرنے کا دوبارہ خوب مزہ چکھایا۔ انہوں نے ہمارے عزیز دوست احمد ابراہیم ہارون جعفر صاحب کو پونہ سے کامیاب کرا کر حسین بھائی لالجی کی دوبارہ ضمانت ضبط کرائی اور ہندوستان اور غیر ملکوں میں انہیں رسوا کیا۔ بانی پاکستان کی شخصیت اتنی بلند، ان کی ہر دلعزیزی اتنی ہمہ گیر اور ان کی خدمات اتنی جلیلہ تھیں کہ کسی بھی مسلمان کا اپنی کم ظرفی دکھلا کر ان سے ٹکر لینا ایسا ہی تھا جیسے کوئی اپنے گلے میں اپنے ہاتھوں سے پھندا ڈال کر خودکشی کر لے۔

دوسرا نوابزادہ صاحب کا بڑا بانی کا انتخابی مقابلہ تھا۔ ایک تو وہ مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور دوسرے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس طرح مسلم لیگ کا وقار سخت خطرہ میں تھا۔ مرد مقابل مولوی محمد احمد کاظمی صاحب ایک پرانے خلافتی، مسلم قوم پرست اور بہت بااثر کانگریسی لیڈر تھے۔ مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے رُکن سہارن پور کے رئیس اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب وکیل ہونے کی وجہ سے ان کے حلقۂ انتخاب کے لوگ انہیں خوب جانتے تھے اور ان کی خدمات سے اچھی طرح واقف تھے۔ نوابزادہ کے لئے یہ حلقۂ انتخاب نیا تھا چونکہ اس نشست کے لئے مسلم لیگ کے پاس سوائے نوابزادہ صاحب کے اور کوئی دوسرا ایسا ہر دلعزیز آدمی میسر نہیں تھا جو بھاری اخراجات کا بوجھ اُٹھا کر اتنے بڑے کانگریسی کے خلاف کامیابی کے ساتھ انتخاب لڑ سکے۔ اللہ کی مہربانی سے جیسا کہ

آپ جانتے ہیں میں بلا مقابلہ منتخب ہو چکا تھا۔ اس لئے میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ میں اور نواب اسماعیل خاں صاحب نواب زادہ کے ساتھ ان کے انتخابی دورہ پر روانہ ہوئے۔ جوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں بڑے خلوص اور جاں فشانی کے ساتھ ہم نے دیکھا کہ رائے طلبی کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلباء کا تو کیا کہنا' وہ اپنی کالی شیروانیاں پہنے' سر پر جناح ٹوپی اوڑھے ہوئے ٹڈی دَل کی طرح آتے' مخالف کیمپ کو خرد برد کر کے بسیرا کرنے کہیں اور چلے جاتے۔ انہیں نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کی اس اپیل کا بھی پاس تھا جو انہوں نے 24 ستمبر 1945ء کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کو مخاطب کر کے کی تھی اور فرمایا تھا: ''تمہیں اور ہندوستان کے تمام مسلم طلباء کو مسلم لیگ کے انتخابات میں مدد کرنے کے لئے اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکل آنا چاہئے۔ تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آنے والے انتخابات میں کامیابی یا ناکامی مسلمانانِ ہند کی زیست یا موت کا باعث بنے گی۔ اگر تمہارا مستقبل تاریک یا المناک ہو تو تمہاری ڈگریاں کس مصرف کی ہوں گی۔ میں تم سے مطالبہ کرتا ہوں کہ آگے بڑھ کر انتخابات میں ہماری مدد کرو۔'' ان کا خلوص اور ان کی انتھک کوششیں قابل دید تھیں۔ اس انتخاب کو تو وہ اپنا ذاتی انتخاب سمجھتے تھے کیونکہ ان کی مادر درسگاہ کا ایک سابق ممتاز طالب علم اور آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری امیدوار تھا اور وہ اس کی حمایت میں رات دن کوشاں تھے۔ اس ہی انتخاب میں قاری زاہر قاسمی صاحب سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ پہلی مرتبہ دہلی میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے دہرہ دون اور سہارنپور کے جلسوں میں تلاوت کلام پاک کر کے سیاسی فضا کو ہموار کیا۔ اس دورہ میں ایک اور میرے لئے سعادت بخش موقعہ ہاتھ لگا جب ہم لوگ فاتحہ کے لئے کلیئر شریف گئے جہاں ''پیا صابری'' حضرت علاؤالدین صابرؒ استراحت فرماتے ہیں۔ نواب اسماعیل خاں صاحب اور نوابزادہ صاحب کی آمد کا سن کر قوالوں کی چوکیاں آ گئیں اور قوالی شروع ہو گئی۔ ہم تینوں نے اپنے اوپر نیچے کے جیب ٹٹولنا شروع کئے لیکن افسوس

ہے کہ وہ بالکل خالی تھے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ تھوڑی دیر قبل ہمارے مذہبی رہنما مولٰینا عبدالحامد صاحب بدایونی جونوابزادہ صاحب کے لئے اپنے مواعظِ حسنہ سے انتخاب لڑ رہے تھے' تشریف لائے۔ آپ جانتے ہیں کہ انکا روحانی اور قلبی تعلق حضرت پیرانِ پیر دستگیرؒ سے ہے۔ چنانچہ اس ہی مناسبت سے انہوں نے اپنے جبہ کے بڑے جیب سے نوٹ نکال نکال کر ہماری دستگیری کی جس سے ہم قوالوں کو نذرانہ پیش کر سکے۔ الحاصل' نوابزادہ صاحب بھی اللہ کی مہربانی سے اس معرکتہ الآراء انتخاب میں تقریباً دو ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرکزی اسمبلی میں اللہ نے مسلم لیگ کو سو فیصدی کامیابی عطا کی اور مسلم لیگ کے اُمیدواروں کو ایک لاکھ ترانوے ہزار سات سو ستاسی (1,93,787) ووٹ ملے جس کی اوسط ستاسی (87) فیصد ہوتی ہے۔

ہندوستان کے ایوانِ زیریں میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی سے صوبائی انتخابات پر بہت اچھا اثر پڑا۔ ویسے تو بہت سی نئی اور پرانی مسلم جماعتیں جن میں سے چند کو کانگریس اور کانگریسی سرمایہ داروں کی مالی امداد مسلم لیگ کو نیچا دکھانے اور اس کی مسلم نمائندگی کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کیلئے حاصل تھی' میدان میں آ گئیں۔ ایسی کل انیس مخالف جماعتیں تھیں جنہوں نے مسلم نشستوں کے لئے ٹکٹ دیے اور اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کو ان تمام جماعتوں سے نمٹنا پڑا۔ ان جماعتوں کے نام بھی سن لیجئے:۔

1- کانگریس 2- قوم پرست 3- جمعیت العلماء 4- مجلس احرارا 5- کرشک پرجا (بنگال) 6- یونینسٹ 7- آزاد امیدواران 8- سید گروپ 9- مومن کانفرنس 10- خاکسار 11- مسلم مجلس (مدراس) 12- امارت پارٹی (بنگال) 13- مسلم پارلیمنٹری بورڈ (بنگال) 14- سنی بورڈ (یو پی) 15- کمیونسٹ پارٹی 16- شیعہ بورڈ (یُوپی) 17- ریڈیکل ڈیموکرٹیک (بنگال) 18- شیعہ پولیٹیکل کانفرنس اور 20- پرجا (آسام)۔ چونکہ صوبائی

اسمبلیوں کے رائے دہندگان کوحق رائے دہندگی وسیع پیمانہ پر حاصل تھا' اس لئے صوبائی رائے دہندگان بمقابلہ مرکزی رائے دہندگان کثیر تعداد میں تھے۔مرکزی اور صوبائی مسلم رائے دہندگان کی جملہ تعداد باسٹھ لاکھ اکیانوے ہزار چار سو دو(62,91,402) تھی جنہوں نے تمام ہندوستان میں ووٹ ڈالے۔صوبائی انتخابات میں تو بڑی گہما گہمی رہی کیونکہ مسلم لیگ کے اُمیدواروں کو انیس جماعتیں نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔قائداعظمؒ اوران کی قوم حق پر تھی۔ وہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے پرامن آئینی جہاد کررہے تھے۔علاوہ ازیں ان کے سروں پر اللہ کا ہاتھ تھااور بزرگوں کی دعائیں شامل حال تھیں۔اس لئے ہماری فتح یقینی تھی۔

دورانِ صوبائی انتخابات دو ایک بہت اہم اور تاریخی واقعات رونما ہوئے جن کا ذکر اس کتاب میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ناظرین اس سے لطف اندوز ہوں گے۔صوبۂ سندھ میں باہمی اورنظریاتی اختلافات کی بنا پر بدنصیبی سے دولیگیں عین انتخاب کے زمانہ میں ہوگئی تھیں۔ایک لیگ پر' اپنی رائے کے دھنی اور دُھن کے پکے رہنما جی ایم سید صاحب جن سے مجھے بہت ہی قریبی رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے' قابض تھے۔ان کی اس حرکت کو ہمارے اقتدار اعلیٰ نے غیرآئینی قرار دے کر قابل تادیبی کارروائی سمجھا تھا۔ دوسری لیگ یعنی اصل لیگ کے صدر حاجی محمد ہاشم صاحب گزدر تھے اور باوجود ہارون برادران کی حمایت کے اس لیگ کا پلہ ہلکا تھا۔ جی ایم سید صاحب کی مقبولیت اور طاقت ایسی اثر انداز تھی کہ وہ نیپیئر روڈ میں حاجی سرعبداللہ ہارون بلڈنگ میں صوبائی مسلم لیگ کے دفتر پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے جس کی وجہ سے مسلم لیگ کے وقار کوٹھیس لگنے کے علاوہ گزدر صاحب کے پاس دفتر اورریکارڈ نہ ہونے سے بھی انتخابی مہم کا کام سرد پڑ رہا تھا۔قائداعظمؒ نے مجھے حکم دیا کہ کراچی جاکر دفتر کا قبضہ لوں اورانتخابی مہم میں گرمی پیدا کروں۔قبضہ لینے کا کام تو سخت مشکل تھا لیکن انتخابی مہم کا کام انتہائی آسان کیونکہ سندھ کے رہنے والوں کو قائداعظمؒ سے والہانہ عقیدت تھی اور مسلم لیگ کے ساتھ رشتہ جوڑ رکھا تھا۔میں کراچی پہنچنے کے بعد سالار اعلیٰ کا یونیفارم پہن کر تنہا صوبائی مسلم لیگ

کے دفتر گیا۔ معلوم ہوا کہ جی ایم سید صاحب دفتر میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کمرہ میں داخل ہوا۔ بہت پھرتی سے اپنے کھدر پوش لیڈر کو فوجی سلامی دی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بہت تپاک اور محبت سے ملے۔ بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں نے انہیں اطلاع دی کہ قائداعظمؒ کے حکم سے قبضہ لینے آیا ہوں۔ فرمایا ایک کرسی اور میز رکھوا دیتا ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی تم بھی میرے ساتھ دفتر میں بیٹھو۔ میں نے کہا گستاخی معاف ''دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند''، لیکن اہل سادات ہونے کی وجہ سے آپ پر روشن ہے کہ ''دہ درویش در گلیمے می خسپند۔'' فرمایا ''ایسا ہے؟'' میں نے جواب دیا ''مجبور ہوں۔'' اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمال شفقت سے معانقہ کر کے خدا حافظ کہا اور چل دیے۔ میری نظر میز کی کھلی دراز پر پڑی۔ اس میں ایک پرس بڑی قیمت کے نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ میں نے فوراً ان کا تعاقب کر کے ان کی امانت ان کو پہنچا دی۔ وہ بہت ہنسے اور دوبارہ علیک سلیک کے بعد روانہ ہوگئے۔ آپ نے دیکھا کہ پرانے زمانہ میں باوجود شدید اختلافات کے ایک دوسرے کے ساتھ شریفانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا اور ایک دوسرے کی پگڑی نہیں اُچھالی جاتی تھی۔

میں قائم مقام صدر جناب حاجی محمد ہاشم گزدر صاحب کا بھی وہ تاریخی خط جو انہوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا' درج کتاب کر رہا ہوں۔ اس خط کو میں تبرک سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ایک مخلص بزرگ اور سچے مسلم لیگی رہنما کا تحریر کردہ ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت یا سیاسی جماعت ان کو کسی بھی قیمت پر نہ خرید سکی۔ وہ ہمیشہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے وفادار رہے۔ اللہ ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ آمین

صوبہ ممالک متوسط و برار کی انتخابی مہم کو کامیاب کرنے کے لئے قائداعظمؒ نے اپنی مجلس عاملہ کے دو ممتاز اور سرگرم اراکین کو سی پی بھیجا تھا۔ جناب سید حسین امام صاحب معہ اپنی خاندانی و پارلیمانی روایات کے ایک مختصر سے دورہ پر تشریف لائے۔ ان کے تدبر محل و موقع شناسی' سیاست دانی' شگفتہ گفتاری' پروقار چہرہ' رعب دار مونچھیں اور بڑی بڑی پھٹ پڑنے والی

آنکھوں نے انتخابی تقریروں اور جلسوں میں بڑا معجز نما اثر پیدا کیا۔ آپ بھولے نہیں ہونگے کہ بعد میں قائداعظمؒ کی نامزدگی اور سفارش پر وائسرائے نے ان کو ایوانِ بالا کی صدارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا تھا جسے انہوں نے بڑی خوبی سے نبھایا اور بڑا نام پیدا کیا۔ الحمدللہ! حسین امام صاحب آج ہم میں موجود ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ابتلائے زمانہ کی وجہ سے ان کی بڑی مونچھوں کے بل کچھ کم ہوگئے اور کمر میں معمولی سا خم آ گیا ہے لیکن ان کی شفقت' شرافت اور انسانیت ہنوز شباب پر ہے۔

ہمارے دوسرے معزز مہمان صدا ہنس مکھ نوجوان ممبر مجلس عاملہ قاضی محمد عیسیٰ صاحب تھے۔ وہ شعبۂ نشریات کے انچارج ہونے کی وجہ سے رات دن نشر و اشاعت میں منہمک رہتے اور اُنہوں نے کانگریسی پروپیگنڈے کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ان کی کارگزاریوں اور شہرت سے ہر مسلم لیگی واقف تھا۔ ان کی جاذب نظر شخصیت اور لچھے دار تقریریں سامعین کے دل موہ لیتی تھیں۔ اس انتخابی دورہ میں مجھے ان کے ہم سفر ہونے کی عزت حاصل رہی۔ جب ہم بذریعہ موٹر کار برہان پور سے امراوتی روانہ ہوئے تو عین نصف النہار کے وقت جب کہ ہمیں سلسلۂ کوہِ ست پڑا عبور کرنا تھا کہ ہم گھنے جنگلوں میں جہاں دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور جہاں بستی کا دور دور تک نام ونشان نہیں پایا جاتا تھا' گزر رہے تھے کہ اچانک چند کالے گہرے رنگ کی بھیل دوشیزائیں پانی سے بھرے ہوئے مٹی کے نئے گھڑے سر پر کج کلاہی انداز میں رکھ کر نہایت شوخ رنگ کی ساڑھیاں مرہٹی طرز پر جسم سے لپیٹی ہوئی باندھ کر نمودار ہوئیں اور کار کا راستہ روک دیا۔ یقین کیجئے قاضی صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے جس سے ان کا چہرہ کشمیری سیب جیسا سرخ ہوگیا۔ آپ کو علم ہوگا کہ کمزور عقیدہ کے مسافر اور شکاری پانی سے بھرے ہوئے مٹکے کو دیکھنا نیک شگون سمجھتے ہیں لیکن قاضی صاحب کی خوشی کا اور ہی کچھ راز پنہاں تھا۔ اس روز گونڈوں اور بھیلوں کا بڑا اہم تہوار ''دسہرہ'' تھا۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فطرت کے بھی چند نا قابل فہم تقاضے ہوتے ہیں یعنی سیاہ فام لوگ گورے چمڑے والے لوگوں پر

جان چھڑکتے ہیں جس کا ہمیں فوراً عملی ثبوت مل گیا۔ یعنی ان بھیل دوشیزاؤں نے قاضی صاحب کا رقص وسرود کے ساتھ ''گھیراؤ'' کیا اور قاضی صاحب سیاہ رخوں میں درخشندہ آفتاب بن کر چمکنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری جان اس یلغار سے اس لئے بچ گئی کہ مجھ جیسا گہرے گندمی رنگ کا انسان قابل توجہ نہیں تھا اور اس لئے میں ''گھیراؤ'' کے باہر کھڑا ہوکر انتہائی اطمینان کے ساتھ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے قاضی صاحب کو کبھی اتنا زیادہ مسرور نہیں پایا اور مجھے یقین ہے کہ وہ جس دن دولہا بنے تھے' اُس دن بھی وہ اتنے خوش نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے سورج مکھی پھول جیسے ہنستے ہوئے اپنی تمام جیبوں کو خالی کر کے اپنی خوشنودی وخوش بختی کا اظہار فرمایا۔ جب ہمارا یہ آفتاب ''گہن'' اور ''گھیراؤ'' کے دائرہ سے باہر نکل آیا تو ہم مغرب کی سمت روانہ ہوئے جہاں شہر امراوتی واقع ہے اور جہاں ہمیں انتخابی جلسہ کو مخاطب کرنا تھا۔

دوسرا واقعہ صوبہ مما لک متوسط و برار کے ایک حلقۂ انتخاب کا ہے جس کا سرکاری نام ''مسلم حلقۂ انتخاب ایوت محل امراوَتی'' تھا۔ مسلم لیگ کے اُمیدوار قاضی سید کریم الدین صاحب ایڈووکیٹ کے خلاف دو آزاد اُمیدوار اور ایک خاکسار صف آرا ہوئے تھے۔ واقعہ شہر ایلچپور کا ہے جہاں سے ایک مقامی باثر آزمودہ خادمِ قوم محمد نظر خاں صاحب جو میرے دوست اور ہم سبق ہوا کرتے تھے' آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے مقابلہ کر رہے تھے۔ یہ شہر مسلمانوں کے لئے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ویسے ہی ولیوں کی نگری ہے جیسے برہان پور' دلی' ملتان وغیرہ ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ایک ہندو ایل نامی اس خطہ کا راجہ تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم کیا کرتا تھا۔ اس ہی کے نام سے شہر ایلچپور موسوم ہوا۔ اصل میں اس کا مرہٹی نام ''ایل چاپور'' تھا۔ روایت کے مطابق شہر غزنی کے ایک نوجوان بزرگ کو بشارت ہوئی کہ وہ ایلچپور پہنچ کر راجہ ایل کی سرکوبی کریں۔ ان بزرگ کا نام نامی عبدالرحمان تھا۔ آپ عقد مسنونہ کے بعد فوراً جہاد پر روانہ ہوئے اور ایلچپور میں راجہ ایل کے کثیر لاؤلشکر کیخلاف مٹھی بھر مجاہدین کی قیادت کرتے ہوئے مجادلہ کے لئے بڑھے اور کافروں کے خلاف جہاد بالسیف کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ کسی

کافر نے ان پر تلوار سے ایسا بھرپور وار کیا کہ سر مبارک تن مبارک سے جدا ہوگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس ہی حالت میں چلتے اور وار کرتے رہے اور کئی کافروں کے سر قلم کئے۔ ان کو آج بھی لوگ شاہ دولہا رحمٰن غازی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا مزار اقدس اور گنجِ شہیداں ایلچپور میں ہے۔

اس ولیوں کی نگری میں ہر زمانہ میں چلتے پھرتے ولی پائے گئے ہیں۔ میں اُس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں جب مجھے ناگپور میں اطلاع ملی تھی کہ ایلچپور میں کئی زندہ کامل بزرگ موجود ہیں۔ مجھے خاص طور سے حضرت گلاب دادا' مستو میاں صاحب اور سعادت خاں میاں کا نام بتلایا گیا تھا۔ اس اطلاع کے بعد میری آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور مجھے ان بزرگوں سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی لیکن موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے آرزو کو عرصہ تک سینہ میں دبائے رہا۔ انتخاب آیا تو اس تمنا کے پورے ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ قائد صوبہ سید عبدالرؤف شاہ صاحب نے انتخابی مہم سر کرنے کے لئے مجھے ایلچپور بھیجا جہاں چوک میں بعد نماز عشاء آخری جلسۂ عام کا انتظام کیا گیا تھا کیونکہ دوسرے دن صبح 8 بجے سے رائے دہندگان پرچیاں ڈالنے والے تھے۔ شرکاء جلسہ اتنی کثیر تعداد میں جمع ہوگئے تھے کہ چوک کی جلسہ گاہ ناکافی تصور کی گئی۔ مقامی رہنمایانِ مسلم لیگ نے بے پناہ ہجوم اور ان کے وفورِ شوق کو دیکھ کر فوراً فیصلہ کیا کہ جلسہ شہر سے باہر احمد شاہ ابدالی کی تعمیر کردہ عیدگاہ میں ہوگا۔ بس کیا تھا' تمام لوگ انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ جلوس کی شکل میں قطار در قطار نعرہ زن میری دو حیثیتوں کے پیش نظر رکن مرکزی اسمبلی و مہمان میرے پیچھے پیچھے ایک میل سے زیادہ لمبے راستے کو طے کرنے روانہ ہوئے۔ میرے سامنے اور دائیں بائیں پیٹرومکس کی روشنیوں سے اندھیرے گھپ کو منور کیا جا رہا تھا۔ جب میں عیدگاہ میں صدر دروازہ سے سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوا تو دیکھا کہ عیدگاہ کے وسط صحن میں ایک بوریا لپٹا ہوا پڑا ہے۔ روشنی' شور اور نعروں کی وجہ سے بوریے میں سے ایک صاحب اس طرح نمودار ہوئے جیسے کہ وہ گہری نیند سے اچانک جاگ اُٹھے ہوں اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تمام سین میرے لئے صرف جاذبِ نظر و شوق ہی نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی اور فتح و نصرت کا پیامبر بھی تھا۔ مجھے بتلایا گیا کہ یہ بزرگ

حضرت سعادت خاں میاں صاحب ہیں۔ میں بے تابانہ ان کی طرف لپکا' مصافحہ کر کے دعا کا طالب ہوا۔ اُنہوں نے کچھ جواب دیے بغیر آسمان کی طرف دیکھ کر شہادت کی انگلی بلند کی۔ جلسہ کی کارروائی اور میری تقریر شروع ہوئی۔ حضرت کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے لوگوں سے کہا کہ جلسہ میں حضرت کی موجودگی ہماری کامیابی کا بین ثبوت ہے۔ اس اثناء میں حضرت خاموشی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے آسمان کی طرف برابر اشارہ کرتے رہے۔ انتخابی تقریر تھی' کچھ لمبی ہوگئی۔ معلوم نہیں وہ بزرگ کب چلے گئے۔

صبح ہی ہم سب پولنگ اسٹیشن گئے جہاں 8 بجے سے ووٹ ڈالے جانے والے تھے۔ مسلم لیگی اُمیدوار کی صندوق کا رنگ سبز تھا اور مقامی اُمیدوار کا زرد۔ پولنگ آفیسر ابھی پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ حضرت سعادت خاں میاں صاحب تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں بانس کی ایک لمبی سی پچی تھی جس سے اُنہوں نے تین مخالف اُمیدواروں میں سے صرف محمد نظر خاں صاحب کی زرد جھنڈیاں ان کے بوتھ میں جاکر پرزہ پرزہ کردیں۔ پھر ہمارے بوتھ میں تشریف لائے۔ شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف بلند کر کے اللہ کی وحدانیت' اسکے قادر مطلق اور مالک فتح وظفر ہونے کی شہادت دیتے ہوئے کسی اور مشن پر عجلت کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ نتیجتاً دو اُمیدواروں کی ضمانت ضبط ہوئی اور کامیاب مسلم لیگی اُمیدوار کو اصلی حریف محمد نظر خاں صاحب سے دو ہزار چھ سو اکسٹھ (2,661) ووٹ زیادہ ملے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے پیاروں نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے ساتھ تعاون ہی نہیں کیا بلکہ ہاتھ بھی بٹایا۔

اُس مالک دو جہاں کا ہزاراں احسان ہے کہ ہندوستان کے صوبائی انتخابات بغیر خون خرابے کے ختم ہوئے۔ نتائج پر صوبہ وار سرسری نگاہ ڈالنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے تاکہ اعداد و شمار سے قائداعظمؒ کے دعوے کی پوری طرح تائید ہوجائے۔ مرکزی وصوبائی مسلم نشستوں کی جملہ تعداد پانچ سو چوبیس (524) تھی جس میں سے مسلم لیگ نے چار سو ترپن (453) نشستیں کامیابی کے ساتھ حاصل کیں۔ مسلم لیگ کو تقریباً پچھتر (75) فیصد ووٹ ملے اور باقیماندہ

پچیس (25) فی صد ووٹ اُنیس (19) مخالف جماعتوں کے اُمیدواروں میں بٹ گئے۔ یو پی اسمبلی میں اکیاسی (81) فی صد سے زیادہ مسلم لیگ کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ مشہور کانگریسی مسلم لیڈر مسٹر رفیع احمد قدوائی جو کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے دست راست سمجھے جاتے تھے اور جنہوں نے تین مسلم حلقوں سے مقابلہ کیا تھا' ہر جگہ مسلم لیگ کے اُمیدوار سے بری طرح پٹے۔ اڑیسہ اسمبلی میں چاروں مسلم نشستیں مسلم لیگ کو ملیں۔ بمبئی اسمبلی میں مسلم لیگ نے تمام پارٹیوں کو مکمل شکست دے کر تیس مسلم نشستیں یعنی سو فیصد کامیابی حاصل کی۔ مدراس اسمبلی میں بھی مسلم لیگ کو عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی یعنی کل اُنتیس (29) مسلم نشستیں حاصل کیں۔ بہار اسمبلی کی چالیس (40) نشستوں میں سے مسلم لیگ کو چونتیس (34) نشستیں ملیں۔ سی پی اسمبلی کے انتخاب میں ہمارے ایک پرانے ساتھی اور مسلم لیگی رہنما محمد اصغر صاحب جنرل سیکرٹری صوبائی مسلم لیگ نے بدنصیبی سے آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے متفقہ فیصلہ کو ٹھکرا کر اور اپنے حلفیہ وعدہ کی خلاف ورزی کر کے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے اس اعلان کے ساتھ کہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے صوبائی لیگ کے عطا کردہ ٹکٹ کو اُن سے واپس لے کر اور ایک نااہل شخص کو دے کر جس کی خدمات اُن جیسی نہیں ہیں' ان کے ساتھ صرف ظلم ہی نہیں بلکہ ان کے حقیقی اور جائز حق سے محروم کر دیا انتخاب لڑا اور مسلم لیگ کی چودہ (14) مسلم نشستوں میں سے ایک نشست حاصل کی۔ توقع یہ تھی کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا مسلم لیگی بغاوت نہیں کرے گا اور قائداعظمؒ کی اپیل موقعہ کی نزاکت واہمیت' کفر واسلام کے مقابلہ کے پیش نظر اور اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اقرارِ وفاداری کرنے کے بعد ہر مسلم لیگی اور بالخصوص ذمہ دار رہنما و عہدہ دار نظم وضبط اور ایثار سے کام لے کر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' قائداعظمؒ کے مطالبۂ پاکستان وجداگانہ قومیت کو منوانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی قوم اور خدا کے سامنے سرخ رو ہوگا۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں مخلص مسلم لیگی اُمیدواروں نے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دیرینہ خدمات کی وجہ سے ٹکٹ کے مستحق تھے، صوبائی یا مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کے سامنے قومی مفاد کے پیش نظر سر تسلیم خم کر دیا اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہیں ہونے دیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اس نازک موقعہ پر بزرگوں کی خطا کو پکڑنا نہیں چاہئے اور فردِ واحد کو چاہے وہ کتنا ہی مستحق کیوں نہ ہو، ٹکٹ کا نہ ملنا مفاد ملی کے مقابلہ میں ایک بہت ہی حقیر سی چیز ہے اور وہ برملا کہتے ہوئے سنے گئے کہ آج شخصیتوں کی جنگ نہیں ہے بلکہ اصول کی جنگ ہے۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پاکستان ہائیکورٹ کے مشہور سابق جج عبدالسلام صاحب فاروقی جنہوں نے حق و صاف گوئی، ذہنی دیانتداری، خدا ترسی اور عدلِ فاروقی کی قدریں اور شاندار روایات قائم کی ہیں، مجھے معاف کر دیں گے اگر میں ان کا ذکر کروں۔ چونکہ وہ خود حق اور انصاف پسند انسان ہیں، اسلئے وہ میری اس جسارت کو عامتہ المسلمین کے مفاد میں بنظر استحسان دیکھیں گے۔ فاروقی صاحب نے ناگپور میں باوجود اپنی وکالتی مصروفیات کے تمام قومی تحریکوں میں پورا پورا حصہ لیا۔ ان کا سیاست میں ہمارے صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کھیل کو دمثلاً کرکٹ اور ٹینس میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

مجھے بھی ہر میدان میں چاہے وہ کھیل یا سیاست ہو، ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ دور اندیش، صاحب فہم اور ایثار پیشہ انسان ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ٹکٹ نہ ملنے پر حالانکہ ہر نقطۂ نظر سے وہ اس کے اہل تھے، ان کے ماتھے پر ایک بل بھی نہیں آیا۔ حقیقتاً ایسی پُر عظمت شخصیتوں کے عملی تعاون نے قائد اعظمؒ کے ہاتھ مضبوط سے مضبوط تر کر دیے تھے۔

ان کے گرامی نامہ کے اُس اقتباس کو ملاحظہ فرما کر لطف اندوز ہوئیے جس سے ان کی ایثار نفسی، اتحاد ملی سے لگاؤ اور بے لوث خدمت آشکار ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں صرف دو چار نے اپنی جماعت کے

ساتھ بے وفائی کی لیکن اللہ کے فضل سے مسلم لیگ کے مطالبات پر ان کی اس باغیانہ حرکت سے کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔

پنجاب اسمبلی میں چھیاسی (86) مسلم نشستیں تھیں جن میں سے مسلم لیگ نے تہتر (73) نشستیں حاصل کیں۔ آسام اسمبلی میں چونتیس (34) مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ کو اکتیس (31) ملیں۔ سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ کو تینتیس (33) میں سے چھبیس (26) نشستیں ملیں۔ سرحدی گاندھی (خان عبدالغفار خان)' ڈاکٹر خان صاحب' سرخ پوش اور خدائی خدمتگاروں کی متفقہ تباہ کن کوششوں سے سرحد اسمبلی کی اڑتیس (38) مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف سترہ (17) نشستیں ملیں۔ یہ ہی ایک صوبہ تھا جہاں اتنی کم نشستیں ملیں لیکن بنگال اسمبلی کی ایک سوانیس (119) مسلم نشستوں میں سے ایک سو بارہ (112) مسلم لیگ کے ہاتھ آئیں۔

باوجود یہ کہ بنگال کے چند ممتاز راہنمایانِ قوم کی وقتاً فوقتاً بے راہ روی سے مسلم لیگ کے وقار کو ٹھیس لگتی تھی لیکن مسلم عوام کا رویہ نہایت مخلصانہ وشریفانہ رہتا تھا۔ کیوں نہ ہو' اُن کے سروں پر آخر مولانا عبداللہ الباقی صاحب' مولانا اکرام خاں صاحب' مولوی تمیز الدین خاں صاحب اور مولوی راغب الاحسن صاحب وغیرہ جیسے نیک اور مخلص بزرگوں کا سایہ تھا۔ اگر اس دنیا میں ہم شمع لے کر چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالیں تو ہمیں ایسی ہستیاں بہت کم ملیں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ کلکتہ کے مسلمان ہمیشہ مشق جور وستم رہے لیکن آفرین ہے کہ ہر آزمائش کی گھڑی میں وہ ثابت قدم رہے اور ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے سینہ سپر ہوئے۔ الغرض مسلمانان بنگال کی غالب اکثریت دیوار چین کی طرح قائداعظمؒ اور آل انڈیا مسلم لیگ کی پشت پناہی کرتی رہی جیسا کہ بنگال صوبہ اسمبلی کے انتخابات کے شاندار نتائج سے ثابت ہوتا ہے۔

آپ کو ان اعداد وشمار کے پڑھنے کی اس لئے زحمت دی گئی کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ان سروں کی گنتی ہی کی بدولت قائداعظمؒ نے ہمارے لئے پاکستان حاصل کیا اور اس

پانی پت کے میدان میں کانگریس اور اس کی بہت سی ہم خیال اور شریک کار مسلم جماعتوں، آزاد جماعتوں اور آزاد اُمیدواروں کو شکست فاش دے کر مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اور ایک جدا مسلم ملک کے مطالبہ کو مسلمانوں کے سرگنوا کر منوایا اور کانگریس کا ہمیشہ کے لئے منہ بند کر دیا۔ اب وہ کس منہ سے کہتے کہ (1) مسلمانانِ ہند ان کے ساتھ ہیں (2) قیادت کی اجارہ داری کے صرف وہ اکیلے حقدار ہیں اور (3) مسلمان ایک علیحدہ قوم نہیں ہیں۔

قائداعظمؒ نے جمہوری تقاضوں اور مسلم جمہوری آئین کے تحت اپنی پوری قوم کے عملی تعاون سے کانگریس کے چیلنج کو قبول کر کے اور قولاً وفعلاً ترکی بہ ترکی جواب دے کر کانگریس اور ہندو قوم کو لاجواب کر دیا۔

آخر میں صدآفریں اس قوم اور اس یکتا قیادت پر جس نے اتحاد، ایمان اور نظم سے ایک ناممکن چیز کو ممکن کر کے دکھلا دیا اور حصولِ پاکستان یقینی ہو گیا۔ قائداعظمؒ نے اپنی قوم کو بڑی سختی کے ساتھ بے راہ روی سے روکا۔ بڑے بڑے راہنمایانِ قوم سے بھی اگر کوئی لغزش ہو جاتی تو وہ انہیں ٹوکنے سے نہیں چوکتے تھے۔ قائداعظمؒ کی قیادت کا یہ بہت بڑا شاہکار تھا کہ اُنہوں نے مسلمانانِ ہند کو کبھی قابو سے باہر نہیں ہونے دیا اور نہ ان کو جذبات کی رو میں بہنے کی اجازت دی۔ قائداعظمؒ و مسلمانانِ ہند زندہ باد۔

پارلیمانی شاہکار

مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں 47-46-1945ء کے سال تاریخی ہونے کے علاوہ تخلیقی اور تخریبی بھی تھے۔ تخریبی اس لئے کہ آخیر کے دو برسوں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے اور جو زیادتیاں کیں' وہ ناقابل بیان ہیں۔ ان مظالم کی درد بھری کہانی سننا ہو تو ان سے سنئے جنہوں نے یہ سب کچھ دیکھا' سہا اور ابھی زندہ ہیں یا اُن کتابوں کی ورق گردانی کیجیے جن کے صفحوں پر یہ خونیں واقعات درج ہیں۔ بہار میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام' کلکتہ میں کشت وخون وغارتگری' گڑھ مکتیشور میں ہندوؤں کے مذہبی تہوار پر نہتے مسلمانوں پر اچانک حملہ' ریاست آلور' ریاست بھرتپور اور میوات کے علاقوں میں پانی پت کی شکست کا انتقام لینے کے منصوبوں پر عمل ہو رہا تھا اور دوسرے کتنے ہی مقامات پر منظّم مسلم کشی جاری تھی۔ ہر صاحبِ سمجھ اس امر کی تائید کرے گا کہ بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام' روزمرہ کے جیسے ہندو مسلم فسادات کا نتیجہ نہیں تھا لیکن ہمارے حاکمِ وقت انگریز اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور اُسے معمولی ہندو مسلم جھڑپیں سمجھتے تھے۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جب سے انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی' انہوں نے اپنی انتظامی سہولت کے مدنظر ہندوستان کو واحد ملک گردان کر اسے کئی صوبوں میں تقسیم کیا اور مرکز یعنی دہلی میں بیٹھ کر حکمرانی کی۔ یہ سب ان کے دماغ کی اُپج اور واقعتاً ان کی تخلیق تھی۔ اس لئے وہ ہمارے غلام ملک کو متحدہ ہندوستان اور اس کے باشندوں کو ایک قوم سمجھنے لگے اور اس ہی ضد پر ایک عرصہ تک اڑے رہے لیکن بالآخر حالیہ ہندو مسلم فسادات نے جن کا ذکر ضمناً اور اجمالاً پہلے آچکا ہے' ان کی آنکھیں کھول دیں اور واقعات نے انہیں باور کرا دیا کہ یہ فسادات صرف دو

فرقوں اور چند لوگوں کے درمیان محدود نہیں ہیں بلکہ جماعتی طور پر بہت بڑے پیمانہ اور منظم طریقہ پر ہوتے ہیں جہاں چند نہیں بلکہ ہزاروں انسان ہلاک سینکڑوں جائیدادیں نظر آتش اور لوٹ مار بھی بکثرت ہوتی ہے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس تخریب میں سے تعمیری چیز نکل آئی اور دو قوموں کے نظریے کے نقوش ان کی آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگے۔

اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ روس کی جانب سے موسم سرما میں بطخیں عارضی نقل وطن کر کے ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں آتی ہیں اور جن کا ہندوستان کے شکاری بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ انگریزوں کو خیال پیدا ہوا کہ ان پرندوں کی طرح اشترا کیت موسم بے موسم ہندوستان میں آ سکتی ہے' اس لئے امریکہ اور برطانیہ کو خوف لاحق ہوا کہ ہندوستان کی افلاس زدہ گرم آب و ہوا اور مہمان نواز سرزمین اشترا کیت کو بہت راس آئے گی اور وہ موقعہ کا فائدہ اٹھا کر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور نہ ہو جائے' لہٰذا اس کا سد باب ہونا چاہئے تا کہ اپنے دیرینہ اثرات جنہوں نے جڑ پکڑ لی ہے' قائم رہیں اور یہ ملک روسی بلاک میں شریک نہ ہو۔ چنانچہ اشترا کیت کو روکنے کے لئے ہمیں غلامی کی تاریک کوٹھری سے نکال کر آزادی کی روشنی کی طرف لانے کے لئے منصوبے بنائے جانے لگے۔ باوجود برطانیہ کے جنگ میں فاتح ہونے کے ہٹلر نے اس کی ریڑھ کی ہڈی ایسی توڑ دی تھی کہ اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور ایسی حالت میں وہ ہندوستانیوں کو کب تک غلام بنا کر رکھتے۔

اقتصادیات کے ہندو ماہرین نے مجوزہ ملک پاکستان کے قیام کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ ہندو جاتی کو یقین ہو گیا کہ یہ نیا ملک ایک دن سے زیادہ قائم نہیں رہ سکے گا اور یہ ثابت کرنے کے لئے اعداد و شمار پیش کئے گئے۔ تحقیقات کی رپورٹیں پیش کی گئیں۔ الحاصل ہر وہ چیز پیش کی گئی جس سے اس امر کو تقویت پہنچے کہ پاکستان ایک مٹی کا گھروندہ ہے جو خود بخود ٹوٹ جائے گا یا جس وقت چاہیں گے' اس کو پیروں تلے رگڑ دیں گے۔ دوسرا یہ بھی گھمنڈ تھا کہ تجارت کی منڈیوں پر مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کا ابھی بہت کچھ قبضہ ہے اور بعد میں تو پورا پورا

قبضہ ہو جائے گا۔ پھر مسلمان کیسے پنپ سکیں گے۔ تیسرے وہ اس غرور میں بھی سڑ رہے تھے کہ مسلم علاقوں سے ہندوؤں اور تاجروں کا فوراً انخلا کر کے پاکستان کو مفلوج کر دیں گے۔ وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ کچھی اور میمن بھائی جنہوں نے ہندوستان میں کروڑ ہا روپیہ کا سرمایہ تجارت اور املاک میں لگا دیا ہے، ہندوستان کو کبھی چھوڑ کر پاکستان نہیں جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ قیاس بالکل درست تھا کیونکہ ہمارے تاجر بھائی اپنا کاروبار اور مال و متاع ہندوستان میں چھوڑ کر نہ آتے لیکن اللہ بھلا کرے سردار ولبھ بھائی پٹیل کا جنہوں نے دھوراجی میں مسلم تاجروں کو دھمکی دی اور ان سے توہین آمیز سلوک کیا۔ ہم اس موقعہ پر سابق صدر کانگریس اچاریہ کرپلانی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بلاوجہ ہمارے صوفی منش سندھی ہندو بھائیوں پر اپنا ذاتی اثر ڈال کر اور ڈراؤنے خواب دکھلا کر راجہ داہر کے ملک کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس خلا کو جنوب وسط ہند اور راجستھان سے آنے والے مسلمانوں نے پُر کیا۔ ہمارے ہندو بھائی بغیر کسی روک ٹوک کے پاکستان سے دھن دولت یہاں تک کہ طوطے کا پنجرا اور سل بٹہ تک لے کر بھارت ماتا کے چرنوں میں بیٹھنے کے لئے چلے گئے۔ وہ تو بغیر کسی روک ٹوک کے اس طرح گئے جیسے کوئی ایک ہی شہر میں ایک محلے سے دوسرے محلے میں منتقل ہو جائے۔ قائداعظمؒ کی سخت تاکید تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی چھیڑ خانی نہ ہو اور انہیں آنے جانے اور ان کے اثاثہ کو لے جانے کی مکمل آزادی ہو اور اس ہی لئے روزانہ گدھے اور اونٹ گاڑیوں کا بندرگاہ تک ایک تانتا بندھا رہتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جانے والے جو ورغلائے اور گمراہ کئے گئے تھے، حسرت و یاس سے اپنے وطن عزیز کو آخری بار دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لئے رضا کارانہ طور پر چھوڑ رہے تھے۔ یہ لوگ زندہ دل، جفاکش لیکن عیش پرست تھے۔ ان کے جانے سے ہمارے ملک میں ایک عرصہ تک بے رونقی رہی اور اقتصادی زندگی بھی چند دنوں کے لئے متاثر ہوگئی۔ میمن بھائیوں، دہلی کے سوداگروں اور دیگر مسلم تاجروں نے بجلی کی سرعت سے کام کر کے ملک کے اقتصادی نظام کو ایسا سنبھالا کہ عقل حیران رہ گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب اور ہر مرد و زن اخلاص، خدمتِ خلق اور خدمتِ ملک کے جذبہ سے دیوانگی کی حد تک سرشار تھا۔ وہ اپنے ملک کو فوراً بنانا اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ چونکہ جذبہ نیک تھا، اللہ نے اس کی مدد کی اور اس کی ہر کوشش بار آور ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ بدخواہوں اور دشمنوں کے منصوبے خاک میں مل گئے اور خوش حالی و ترقی ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ہنستی ہوئی جلوہ گر ہوئی۔ دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن میں اس لئے مجبور تھا کہ بات میں سے بات نکل آئی۔

دوئم اس ہی دورِ جناح میں ایک قوم اور ایک ملک کی تخلیق کے اسباب پیدا ہوئے اور مملکت قائم ہوئی۔ آپ نے کسی اور جگہ ملاحظہ کیا ہوگا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج سے قائداعظمؒ نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی نیابت کا حق صرف آل انڈیا مسلم لیگ کو پہنچتا ہے اور وہ ہی ان کے حال اور مستقبل کے معاملات پر گفت و شنید اور تصفیہ کرنے کی اہل ہے۔ اب ان کے آئینی دماغ نے مطالبۂ پاکستان کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک اور ترکیب نکالی۔ انتخابات کامیابی کے ساتھ ضرور ہوئے۔ تقریباً ایک کروڑ مسلم رائے دہندگان نے ہوش و حواس کے ساتھ ہندوستان بھر میں ووٹ دے کر مسلم لیگی نمائندوں کو اسمبلیوں میں اس فرمان کے ساتھ بھیجا کہ وہ بحیثیت مسلم لیگی رکن اسمبلی پاکستان کے حصول کے لئے آئینی جدوجہد کریں۔ میرے جیسے لوگوں نے اس انتخاب کو آئینی جنگ کی آخری کارروائی سمجھا لیکن قائداعظمؒ کی سیاست، سوجھ بوجھ، دور بینی اور معاملہ فہمی ہم سب سے بہت اونچی تھی۔ اس لئے ان کی دماغی دور رسی کا یہ کرشمہ تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے تمام مسلم لیگی واضعانِ قانون کو جن کی تعداد 453 تھی، دہلی طلب کر کے کنونشن کا 7 اپریل 1947ء کو انعقاد کیا اور مطالبۂ پاکستان کو آئینی و جمہوری مہر لگا دی۔

قائداعظمؒ کی دعوت پر تقریباً تمام مسلم لیگی اراکین نے لبیک کہا سوائے ان چند بدنصیبوں کے جو وقت پر علیل ہو گئے اور نہ آ سکے۔ اجلاس کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا

ہے کہ ڈھائی سو کے لگ بھگ اخباری نمائندوں نے شرکت کی۔ یہ اخبار مختلف ممالک واقوام کے ترجمان تھے۔ غیر ملکی نمائندہ روس، انگلستان، امریکہ، فرانس، جنوبی افریقہ وغیرہ اخبارات کے نامہ نگار تھے۔ انگلو عربک کالج دہلی کے وسیع وعریض کمپاؤنڈ میں مسجد کے زیر سایہ ایک پنڈال بڑے سلیقہ کے ساتھ مندوبین کے لئے آراستہ وپیراستہ کیا گیا جس میں واضعانِ قانون صوبہ وار اپنی اپنی نشستوں پر جلوہ گر تھے۔ ان کے چہرے جوش وخروش اور خوشی سے تمتمائے ہوئے تھے۔ اس نمائندہ مجلس کی شرکت سے اُنہوں نے پہلی بار دراصل محسوس کیا کہ ان کی قوم نے مسلم لیگ کے حکم پر انہیں منتخب کرکے بہت بڑا اعزاز بخشا اور اعتماد کیا ہے اور انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ ان کی اس سرفرازی پر تمام دنیا کی نگاہیں پڑ رہی ہیں اور وہ آج اپنے محبوب اور ہر دلعزیز قائداعظمؒ کی سرکردگی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان پر مسلم واضعانِ قانون کی حیثیت سے تائیدی تجویز پاس کرکے آخری مہر ثبت کریں گے جس کے بعد برطانیہ وکانگریس پر مزید گفت وشنید کے تمام دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔ یہ یقین کیجئے کہ ہندوستان کے مسلم رائے دہندگان نے بہت سوچ سمجھ کر نہایت دیانتداری کے ساتھ اپنی رائے دی اور آج کل کے رواج کے مطابق انہوں نے اپنی رائے کو کالے بازار میں فروخت نہیں کیا۔ وہ اغیار کی غنڈہ گردی اور دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے اور انہوں نے وہ ہی کیا جوان کی دل کی آواز تھی اور جس میں ان کی قوم اور ملک کی بہتری کا راز سربستہ تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے نہیں سوچا کہ پاکستان بننے کے بعد ہندو اکثریت ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ بس ان کا صرف ایک ہی مطمح نظر تھا کہ ہندوستان کے اُس خطۂ ارض میں جہاں آج پاکستان قائم ہے، اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ جہاں مسلمان پھولیں پھلیں اور سکھ وچین کی باعزت زندگی بسر کریں ؎

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

(وحشتؔ کلکتوی)

پہلا کنوینشن اجلاس مقررہ وقت پر نہ ہو سکا کیونکہ بنگال کے مندوبین ٹرین کے دیر میں آنے کی وجہ سے تاخیر سے پہنچے۔ قائداعظمؒ کی صدارتی تقریر حسب معمول معرکتہ الآراء ہوئی اور مجلس مضامین کی تقرری کے اعلان کے بعد کنونشن کا اجلاس اڑتالیس گھنٹہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس اثناء میں مجلس مضامین کے دو اجلاس ہوئے اور نو دس گھنٹہ تک بحث تمحیص کے بعد ایک متفقہ تجویز کھلے اجلاس میں پیش کرنے کے لئے منظور کی گئی اور یہ بھی طے کیا گیا کہ بنگال اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی اس تجویز کے محرک ہوں گے اور یو۔پی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر چودھری خلیق الزماں صاحب تائید کریں گے۔ محرک و موئید کے ناموں کے اعلان کے بعد لوگوں کے دلوں میں بہت شوق پیدا ہوا اور ان دونوں کو سننے کے لئے انہوں نے سخت بے تابی میں وقت گزارا۔ جلسے میں شرکت کرنے والوں کو یقین تھا کہ ہمارے دونوں جہاں دیدہ سیاست داں برطانوی اور کانگریسی قلعوں کو ڈھا کر نئی مملکت کی داغ بیل ڈالیں گے۔ دوسرے دن لوگوں کی توقعات پوری ہوئیں۔ شہید سہروردی صاحب نے انگریزی زبان میں بڑی فاضلانہ، مدلل اور جوشیلی تقریر کی جس نے سامعین کے دلوں کو مسحور کر دیا۔ ان کی تقریر کی کامیابی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو پریس کئی دن تک ان کے خلاف زہر اُگلتا رہا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سید حسین شہید سہروردی صاحب اور محمد ایوب کھوڑو صاحب دورِ جناح کی دو بڑی ابھرتی ہوئی شخصیتیں تھیں جنھوں نے اپنے اپنے صوبوں میں نبرد آزما ہندوؤں اور مخالف سیاسی جماعتوں کا بڑی دلیری سے مقابلہ کر کے مسلم لیگ کی حمایت کی اور مسلمانوں کی بڑے خلوص کے ساتھ خدمت انجام دی جس کی وجہ سے وہ دونوں ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے بہت مقبول و ہر دلعزیز رہنما بنے۔ حقیقتاً ہمارے یہ دونوں رہنما اُس جنگ و جدال کے زمانہ کی بڑی دریافت تھے۔ شاید کوئی مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ پاکستان کے بننے کے بعد جو توقعات ہماری قوم نے ان دونوں بزرگوں سے وابستہ کی تھیں، وہ پوری ہوئی یا نہیں؟ میں تو سچ مچ اس سوال کا جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ غالباً آئندہ کا مورخ ہی اس کا جواب دے سکے گا۔

بہر حال میں حسین اور ''شہید'' کو اپنا نذرانہ عقیدت پیش کرتا چلوں جو ہمیں چھوڑ کر اپنے مقدس کنبہ میں جا ملے ہیں۔ وہ روایتاً اور نسلاً بڑے شجیع تھے اور قابل تقلید قدیم روایت کے مطابق مسلمانوں کی خدمت کرنے اور انہیں دشمنوں سے بچانے کے لئے ہمیشہ اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھ کر کلکتہ کے فساد زدہ علاقوں میں بلا خوف وخطر کبھی کھلی جیپ میں بیٹھ کر اور کبھی پا پیادہ پھرا کرتے تھے۔ وہ اکثر پولیس کمشنر کے کنٹرول روم سے کمک بھجواتے اور خود بھی موقعۂ واردات پر پہنچ جاتے۔ کیوں نہ ہو آخر شہید کربلا کے نام لیوا تھے۔

چودھری صاحب کا کیا کہنا۔ ہماری پہلی صف کے لیڈروں میں اُن کے مقابلہ کا کوئی لیڈر نہیں تھا جو کانگریس کو اتنی جلی کٹی سنا سکتا۔ اقلیتی صوبوں کے لیڈروں نے بڑے اعتماد کے ساتھ حصول پاکستان کے لئے اپنے صوبوں کی طرف سے ہر ایثار و قربانی کا اعلان اور وعدہ کیا کیونکہ قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلمانان ہند اب پوری طرح سے منظم ہو گئے تھے۔

شب میں تیسرا اور آخری اجلاس ہوا جس میں اکابرین کی تقریروں کا سلسلہ ڈیڑھ بجے کے بعد ختم ہوا۔ قائداعظمؒ نے اپنے موثر و دلکش انداز میں تجاویز پر روشنی ڈالی اور اس حلف نامہ کا ذکر کیا جس پر مسلم لیگی واضعان قانون نے دستخط کئے ہیں۔ دو بجے کے بعد قائداعظمؒ کی بصیرت افروز تقریر ختم ہوئی اور اس ہی کے ساتھ نعروں کی گونج میں اس تاریخی اجلاس کے اختتام کا اعلان ہوا۔ جو تجویز مسلم واضعانِ قانون نے متفقہ طور پر بغیر کسی مخالفت کے پاس کی' اس کے چار اہم جزو آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:-

1- ان دو منطقوں میں جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے' ایک با اختیار آزاد مملکت موسوم' ''پاکستان'' فوراً قائم کی جائے (2) ہندوستان و پاکستان کا جداگانہ دستور مرتب کرنے کے لئے دو علیحدہ آئین ساز مجالس قائم کی جائیں۔ (3) 23 مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق نئے آئین میں دونوں مملکتوں کی اقلیتوں کے لئے تحفظات مہیا کئے جائیں اور (4) مسلم لیگ کے نمائندے اس عارضی مرکزی حکومت میں جس کی تشکیل ہونے والی ہے' اُس وقت تک شریک

نہ ہوں جب تک مطالبہٗ پاکستان کومنظور کر کے اُسے فوراً قائم کرنے کی جوابداری نہ لی جائے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا' اس لئے کہ اس کا تمام تر تعلق دنیا کی جماعتوں اور حکومت سے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے اللہ سے مدد نہ مانگے اور اس کی طرف رجوع نہ کرے۔ سب سے پہلے قائداعظمؒ نے اور اسکے بعد تمام مسلم لیگی واضعان قانون نے حسب ذیل مقدس آغاز کے بعد یعنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ رب العالمین

کہہ کر حلف اٹھایا اور اپنے پروردگار کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ بہ صمیم قلب اقرار کیا جاتا ہے کہ حصول پاکستان کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی تمام ہدایات واحکامات کی بسر وچشم تعمیل کی جائے گی اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا اور آخر میں اللہ سے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ یہ دعا مانگی گئی:-

ربنا افرغ علینا صبراً وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین

قائداعظمؒ کی صدارت وقیادت میں قرارداد لاہور کی کچھ ترمیموں کے ساتھ مسلم لیگ واضعانِ قانون کی زبان سے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر آخری بار قطعی طور پر توثیق ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کے حصول کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کا اعلان بھی کر دیا۔ اس طرح اپنے عزائم وارادوں کا کھلم کھلا اظہار کیا تا کہ حکومت اور متعلقہ پارٹیاں کسی دھوکہ میں نہ رہیں۔ قائداعظمؒ نے اس آخری کارروائی سے مخالفین ومعاندین کے لب ہی بند نہیں کر دیے بلکہ اس میں تالا ڈال کر چابی اپنی تجوری میں حفاظت کے ساتھ رکھ لی اور پاکستان قائم کر کے دم لیا۔

قائداعظمؒ زندہ باد

☆☆☆☆☆

ڈپٹی لیڈر

ماضی کی یاد میں دل و جان رشکِ طور ہیں
جلوے وہ آج بھی میری آنکھوں کا نور ہیں

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی تجویز کے مطابق جب مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی پہلی بار تشکیل ہوئی تو غیر مسلم ممبرانِ انڈپنڈنٹ پارٹی ہم سے جدا ہو گئے کیونکہ مسلم لیگ کے آئین کے مطابق غیر مسلموں پر ہماری سیاسی جماعت کے دروازے بند تھے۔ قائداعظمؒ پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے اور وہ مرکزی اسمبلی کے خاتمہ تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ مولوی سید غلام بھیک نیرنگ صاحب ڈپٹی لیڈر، حاجی سر عبداللہ ہارون صاحب خازن اور سر محمد یامین خاں صاحب سیکرٹری، حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب چیف وہپ اور راقم الحروف ڈپٹی چیف وہپ منتخب ہوئے۔ چونکہ قائداعظمؒ مسلم لیگ کے کاموں میں بہت مصروف رہتے تھے، اس لئے نیرنگ صاحب پر قیادت کا بوجھ پڑ گیا تھا۔ 1940ء میں یوپی کے ایک ضمنی انتخاب میں نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور مرکزی اسمبلی میں یوپی لیجسلیٹو کونسل کا بہت سا پارلیمانی تجربہ اپنے ساتھ لائے۔ نئے ممبر ہونے کی وجہ سے پچھلی نشستوں میں ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھنے لگے۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ اس طرح ہم لوگوں کو ان کی قربت نصیب ہوئی۔

چند ماہ کے بعد انہیں سالانہ انتخاب میں نیا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا گیا۔ قائداعظمؒ نے اپنی موجودگی میں ان سے پہلی تقریر کرائی۔ دوسری تقریر سے قبل کچھ ہدائتیں کیں اور پھر ایک جلسہ میں نوابزادہ صاحب کی تعریف کر کے اسمبلی سے اپنی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مستعفی

ہو جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اراکین نے ان کی منت سماجت کر کے راضی کر لیا کہ وہ قاعدہ کے مطابق سال میں صرف ایک مرتبہ اجلاس میں شریک ہوں اور محض مسلم لیگ پارٹی کی عزت ووقار کے لئے رکن اور لیڈر رہیں۔ نوابزادہ صاحب نے خطابت و پارلیمانی سوجھ بوجھ کے وہ جوہر دکھلائے کہ جس دن ان کی تقریر ہوتی' گیلری کھچا کھچ بھری ہوتی اور لوگ ان کی تقریر کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ نوابزادہ صاحب سے حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب اور اپنی قربت کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اب تو قربت اتنی بڑھ گئی کہ نواب زادہ صاحب دن میں کم وبیش چار مرتبہ ہم دونوں کو ویسٹرن کورٹ سے اپنے ساتھ اسمبلی لاتے لیجاتے اور روزانہ شام کی چائے ہمارے ساتھ حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب کے کمرہ میں جو ویسٹرن کورٹ کی نچلی منزل میں واقع تھا' پیتے اور آئندہ دن کی اسمبلی کی کارروائیاں صلاح مشورہ کے بعد طے ہوتیں۔

یہ زمانہ بہت ہنگاموں کا تھا۔ دوسری پارٹیوں میں ہندوستان کے چوٹی کے لوگ تھے جن سے اکثر نوک جھونک رہتی اور نوابزادہ صاحب کو آخر میں سرکاری اور تمام غیر سرکاری پارٹیوں کے زعما سے نمٹنا پڑتا۔ پارٹی کی قیادت ان کا ایک بڑا فرض تھا لیکن اس کے علاوہ انہیں بحیثیت جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ ان گنت فرائض رات دن انجام دینے پڑتے تھے۔ دلی کے ایک چوٹی کے رئیس ہونے کی وجہ سے ممتاز سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں سے اخلاقی وسماجی روابط بھی قائم رکھنا پڑتے تھے جس کا ایک بڑا عیاں فائدہ یہ تھا کہ بڑی حد تک مسلم لیگ کے کاموں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی اور خدمت خلق میں بھی آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ ان کے گھر کی تقریبات کام چلاؤ قسم کی کبھی نہیں ہوتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کی خاص توجہ' ذاتی دلچسپی اور حسن انتظام کی وجہ سے ہر تقریب کا ذکر خواہ وہ ظہرانہ ہو یا عصرانہ' عشائیہ ہو یا استقبالیہ' عرصہ تک زبان زد رہتا۔ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ان کی دعوتوں وضیافتوں میں شرکت کے متمنی رہتے اور شرکت کو باعثِ عزت سمجھتے۔

سب سے پہلے نواب زادہ کے ایک اہم دورہ کے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آسام کے ہندوؤں اور بنگالی ہندو راجگان کی سخت مسلم آزاری اور تشدد

کی وجہ سے نو وارد بنگالی مسلمانوں کے آسام سے جبری انخلا کے مسئلہ نے کل ہند مسئلہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ چونکہ صرف مسلمان اس کی زد میں تھے' لہٰذا اس کا تعلق مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ سے تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کیونکر خاموش بیٹھے رہتے۔ اُنہوں نے ایک سہ رکنی وفد نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت میں مقرر کیا۔ دوسرے واجب الاحترام رکن چودھری خلیق الزماں صاحب تھے۔ اس بندۂ عاجز کو کلکتہ میں ان دونوں بزرگوں سے ملنے اور ساتھ میں جانے کا حکم ملا۔ میں اس وقت کلکتہ پہنچا جب خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت ہندوانہ تعصب اور سیاسی جوڑ توڑ کا شکار ہو چکی تھی۔

کلکتہ سے ہم لوگ شیلانگ پہنچے۔ اس زمانہ میں آسام کے گورنر نواب زادہ صاحب کے پرانے دوست اور وائسرائے کی کونسل کے سابق رکن سر اینڈ رو کلو اور وزیراعظم سر محمد سعداللہ تھے۔ ہم تینوں اپنے عزیز ترین دوست اور رفیق کار عبدالمتین چودہری صاحب کے مہمان ہوئے۔ ان کا نام آتے ہی ایک واقعہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ جب چودھری صاحب قائداعظمؒ کے حکم سے مرکزی اسمبلی کو چھوڑ کر 1937ء میں آسام صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تو اس ہی زمانہ میں ایک روز حاجی عبدالستار سیٹھ اور آپ کا یہ خادم قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے ہمیں دیکھ کر فرمایا کہ تم دونوں بغیر کسی تکلف کے جب چاہو میرے پاس اس ہی طرح آیا کرو جیسا کہ متین آیا کرتے تھے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ چودہری صاحب ان سے کتنے قریب تھے۔

ہم سب کی پہلی مرتبہ عبدالحمید خاں صاحب بھاشانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہ سن کر آئے ہوئے تھے کہ ہم محل وقوع پر جا کر لائن سسٹم کا معائنہ کریں گے اور حالات کا جائزہ لیں گے۔ جوشیلے' ہمدرد' مخلص اور سادگی پسند بھاشانی صاحب وزیر عبدالمتین چودہری کے موٹر گیراج کے پاس ایک کھری چارپائی پر بیٹھتے اور وہیں سو بھی جاتے۔ اس وقت تک کسی نے ان کو مولٰینا یا سرخ ملا (ریڈ ملا) کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان کا نصب العین ان ستم زدہ بنگالی مسلمانوں کی جو بے گھر کئے جا رہے تھے' خدمت کرنا اور آسام کو مسلم صوبہ بنانا تھا۔ کاش وہ اور بنگال کے ہمارے

مسلم رہنما اپنے اس نیک مشن میں کامیاب ہوجاتے تو آسام کی شمولیت سے پاکستان کا اور ہی کچھ نقشہ بنتا۔ اس ہی طرح سرزمین دکن میں اگر سرعلی امام کی اسکیم یا مجاہدِ دکن سید قاسم رضوی صاحب کا دفاعی جہاد بالسیف کامیاب ہوجاتا تو ہم آج فخریہ کہہ سکتے ۔

سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں سے[1] تیری سلطنت کا[2] ہے نشان باقی

(نوٹ 1، 2: اعلیٰ حضرت سے اس تصرف پر معافی چاہتا ہوں)

ڈپٹی لیڈری کے زمانہ میں انہیں بالخصوص جنوبی ہند کا جنوری 1945ء میں کئی دن تک ایک طویل دورہ کرنا پڑا تھا۔ اس وفد میں حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب اور خادم کو شرکت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جناب ظفر احمد صاحب انصاری ہمارے ہم سفر تھے۔ اس دورہ کا مقصد صرف قرارداد لاہور یعنی تجویز پاکستان کو راس کماری تک پہنچانا تھا۔ جنوبی ہند کے لوگ ذہین، فراخ دل اور دوسرے صوبوں کے ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ روادار تھے۔ چونکہ ماحول سازگار تھا اور نوابزادہ صاحب کی شہرت مختلف حیثیتوں سے ان تک پہنچ چکی تھی، اس لئے جنوبی ہند کے لوگ صرف مشتاق دید ہی نہیں بلکہ ان کی زبان سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان کیا شے ہے۔ نوابزادہ صاحب نے تعلیم یافتہ لوگوں کے مجمع میں تقریباً تمیں معرکتہ الآرا تقریریں کیں اور ہر جلسے میں سوالات کے جوابات دیے۔ صوبہ مدراس کی ہر میونسپلٹی نے شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کر کے انہیں معزز اور قابل قدر مہمان تسلیم کیا۔ ان کی ذاتی صلاحیتوں، قائداعظمؒ سے رفاقت اور آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستگی کی داد دی۔ اس کامیاب دورہ سے صرف نواب زادہ صاحب کی شخصیت ہی نہیں ابھری بلکہ ان کا یہ عملی اقدام میری ناقص رائے میں حصولِ پاکستان کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔

اس دورہ کی پانچ تقریبات ایسی تھیں جو اس وجہ سے قابل ذکر ہیں کہ انہیں ایک مسلم لیگی فراموش نہیں کرسکتا۔ ایک وہ ظہرانہ تھا جو سابق میئر مدراس کارپوریشن اور ممتاز مسلم لیگی رہنما

عبدالحمید خاں صاحب نے نوابزادہ صاحب کے اعزاز میں دیا۔ آپ پہچان گئے ہوں گے کہ یہ وہ عبدالحمید خاں صاحب تھے جو آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس مدراس منعقدہ 1941ء کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ مرکزی اسمبلی کے ہمارے بہت نیک اور غیر متعصب کروڑ پتی ہندو رفیق اور دوست سر انا ملی چٹیار' بانی انا ملی یونیورسٹی نے اپنے مدراس کے چیٹی ناڈ محل میں نواب زادہ کے اعزاز میں ظہرانہ دیا۔ یقین کیجئے کہ اس تقریب میں شاید ہی مدراس کا کوئی بڑا آدمی شریک نہ ہوا ہو۔ تیسرا ظہرانہ حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب نے تلچری میں اپنے رہائشی دولت کدہ جو بحر ہند کے ساحل پر واقع تھا' دیا۔ چونکہ اُنہوں نے اپنے معزز رفیق اور ڈپٹی لیڈر کو اپنے گھر مدعو کیا تھا' اس لئے دل کھول کر ضیافت کے اعلیٰ انتظامات کئے۔ کیوں نہ ہو قائداعظمؒ کا دست راست ان کے گھر کو رونق بخشنے والا تھا۔ اس لئے بھی انہوں نے کئی سو کی تعداد میں معززین شہر کو بلوایا تھا۔ ان کے قلب کے علاوہ ان کے گھر میں بھی اتنی وسعت تھی کہ مہمانوں کو بیک وقت بٹھلا کر کھانا کھلایا گیا۔ اللہ کے دیے سے گھر میں سب کچھ موجود تھا' اس لئے ظروف' کانٹا چھری' میز کرسی اور قالین وغیرہ نظام الدین اینڈ سنز کراچی سے کرایہ پر نہیں منگوانے پڑے۔ کنانور جانے کے لئے ہمیں اپنے عزیز دوست حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب کی اعلیٰ مہمان نوازی کو بادل ناخواستہ خیر باد کہنا پڑا۔ ہمیں کنانور میں موپلاؤں کے ممتاز مسلم رہنما سلطان عبدالرحمٰن علی راجہ نے اپنے ارکل محل میں ٹھہرایا اور نواب زادہ کے اعزاز میں شاہانہ ضیافت دی۔ پانچویں یادگار تقریب وہ عصرانہ تھا جو ایک اہل سادات' بزرگ کامل' مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے سب سے زیادہ معمر اور ممتاز رکن مولوی سید مرتضیٰ صاحب بہادر نے اپنے شہر ترچنا پلی میں دیا۔ سید صاحب فقیر منش تھے لیکن دل کے ایسے غنی کہ ان کے عصرانہ میں تمام شہر اُمڈ آیا تھا۔

الحاصل جنوبی ہند کا دورہ ہر نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہا۔ ان کی تمام تقاریر کا بالعموم یہ ماحصل ہوتا تھا کہ پاکستان کا قیام دنیا والوں کے لئے ایک اسلامی دارالتجربہ اور برصغیر ہند اور دنیا کے مسلمانوں کا گھر ہوگا جہاں اسلامی قوانین پر عمل کیا جائے گا۔ بعد کے حالات شاہد ہیں کہ

نوابزادہ صاحب کے زمانہ میں جو مسلمان اس ملک میں ہندوستان سے آئے' انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ یہ ہی قائداعظمؒ کا بنیادی نظریہ اور نصب العین تھا جس کی بدولت پاکستان عالم وجود میں آیا اور جس پر ان کے ساتھی اور بالخصوص نوابزادہ صاحب کاربند رہے اور آج بھی ہمارا یہ ہی حقیقی اور نہ بدلنے والا نظریہ ہے اور تا قیامت رہے گا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس نصب العین کے اعلان کے بعد علمائے کرام اور بالتخصیص شیخ التفسیر حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے علی الاعلان مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں قدم اٹھایا۔ اس کا تحریری ثبوت حضرت العلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی جانشین حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو حضرت مولینا نے میرٹھ مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس منعقدہ 31 دسمبر 1945ء میں ارشاد فرمایا تھا۔ مطبوعہ خطبۂ صدارت کے صفحہ 17' 18 کی حسب ذیل عبارت تبرکاً ناظرین کی اطلاع و استفادہ کے لئے درج کی جاتی ہے:-

''لیگ کے سب سے بڑے قائد مسٹر محمد علی جناح نے نومبر 1939ء عیدالفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو اس طرح مخاطب فرمایا تھا:-

''مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو بغور پڑھیں اور قرآنی پروگرام کو دیکھ کر اس پر عمل کریں۔ اس قرانی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کرسکتی۔'' آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے موقع پر انہوں نے ہزارہا مسلمانوں کی موجودگی میں نہایت تاکید سے فرمایا تھا کہ ''قرآن حکیم تمام مسلم قوم کا پشت پناہ' ملجاو ماویٰ اور قومی کشتی کا کھیون ہار ہے۔ ہم مسلمانوں پر فرض ہے کہ قرآن پاک کو بغور پڑھیں اور اس پر عمل کریں اور تعلیمات قرآنی کو سب سے مقدم سمجھیں۔'' اسی طرح کی نصیحتیں علیگڑھ' سیالکوٹ' دہلی' لاہور وغیرہ مختلف مقامات پر کیں۔ پھر ستمبر 1945ء گذشتہ عیدالفطر کے موقعہ پر جو پیغام انہوں نے دیا' وہ بہت ہی مفصل و مشرح تھا۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے کہ ''ہر مسلمان کا فرض اسلامی ہے کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت

کیا کرے تاکہ احکام الٰہی سے واقفیت ہو اور اُن پر عمل کرنے سے دنیوی معاملات میں خیر و برکت اور آخرت میں نجات حاصل ہو۔'' ابھی حال میں جناب نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے بمقام پشاور بموجودگی ارکان وعہدہ داران مجلس عمل اعلان فرمایا کہ پاکستانی علاقوں میں تمام نظام و انتظام حکومت قرآن پاک کے احکام اور اصولوں کے بموجب ہوگا۔''

چنانچہ انہی اعلانات سے متاثر ہوکر جناب ارباب عبدالغفور خاں صاحب خلیل مع جملہ افغانان جرگہ سرحد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔

جناب نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب صدر مجلس عمل آل انڈیا مسلم لیگ نے جو اپیل علماء سے لیگ کی حمایت کے لئے کی ہے، اس میں فرماتے ہیں۔ ''لیگ کا نصب العین پاکستان ہے اور لیگ اس پر تلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین پر اسلام کی سیاسی بنیادوں پر شریعت مطہرہ کی حکومت قائم کردے۔'' (منشور 11 نومبر 1945ء)

مذکورہ بالا اعلانات کی روشنی میں مجھے کہنے دیجئے کہ قرآن کریم کی ہدایات واحکام پر عمل کرنے کے لئے کچھ قیامِ پاکستان کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو پاکستان کا ملنا احکام شرعیہ اور تعلیماتِ قرآنیہ پر استقامت کے ساتھ ہمارے عمل درآمد رکھنے کا ثمرہ ہوگا۔''

دراصل یہ الفاظ انہوں نے ذمہ دار قائدین لیگ کو مخاطب کرتے ہوئے اور متردّدین کے شکوک وشبہات کو رفع کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شرکت اور مسلم لیگی اُمیدوارانِ اسمبلی کی حمایت میں رائے دینے کے لئے فرمائے تھے۔ ان اہم تاریخی بیانات اور قائداعظمؒ کی روایتی غیر مبہم وضاحت اور اشتراکیت کی شدید مذمت کے بعد یہ کہنا سراسر جھوٹ ہے کہ پاکستان کے مطالبہ کے وقت قائدین کے سامنے صرف تقسیم ہند کا مسئلہ زیرغور تھا اور ان کے ذہن پاکستان کے آئینی خاکہ سے خالی تھے اور انہوں نے مطلقاً یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ملک کس قسم کا ہوگا اور رعایا کے کیا حقوق ہوں گے۔ یہ کوئی گڈا گڈی کا کھیل تو نہیں تھا۔ یہ مسلمانانِ ہند کی موت و

زیست کا سوال تھا اور اگر آپ باور کریں تو یہ کہہ دوں کہ ان کی قسمت سے نہیں کھیلا جا رہا تھا۔ دراصل مطالبۂ پاکستان مسلمانوں کے مذہبی، لسانی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل کا واحد حل تھا۔ یہ کوئی فوری جذباتی مطالبہ بھی نہیں تھا۔ انہیں ہندو اکثریت کی قدیم مسلم کش پالیسی نے برسہا برس کے غور و خوض کے بعد اپنے مذہبی و ملی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسی اسلامی مملکت کو قائم کرنے کے لئے ابھارا تھا جہاں انہیں مذہبی، سیاسی، لسانی اور معاشی آزادی میسر ہو اور وہ سکھ اور چین کی زندگی گزار سکیں اور ان کا یہ نیا ملک ایسا مثالی ہو جسے کرۂ ارض کے تمام مسلمان اپنا کہہ سکیں۔ آج قائداعظمؒ اور ان کے مرحوم رفقاء کے مذکورہ بیانات وتقریروں کی تاویلیں کرنا اور پاکستانی ہو کر گاندھوی اور نہروی ذہنیت کا مظاہرہ کرنا ایک بیدار اور آزاد قوم کے افراد کے لئے ایک بچکانہ فعل ہے۔ خدارا حضرت شاہ نیازؒ کو اپنے متعلق حسب ذیل شعر کہنے کا موقعہ نہ دیجئے ؎

آنکھیں موندی ہوئی ہوں تو پھر دن بھی رات ہے

اس میں قصور کیا ہے بھلا آفتاب کا

قائداعظمؒ نے اپنی زندگی میں حیات ملی کے ہر شعبہ کی قرآن وسنت کی روشنی میں نشاندہی کر دی تھی۔ اب کوئی علمی بحث وتمحیص اور ترجمانی کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ ہمیں صرف گامزن ہونا ہے۔ اگر کوئی شکوک وشبہات ہوں یا الجھے ہوئے یا خود ساختہ مسائل کی مزید گرہ کشائی کرنے سے عقل قاصر ہو تو بحیثیت مسلمان اُس صحیفۂ آسمانی کی طرف رجوع کیجئے جو آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری کتاب کہہ کر نازل کیا گیا۔ اس میں میرا ایمان ہے کہ تمام ذہنی بیماریوں کا تیر بہ ہدف علاج اور مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا قطعی حل مل جائے گا۔

اسمبلی کی کارروائیوں پر روشنی ڈالنا یا اپنے ڈپٹی لیڈر کے گن گانا مقصود نہیں ہے۔ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ان کے زمانہ میں ان کی کمال ہوشمندی، تدبر اور اعلیٰ پارلیمانی صلاحیت کی وجہ سے اسمبلی میں پہلی مرتبہ ایک ایسی کارروائی عمل میں آئی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ 26 جولائی

1943ء کا واقعہ ہے جب بمبئی میں ایک گم کردہ راہ اور سر پھرے نوجوان خاکسار کے قاتلانہ حملہ سے سوائے چند خراشوں کے قائداعظمؒ بحکم خداوندی پاکستان حاصل کرنے کے لئے بال بال بچ گئے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہند نے اس عظیم بلا کے ٹل جانے پر سجدۂ شکر بجالایا۔ اس ہی سلسلے میں نوابزادہ نے اسمبلی میں حسب ذیل تجویز پیش کرتے ہوئے جو تقریر انگریزی میں کی' وہ آپکے ملاحظہ کے لئے پیش کی جارہی ہے۔

بمبئی کے ایک ہندو ممبر مسٹر جمنا داس' ایم' مہتا نے دوران تقریر قائداعظمؒ کے خلاف بہت زہر اگلا اور مسلمانوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف زہریلی تقریر کر کے تجویز کی بڑی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی۔ قائد ایوان سر سلطان احمد اور حسین بھائی لالجی نے تجویز کی تائید کی۔ اس نازک دور میں بھی چند حق شناس اور صداقت پسند غیر مسلم ممبران اسمبلی مثلاً سر کاوس جی جہانگیر' راؤ بہادر این شیوراج' سرہنری رچرڈسن اور اقتصادیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر پی این بنر جی ڈپٹی لیڈر نیشنلسٹ پارٹی نے تجویز کی پرزور تائید کی جسے ایوان نے قبول کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ مرکزی اسمبلی کی کارروائیوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح ہمارے ڈپٹی لیڈر نے صرف اپنے اور اپنی پارٹی ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوستان کے دارالعوام کی طرف سے جہاں مختلف مکتبۂ سیاست کے غیر مسلم ممبران اکثریت میں ہوتے تھے' تجویز پاس کرا کر قائداعظمؒ کی خدمت میں خراج عقیدت و تحسین پیش کرنے کا انوکھا طریقہ اور نرالا موقعہ نکالا اور مسلم لیگ کو صرف سرخ رو ہی نہیں بلکہ اُس کی شہرت کو چار چاند لگائے۔

قائداعظمؒ نے جب نوابزادہ صاحب کو حکومت ہند میں مسلم لیگ کی طرف سے وزیر مال نامزد کیا تو اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر کی جگہ خالی ہوگئی۔ خوش نصیبی سے خواجہ ناظم الدین صاحب بنگال مسلم لیگ کے باہمی نزاع کو رفع دفع کرنے کی خاطر صوبہ کو چھوڑ کر مرکز میں آ گئے تھے' انہیں ڈپٹی لیڈر منتخب کیا گیا۔ وہ ہمارے تیسرے اور آخری ڈپٹی لیڈر تھے کیونکہ 13 اپریل 1947ء کو مرکزی اسمبلی ختم کردی گئی۔ 12 اپریل کو ہمارے نیک دل و نیک خو ڈپٹی لیڈر نے اپنے اور ہمارے سب کے لیڈر قائداعظمؒ کے اعزاز میں ایک الوداعی ظہرانہ ترتیب دیا جس میں

اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے اراکین اور ایوانِ بالا کی مسلم لیگ پارٹی کے ارکان شریک ہوئے۔
اس تاریخی موقعہ کی تصویر شائع کی جارہی ہے جس میں آپ اپنے اُن چند بزرگوں کو بھی دیکھیں گے جنہیں آج جسمانی طور پر دیکھنے کے لئے ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں اور ترستی رہیں گی۔

یادش بخیر ایک چھوٹا سا لیکن بڑا سبق آموز واقعہ سنا کر اس باب کا اختتام کروں گا۔
سب واقف ہیں کہ نوابزادہ صاحب کو ڈپٹی لیڈری اس لئے چھوڑنی پڑی کہ قائداعظمؒ نے انہیں حکومت ہند کا وزیر خزانہ نامزد کیا۔ نوابزادہ چونکہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے بڑے ممتاز اولڈ بائے تھے اس لئے یونیورسٹی کے فدائی وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب نے جنہوں نے چاردانگ عالم میں تعلیم اور مسلم یونیورسٹی پر فنا ہو کر بقا حاصل کر لی تھی نوابزادہ صاحب کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا۔ ہم لوگ بھی بر بنائے رکنیت اسمبلی کورٹ کے ممبر تھے اور ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ وزیر مال نے اپنے سیلون میں ہم لوگوں کو ان کے ساتھ علیگڑھ تک سفر کرنے کی دعوت دی۔ ان کی طبیعت میں بلا کا مزاح تھا۔ اس کی آڑ لے کر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ بغیر ٹکٹ کے مفت میں سفر ہوگا۔ جی نہیں! آپ کے جیب میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ موجود ہونا چاہیے۔ سردار عبدالرب نشتر وزیر مواصلات بھی ہمسفر تھے۔ ڈبے میں خاصا ہجوم ہو گیا تھا جن میں وائسرائے کی کابینہ کے دو ممبر اور اراکین اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ بھی تھے۔ ٹی ٹی سی اور دیگر ریلوے افسران ان ممتاز رہنمایان مسلم لیگ سے ملنے اور دیکھنے کے لئے ہر جنکشن پر ڈبے میں داخل ہو جاتے۔ نوابزادہ صاحب کو مذاق سوجھا۔ انہوں نے ایک ٹی ٹی سی سے کہا کہ اب ملاقات ختم ہوگئی آپ ڈیوٹی پر ہیں۔ اپنے ریلوے ممبر کو سب کے ٹکٹ چیک کر کے کارگزاری دکھلائیے۔ ٹی ٹی سی نے بادل ناخواستہ ہم سب کے ٹکٹ چیک کئے۔ دیکھا آپ نے مذاق کے پردے میں اُنہوں نے کیا اچھی ترکیب نکالی جس سے ان کا بلند کردار اُجاگر ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مسلم لیگی ساتھیوں کے وقار کو بھی ریلوے ملازمین کی نظروں میں کتنا بلند کر دیا۔

آ کاش وانی دِلّی

لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند کے ایما پر یہ طے پایا کہ 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے کانگریس، سکھ اور مسلم لیگ کے نمائندے اپنی اپنی جماعتوں کی طرف سے مونٹ بیٹن پلان کی منظوری کا اعلان کریں۔ چنانچہ وائسرائے ہند نے حکومت برطانیہ، پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس، سردار بلدیو سنگھ نے سکھوں اور قائداعظمؒ نے مسلمانان ہند کی واحد مسلم نمائندہ جماعت کی طرف سے اپنی اپنی لکھی ہوئی تقریریں نشر کیں جن کے مسودے پہلے ہی سے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے تھے۔ سوائے قریبی حلقوں کے کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ ممتاز رہنما کیا بولیں گے۔ لہٰذا لوگ اُمید و بیم کی حالت میں نشریات کی گھڑی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ عام مقامات پر اور ریڈیو سیٹ کے پاس ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ زبان پر صرف دو سوال تھے: (1) کیا بولتے ہیں اور (2) کون سب سے اچھا بولتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گھڑی بھی آ گئی۔ آنکھیں ریڈیو پر جم کر رہ گئیں۔ گوش برآواز ہو گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی جنبش ہوئی، خاموش دُعا لیکن دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی۔ ایک کی نہیں لاکھوں کی عجز، خشوع و خضوع کے ساتھ عرش اعظم کی طرف روانہ ہوئی کہ قائداعظمؒ کو کامیابی عطا ہو اور ہمیں سرخ روئی۔ وائسرائے کی تقریر سے قبل اور اختتام پر برطانوی قومی ترانہ بجایا گیا۔ پنڈت جی نے تقریر ختم کرتے ہوئے ''جے ہند'' کا نعرہ لگایا اور سردار جی کا تو سوائے ''ست سری اکال'' کے اور کیا نعرہ ہو سکتا تھا۔ ان تینوں صاحبوں نے کیا کہا، میں وہ آپ کو سنا کر آپ کی سمع خراشی نہیں کروں گا۔ میں تو آپ کو صرف مجملاً بتلاؤں گا کہ میرے قائداعظمؒ نے کیا کہا اور کیا

کیا۔ دوسروں نے تو منظوری کا اعلان کیا لیکن میرے قائد نے انتہائی جمہوریت پسندی کا مظاہرہ کیا حالانکہ کچھ سفلہ طبیعت' کج بین اور کوتاہ ذہن ان کو ڈکٹیٹر کہا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ''پلان'' کے متعلق کچھ رائے زنی نہیں کر سکتا۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ مورخہ 9 جون 1947ء کو طلب کیا ہے جسے حق حاصل ہے کہ وہ اس تجویز کو قبول یا مسترد کرے۔ میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اس سے سفارش کروں کہ اس تجویز کو مان لے۔ دوسری بات جو ان کے جیسے آئین پسند اور مدبر مسلم راہنما کو کہنی چاہیے تھی' وہ یہ تھی کہ انتقال اختیارات انتہائی پر امن طریقہ سے عمل میں آنا چاہئے اور انہوں نے صوبائی مسلم لیگ سرحد سے اپیل کی کہ وہ سول نافرمانی کی پر امن تحریک کو واپس لے لے اور صوبہ سرحد کی خواتین و مردوں کے ایثار و قربانی کی داد دی جو انہوں نے شہری آزادی کے تحفظ کی جنگ میں کی تھی اور انہوں نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ صوبہ سرحد کے لوگ پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں شمولیت کے حق میں رائے دیں گے۔

تقریر ختم کرتے ہوئے وہ ایسی بات کہہ گئے جو کسی کے وہم و گمان اور ان کے مسودۂ تقریر میں نہیں تھی۔ آخر تھے مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر اس لئے مسلمان جیسی بات کی۔ ایسے نازک اور اہم موقعہ پر جب دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کے بننے یا بگڑنے کا سوال تھا تو وہ خالق حقیقی کی طرف رجوع ہو کر دعا گو ہوئے اور گھن گرج کے ساتھ کہا: ''پاکستان زندہ باد۔'' دراصل یہ دعا بھی تھی اور ''جے ہند'' کا جواب بھی۔ جن خوش نصیبوں نے یہ تقریریں سنیں' ان کا بیان ہے کہ قائداعظمؒ کی تقریر مقابلتہً سب سے بہتر تھی۔ اگر باور نہ ہو تو ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'' ریڈیو پاکستان سے فرمائش کر کے ریکارڈ سنیے اور خود فیصلہ کیجئے۔

امپیریل ہوٹل دہلی

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(اقبالؒ)

قائداعظمؒ نے 3 جون 1947ء کی نشری تقریر میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو طلب کرنے کا فرمایا تھا۔ کل اراکین کی متوقع حاضری کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ امپیریل ہوٹل کے وسیع وعریض ڈائننگ ہال میں جو پہلی منزل پر تھا' جلسہ منعقد کیا جائے۔ حسب اُمید دہلی میں ہندوستان کے تمام صوبوں سے اراکین کونسل اُس آئینِ مسلم لیگ کی رو سے جس میں انہیں اختیارات دیے گئے تھے' ہندوستان اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ انتظامات اونچی سطح پہ کئے گئے تھے۔ یو پی کے سالار صوبہ سلیمان جان صاحب یو پی کے مسلم نیشنل گارڈز کے ایک دستہ کے ساتھ آئے تھے۔ سید ہاشم علی صاحب انعامدار سالارِ صوبہ بمبئی جنہیں اپنے فرائض کا چوبیس گھنٹے شدت سے احساس رہتا تھا' اپنی جماعت کے ساتھ موجود تھے۔ چونکہ دلّی میں اجلاس ہو رہا تھا' اس لئے سالار صوبہ دہلی شیخ منظور الحق صاحب صرف میزبان ہی نہیں بلکہ جلسہ گاہ میں انتظام اور امن وامان قائم رکھنے کے جواب دار بھی تھے۔ دہلی پولیس کو پہلے سے نقص امن کے احتمال کی اطلاع ہوگی۔ اس لئے انہوں نے دفعہ 144 کے فوری نفاذ کا اعلان کر دیا جس سے ہم تمام لوگ بے خبر تھے۔ چنانچہ مسلم نیشنل گارڈز اور جملہ افسر اپنی وردیوں میں ملبوس لاٹھیوں سے مسلح ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میں جیسے ہی پہنچا' دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر محمد حیات نون میرے پاس آئے اور دفعہ 144 کے نفاذ کی اطلاع دی۔ میں نے فوراً حکم دیا کہ تمام

لاٹھیاں جمع کر دی جائیں۔ ہمارے سپاہی پہلے ہی سے بے تیغ تھے۔اب بے لاٹھی سپاہی ہو گئے لیکن یہ یقین کیجئے کہ سپاہی ضرور رہے۔

کونسل کے دو اجلاس ہوئے۔ کارروائی اور تقریریں درج کر کے میں آپ کو تھکانا نہیں چاہتا' آپ کو صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ پہلا اجلاس ظہرانہ اور ظہر کی نماز کے لئے ملتوی ہوا۔ کچھ ممبروں اور قائداعظمؒ کی تقریریں اور تجویز پر رائے شماری باقی تھی۔ اس لئے سہ پہر میں دوسری نشست ہوئی۔

دوسری نشست کا اجلاس شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جمعیتِ خاکساران کے چند سرپھرے خاکساروں نے بیلچوں کے ساتھ مسلح ہو کر قانون توڑا اور ہمارے نہتے سپاہیوں پر حملہ بول دیا۔ ہم لوگ کافی تعداد میں تھے۔ سمٹ کر سیڑھیوں کے پاس پہلے پلیٹ فارم اور دوسرے پلیٹ فارم پر جو کھانے کے ہال کے بڑے دروازے کے سامنے تھا' مورچے سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں ان کا مقابلہ اور اپنا دفاع کرنا تھا۔ ان کے پاس بیلچے تھے اور ہم خالی ہاتھ۔ فوراً تمام گارڈز کرسیوں' چھوٹی میزوں' کانچ کے گلاسوں اور پانی کے جگوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کھڑے ہو گئے۔ حملہ آور بھول گئے کہ ان کو دو قسطوں میں تقریباً 40 سیڑھیاں چڑھ کر ہمارے قلعہ کے بڑے دروازے میں داخل ہونا تھا جہاں ہمارا بے تیغ جنرل اپنی کونسل کے ساتھ غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ مقابلہ ہمارے دلِ تنومند نے جی کھول کر کیا کیونکہ ہمیں بالائی منزل پر ہونے سے بالادستی حاصل تھی۔ حملہ آور پولیس کی آنسو گیس اور گرفتاری سے بچنے کے لئے تتر بتر ہو گئے کیونکہ مسلح پولیس پہنچ چکی تھی اور اشک آور گیس کا بڑی افراط کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔ خاکسار تو یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ طاقت استعمال کر کے جلسہ کو درہم برہم کر دیں گے تاکہ برطانوی تجویز کو جسے وہ ملک کے مفاد میں نہیں سمجھتے تھے' کونسل قبول نہ کر سکے۔ صائب الرائے لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ خاکساروں کو اپنی رائے منوانے کیلئے یہ تشدد آمیز رویہ جو جمہوری آئین کے منافی ہے' ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مسلمانانِ ہند نے بھی اسے

پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ مسلمانوں کے نڈر جنرل نے کارروائی ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں روکی اور انتہائی اطمینان کے ساتھ اپنی کونسل کے مشورہ سے ہندوستان کو آزاد اور پاکستان کو قائم کرنے کی تجویز پاس کی۔

آپ سننا چاہیں گے کہ اس جھڑپ میں ہمارے کتنے سپاہی مرے اور کتنے زخمی ہوئے تو سنیئے۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ مقابلہ تو دلِ مضبوط نے بغیر کسی جسمانی نقصان کے خوب کیا۔ کرسیاں، چھوٹی میزیں، گلاس اور پانی کے جگ اتنے شہید ہوئے کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے سید شمس الحسن صاحب اسسٹنٹ سیکرٹری کو متوفین ومجروحین کے ورثا یعنی منیجر امپیریل ہوٹل کو مبلغ (چار ہزار) روپیہ بطور ہرجانہ ادا کرنے کے لئے دیے۔

مغرب کی نماز کے بعد جلسہ ختم ہوا۔ میں قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی کار تک گیا۔ کار میں بیٹھنے لگا تو فرمایا تکلیف مت کرو۔ میں نے عرض کیا ڈیوٹی پر ہوں۔ پوچھا کس نے ڈیوٹی پر لگایا ہے۔ میں نے کہا قائداعظمؒ نے سالارِ اعلیٰ بنا کر صرف عزت ہی نہیں بلکہ اختیارات بھی دیے ہیں۔ جب ہم ان کی قیامگاہ اورنگ زیب روڈ بعافیت پہنچے تو انہوں نے مجھے اپنی کار میں واپس جانے کے لئے کہا۔ جب وہ خیریت سے کمرہ کے اندر چلے گئے تو میں باہر آیا۔ ایک سردار جی سب انسپکٹر پولیس بے تحاشہ میری طرف لپکے۔ میں نے کہا یا اللہ خیر کہیں یہ دوسرا حملہ تو نہیں ہے لیکن وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور فرمانے لگے ”توسی نہ گبراؤ جی۔ توسی گھر جاؤ جناب۔ قائداعظمؒ دی حفاظت کرنا ساڈا کم اے۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ان کا فرض ادا کرنے چھوڑ کر ویسٹرن کورٹ لوٹا اور اس احساس کے ساتھ کروٹیں بدلتے ہوئے کہ میرے ساتھ میری جماعت کے کئی افراد اشک آور گیس سے بری طرح متاثر ہوئے ہیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں شب بسری کی۔ اللہ کے فضل سے یہ کٹھن راستہ بھی خیریت سے طے ہوا اور منزل مقصود (پاکستان) سامنے صاف نظر آنے لگی۔

(”پاکستان زندہ باد“)

پرانے شکاری

(نیا دام لائے پرانے شکاری)

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم

(حافظ)

دلی کے سرکاری حلقوں میں یہ خبر گرم تھی کہ فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلیک ہندوستان کے وائسرائے بنائے جائیں گے۔ اس خبر پر نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا کیونکہ ہندوستان میں ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا اور وہ اپنی سادگی اور خوش خلقی کی وجہ سے بہت ہردلعزیز بھی تھے لیکن بجائے ان کے لارڈ ویول کا غالباً ان کی مشرق وسطیٰ میں جرمنوں کے خلاف کامیاب جنگی خدمات کے صلہ میں تقرری کا اعلان ہوا۔ وہ نرے سپاہی تھے اور سیاسی جوڑ توڑ میں بالکل کورے۔

اس زمانہ میں برطانیہ میں لیبر پارٹی جو ہمیشہ سے کانگریس کی سرپرستی کرتی رہی' برسراقتدار تھی۔ لارڈ ویول چونکہ پوری طرح کانگریس کے ہتھے نہیں چڑھے تھے' اس لئے وہ کیسے قابل قبول ہوتے اور انہیں کیونکر رہنے دیا جاتا۔ مسٹر ایم کے گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے دلی میں بیٹھ کر ڈوری کھینچی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے عدل و انصاف کا خون کر کے اپنے کانگریسی دوستوں کو خوش کرنے اور نواز نے لارڈ ویول کو ہندوستان سے واپس بلوا لیا اور جرمن نژاد امیر البحر لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو جن کا انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق ہے' ان کا جانشین منتخب کیا۔

اس تقرری سے قبل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا کچھ عرصہ کے لئے بحیثیت سپریم کمانڈر مشرق بعید دہلی میں دفتر رہا تھا جو بعد میں کیانڈی (سیلون) منتقل ہوگیا۔ نئے وائسرائے بہت طمطراق سے دہلی آئے۔ ان کا اسٹاف ان لوگوں پر مشتمل تھا جنہیں ہندوستان کی سیاست اور امور مملکت سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ اس لئے ان سے جائز طور پر توقع کی گئی کہ یہ کھلے دل و دماغ والے کسی سیاسی فریق کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔ انہوں نے سیاسی رہنماؤں سے متعدد بار ملاقاتیں کیں اور منصوبہ بنایا لیکن اس ہی اثناء میں ایسی بھونڈی حرکتیں کیں جس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ ایک جانبدار انسان ہیں اور مسلم لیگ کے مفاد کو کیونکہ وہ قائداعظمؒ پر اپنا پھندا نہ ڈال سکے' نقصان پہنچا کر کانگریس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے مسٹر وی پی مینن کو جو سردار ولبھ بھائی پٹیل کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے' اپنا مشیر بنایا جنہوں نے کانگریس کی سواری کو گزارنے کے لئے صاف ستھرا راستہ پاٹ کر رکھدیا۔ دوئم ان کی پنڈت جواہر لال نہرو سے یہاں تک دوستی تھی کہ اُنہوں نے پنڈت جی کو مشرق بعید کے جنگی محاذ کا اپنی معیت میں سیلون بلوا کر پانچ روزہ دورہ بھی کرایا تھا۔ الحاصل پنڈت جی نے وائسرائے پر اور وائسرائے نے پنڈت جی پر ذاتی اثرات کے بڑے گہرے نقوش قائم کئے تھے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے بھی اپنی موجودگی اور مداخلت سے ان نقوش کو اتنا ابھار دیا کہ وہ اب سب کو صاف صاف نظر آنے لگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن عشق پیچاں کی طرح پنڈت جی سے لپٹ گئیں۔ مولٰنا ابوالکلام آزاد نے اپنی انگریزی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ ''لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا جواہر لال پر بہت زیادہ اثر ہے۔ وہ بلا کی ذہین ہی نہیں بلکہ گرویدہ کرنے والا دوستانہ مزاج رکھتی ہیں۔'' ان گہرے دوستانہ تعلقات نے کیا کیا رنگ دکھلائے اور انصاف کا کس کس طرح گلا گھونٹا' یہ مسلمانان ہند کی دردبھری کہانی اور ہندوستان کی جانبدارانہ تقسیم کی تاریخ کا ایک کھلا اور سیاہ باب ہے جسے تاریخ کا طالب علم ہر وقت پڑھ سکتا ہے۔

اگرچہ وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے اختیارات کی منتقلی کے لئے پندرہ مہینہ کی مدت مقرر کی تھی لیکن برطانوی حکومت کے آخری خودسر وائسرائے نے حکومت برطانیہ کا تین مہینہ کی قلیل مدت میں تختہ اُلٹ کرر کھ دیا۔ بیچارے ایٹلی یہ خبر سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس جلد بازی سے وہ خون خرابہ ہوا کہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک خونیں باب بن گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ سمجھے کہ تقسیم ہند ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر جاپان کو نیست و نابود کرنے کے مترادف ہے لیکن وہ بھول گئے کہ یہاں تو ایک نئے ملک پاکستان کی تخلیق کرنی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تو ہندوستان میں اپنے وعدہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ وہ صرف تخریب کے ماہر ہیں اوران کے پاس تعمیری کاموں کا فقدان ہے۔ میں اپنے قائداعظمؒ کا نام لے کران کے حوالہ سے کچھ عرض کرتا لیکن آپ کے سامنے مولٰینا ابوالکلام آزاد صاحب کی کتاب سے خودان کے الفاظ دہرا کر اکتفا کروں گا۔ جب مولٰینا نے وائسرائے سے کہا کہ تقسیم سے پہلے ہی کلکتہ، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہورہے ہیں تو تقسیم کے بعد خون کی ندیاں بہیں گی اور برطانیہ اس کے لئے موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا۔ مولٰینا فرماتے ہیں کہ وائسرائے نے بغیر ایک لمحہ پس و پیش کئے جواب دیا: ''میں کم از کم اس سوال کے بارے میں آپ کو مکمل یقین دلاتا ہوں کہ فساد اور قتل وخون نہیں ہوگا۔ میں سول حاکم نہیں بلکہ سپاہی ہوں۔ اصول تقسیم قبول ہوجانے کے بعد میں احکامات جاری کروں گا کہ ملک بھر میں کہیں بھی کوئی فرقہ وارانہ فساد نہ ہو۔ اگر کہیں جھگڑے کا شائبہ بھی ہوگا تو مسلح پولیس کی بجائے برّی و فضائی فوج سر کچلنے کے لئے استعمال کی جائے گی''، لیکن افسوس، ہماری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کر نیرو سارنگی (فڈل) بجاتا رہا اور روم جلتا رہا۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ کانگریس جو گھروں کی چھت پر سے گلے پھاڑ پھاڑ کر آزادی کا مطالبہ کرتی تھی اور انگریزوں کو دشمنِ جانی کہہ کر اپنے سورما ہونے کے ڈنکے بجاتی تھی، آج وہ انگریز کے قدموں میں جا کر پڑ گئی اور اسے اپنا اَن داتا مان لیا۔ کانگریس اس سے بڑھ کر اپنے

ذہنی دیوالیہ پن کا اُور کیا ثبوت دے سکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر لائق وفائق موزوں ہندوستانی موجود تھے۔ قدرت نے بھی بڑے بول کی کانگریس کو خوب سزا دی۔ آپ جانتے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کا بانی اور پہلا صدر انگریز تھا اور اب آزاد کانگریسی بھارت کے چہرہ پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کیلئے پہلا گورنر جنرل بھی انگریز بنا۔ مولٰینا فرماتے ہیں کہ ''برطانوی روایت کے مطابق آزاد ہونے والا ملک اپنے کسی باشندے کو جیسا کہ اُور ملکوں میں ہوا ہے' گورنر جنرل مقرر کرسکتا ہے لیکن ہم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اپنا پہلا گورنر جنرل اس توقع کے ساتھ مقرر کیا کہ پاکستان بھی انہیں اپنا گورنر جنرل بنائے گا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کی یہ بڑی سوچی سمجھی چال تھی اور اس کے ذریعہ تقسیم ہند کی تجویز کو پیٹھ میں چھرا گھونپ کر کالعدم کرنے کا ارادہ تھا۔ اس تخریبی کام کی تکمیل کے لئے وائسرائے نے بھی تہذیب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر قائداعظمؒ پر کمند پھینکی اور ڈھیٹ بن کر خود کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کی پیشکش اور خواہش ظاہر کی۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تقسیم ہند کے سب سے بڑے بنیادی اصول کی مشترکہ گورنر جنرل کی تقرری سے بیخ کنی ہوتی اور دُنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی کہ تقسیم ہند کا مفت میں ڈھونگ رچایا گیا۔ علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ کانگریس کا پٹھو انگریز گورنر جنرل پاکستان کا سچا بہی خواہ ہوتا۔ وہ تو خود کو پہلے ہی سے پنڈت۔جی اور کانگریس کے ہاتھوں بیچ چکا تھا۔ وہ بھارت کی ملکی اور انتظامی وسعت کی وجہ سے ہمیشہ راجدھانی یعنی دہلی میں براجمان رہتا اور پاکستان کی طرف سے غفلت برتتا۔ قائداعظمؒ نے ان سے صرف ایک سوال کیا تا کہ وہ صحیح خدوخال میں نظر آجائیں کہ ''کسی اہم معاملہ میں اگر دونوں ملکوں میں اختلاف رائے ہو تو آپ کیا کریں گے؟'' کانگریس نواز امیر البحر وائسرائے اس سوال کا کیا جواب دیتے۔ ان کی آبدوز کشتی بحر تلاطم میں ایسی غرق ہوئی کہ بلبلہ تک نہ اٹھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ بہت سٹ پٹائے اور بوکھلائے کیونکہ وہ تو ایک بہت گہری سازش کے تحت دونوں ملکوں کے بیک وقت گورنر جنرل بن کر پاکستان کا بیڑا

غرق کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنی اس چال میں بری طرح ناکام ہوئے تو اب ان کے لئے صرف ایک ملک یعنی بھارت کی گورنر جنرلی رہ گئی جس کے قبول کرنے میں ان کی بڑی سبکی و رسوائی تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے نکل بھاگنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے جو سازش اور فریب کا پھندا قائداعظمؒ پر پھینکا تھا' وہ ان کے گلے کا ہار بن گیا۔

یہ ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مشترکہ گورنر جنرلی کے راز کی حقیقت۔ دیکھا آپ نے قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت اور صحیح قیادت جس نے پاکستان کو مزید الجھنوں' نقصان اور بربادی سے بچالیا۔

''قائداعظمؒ زندہ باد''
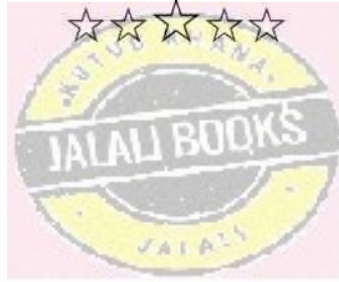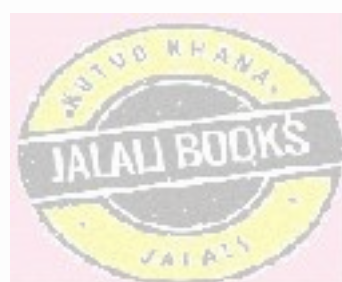
مملکتِ خداداد پاکستان

جب سے خالق کونین نے اس جہان فانی کی تخلیق کی، روزانہ دن نکلتا ہے اور رات ہوتی ہے۔اس ہی طرح معمول کے مطابق چودہ اگست 1947ء کا آفتاب لیلتہ القدر کی برکتوں اور عبادتوں والی آغوش سے اپنی چمک دمک کے ساتھ اُفق سے طلوع ہوا اور مژدہ لایا کہ آج کا دن نہایت مقدس ومتبرک اور آج اللہ کے مومن بندوں کا چھبیسواں روزہ اور لیلتہ القدر ہے۔اللہ اللہ کیسا مبارک مہینہ، کیسی برکتوں والی رات اور کیسا مسعود دن ہے۔جس کے متعلق کہا گیا ہے:۔

''اُنزِلَ فِیہِ الْقُرآن ''اور''لَیلَۃُ الْقَدْرِ خَیرٌ مِنْ اَلْفِ شَھْرٍ ''

دستورِ خداوندی کے مطابق تا قیامت یہ روزِ سعید آتا رہے گا لیکن آج تو یہ بفضل ربیؒ ی ایک خاص مژدۂ روح پرور و جانفزا لے کر آیا کہ آج دنیا کا پانچواں بڑا ملک یعنی مسلمانوں کی سب سے بڑی ایک آزاد اسلامی مملکت ''پاکستان'' عالم وجود میں آ گیا اور اس خطہ کے مسلمان انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ستم ظریفی دیکھئے کہ ہندوؤں کے پنڈتوں اور جوتشیوں نے متفقہ اعلان کیا تھا کہ 14 اگست کا دن ہندوستان کے لئے بہت منحوس ہوگا۔اس لئے انہوں نے اپنا یومِ آزادی دوسرے دن یعنی 15 اگست کو منایا اور اختیارات کی منتقلی آدھی رات کے بعد ہوئی۔

مالک الملک نے جس کی قدرت میں ''تُؤتِی الْمُلْکَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْکَ مِمَّن تَشَآءُ'' ہے، قائداعظمؒ کو پہلے عزت بخشی اور اس طرح کانگریس پر برتری عطا کی۔اقبالؒ کے تصورِ اسلامی مملکت کو ربّ العالمین نے اپنے اس نیک بندہ کے ہاتھوں حقیقت بنا

کر مسلمانوں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سے نوازا۔ اللہ نے علامہ اقبالؒ کے اس انتخاب کی بھی لاج رکھ لی جس کی رُو سے انہوں نے قائد اعظمؒ کو اس کام کی انجام دہی کے لئے لندن سے ہندوستان بلوایا تھا۔ واحسرتا! آج اقبالؒ ہم میں موجود نہ تھے ورنہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنے اس خواب کی جسے انہوں نے 17 سال پہلے دیکھا تھا، تعبیر دیکھتے اور اپنے شعر ؎

می رسد مردے کہ زنجیر غلامی بہ شکند
دیدہ ام از روزنِ دیوار زندان شما

کو پورا ہوتے ہوئے دیکھتے۔

31 توپوں کی سلامی نے پاکستان کے جنم لینے کی خوشخبری سنائی۔ سننے والوں کے سر فخر و مباہات سے اونچے ہوئے لیکن فوراً ہی چشم پرنم کے ساتھ کعبہ کی طرف رخ کر کے کمال بندگی و عجز سے ربّ کعبہ کے حضور سجدھائے شکر بجالائے کہ آج سے وہ غیروں کی غلامی سے آزاد ہوئے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 14 اگست کو پاکستان اسمبلی کی ایک سادہ سی تقریب میں اسمبلی کے صدر اور پہلے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناحؒ کو پاکستان کے علاقوں کے اختیارات منتقل کئے۔ اس ہی شب گورنمنٹ ہاؤس میں پاکستان کے نئے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے ایک بہت بڑا استقبالیہ دیا جس میں ممتاز شہریوں کے علاوہ حکومت برطانیہ کے آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کی لیڈی شریک ہوئیں۔ انہیں دہلی جانے کی عجلت تھی کیونکہ آدھی رات کے بعد کسی شبھ گھڑی میں کانگریس تقسیم ہند کی تجویز (قرارداد لاہور) کے مطابق صرف بھارت کی حکومت کے اختیارات سنبھالنے اور ایک انگریز گورنر جنرل بنانے والی تھی۔

اللہ کی قدرت دیکھئے کہ دو ممتاز ترین کٹر کانگریسی مہاتما گاندھی اور راجگو پال اچاریہ نے تقسیم ہند کو قبول کرلیا۔ بیچارے راجہ جی نے جب اپنا فارمولا تقسیم ہند کے متعلق پیش کیا تھا تو قائد اعظم اس سے بالکل غیر مطمئن تھے۔ اس زمانہ میں راجہ جی نے اپنا فارمولا منوانے کے لئے

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبری، وزارتِ عظمیٰ اور کانگریس کی رکنیت چھوڑ دی تھی لیکن ان کے اس اقدام سے کچھ ہوا گیا نہیں۔ بیچارے خالی ہاتھ رہ گئے اور پینترا بدل کر بعد میں اُنہوں نے تقسیم ہند کو گئو ماتا کے دو ٹکڑے کرنے سے تعبیر کیا۔ دوسرے صاحب مہاتما گاندھی نے تو ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ میری زندگی میں نہیں بلکہ میری لاش پر سے گزر کر تقسیم ہند کرنا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کو کانگریس اور مہاتما گاندھی سے منوانے میں وائسرائے ہند نے برٹش ڈپلومیسی کا بھرپور استعمال کر کے ان لوگوں کو زیر کیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے عظیم رہنما نے اپنی تن تنہا سعیٔ پیہم اور توکّلِ خداوندی سے صرف کانگریس ہی کو نہیں بلکہ برطانیہ کو بھی مملکت خداداد پاکستان قائم کر کے شکست فاش دی۔

اس گہما گہمی اور عدیم الفرصتی میں بھی ہمارے پہلے گورنر جنرل قائداعظمؒ اپنے اُن قومی رضا کاروں کو جنہیں ان کی تنظیم نو کے موقعہ پر آل انڈیا مسلم لیگ دہلی کے اجلاس عام میں ''مسلم نیشنل گارڈز'' کا لقب بخش کر نوازا تھا' بھولے نہیں بلکہ 15 اگست 1947ء کی صبح گورنمنٹ ہاؤس میں سلامی لے کر اُن کی عزت افزائی اور قدر دانی کی۔ یہ بات اپنی جگہ ایسی وقیع اور اہم تھی کہ وہ تاریخ بن کر رہ گئی کیونکہ مسلم نیشنل گارڈز کی سلامی کا جشنِ آزادی کے پروگرام میں کہیں ذکر تک نہ تھا اور اس لئے ہم بھی اس تقریب کا شایانِ شان انتظام نہ کر سکے۔ صوبہ بمبئی' صوبہ سندھ' صوبہ پنجاب یا اُن صوبوں کے مسلم نیشنل گارڈز جو کراچی میں موجود تھے' پریڈ میں شریک ہوئے اور اپنی گہری عقیدت' محبت اور شیدائیت کا مظاہرہ کر کے اس تقریب کو جشنِ آزادی کا ایک جزو اور خود کو قابل رشک بنا دیا۔

مملکت خداداد پاکستان کے وجود سے قبل کا ایک واقعہ ہے جس کا اندراج بہت ضروری ہے کیونکہ اس کا تعلق قیامِ پاکستان سے ہے۔ قائداعظمؒ نے پاکستان آنے سے قبل طے کر لیا تھا کہ یومِ آزادی پر یعنی 14 اگست 1947ء کو دنیا کے دو بڑے ملکوں کی آزاد فضا میں پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا کر کرۂ ارض کے جغرافیہ میں ایک نئے اسلامی ملک کے اضافہ کا اعلان کریں گے۔

اس کی تکمیل کے لئے دو جواں سال باہمت آزمودہ مسلم لیگیوں کا اس یقین واثق کے ساتھ انتخاب کیا گیا کہ چاہے انہیں کتنا ہی ایثار کرنا پڑے، وہ اس عہدہ کو قبول کر کے پاکستان کی خدمت کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ پہلے خوش نصیب انسان مرزا ابوالحسن صاحب اصفہانی تھے جن کا تقرر بحیثیت سفیرِ نئی دنیا یعنی امریکہ میں نئے ملک پاکستان کا نیا جھنڈا لہرانے کے لئے کیا گیا۔ اصفہانی صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن ہی نہیں بلکہ قائداعظمؒ کے چند معتمدین خاص میں سے تھے۔ انہوں نے اور ان کے بڑے بھائی مرزا احمد اصفہانی نے قائداعظمؒ سے خاص عقیدت کی وجہ سے مسلم لیگ کے نازک دور میں ناقابل فراموش خدمات انجام دے کر مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت بنانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ قائداعظمؒ کی وہ رفاہی اور تعمیری تجاویز جو بروئے کار آنے کے لئے لوگوں کا پیسوں کیلئے منہ تکا کرتی تھیں، ان دونوں بھائیوں کے ایک اشارۂ ابرو سے مکمل ہو جاتیں۔ اُن کا ستارۂ قسمت اوجِ اقبال پر تھا۔ قومی یا نجی جو کچھ بھی کام وہ اپنے ہاتھ میں لیتے، اُس میں صدفی صد کامیابی یقینی ہو جاتی۔ ہندوستان میں لوگوں کے حسن ظن کی پرواز اتنی بلند ہوگئی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ اصفہانی کے ہاتھ اگر مٹی کو چھو دیں تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ آج کل وہ اپنی پرانی جلیل القدر خدماتِ سفارتی اور وزارتی تجربات کا خزینہ لئے ہوئے عملی سیاست سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ چونکہ دلِ دردمند رکھتے ہیں اور حصول پاکستان میں نمایاں حصہ لیا تھا اور قائداعظمؒ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں، اس لئے کبھی کبھار قوم کو تنبیہہ کر کے غلط اقدام سے روکتے ہیں۔ قائد کے اصول اور تعلیم کو اُجاگر کرتے ہیں اور قائداعظمؒ کی عظمت پر آنچ نہیں آنے دیتے۔

دوسرے صاحب جن کا ہمارے پرانے آقا یعنی انگریزوں کے ملک کی راجدھانی لندن میں تقرر ہوا، وہ بڑے باپ کے ہر زاویۂ نگاہ سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ برطانیہ میں یونین جیک کے برابر ہمارا ملکی پرچم لہرانے کے اہل سمجھے گئے۔ ان کے پدر بزرگوار سر ابراہیم رحمت اللہ کا ہندوستان کے ممتاز مسلمان رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا۔ میری بدنصیبی کہ ان سے کبھی شرف نیاز

حاصل نہ ہوا کیونکہ اس زمانہ میں میری ملی اور سیاسی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

جناب حبیب ابراہیم رحمت اللہ صاحب ہمارے بڑے کامیاب سفیر ثابت ہوئے۔ ان کی برطانیہ کے تاج وتخت کے حقداروں، انگلستان کے رؤسا وامراء میں بڑی رسائی تھی۔ جب تک وہ انگلستان میں رہے، ہندوستانی سفیر کا رنگ پھیکا رہا۔ ان کی اس کامیابی میں ان کی ہنس مکھ رفیقۂ حیات کا بڑا دخل تھا۔ سفیر صاحب نے ایک پرانے مشہور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے اپنے ریس کے گھوڑوں کے اصطبل اور لندن کے ریس کورس میں اپنا جھنڈا بھی لہرا دیا۔ جب وہ سفارت چھوڑ کر وطن لوٹے تو وزیر اور گورنر بنے۔ وہ سیاست کو کب کا چھوڑ بیٹھے ہیں اور اب تو انہوں نے اپنی مرضی سے آبائی پیشہ یعنی تجارت کو از سر نو اختیار کیا ہے اور آج کل صرف تاجر ہو کر رہ گئے ہیں۔

کسی اور جگہ صاف صاف الفاظ میں یہ عرض کر دیا گیا ہے کہ یہ پیشکش نہ تو کوئی تاریخی مرقع ہے اور نہ سوانح حیات، یہ تو چند آنکھوں دیکھے حالات ہیں جن سے بیشک تاریخ بن سکتی ہے اور اُن کے مطالعہ سے اُن لوگوں کی عظمت اور کردار کا پتہ لگ سکتا ہے جنہوں نے ہماری بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔

آیئے آپ کو ایک اور واقعہ سنائیں۔ ہمارے پہلے گورنر جنرل نے عہدہ سنبھالتے ہی ایک ایسا بڑا اقدام کیا جس سے سب حیران رہ گئے اور جس گتھی کو انگریز اپنے صد سالہ دور حکومت میں کبھی سلجھا نہ سکے تھے، اسے قائداعظمؒ نے وزیرستان سے فوج ہٹا کر جہاں انگریز کروڑ ہا روپیہ خرچ کر کے زیادہ تر اپنے وقار اور بعد میں ہندوستان کے دفاع اور آزاد پٹھانوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں رکھتے تھے، مسئلہ کو حل کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی آزاد قبائلیوں کے ساتھ رات دن جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن انگریز انہیں کبھی مغلوب نہ کر سکے۔ بسا اوقات انگریز اپنی بے بسی کے پیش نظر خطیر رقومات ادا کر کے اپنی عورتوں اور افسروں کو رہا کراتے جنہیں پٹھان، اُن چھاؤنیوں سے جہاں چڑیا تک پر نہیں مار سکتی تھی، اغوا کر کے لے جاتے۔ گرفتاری کے بعد وہ ان قیدیوں کی روایتی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور بعد میں زر کثیر وصول کر کے ان کو رہا کر دیتے۔ ہمارے قائداعظمؒ نے افواج کو واپس بلواتے ہوئے آزاد قبائل کے لوگوں سے کہا کہ

بحیثیت مسلمان تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرو۔ دیکھئے کس خوبصورتی سے غیور پٹھانوں کو یہ جتلایا گیا کہ اب اس نئے ملک کے تم مالک ہو اور انگریز حاکم جو غاصب تھا' دستبردار ہوگیا ہے اور اب اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ اسلامی رواداری' اخوت اور تدبر کا یہ ایسا شاہکار تھا کہ امن و امان فوراً قائم ہوگیا۔ سرحدوں کی خود بخود حفاظت ہوگئی اور آزاد قبائلیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے۔ مزید برآں پاکستان مستقل زیر باری سے بچ گیا۔

ایک اور واقعہ گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق صرف گورنر جنرل کی ذات گرامی اور حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب کے خوش آئند یا تاریک مستقبل سے تھا۔ اوائل 1948ء کی بات ہے جب خواجہ شہاب الدین صاحب پاکستان اسمبلی میں سرکاری چیف وہپ تھے اور انہیں دو یا تین ہفتہ کے لئے ہندوستان میں پاکستان کا قائم مقام ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں ان کے ذریعہ حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب کو جو دہلی میں ہندوستان کی قانون ساز جماعت کے رکن تھے' قائداعظمؒ نے زبانی پیغام بھیجا کہ وہ مصر میں پاکستان کے سفیر کا عہدہ قبول کریں۔ حاجی صاحب قائداعظمؒ کے اُن چند سرپھرے شیدائی ساتھیوں میں سے تھے جو بے چون و چرا صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتے تھے۔ فوراً راضی ہوگئے۔ میں حاجی صاحب سے دیرینہ رفاقت کی بنا پر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سیٹھ صاحب نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ ہندوستان چھوڑنے سے انہیں کیا کیا ایثار کرنے پڑیں گے اور نئے وطن پاک میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ یہ وہ زرّیں زمانہ تھا کہ ہر خادم ملت ذاتی مفاد کو قوم اور ملک پر خوشی سے نچھاور کرتا اور کسی صلہ کا طالب نہیں ہوتا تھا۔ الحاصل وہ اہل وعیال کے ساتھ فوراً پاکستان آ گئے۔ مصر' سعودی عرب اور سیلون میں سفارت کے عہدہ پر فائز رہے۔ عام رائے یہ ہے کہ اُنہوں نے غیر ممالک میں پاکستان کا بول بالا کیا اور اس کے نام کو روشن کیا۔ یہ ہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ یہ تو قائداعظمؒ کا انتخاب تھا لیکن کچھ مغرب زدہ بڑے بڑے پاکستانی حکام کو ہم نے شکایتاً یہ بھی کہتے ہوئے سنا ہے کہ حاجی صاحب زاہد خشک تھے اور وہ خمر آلود مشروبات کی بجائے کوکا کولا اور لیموں کا

شربت پلایا کرتے تھے۔ ان کے خلاف ان صاحبوں کو ایک اور شکایت تھی کہ وہ سوٹ کے بجائے شیروانی زیب تن کیا کرتے تھے۔

یہ قانونِ فطرت ہے کہ چمگادڑ کی دن میں آنکھیں بند رہتی ہیں اور اس کی آنکھیں صرف رات میں کھلتی ہیں۔ اس لئے ان شپّرہ چشم کی بات پر کان دھرنا اور اس سلسلہ میں کچھ کہنا بے سود ہے۔ اب آپ یہ بھی سن لیجئے کہ آج کل حاجی صاحب کس حال میں ہیں۔ وہ کبھی کبھار بوری بازار اور ایمپریس مارکیٹ کے گلی کوچوں میں ایک چھوٹا سا جھولا ضروریاتِ زندگی سے پُر ہاتھ میں تھامے ہوئے اور جوتے چٹخاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے خوددار اور قانع انسان ہیں، اس لئے زندگی کے تلخ ایام کو صبر وقناعت اور خاموشی سے گزار رہے ہیں۔ میں بارہا ان کی آخری تمنا کو بہت بے بسی و یاس کے ساتھ سنتا ہوں لیکن برابر دعا کرتا رہتا ہوں کہ اے مجیب الدعوات! ان کو اِس اور اُس دنیا میں ان کی آخری آرزو یعنی قربت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب کر۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں قائداعظمؒ عادتاً بہت کفایت شعار تھے اور فضول خرچی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ بحیثیت امین کے دوسروں کا پیسہ خرچ کرتے ہوئے انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ ذیل کا واقعہ میرے اس بیان کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے جو حکمرانوں کے لئے مشعل راہ ہونا چاہئے۔ ہوا یوں کہ گورنر جنرل کے عہدہ کا حلف لینے کے بعد قائداعظمؒ کے لئے لازمی ہوگیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے دورہ پر تشریف لے جائیں۔ دورہ کا جب پروگرام مرتب ہونے لگا تو انہوں نے فرمایا کہ مشرقی پاکستان جاتے ہوئے وہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھیں گے۔ سوال پیدا ہوا کہ اس پرانے سڑے گلے ڈکوٹہ جہاز سے جو تقسیم ہند کے وقت ہمارے گورنر جنرل کے حصہ میں آیا تھا، کیونکر سلامتی کے ساتھ اتنا طویل سفر کیا جاسکتا ہے جب تک کہ دہلی میں صفدر جنگ یا پالم کی طیران گاہ پر پٹرول نہ لیا جائے۔ ان حالات میں ماہرین وزارت دفاع کے مشورہ اور وزیر دفاع یعنی وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں کی رائے سے یہ لازمی ہوگیا کہ قائداعظمؒ سے عرض کیا جائے کہ وہ کے، ایل، ایم کے مخصوص طیارہ سے سفر کریں۔ جب نوابزادہ صاحب نے یہ تجویز پیش کی تو قائداعظمؒ نے ہدایت فرمائی کہ معلوم کیا جائے کہ کتنی رقم

صرف ہوگی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ دوطرفہ سفر پر تخمینہ کے مطابق پانچ سات لاکھ روپیہ یا اس سے کچھ زیادہ خرچ ہوتا۔ سرکاری خزانہ جیسا کہ سب جانتے ہیں، خالی ہی خالی تھا۔ قرض لینے یا کسی غیر ملک سے بھیک مانگنے کا قائداعظمؒ جیسے غیور اور خوددار انسان کے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ ایک پل کے لئے گوارہ کرتے کہ ٹیکس دہندگان کی گاڑھی کمائی کا پیسہ اپنے آرام اور تفریح کے لئے اس بیدردی سے خرچ کیا جائے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کے ڈکوٹہ میں پٹرول کا ایک اور ٹینک نصب کیا جائے تا کہ وہ لمبی مسافت ایک ہی پرواز میں طے کرسکیں۔ ماہرین چیختے اور سر پیٹتے رہے اور لیاقت صاحب کی بھی ایک نہ چلی، قائداعظمؒ پروگرام کے مطابق کراچی سے لاہور تشریف لے گئے۔ اللہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ اس ہی فرسودہ ڈکوٹہ سے انتہائی خطرہ مول لے کر مشرقی پاکستان کے پہلے اور آخری دورہ پر تشریف لے گئے اور بخیریت لوٹ آئے۔

ایک اور کافی پریشان کن حقیقت تھی جس کی وجہ سے قائداعظمؒ مشرقی پاکستان فوراً تشریف لے جانا چاہتے تھے تا کہ صوبائی نظام کو مستحکم کریں۔ اس واقعہ سے بحکم قائداعظمؒ میرا بھی کچھ تعلق ہوگیا تھا۔ اس لئے پورے وثوق وصداقت کے ساتھ مطالعہ کی زحمت دیتا ہوں۔ مجھے ہندوستان سے آئے ہوئے مشکل سے ہفتہ عشرہ ہوا تھا کہ ایک شام وزارتِ امور خارجہ کے سیکرٹری محمد اکرام اللہ صاحب قائداعظمؒ کا پیغام لائے کہ وہ مجھے برما میں سفیر بنا کر بھیجنا چاہتے ہیں۔ وزیراعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری وزیر علی صاحب نے جو میرے ایک بہی خواہ، نیک دل اور مخلص دوست ہیں، مجھے تقرریٔ سفارت کے سلسلے میں کچھ معلومات بھی فراہم کی تھیں لیکن جب قائداعظمؒ ڈھاکہ پہنچے تو اُنہوں نے مشاہدہ فرمایا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارتی ںیّا ہچکولے کھا رہی تھی اور ان کے نوجوان سیاسی حریف محمد علی بوگرہ خواجہ صاحب کے ہاتھوں سے پتوار چھین کر نئے ناخدا بننے کو تیار تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے ملک کے وقار اور مفاد کو ٹھیس لگتی، لہٰذا قائداعظمؒ نے محمد علی بوگرہ کو برما کا سفیر بنا دیا جس سے مجھے نواب زادہ کی رفاقت اور آخری خدمت کی مزید سعادت نصیب ہوئی۔

ہمارے محبوب گورنر جنرل باوجود خرابیٔ صحت کے کھیل کود کی ملکی سطح پر تحریک سے غافل

نہیں رہے۔ فاضل وقت ان کے پاس بہت کم ہوتا تھا کیونکہ ان کا تمام وقت قوم اور ملک کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ ہمارا نیا ملک چونکہ اقوام متحدہ کا ممبر تھا' اس لئے دنیا کی کانفرنسوں میں اس کی شرکت اور نمائندگی ضروری تھی۔ اس ہی طرح اولمپک کھیلوں میں نمائندگی اور شرکت ناگزیر تھی۔ نوزائیدہ ملک میں سہولتوں کی نایابی اور نامساعد حالات کا عذر کرنا ملکی مفاد میں نہ تھا کیونکہ قائداعظمؒ اس خداداد مملکت کو ہر میدان میں دنیا والوں اور دنیا سے بار بار روشناس کرانا چاہتے تھے۔ خدا بھلا کرے ہمارے کھلاڑی دوست احمد ہارون جعفر صاحب کا جو صرف موقعہ شناس ہی نہیں بلکہ پاکستان کے سچے بہی خواہ اور خادم بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کے محدود وسائل کو اکٹھا کیا اور اپنے پرانے تجربے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر پہلی مرتبہ پاکستان اولمپک کھیلوں کا اپنی صدارت میں آغاز کیا اور اس طرح پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ قائداعظمؒ اس جماعت کے مربیِّ خاص تھے۔ قائداعظمؒ نے 23 اپریل 1948ء کو پولوگراؤنڈ کراچی میں اولمپک کھیلوں کا افتتاح فرمایا۔ میں اس یادگار موقع کی تصویر کو جز و کتاب بنا کر محفوظ کر رہا ہوں۔

کھیلوں کے اختتام پر اسّی کھلاڑیوں کا انتخاب کیا گیا جن میں ہاکی کے بھی کھلاڑی تھے۔ متحدہ ہندوستان کے مشہور و معروف ہاکی کے کھلاڑی کرنل آئی اے ایس دارا ہاکی ٹیم کے کپتان منتخب کئے گئے جو زمانہ سابق میں جیسا کہ میں نے کسی جگہ لکھا ہے' سالارِ صوبہٗ پنجاب تھے۔ ان تمام کھلاڑیوں نے احمد ہارون جعفر صاحب کی سربراہی میں جولائی 1948ء کے لندن اولمپک کھیلوں میں حصہ لیا۔ الحاصل اس ابتدائی نازک دور میں بھی پاکستان کو کھیل کے میدان میں اپنے قائداعظمؒ کی اعلیٰ سرپرستی اور ذاتی توجہ کا شرف حاصل رہا۔

ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اُسے بھی سن لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے چند دن قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظمؒ اور جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ جب ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو تقریباً پانچ مہینے ہو گئے تو قائداعظمؒ نے ماہ دسمبر 1947ء کے آخری عشرہ میں آل انڈیا مسلم

لیگ کونسل کا اجلاس کراچی میں طلب فرمایا جس میں ہندوستان کے رہنے والے اراکین نے بھی شرکت کی۔ یہ اجلاس یوں بھی بہت اہم تھا کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی وحدانیت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے بھی ہندوستان کی طرح دو آزاد حصوں میں تقسیم ہونا تھا۔ اس اجلاس میں کیا ہوا' کیا نہیں ہوا اور کیا ہونا چاہئے تھا' اس کا ناقدانہ جواب دینے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میں تو اس مخصوص اجلاس کا اشارہ صرف ایک غرض سے کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے بحثیت گورنر جنرل بھی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کو کتنا وقیع اور اہم سمجھا کیونکہ جن لوگوں کو آل انڈیا عہدے بخشے گئے تھے' وہ ہنوز ان پر فائز تھے۔ میں بحثیت سالار اعلیٰ اپنے یونیفارم میں ملبوس خالق دینا ہال کے صدر دروازہ پر انتظامات کی نگرانی اور اپنے صدر قائداعظمؒ کی تشریف آوری کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی اور وہ اپنے دواے ڈی سی صاحبان کی معیت میں جلوہ افروز ہوئے۔ میں تشویشناک الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ ان سے داخلہ کا ٹکٹ دکھلانے کی گزارش کروں یا اس قوی یقین کے ساتھ کہ داخلے کا ٹکٹ ان کے جیب میں موجود ہے' خاموش ہو جاؤں۔ میرا تذبذب اور میری گھبراہٹ قائداعظمؒ کی عمیق مطالعہ کرنے والی نظروں سے کیونکر مخفی رہ سکتی۔ وہ ہال کے اندر بغیر کسی پوچھ گچھ کے داخل ہوئے اور تھوڑا فاصلہ طے کر کے ٹھٹک کر رک گئے۔ مجھے آنکھوں اور سر کے اشارے سے نزدیک طلب فرما کر چکے سے دریافت کیا کہ میں نے ان کا ٹکٹ کیوں نہیں مانگا۔ میں جانتا تھا کہ میرا کوئی بھی معقول سے معقول عذر درخور اعتنا نہیں ہوگا۔ اس لئے اعتراف خطا کیا۔ ان کے چہرۂ مبارک پر ہلکی سی مسکراہٹ بجلی کی طرح کوندی۔ میرے لئے تو ان کی یہ آخری مسکراہٹ ایک بے بہا خزانہ تھا جو آج تک میرے دل میں محفوظ ہے۔ اس ایک چھوٹے لیکن کردار ساز واقعہ کو ہمارے اکابرین اور نوجوان اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا سکتے ہیں۔

راجہ محمود آباد

سنت حسینی مضطرب تھی کہ اس دورِ جدید میں اس کی تجدید ہو چنانچہ قدرت نے حسینیت کے شیدائی وفدائی راجہ محمود آباد کو تجدید سنت کے لئے منتخب کر کے رہنمائی کا علم سپرد کیا۔ یہ مختصر سا قافلہ جو تیس نفوس پر مشتمل تھا' وسط جون 1947ء میں قیصر باغ لکھنؤ سے اپنی منزل کا تعین کر کے اپنی تاریخ' اپنی امارت' اپنی ریاست اور اپنا سب کچھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر رواں دواں منزل کی طرف بڑھا۔ قافلہ سالار ایک مردِ مومن' خلق عظیم کا سچا پیرو اور مجسمۂ ایثار تھا۔ وہ لکھنؤ میں رہ کر اپنے عزیزانِ گرامی کے لئے باعث تکلیف و پریشانی نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ دیانتداری کے ساتھ سمجھتا تھا کہ ابنائے وطن کو اس کا ہندوستان میں رہنا بہت کھلے گا۔ وہ ذاتی طور پر تمام مصیبتیں جھیلنے اور برداشت کرنے کو تیار تھا اور ان کا پامردی سے مقابلہ بھی کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی بے بسی و بیکسی کے پیش نظر اپنوں کو اپنی اسلام و پاکستان دوستی کے باعث انتقام کے شعلوں کی لپیٹ سے بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ دُھن کا پکا اور ارادہ کا سچا تھا۔ اس نے مصائب آباد میں پناہ لینے کی ٹھانی۔ اس نے مصائب آباد یعنی کربلائے معلےٰ کو اس لئے منتخب کیا کہ وہاں کے پاک مکینوں پر جو عظیم مصیبتیں ڈھائی گئی تھیں' اس کا خیال کر کے وہ اپنی مصیبت کو یکسر فراموش کر دے گا۔

سفر میں زاہدان' مشہد' طہران اور دیگر مقامات پر اس کی شایانِ شان آؤ بھگت ہوئی اور وہ شاہی مہمان بھی بنایا گیا۔ شاہنشاہ ایران نے بھی شرف باریابی بخشا۔ وزیر اعظم قوام السلطنت نے ملاقات کی اور مجتہد عصر علامہ سید الحاج حسین بزوجروی نے اپنے فیوض و برکات و دعاؤں سے نوازا۔ ایران میں یہ عام خیال تھا کہ قافلہ سالار ایران میں پاکستان کے سفیر کے فرائض انجام دیگا۔ چونکہ یہ خیال درست نہ نکلا' اس لئے ایرانی بہی خواہانِ پاکستان کو یک گونہ مایوسی ہوئی۔

بہر حال دیار سید الشہد کا راستہ بغداد پر سے تھا۔ وہاں بھی ان معزز زائرین کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اگرچہ عراق کے وزیر اعظم جنرل نوری السعید جو کثیر المشاغل انسان تھے لیکن راجہ صاحب کی آمد کی اطلاع ملنے پر وقت نکال کر ملے اور بڑی دیر تک ملے۔ غیر سرکاری سفیر جس کا قیامِ پاکستان میں بڑا عملی حصہ تھا اور اس کے حصول کے لئے جس نے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی' اپنے فرض یعنی پاکستان کے پروپیگنڈہ کرنے سے کیونکر غافل رہ سکتا تھا۔ اس نے نجی ملاقاتوں اور اجتماعات میں ایسا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا جہاں پاکستان کا ذکر نہ کیا ہو۔

بالآخر قافلے والے منزل مقصود پر بعافیت تمام پہنچے۔ ان کے تمام نئے اور پرانے زخم ہرے ہو گئے۔ مقدس فضا' شجاعت و دلیری کے زندہ جاوید کارناموں' ایثار و قربانی کے دل کو چھلنی کرنے والے واقعات' ہوش ربا حادثات اور وہ صبر آزما گھڑیاں لیکن مرضئ مولیٰ از ہمہ اولیٰ کی روشن مثال نے رنج سے خوگر انسان کے رنج کو تو مٹایا نہیں لیکن صبر کی دستگیری سے قدرے سکون نصیب ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد بڑی ہمشیرۂ محترمہ نے وسط جولائی میں ہندوستان جانے کے لئے رخت سفر باندھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس پُر آشوب زمانہ میں بہن تن تنہا اتنے دور و دراز خطرناک سفر پر روانہ ہو'اس لئے ماں جایا بھائی ہمسفر ہوا اور خیریت سے بہن بھائی لکھنؤ پہنچے۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے ہر مسلمان کی جان و مال و عزت چوبیس پہر خطرہ میں تھی۔ قوم پرست و کانگریسی مسلمان بھی خونخوار ہندو درندوں کی دست برد سے محفوظ نہیں تھے۔ مسلمان مرد' عورتوں اور بچوں کا سفاکانہ قتل' عزت و ناموس کی تاراجگی' رہائشی مکانوں کو نذر آتش کرنا یہ وہ بربریت تھیں جس کو سن کر ہی رونگھٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ حاکم وقت انگریز چل کوچ کی فوری تیاری میں مصروف تھا اُسے کیا پرواہ تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو دل سے چاہتا تھا کہ خوب قتل و غارتگری اور ہر طرف تباہی ہو۔

بیچارے راجہ صاحب لکھنؤ میں جب اپنی بہن کو چھوڑنے گئے تو ان چیرنے پھاڑنے والے دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئے اور ان کی بیچارگی اس بلا کی تھی کہ وہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے لیکن کسی کو نہ بچا سکتے اور نہ مدد کر سکتے تھے۔

مسلمانوں سے والہانہ محبت اور بانیانِ پاکستان میں سے ہونے کی بنا پر وہ بیرحم دشمن کی فہرست میں سرورق تھے۔

اپنوں اور بہی خواہوں کے شدید اصرار پر راجہ صاحب نے پھر اپنے وطن عزیز کو جہاں چھوٹے سے بڑے ہوئے، پلے پوسے، حکومت دیکھی، حکومت کی، خیر باد کہا اور صحرا نوردی کے لئے روانہ ہوئے۔ اس گراں قدر ہستی کا ہندوستان کی حدود جو پاکستان کی سرحد سے جا ملتی ہیں، عبور کرنا سخت خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ دو مرتبہ اقدام قتل کی کوشش کی گئی لیکن اللہ نے انہیں بال بال بچایا۔ سچ ہے ۔

"اللہ جسے رکھے اسے کون چکھے"

وہ اُفتاں وخیزاں اپنی جانِ عزیز کو دشمنوں کی متلاشی نگاہوں سے بچاتے ہوئے کھوکھر اپار کو پار کر کے حیدرآباد اس دن پہنچے جب 14 اگست 1947ء کو یومِ آزادی منایا جا رہا تھا۔ ہر چند لوگوں نے اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے اصرار کے ساتھ کہا کہ کراچی سے اتنے نزدیک ہو کر جشنِ آزادی میں ضرور شریک ہونا چاہیے تاکہ کسی غلط فہمی کے احتمال کا امکان نہ رہے اور زور دیا گیا کہ آپ بذاتِ خود کراچی پہنچ کر قائداعظمؒ کو مبارکباد دیں۔ انہوں نے کسی کی نہ مانی اور بجائے کراچی کے پھر اس دیار کی طرف رخ کیا جہاں پہنچ کر وہ صرف اپنے ہی رنج وغم کو نہیں بلکہ خود کو بھی بھلا دینا چاہتے تھے۔ بعد میں کسی وقت دریافت کرنے پر انہوں نے فرمایا کہ وہ قائداعظمؒ سے اس لئے جا کر نہیں ملے کہ کہیں وہ یہ نہ خیال کریں کہ میں ان سے انعام واکرام مانگنے آیا تھا۔ واہ رے بلند انسان اور واہ رے تیری اعلیٰ خودداری ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(اقبالؒ)

راجہ صاحب کو کسی بھی ملک کی فضا راس نہیں آئی اور نہ انہوں نے حالات ساز گار
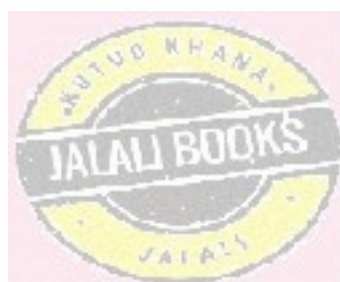
پائے۔اس لئے وہ آج یہاں رہے اور کل وہاں، مجھے بھائی پکار کر کرم گستری کرتے ہیں۔اس بناء پر میں نے دل کو کڑا کر کے ایک دن کہہ ہی ڈالا کہ اگر ''زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز۔''

انہوں نے حیرت اور چہرہ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ فرمایا ''صدیق بھائی! میرا ضمیر قبول نہیں کرتا۔'' میں نے اس مصمم ارادہ کے ساتھ خاموشی اختیار کی کہ آئندہ اس معاملے میں کبھی لب کشائی نہیں کروں گا کیونکہ آخر وہ اس ہی چچا کے بھتیجے ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت کبھی خرید نہیں سکی اور میں اس حقیقت کو کیوں کر بھول جاتا کہ وہ تو ان عالی مقام امام کے جوحق وصداقت کے عظیم علمبردار تھے، سچے فدائی اور شیدائی ہیں۔

راجہ صاحب اپنے زرّیں دور میں بھی فطرتاً واصولاً دولت جمع نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اسے ہاتھ کا میل سمجھ کر بکھیر اور مستحقین کو تقسیم کر دیا کرتے تھے، لہٰذا ان کا بینک ہمیشہ خالی خالی رہا اور اب تو شاید کسی بھی بنک میں ان کا حساب نہیں ہے کیونکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جب روپیہ نہیں تو حساب کیسا۔اُنہوں نے تجارت ضرور کی لیکن چور بازار میں نہیں بلکہ اس تجارت کے اصولوں پر جسے سرورِ کائنات نے اپنایا تھا اور جس کے متعلق صاف الفاظ میں ارشاد خداوندی ہے: ''وَلَا تُخْسِرُوْ الْمِیْزَانَ ''۔ذخیرہ اندوزی و چور بازاری کے زمانہ میں نوجوان مومن تاجر بجائے دولت کمانے کے خسارہ کے ڈھیر لگانے لگا۔آخر کار صحیح ناپ تول کی دکان کو بڑھانا پڑا۔ ایک آدمی ہو تو گر پڑ کے بھوکا پیاسا رہ کر زندگی کے دن گزار دے لیکن کندھوں پر اگر کسی کی کفالت کا بار ہو تو معاملہ تشویش ناک ہو جاتا ہے۔اللہ نے دو نور نظر صاحبزادیاں اور صرف ایک لخت جگر صاحبزادہ عطا کیا۔صاحبزادیاں تو اپنے گھروں میں آباد ہیں۔اللہ انہیں شاد اور آباد رکھے لیکن صاحبزادہ تو ابھی آکسفورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔کون نہیں جانتا کہ تعلیم آج کل کتنی جنس گراں ہوگئی ہے۔بادشاہی میں فقیری کرنے والے اور فقیری میں بادشاہی کرنے والے باپ کو مجھے یہ کہتے ہوئے ''دل میں درد سوا ہوتا ہے'' فکر معاش ہوئی تا کہ لخت جگر کی تعلیم مکمل ہو جائے اور وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں۔یہ درست ہے کہ ہمارے بے شمار رفقائے کار

ایسی ہی مصیبتوں کا شکار ہیں۔ کچھ تو تھک ہار کر دل شکستگی کے عالم میں اللہ کے پاس چلے گئے۔ جو زندہ ہیں، وہ سسک سسک کر اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے ہیں۔ ان کے لئے اس واقعہ میں صبر وقناعت کا ایک بڑا اسبق ہے کہ دنیا کا ایک بڑا رئیس ہے اور جس کی پرورش ناز ونعمت کی گود میں ہوئی اور جو اس طرح دولت تقسیم کیا کرتا تھا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوا کرتی تھی، وہ بالآخر حلال کسبِ معاش کی تلاش میں سنتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہوا۔ سبحان اللہ! یہ عمل تو نہایت پسندیدہ اور اعلیٰ ہے لیکن دلِ ناداں مانتا نہیں اور وہ یہ برابر کہتا ہے کہ کیا آج ایسا روزِ بد آ گیا کہ راجہ صاحب محمود آباد کو لندن اسلامک سنٹر میں تنخواہ دار ڈائریکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنی پڑی۔'' تفو بر تو اے چرخ گردون تفو'

یہ باب ادھورا رہ جائے گا اگر آپ کو یہ نہ بتلایا جائے کہ اس عہدہ کے سنبھالنے سے قبل وہ لندن میں کس طرح زندگی گزارا کرتے تھے۔ ملازمت کی تلاش میں کئی ماہ تک ان کا لندن میں قیام رہا لیکن عسرت ان کی لونڈی بن کر چوبیس گھنٹے ساتھ رہی۔ اس لئے ان کے روزمرہ کے فرائض سوہانِ روح تھے۔ ان کی یہ حالت تھی کہ مالک بھی خود اور نوکر بھی خود۔ وہ صبح کی نماز کے بعد دو وقت کا کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاتے اور اُسے دو دن تک رکھ کر کھاتے۔ جتنے دن انہوں نے لندن میں قیام فرمایا، صرف کھچڑی پکائی اور کھائی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ روزانہ انڈیا لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ اور سینڈوچز کھا کر شکم پُری کرتے۔ تنگ دستی کی وجہ سے موٹر کار رکھنے کی اُن میں سکت اور ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کی مقدرت نہیں تھی اور بہ ایں وجہ وہ اپنے بہت ہی کم کرایہ کے فلیٹ سے اسٹیشن پیدل جاتے اور ٹیوب سے سفر کرتے تھے کیونکہ اس سے زیادہ اور کوئی سستی سواری میسر نہیں تھی۔

کہیں ٹوٹ جائے نہ دل بیکسی کا
نگاہِ کرم آسرا چاہتا ہوں
(جگر)

منزل

بت کدہ میں مطمئن رہنا مرا دشوار تھا
بت تو اچھے تھے برہمن درپئے آزار تھا

(اکبرالہ آبادی)

مرکز و کلکتہ میں تنظیمی امور سے فراغت پانے اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں حصہ لینے کے بعد جب میں جولائی 1947ء کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں ناگپور پہنچا تو وہاں کے دگرگوں حالات کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ہمارا مسلم لیگی نظام جو بہت مضبوط ہوگیا تھا' آناً فاناً درہم برہم ہوکر پارہ پارہ ہوگیا۔ مسلمانوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا کہ وہ اپنے گھر دار چھوڑ کر ہر اس سمت کی طرف چل کھڑے ہوئے جدھر سینگ سمائے یا اُنہوں نے جہاں کہیں یہ محسوس کیا کہ ان کی عزت اور جان درندہ صفت انسانوں سے محفوظ رہے گی' ڈیرا ڈال دیا۔ وہ اس لئے بھی برداشتہ خاطر ہوگئے تھے کہ کلکتہ' گڑھ مکتیشور' بہار وغیرہ کے خونیں واقعات کا انہیں علم ہو چکا تھا اور انہوں نے ناگپور کے پلیٹ فارم پر مدراس جانے والی گرانڈ ٹرنک ایکسپریس کے ڈبوں کو بے گناہ مسلمان مسافروں کے پاک خون سے لت پت دیکھا تھا۔ اب ہندو صاف صاف کہتا تھا کہ پاکستان جاؤ۔ تم نے پاکستان مانگا تھا' وہ تمہیں مل گیا' تمہارا اب ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلمان اپنا پرانا دیس نہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن ہندو انہیں چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے اتنا تنگ و مجبور کرتے کہ وہ اس ناگہانی مصیبت کو ٹالنے کے لئے عارضی طور پر اپنے مکانوں کو چھوڑ کر عازم حیدرآباد و بھوپال ہوئے۔ یہ دونوں مسلم ریاستیں مسلمانانِ ہند کی دو بڑی قابل احترام یادگاریں تھیں جن کی سرحدوں سے صوبہ سی پی و برار کی

سرحدیں جاملتی تھیں لیکن موجودہ خطرناک حالات میں مسلمانوں کا وہاں پہنچنا کارے دارد تھا۔ سفر کی صعوبتیں، ریل گاڑیوں کے ٹکٹ کی کمیابی، کھلے پلیٹ فارموں پر انتظار میں شب بسری، قلیل سرمایہ سے پریشانی الحاصل سینکڑوں مصیبتیں تھیں۔ بہرحال گرتے پڑتے یہ عازمین حیدر آباد منزل مقصود پر پہنچے۔ حیدرآباد دکن میں حاکم وقت یعنی اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد نے اپنی قدیم مہمان نوازی و سرپرستی کی روایتوں کو دوبالا کر کے ان بیکس پناہ گزینوں کے ساتھ ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ وہ اپنے تمام رنج وغم اور پریشانیوں کو بھول بیٹھے اور حیدرآباد کو اپنا محفوظ مامن سمجھا۔

وہ منزلت جسے مغلوں کی یادگار کہیں
دکن میں سطوت شاہ نظام بن کے رہی

(ماہر القادری)

حیدرآباد کے رؤسا اور عوام نے اپنے مہاجر نواز انصار صفت بادشاہ کی پوری پوری تقلید کی اور اسلامی اخوت اور غریب نوازی کا ہر ہر لمحہ ثبوت دیا۔ حیدرآباد ریاست میں باہر سے آنے والوں کو ان کی اہلیت و صلاحیت کے مطابق بسایا گیا۔ میزانیہ کی آڑ نہیں لی گئی بلکہ بغیر پس و پیش کے ملازمتیں دی گئی۔ تجارت کرنے کے لئے مواقع و سرمایہ فراہم کیا گیا۔ رہائش کے لئے مکانات دیے گئے۔ روسا نے اپنی ڈیوڑھیوں کے دروازے جو بند رہا کرتے تھے، کھول دیے۔ اسلامی مساوات میں خود کو سمو کر ہر ایک کو گلے سے لگایا۔ عملاً اور قولاً ہمدردی کی۔ مصیبت زدگان پر ملک الرئیس اور اس کی رعایا نے جو احسانات کیے، اگر ان کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب کرنی پڑے گی۔ تاجدار دکن کی سرپرستی سے ان لوگوں کے بہت اچھے دن آ گئے۔ مقامی لوگوں اور حکومت کو بھی ان نو واردوں سے بڑی تقویت پہنچی۔ ہر مقامی شخص سمجھا کہ وہ اغیار کی نظر بد اور للچائی ہوئی نگاہوں سے ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے محفوظ رہے گا۔ الحاصل حاکم و محکوم یعنی دونوں کو اللہ کے سہارے کے بعد اپنی بقا کے لئے ایک دوسرے کے تعاون کی اشد ضرورت تھی جو پوری طرح میسر تھا۔

سی پی کے شمالی اضلاع اور وسط ہند سے ملے ہوئے اضلاع یعنی جبلپور' ساگر' نرسنگ پورہ' دموہ' ہوشنگ آباد وغیرہ کے مسلمانوں نے عافیت کی خاطر حیدر آباد کی دوری کا خیال کر کے اپنے سے بہت قریب کی ایک تاریخی اور قدیمی اسلامی ریاست کی طرف رخ کیا۔ رئیس بہت سیانا گردانا جاتا تھا لیکن دراصل وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ وہ اپنے شاہی خاندان کی شاندار روایات کا حامل تھا۔ اُسے حکمرانی کے فن کا ماہر مانا جاتا تھا۔ وہ بین الاقوامی شہرت کا کھلاڑی' بساطِ سیاست کا شاہ' جمہوریت پسند' بڑے دل کا مالک تھا۔ یہ بلند انسان قائداعظمؒ کے معتمد علیہ یعنی ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں والیٔ ریاست بھوپال تھے جو اپنی ذہنی صلاحیتوں اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے چیمبر آف پرنسز کے منتخب صدر تھے۔ انہوں نے شکستہ حال' شکستہ دل اور خوفزدہ پڑوسی مہمانوں کو بیراگڑھ کیمپ میں جو چند سال قبل دوسری جنگ عظیم کے دوران اطالوی جنگی قیدیوں کا جنگی کیمپ تھا' ٹھہرا کر اپنی پناہ وامان میں لے لیا۔ ان بن بلائے مصیبت کے مارے مہمانوں کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات ریاست بھوپال کی چیف سیکرٹری کے ذمہ تھی جو ولی عہد بھی تھیں اور آنے والے زمانہ میں ایک کامیاب اور اچھی والیٔ ریاست بننے کے لئے مختلف شعبہ جات حکومت کی انتظامی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے عمل سے اسلامی رواداری' اخوت اسلامی اور شاہانہ مہمان نوازی کا قدم قدم پر بہتات کے ساتھ عملی ثبوت دیا۔ آج ہماری وہ محسنہ شہزادی عابدہ سلطان پاکستان میں ایک عام شہری کی طرح خاموشی وقناعت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی خداداد قابلیتوں اور وسیع تجربہ کا ہم لوگوں نے جیسا کہ چاہئے تھا' فائدہ نہیں اٹھایا۔ آج کل قدیمی' تاریخی واسلامی ریاست بھوپال کی قانونی وشرعی مالک ملیر میں ایک بزرگ کامل کے سایۂ سعادت میں ایک چھوٹے سے مکان میں مقیم ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ ریاست چلی گئی' ولیعہدی چھن گئی لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ آج بھی لاکھوں پاکستانیوں کے دلوں میں شہزادی عابدہ سلطان اور ان کے بزرگوں کا ایک خاص مقام ہے۔ ویسے تو ہندوستان کے حکمرانوں نے بہت مظالم کئے لیکن ایک بہت بڑا سنگین ظلم یہ کیا کہ شہزادی صاحبہ کی

ولی عہدی چھین کر تاج وتخت سے ہی محروم نہیں کیا بلکہ وراثت ذاتی کے حقوق کو بھی پامال کر دیا۔

ہمیں اپنی جدوجہد کی تاریخ میں اس حقیقت کو بھی محفوظ کر لینا چاہئے کہ بھوپال بنک نے اُن پناہ گزینوں کی جو پاکستان آ گئے تھے' بڑی شاندار خدمت انجام دی۔ بلاشک یہ رئیس اور حکومت کے ایما سے ہوا۔ اس خدمت کی انجام دہی مسیح الدین صاحب جیسے ماہر مالیات کے سپرد تھی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آخری تاجدار بھوپال کی بے لوث انسانی خدمت کو قبول فرما کر انہیں فردوس بریں میں قصر زمردیں عطا فرمائے۔ بے انصافی اور احسان فراموشی ہوگی اگر اس سلسلہ میں مَیں اپنے ایک اور بزرگ سیٹھ محمد علی حبیب کا ذکر نہ کروں۔ دراصل اُنہوں نے ہندوستان کے ستم زدہ مسلمانوں اور مہاجرین کی جو خدمت حبیب بنک کے ذریعہ انجام دی' اس کی بدولت وہ زندہ ہیں حالانکہ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر کراچی کے خراسان باغ میں ایک ہشت پہلو سنگ مرمر کے چھتر کے تلے ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ناگپور کے چند مقامی مسلم رہنماؤں نے جن میں خاص طور پر بیرسٹر محمد یوسف شریف صاحب قابل ذکر ہیں' مسلمانوں کو بہت سمجھایا بجھایا۔ گھر اور شہر چھوڑنے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ کچھ لوگ ان کی بات مان گئے اور ریلوے اسٹیشن سے اپنا سامان لے کر گھر لوٹ آئے لیکن اکثریت تو کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ ان کے خیال میں صرف ترک وطن ہی ان کی جان و مال' عزت و آبرو کا ضامن ہوسکتا تھا۔ میرے تمام قریبی عزیز اس سیل رواں میں بہہ کر حیدر آباد پہنچ چکے تھے۔ ان کی دانست میں حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ وہ میری واپسی کے انتظار کی مزید تاب نہ لا سکے۔ میں جب ناگپور پہنچا تو ظاہر ہے کہ میری رفیقۂ حیات اکیلی انتہائی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھیں اور میری بخیر واپسی اور سلامتی کی دعاؤں کے سوا ان کا ایک پل بھی نہیں گزرتا تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے افراتفری کے حالات دیکھے۔ بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے اور اکٹھا کرنے کی تجاویز پر غور کرنے لگا۔ مشکل یہ تھی کہ میرے بہت سے رفقائے کار بھی

گھر بار چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ جو موجود تھے‘ ان سے مشورے شروع کئے گئے کہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے کس طرح پشتے باندھے جائیں۔ میں اس اُدھیڑ بن میں تھا کہ کراچی سے سردار عبدالرب نشتر نے جو بھارت سے آنے والے پاکستانی افسروں اور عملہ کے طعام و رہائش کے منتظم تھے‘ ٹرنک کال کر کے حکم دیا کہ مجھے فوراً کراچی پہنچ کر قائداعظمؒ کی تشریف آوری پر بحیثیت سالارِ اعلیٰ 7 اگست کو ان کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ میں اس امر سے بے خبر بذریعہ طیارہ کراچی پہنچا کہ میری رفیقۂ حیات بھی ٹرین سے چند دن بعد بہ ہمراہی رہنمایانِ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن‘ سرمستانِ آزادی قائداعظمؒ کے متوالے عبدالستار صدیقی‘ محمد اظہر اللہ خان صاحب اور ریاض الرحمٰن صاحب (پروفیسر وڈاکٹر) اتنا دور ودراز کا ریگستانوں میں سے سفر کر کے کراچی پہنچیں گی۔ ہم دونوں کے لئے ہمیشہ کے مطابق ”سی فیلڈ“ کے دروازے کھلے تھے۔

آج کا وہ مبارک‘ مسعود اور تاریخی دن تھا کہ پاکستان کے پہلے مسلمان گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ فاتح پاکستان کی حیثیت سے بغیر کسی لاؤ لشکر کے تن تنہا صرف اپنی جان نثار اور خدمت گزار بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ اس مقدس سرزمین کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے سرفراز فرمانے والے تھے۔ اسلام کی تاریخ بتلاتی ہے کہ غازی محمد بن قاسم پہلے فاتح تھے۔ اللہ کے حکم سے اسلامی تاریخ آج اپنے کو دہرانے والی تھی اور ایک اور فاتح کا نام درج کرنے والی تھی۔ کراچی کے رہنے والوں کا اور جو لوگ اس کے اکناف اور ہندوستان سے آئے تھے‘ ان کا ذوقِ وارفتگی اور جوشِ ایمانی قابلِ دید تھا۔ ان کے چہرے خوشی سے کندن کے جیسے دمک رہے تھے۔ ویسے تو قائداعظمؒ کو لوگوں نے بارہا دیکھا تھا اور زندہ باد کے نعرے لگائے تھے لیکن آج کے قائداعظمؒ اور ان کے چاہنے والے لوگ کچھ اور ہی تھے۔ آج قائداعظمؒ ان کے محسن اور غلامی سے آزادی دلوانے والے رہنما تھے۔ آج لوگوں کی بھی غلامی ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنے کو آزاد قوم سمجھ رہے تھے۔ آج ان کی وفورِ محبت‘ مسرت ودیوانگی قابلِ فہم تھی۔ آج وہ اپنے قائداعظمؒ‘ اپنے نئے ملک اور خود پر جتنے نازاں وفرحاں ہوتے‘ کم تھا۔

لوآج تو صرف ایک ہی سڑک چل رہی تھی اوراس پر قطار در قطار اونٹ گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، بائیسکلیں، موٹر سائیکلیں، موٹر کاریں اور پا پیادہ لوگ جوق در جوق جھنڈیاں ہاتھ میں لئے ہوئے قائداعظمؒ زندہ باد، پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد اور اسلام زندہ باد کے نعرے گلے پھاڑ پھاڑ کر لگاتے ہوئے ماری پور کے ہوائی اڈہ کی طرف کشاں کشاں چلے جارہے تھے جہاں آب و گیاہ اور درخت مفقود لیکن صرف ٹین کے چند سائبان گرمی و بارش سے پناہ دینے کے لئے موجود تھے اور ہر طرف ریگستان ہی ریگستان نظر آتا تھا۔ عصر کے وقت ''وہ آ گئے''،''وہ آ گئے'' کی صدا بلند ہوئی، پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ''آ گئے'' کی صدا کانوں میں گونجی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور دونوں آنکھوں پر پانچوں انگلیاں اور ہتھیلی کا سائبان بنا کر دور افق پر نگاہوں کو گاڑ دیا گیا جہاں ایک بہت ہی چھوٹی سی پرندہ نما چیز نظر آئی اور ہماری سمت میں آتی ہوئی دکھائی دی۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا گیا، اس کی جسامت بڑھنی شروع ہوئی، دل دھڑ کنے لگے اور لوگوں نے بآواز بلند وثوق کے ساتھ کہا دیکھو بھئی وہ قائداعظمؒ کا ہوائی جہاز ہے اور لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ''وہ آ گئے''۔ انجنوں کی گھڑ گھڑاہٹ بڑھتی گئی اور ہوائی جہاز نے زمین پر اُترنے کے لئے گول دائرے بنانا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ زمین پر اُتر گیا اور ہاتھی کی طرح شان و شوکت کیساتھ جھومتا جھامتا مستانہ وار مقررہ جگہ پر آ کر رُک گیا۔ لوگوں کے دل بلیوں اچھلنے لگے اور ان کا جوش و خروش سمندر کی طوفانی امواج سے زیادہ بڑھ گیا۔ ان کی آوازیں بھی بلند ہو کر فلک شگاف نعرے لگانے لگیں اور شوقِ دید، اظہارِ مسرت اور جذباتِ عقیدت پہاڑی نالے کے تیز دھارے کی طرح بہنے لگے۔ ان حالات میں نظم و نسق جس کے قائم رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی تھی، پاش پاش ہو گیا۔ اب تو امڈے ہوئے انسانی سمندر نے ہوائی جہاز کی طرف رُخ کیا۔ قائداعظمؒ شیروانی شلوار میں ملبوس جناح ٹوپی اوڑھے ہوئے برآمد ہوئے۔ لوگوں کی دیوانگی اور قائداعظمؒ کی خفگی بڑھی لیکن ان کے پُررعب چہرے اور اٹھی ہوئی انگلی کو دیکھ کر یہ بڑھتا ہوا سمندر یکا یک تھم گیا۔ ''اتحاد، ایمان اور تنظیم'' کی تلقین اور آزاد قوم کے افراد کا طرزِ

عمل اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نظم ونسق کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ گئیں۔ قائداعظمؒ لکڑی کا سہارا لئے ہوئے ذمہ داریوں کے بھاری بوجھ کے تلے نڈھال نظر آرہے تھے۔ان کے چہرے سے بشاشت کافور ہوگئی تھی اوراس کی جگہ اضمحلال' فکر' تیز رو بڑھاپے اور گرتی ہوئی صحت نے لے لی تھی۔قائداعظمؒ کے ساتھ ایک اکہرے جسم والا سروقد نوجوان' بحریہ کا گوراچٹا افسر سفید برق لباس پہنے قائداعظمؒ کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح چل رہا تھا۔ یہ نوجوان لیفٹیننٹ ایس ایم احسن قائداعظمؒ کے اے ڈی سی تھے جواس سے قبل آخری وائسرائے ہندلارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اے ڈی سی ہوتے تھے۔ان کی مسلم دوستی' حق پرستی اور نئے اسلامی ملک سے گہری محبت نے انہیں دیگر مسلم افسروں کی طرح حکومت برطانیہ اور بھارت کے سایۂ عاطفت کو چھوڑ کر ظل اللہ میں لا کھڑا کیا۔مقام شکر ہے کہ یہ نوجوان اے ڈی سی پاک بحریہ کے کمانڈر انچیف بنے اوراب ماشاءاللہ مشرقی پاکستان کے گورنر ہیں۔سنا ہے کہ اس ہی طرح قائداعظمؒ کے ایک اور سابق اے ڈی سی بری فوج کے کیپٹن گل حسن' آج کل میجر جنرل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ہم اپنی تینوں افواج کے ہر افسر اور فوجی اور دیگر سرکاری ملازمین پر فخر کرتے ہیں جنھوں نے شروع سے اور بعد میں پاکستان کی خدمت کی اوراب بھی کررہے ہیں۔اللہ انہیں دنیا اور عاقبت میں سرخرو رکھے۔

مجھے ہر جشن وتقریب میں جو بسلسلہ یوم آزادی منائی گئی' شرکت کی عزت نصیب ہوئی۔اس زمانہ کے دو واقعات قابل ذکر ہیں۔پہلے کا تعلق اسلام دوستی اور اسلامی کردار سے ہے۔دوسرے کا تعلق پاکستان کی سیاست اور حکومت سے ہے۔ بعد میں جس کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔14 اگست 1947ء کو 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع تھا۔نوابزادہ صاحب اور بیگم رعنا لیاقت علی خان ''سی فیلڈ'' میں فروکش تھے۔نوابزادہ نے وزارت عظمٰی کا حلف اٹھالیا تھا اور وہ عطائے کردگار یعنی قیام پاکستان اوراپنے ذاتی اعزاز یعنی وزارت عظمٰی کی تقرری پر اللہ کے گھر جا کر سر نیاز کو سجدہ ریز کرنا چاہتے تھے۔اس لئے طے پایا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے اور فریضہ کو ادا کرنے گاڑی کھاتہ میمن مسجد جائیں۔بعد نماز جمعہ مسجد کے متولی حاجی

سیٹھ محمد ہاشم صاحب نے پاکستان کے پہلے اور نئے وزیراعظم نوابزادہ سے تقریر کرنے کی گزارش کی۔ نوابزادہ نے دو چار جملے کہے ہوں گے کہ ان کا دلِ مومن نئی اسلامی مملکت کے غیر متوقع قیام اور احسانِ خداوندی سے بھر آیا اور موم کی طرح پگھل کر آنکھوں کی راہ سے آنسو بن کر سوتے کی طرح بہنے لگا۔ بڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن دریں اثنا تمام مصلّی بہ آوازِ بلند درود شریف پڑھتے رہے۔ جب جذبات پوری طرح قابو میں آ گئے تو نواب زادہ نے تقریر شروع کی اور قائداعظمؒ کی درازیٔ عمر اور بقائے پاکستان کی دعا پر ختم کی۔

دوسرے واقعہ میں جمہوریت کا راز پنہاں تھا۔ ہوا یوں کہ جناب سید حسین شہید سہروردی صاحب جو ہندوستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور مہاتما گاندھی کی قربت، پرارتھنا میں روزانہ شرکت اور دورۂ بنگال میں ان کی رفاقت کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خوشگوار فضا اور سازگار ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے، اچانک ڈھاکہ سے کراچی پہنچے۔ ڈھاکہ میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کا جب انتخاب ہوا تو سہروردی صاحب بھی اُمیدوار تھے لیکن خواجہ ناظم الدین صاحب کثرت رائے سے ان کو شکست دے کر لیڈر منتخب ہو گئے۔ ان نامساعد حالات میں وہ کراچی آئے اور شاید اپنے مشن کی متوقع ناکامی اور ہندوؤں کے طعن تشنیع کے خیال سے ہندوستان واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی اور قائداعظمؒ بھی یہی چاہتے تھے کہ پاکستان کی کابینہ میں انہیں وزیر بنا دیا جائے لیکن فضل الرحمٰن صاحب نے ان کی مخالفت پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور جب دیکھا کہ ان کی مخالفانہ کوششیں بارآور نہیں ہوں گی تو جمہوریت اور خواجہ صاحب کے کامیاب انتخاب کی آڑ لے کر سہروردی صاحب کی تقرری کے آڑے آئے۔ سہروردی صاحب کی دوسری بے موقعہ کوشش یہ تھی کہ انہیں لندن یا واشنگٹن سفیر بنا کر بھیج دیا جائے۔ یہ بالکل ممکن نہیں تھا کیونکہ میں کسی جگہ عرض کر چکا ہوں کہ کچھ دن قبل ان شہروں میں پاکستان کا پرچم لہرانے کے لئے دو صاحب بھیج دیے گئے تھے۔ المختصر سہروردی صاحب مایوس و دل برداشتہ کلکتہ چلے گئے اور پاکستان اس وقت مستقلاً آئے جب ہندوؤں نے ان پر عرصۂ حیات

تنگ کر کے کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے چلے جانے اور لوٹنے کے درمیانی عرصہ میں انہیں ایک مرتبہ قائداعظمؒ کی طرف سے الطاف حسین صاحب کے توسط سے وزارت پیش کی گئی جسے انہوں نے شاید ملی مفاد کی خاطر قبول نہیں کیا۔

جشن آزادی کی تمام تقریبات میں شرکت اور قائداعظمؒ کے ساتھ عیدگاہ میں نماز عید مولوی عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی کی امامت میں ادا کرنے کے بعد دوسرے دن صبح ہم دونوں بذریعہ طیارۂ ٹاٹا ایئرویز یوسف ہارون صاحب کی معیت میں عازم بمبئی ہوئے جہاں موسلا دھار بارش کی وجہ سے طیارہ نہ اُتر سکا اور ہمیں پونا کے فوجی فضائی اڈہ پر اُترنا پڑا۔ ہماری آمد کی پیشگی اطلاع ملنے یا باوجود عید کا دن ہونے کے احمد ہارون جعفر صاحب کھانے کا بہت سا سامان لے کر فوراً طیران گاہ پہنچے اور تمام مسافروں کی بڑی خاطر مدارت کی۔ اللہ اللہ کر کے ہم لوگ سہ پہر میں بمبئی پہنچے۔ اگرچہ ٹرین کا سفر اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے بڑا مخدوش ہوگیا تھا لیکن ہوائی سروس دوسرے دن تھی اور ہمیں جلد از جلد ناگپور پہنچنا تھا۔ اس لئے ہم ٹرین سے روانہ ہوئے اور بخیریت ناگپور پہنچے۔

ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کو بھی پوری آزادی مل چکی تھی۔ وہ مسلمانوں سے پرانے سودے چکانا چاہتے تھے۔ محمود غزنوی کی بت شکنی کا جواب مساجد کو شہید کر کے اور سومنات کا نیا مندر تعمیر کر کے دینا چاہتے تھے اور مزید برآں اس مندر کی تعمیر میں مسلمانوں کے پاک خون کو مٹی گارے اور چونے میں پانی کے بجائے ملا کر اپنے پرماتماؤں کا آشیرواد لینا چاہتے تھے۔ مسلمانانِ ہند کے لئے موت وحیات کی آنکھ مچولی' غنڈوں کی سازشیں' قتل کی دھمکیاں' جابرانہ چیرہ دستیاں' دن دھاڑے خانہ بدر کرنے اور املاک کے نذر آتش کرنے کے کھلے منصوبے سوہانِ جان وروح تھے اور طرفہ تماشہ یہ تھا کہ ان کی بے بسی اور بیکسی رفیق وغمگسار بن کر تباہی و بربادی' آتش زنی' لوٹ کھسوٹ اور قتل وخون کو دعوت عام دے رہی تھی۔ یہ تھے ہمارے سب کے لیل ونہار جو بہت بھیانک وتاریک تھے۔ شیوا جی اور مونجے کے دیش میں ہم

کیسے بچ گئے اور کیونکر زندہ رہے، یہ تو بڑا معمہ ہے جسے خدا کے سوائے کوئی حل نہیں کرسکتا۔ اجل کو غالباً حضرت بابا تاج الدینؒ کی دعا سے حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہم سے بہت دور رہے اور نزدیک نہ پھٹکنے پائے۔ بہرحال تمام مسلمان خوف و ہراس اور ایک جان لیوا ہیجان میں شب و روز مبتلا تھے۔

ہماری زندگی بھی اس ہیجانی و اضطرابی کیفیت سے کیونکر متاثر نہ ہوتی آخر ہم بھی اس ہی معاشرہ کے فرد تھے جس کے سر پر ظلم و ستم کی کالی کالی ہیبت ناک بلائیں منڈلا رہی تھیں۔ پاکستان سے لوٹے ہوئے مشکل سے ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک شام ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مجھے جنرل ٹیلیگراف آفس سے مطلع کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ کراچی سے موصول شدہ ایک اہم سرکاری تار کو جسے صرف میں ہی وصول کرسکتا ہوں، آکر خود لے جاؤں۔ تار ملاحظہ کیجئے:-

میں نے چند احباب و رفقائے کار کو جو ناگپور میں موجود تھے یا آسانی سے مل سکتے تھے، فوراً انجمن کلب میں بلوایا۔ برقیہ کے مطالعہ کے بعد حاضرین نے بھانپ لیا کہ پاکستان میں مجھے کوئی خدمت سپرد کی جائیگی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہاں کی میری اپاہجی و مشتبہ زندگی کے مقابلہ میں پاکستان میں میری موجودگی تمام لوگوں اور بالخصوص مہاجرین کے لئے بہت زیادہ سود مند ثابت ہوگی۔ اس مشورہ و دعاؤں کے ساتھ میں سیدھا ''سی فیلڈ'' کراچی پہنچا اور قائداعظمؒ اور نوابزادہ سے ملا۔ قائداعظمؒ نحف کی وجہ سے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں حسب معمول اچھا سا بغیر کریز کا سوٹ پہنے ہوئے کوچ پر نیم دراز تھے۔ ہلکے سے تبسم کے ساتھ نحیف آواز میں میرا خیر مقدم کیا اور متمنی انداز میں پاکستان آکر خدمت کرنے کا فرمایا۔ چونکہ ان کی ہر خواہش ہر زمانہ میں میرے لئے فرمان سے کم نہیں تھی تو اب کیسے انکار کرتا۔ حالانکہ میرا ارادہ ناگپور چھوڑنے کا نہیں تھا۔

کرم سے مجھے اپنی محفل میں جا دی
جو سچ پوچھیے میری دنیا بنا دی

(ماہرالقادری)

نوابزادہ کی بات چیت زیادہ تفصیلی تھی۔ اُنہوں نے میرے لئے معتمد سیاسی کا عہدہ تجویز فرما کر اس زمانہ کے جائنٹ سیکرٹری کا مشاہرہ مبلغ ساڑھے تین ہزار روپیہ' بغیر کرایہ کا آراستہ و پیراستہ مکان اور سواری کے لئے سرکاری موٹر کار کی رعائتیں تجویز فرمائیں۔ آپ کو یہ بھی بتلا دوں کہ میں اس وقت تک اس اسامی کی اہمیت اور اس کے حق تقدم سے بالکل ناواقف تھا۔ چونکہ پیشۂ آباء زراعت و سپہ گری رہا ہے' اس لئے مجھے عمر میں پہلی مرتبہ سرکاری ملازمت کا خیال دل کو نہیں بھایا اور میرے لئے حیرت انگیز حد تک تکلیف دہ ثابت ہوا کیونکہ بزرگوں کی جوتیوں کے صدقے میں اتنی آمدنی تھی کہ اطمینان اور سکھ کی زندگی گزارنے کے بعد بقایا رقم خدمت قومی پر صرف ہوتی تھی۔ نوابزادہ صاحب بڑے قیافہ شناس تھے۔ میرا دل جو اس وقت رزمگاہ بنا ہوا تھا' ان کی آنکھوں سے سے جو تاریکی میں روشنی ٹٹول لیتی تھیں' کیسے چھپ سکتا تھا۔ میں نے اپنے پرورش و تربیت یافتہ جذباتِ خدمتِ ملی و ملکی کے پیش نظر اعزازی طور پر معتمد سیاسی کے عہدہ کو دو گزارشات کے ساتھ قبول کیا۔ پہلی گزارش رہائشی مکان کے متعلق تھی جس کے لئے نوابزادہ صاحب نے خود پہلے ہی فرمایا تھا۔ دوسری گزارش یہ تھی کہ میں صرف ان کی ماتحتی میں کام کروں گا اور چونکہ پبلک سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے مقرر کیا جا رہا ہوں' اس لئے پبلک کے جذبات کی صحیح ترجمانی کروں گا جو وزیراعظم کی طبع پر گراں نہیں گزرنا چاہئے۔ وہ بڑے دل گردہ کے سچے اور مخلص رہنما تھے' انہوں نے ہنس کر قبول فرمایا۔ میں کچھ باتیں کہہ گیا اور آگے چل کر بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں تا کہ پرانے خادمانِ قوم کے احساسات اور اس زمانہ کے ''انسان اور آدمی'' کے کردار کی صحیح عکاسی ہو سکے اور نوزائیدہ ملک کے چشم دید حالات قلمبند ہو جائیں۔

مجھے حکم ملا کہ میں کراچی میں رک جاؤں اور ناگپور سے اپنی رفیقۂ حیات کو کسی عزیز کے ساتھ بلوا لوں۔ چونکہ یہ بات ممکن العمل نہیں تھی' اس لئے حکم ثانی ملا کہ میں کوئی خطرہ نہ مول لوں اور صرف ہوائی جہاز سے دونوں طرف کا سفر کروں اور ناگپور سے فوراً آ کر اپنے عہدہ کو سنبھال لوں۔ میں کیسے گیا' کیسے آیا' ناگپور میں دورانِ دو روزہ قیام مجھ پر کیا بیتی' اپنے وطن کو کس طرح

چھوڑا' حضرت بابا تاج الدینؒ کے آستانِ اقدس سے ظاہری دوری پر میرے قلبِ حزیں پر کیا گزری' اپنی اپنی جگہ بہت بڑے عنوانات ہیں۔ ان کو نہ چھوتے ہوئے مختصراً عرض کروں گا کہ بمبئی سے ناگپور ٹرنک کال کر کے اہلیہ کو ہدایت کی کہ وہ فوراً سنٹرل کالج فار ویمن کی اُردو اور فارسی کی پروفیسر سے مستعفی ہو جائیں جہاں وہ اپنی قدیم ایثار کیش طبیعت کی بدولت برائے نام تنخواہ پر بمعہ دیرینہ جذبۂ خدمتِ تعلیم نسواں و طالب و محافظ حقوق نسواں ہمارے پسماندہ صوبہ کی مسلمان بچیوں کی شب و روز بڑے انہاک کے ساتھ تعلیمی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ میں نے انہیں مزید ہدایت کی کہ وہ دو دن کے اندر کراچی چلنے کے لیے تیار رہیں۔

میں ناگپور پہنچ کر خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ صاحب سابق ممبر مرکزی اسمبلی و ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر سے جو میری بھانجی کی مناسبت سے جوان کے نواسہ کے ساتھ بیاہی گئی تھی' قرابت دار ہو گئے تھے' جا کر ملا۔ ان کی رائے کے مطابق ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ناگپور کو پاکستان میں اپنی تقرری اور ناگپور سے روانگی کی اطلاع دی جس سے میں واقعتاً بہت سی الجھنوں اور تشدد کی کارروائیوں سے بال بال بچ گیا۔ روانگی سے چند گھنٹہ قبل جبکہ ابھی صبح کاذب نمودار نہیں ہوئی تھی کہ پولیس نے مکان کا محاصرہ کر لیا اور کوتوال شہر رائے صاحب ہیرا نند نے جو میرے اچھے جاننے والوں میں سے تھے' مکان کی تلاشی لے کر تمام اسلحہ جات جن میں چند خاندانی اور تاریخی تھے' رائج الوقت قواعد کے خلاف ضبط کر لئے کیونکہ میں بحیثیت معافی دار کے ہندوستان کے قواعد کے مطابق بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کا مجاز تھا۔ علاوہ ازیں بحیثیت رُکن مرکزی اسمبلی مَیں من مانے اسلحہ رکھ سکتا تھا۔ بہرحال میں نے انہیں سب کچھ بغیر ردّ و قدح کے سپرد کر دیا تاکہ خوشگوار فضا قائم رہے اور ہم دونوں بغیر کسی مزاحمت و دقّت کے پاکستان چلے جائیں۔ ہم دونوں اپنا بنا بنایا سجا سجایا مکان چھوڑ کر بہت ہی مختصر سامان لے کر ہوائی جہاز کی روانگی تک اس سراسیمگی کے ساتھ کہ اب روکے اور گرفتار کئے جاتے ہیں' بمبئی روانہ ہوئے جہاں ہمارے ایک ہندو دوست مسٹر رام چندر راؤ ہمارے بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ

ان ہزاروں اور لاکھوں نیک طبیعت ہندو دوستوں میں سے ایک تھے جو مسلمانوں کے بہی خواہ اور پشت پناہ لیکن درندہ صفت ہندو غنڈوں کے ہاتھوں یہ امن و صلح پسند لوگ بھی تنگ تھے۔ یہ کامٹی سے جب مسلمان کو قتل کر دینا پُن (ثواب) سمجھا جاتا تھا' ڈاکٹر بیگم (زوجہ ڈاکٹر حبیب الرحمان خاں) اور ان کی ننھی بچی کو بحفاظت میرے سپرد کرنے بمبئی لائے تھے کہ میں کراچی جا رہا ہوں جہاں بیگم صاحبہ کے شوہر بمعہ دیگر عزیز و اقارب اور ان کے والد ماجد ڈاکٹر اے آر احمدی صاحب (سابق ڈاکٹر میونسپل کمیٹی کامٹی) جو میرے دیرینہ کرم فرما بزرگ ہیں' مقیم تھے۔

اس مرتبہ بجائے ''سی فیلڈ'' کے میں اپنے ہم زلف محمد سلیم خاں صاحب درانی' ڈائریکٹر آف وائرلیس کے مکان واقع نیپئر بیرکس گیا۔ اللہ اللہ اس زمانہ میں نو واردوں کی جو لاچارگی کی حالت تھی' اس کا مشاہدہ درانی صاحب کے مکان پر ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ پتھر کے کھردرے فرش پر چٹائی بچھا کر ان کے ننھے منے بچے پڑے تھے۔ مکان تمام اہم ضروریات زندگی سے خالی تھا لیکن عجیب بات ہے کہ کراچی میں اشیائے خوردنی بہتات کے ساتھ میسر تھیں۔

ہمیں بھی نئے ملک اور نئے ماحول میں از سر نو زندگی شروع کرنی تھی۔ اس لئے بغیر تاخیر کے ہم لوگ سرکاری مکان نمبر 204 الف فریئر اسٹریٹ میں منتقل ہو گئے جہاں دیواروں' دروازں اور کھڑکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے حکم ملا کہ وزارتِ محنت کے ایک افسر سے سرکاری فرنیچر وغیرہ کے لئے رجوع کروں۔ میں جب ان سے ملنے گیا تو وہ کثرت کار کی وجہ یا اپنے وزیر یا کسی بالا افسر کی ڈانٹ کی وجہ سے بھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بغیر کچھ سوچے سمجھے جھنجھلا گئے اور بلا وجہ بدمذاقی کی چند باتیں کہہ ڈالیں۔ جب اس کا علم غلام محمد صاحب مرحوم کو ہوا جو عارضی طور پر وزارتِ محنت کا بھی کام دیکھ رہے تھے تو افسر مذکور کو فوراً طلب فرمایا اور درسِ تہذیب دے کر خوب تہدید کی۔ بہرحال میں اپنا سا منہ لے کر گھر لوٹ آیا۔ گھر میں فوراً ٹیلیفون نصب کر دیا گیا۔ جو برآمدے کی ایک کھڑکی کی چوکھٹ میں رکھا ہوا تھا۔ گھر میں کرسی کے نہ ہونے کی وجہ سے میں بھی ٹیلیفون کے قریب چوکھٹ میں بچوں کے جیسا پیر لٹکا کر بیٹھا تھا کہ ایک موٹر کار کوٹھی

کے احاطہ میں داخل ہوئی اور کھلے دروازہ کے سامنے رکی۔ اس میں سے مسرت حسین صاحب زبیری برآمد ہوئے اور کسی کا پتہ دریافت کرنے کیلئے تیزی کے ساتھ دروازہ کی طرف بڑھے۔ مجھے کھڑکی میں بیٹھا ہوا دیکھ کر حیرت وخوشی سے ٹھٹک گئے۔ میں انہیں اور وہ مجھے اس وقت سے جانتے تھے جب میں مرکزی اسمبلی کا ممبر تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ انگریز اور ہندو رفقائے کار کو بہت پیچھے چھوڑ کر حکومت ہند کی ریلوے وزارت کے سیکرٹری بن گئے تھے۔ ان کی یہ حیرت انگیز ترقی مسلمان ممبروں اور مسلمانوں کے لئے موجب افتخار تھی۔ الحاصل انہوں نے مجھے دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور خاموش نگاہوں سے گھر کا جائزہ لیا۔ دوسرے دن علی الصبح جب کہ مؤذن صاحب دوسری دفعہ ''الصلوۃ خیر من النوم'' کا اعلان نہ کر پائے تھے کہ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر میں میرے اور میری بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ اونٹ کی دو گاڑیوں میں گھر کا تمام فرنیچر قالینوں کے ساتھ لدا ہوا ہے۔ میں سمجھا کہ مکان پر اور کوئی صاحب قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں نے احتجاج کیا کہ حکومت کی طرف سے یہ کوٹھی میری رہائش کے لئے دی گئی ہے اور کسی صاحب نے غلطی سے اپنا سامان یہاں بھیج دیا ہے۔ میری باتیں سن کر چپراسی نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ یہ سب سامان زبیری صاحب نے آپ کے استعمال کے لئے بھجوایا ہے۔ میں گنگ سا ہو گیا۔ اتنے عرصہ کے بعد بھی آج میں اس سلسلہ میں کچھ لکھ کر جذباتِ تشکر کی توہین نہیں کروں گا۔

ایسی ہی انسانی ہمدردی کا ایک اور واقعہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں جس روا روی سے اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ کر چلا آیا تھا تو میں اپنی موٹر کار کیسے لاسکتا۔ اس لئے میں کراچی میں چند دنوں تک اپنے دفتر کو پیدل جایا کرتا تھا۔ جب گرمی کی شدت بڑھی تو میں نے ایک سائیکل پندرہ روپیہ ماہانہ کرایہ پر لے لی اور کئی مہینہ تک میں اسے استعمال کرتا رہا۔ اس زمانہ کے ہمارے عزیز و مخلص دوست مسٹر اے ایم قریشی جن کی تعلیمی خدمات و علم دوستی کے گھر گھر

چرچے ہیں اور جن پر مولینا شبیر احمد عثمانی جیسے ممتاز عالم دین و عامل شریعت محمدیہ پوری طرح سایہ فگن تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب تک یہ مہر سعادت ضوفشاں رہا۔ قریشی کا ستارۂ عروج اسلامیہ کالج کی بلند عمارت کی طرح فلک بوسی کرتا رہا۔ اب تو ہرجائی اور بے وفا خوش نصیبی ان کا دامن چھوڑ کر اور کسی کے پہلو میں جا بیٹھی ہیں۔ قریشی صاحب نوابزادہ صاحب کے عقیدتمندوں میں سے تھے اور مسلم لیگ کے کاموں کے سلسلے میں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ انہیں میرا سائیکل پر آنا جانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ اپنی مارس کار جوان کے قول کے مطابق ان کی ضرورت سے زیادہ تھی' میرے استعمال کے لئے لائے اور کہا کہ جب میں دوسری کار خریدلوں' اس وقت اس کار کو واپس کردوں۔ نوابزادہ صاحب کی اجازت سے میں نے کار رکھ لی۔ دو تین ماہ کے بعد قریشی صاحب کی مہربانی وتوجہ سے میں نے دوسری کار خریدلی۔ پاکستان کا یہ وہ بہترین زمانہ تھا جب اپنے بھائیوں کے گلے کاٹنا' چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور کوئی بھی سودا بازی نہیں کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ہر شخص چاہے وہ سرکاری یا غیر سرکاری ہو' صرف خدمت کرنا جانتا تھا اور خلوص' ہمدردی اور اُخوت کے جذبے سے سرشار تھا۔

میرے دفتر کے لئے وزیراعظم صاحب کی قیام گاہ میں قلت مکانی کی وجہ سے جگہ نہیں تھی' اس لئے دو چار دن ایک بوسیدہ خیمہ اور بعدہ' کمپاؤنڈ میں ایک سایۂ دار درخت کے نیچے میرے دفتر کے لئے ایک میز' ایک کرسی اور ملنے والوں کے لئے ایک لمبی سی بینچ رکھی گئی۔ دوات قلم پنسل کاغذ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا کیونکہ ہر چیز کی بنیاد کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کو ہٹا کر رکھی جارہی تھی۔ دو تین واقعات ایسے ہیں جن کا سنا دینا ازبسکہ ضروری ہے تاکہ حکومت اور اس کے اعمال کی بے چارگی کا صحیح پس منظر آپ کے سامنے آجائے۔ اکاؤنٹنٹ جنرل اور ڈی اے جی پی ٹی کے دفاتر کا تعلق مرکزی حکومت دہلی سے تھا۔ مرکزی حکومت کے دفاتر کے بہت سے مسلمان افسر اور عملہ قائداعظمؒ کی آواز پر پاکستان کی خدمت کو ایک اہم اسلامی فریضہ سمجھ کر اس ہی طرح لبیک کہتے ہوئے دوڑے جیسے صاحب حیثیت مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے جاتا ہے۔ مسلمانوں نے نئی اسلامی مملکت کو اپنے عملی تعاون سے قائم کرنے اور اس کی خدمت کو ایک اہم مقدس فریضہ

اور اس کی ادائیگی کو اُخروی نجات کا باعث سمجھا۔ اس پاک جذبہ کے ساتھ آنے والوں میں میرے ایک عزیز دوست جو ڈی اے جی پی ٹی آفس ناگپور میں ملازم تھے۔ بمعہ اہل وعیال کراچی آن وارد ہوئے حالانکہ انہیں لاہور جانا چاہیے تھا جہاں ان کا دفتر تھا۔ چونکہ میں سرکاری دفاتر کی کارروائی سمجھنے سے بالکل قاصر تھا' اس لئے اپنے دوست کی زبوں حالی اوران کے شدید اصرار پر پاکستان کے پہلے اکاؤنٹنٹ جنرل سید یعقوب شاہ صاحب سے جوایک خاموش طبیعت' بزرگ صفت اور مخلص انسان ہیں' سفارش کر بیٹھا کہ اگر حاملِ رقعہ کو اپنے دفتر میں جگہ دیں تو بڑا احسان ہوگا۔ ہندوستان سے آنے والے سرکاری ملازمین کو ملازمت دینا اور بسانا حکومت کی پالیسی تھی' لہٰذا شاہ صاحب نے مسلّمہ قاعدہ میں وسیع گنجائش پیدا کر کے میرے دوست منیر الدین شیرازی صاحب کو اپنے دفتر میں کلرکی عطا کی جو پہلے ڈی اے جی پی ٹی آفس میں ملازم تھے اور اب اکاؤنٹنٹ جنرل کے آفس میں منتقل کر دیے گئے۔ مزے کی بات اس دستی رقعہ کی ہے جو میں نے شیرازی کو اکاؤنٹنٹ جنرل کے لئے دیا تھا۔ شیرازی میرے بے تکلف سیاہ فام دوست ہیں۔ اُنکے سیاہ فام ہونے کی مناسبت سے میں ان کو طنزاً شیرازی کہتا ہوں ورنہ اس بے چارہ کو سعدی اور حافظ کی سرزمین گل وبلبل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ جب دفتر میں کاغذ و دوات میسر نہیں تھی تو میرے گھر پر اس کا کیا ٹھکانہ ہوسکتا تھا۔ باور فرمائیے کہ قینچی چھاپ سگریٹ کے پیکٹ کے پشت پر شیرازی کے فاؤنٹین پین سے اکاؤنٹنٹ جنرل صاحب کے نام چند ٹیڑھی بھنگی سطریں لکھ کر دی گئیں۔

اس زمانہ میں ہر پاکستانی افسر نے خدمت کرنا اپنا فرضِ اوّلین بنالیا تھا اور وہ دفتر کی گھس گھس اور سرخ فیتہ کی کارروائی کو ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے اور اس لائحہ عمل پر ہر شخص کاربند تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ وزیراعظم کے نام ایک درخواست آئی جسے درخواست گزار کے ہمدست کسی دفتر میں بھجوانا تھا۔ معتمد سیاسی کے پاس پنسل تک نہیں تھی۔ اس وقت اتفاق سے دہلی کے منظور الحق صاحب جو کسی زمانہ میں دہلی صوبہ مسلم نیشنل گارڈز کے سالار صوبہ تھے' معتمد سیاسی

کے دفتر میں بنچ پر بیٹھے تھے۔ انہیں معتمد سیاسی کی حالت زار پر رحم آ گیا اور اُنہوں نے اپنی جیب سے ایک پنسل نکال کر عطا کی جس سے درخواست پر چند سفارشی لفظ لکھے گئے۔ معتمد سیاسی کے میز سے سمندری ہوا کے زوردار جھکڑ کاغذوں کو ہر سمت اڑایا کرتے تھے جس کو جمع کرنے کے لئے بنچ پر بیٹھے ہوئے لوگ تعاقب کرتے۔ وزیر اعظم کے نورنظر اکبر میاں جو چھوٹے سے بچے تھے ان کے لئے چند دنوں تک اڑتے ہوئے کاغذوں کو دوڑ دوڑ کر پکڑنا بڑا دلچسپ تماشہ و تفریحی شغل تھا۔ ایک دن وہ چند گول پتھروں پر پتنگ کے رنگی برنگی کاغذ مڑھ کر لائے اور کاغذوں پر رکھ دیا تاکہ آئندہ وہ اُڑنے نہ پائیں۔ یہ تھے پاکستان حکومت کی عہد طفلی کے چند آپ بیتی واقعات۔

آپ جانتے ہیں کہ میں مصیبت زدہ لوگوں اور وزیر اعظم کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس لئے صبح سے شام تک میرے پاس دُکھیوں اور حاجتمندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ وزیر اعظم صاحب اپنی بے پناہ اہم ملکی مصروفیات کی وجہ سے ملنے والوں کو بالکل وقت نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھ پر اعتماد کلی کر کے اپنی زبان بنا کر بٹھلایا تھا۔ وہ صرف وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ قوم کے محبوب رہنما بھی تھے۔ میری سفارش ان کا حکم سمجھا جاتا تھا اور حکومت کی بھی یہ طے شدہ پالیسی تھی کہ مصیبت زدوں کو بسایا جائے اور ان کی تکالیف حتی الوسع دور کی جائیں۔ حکومت کی اس پالیسی کو عمال حکومت بڑی دیانتداری اور تندہی سے عملی جامہ پہناتے تھے۔ لوگ وزیر اعظم صاحب کی ہمدردی و امداد پر اتنا یقین رکھتے تھے کہ بیماروں کو اسپتالوں میں داخلہ دلوانے وزیر اعظم صاحب کی کوٹھی پر لاتے۔ بارش ہوتی تو اپنی خراب و بوسیدہ جھونپڑیوں کی مرمت کے لئے چٹائی، بانس اور ٹن کی چادریں مانگنے آتے۔ ان کی اس دروازے سے ہر حالت میں حاجت روائی کی جاتی۔ ایک مرتبہ ایک برقعہ پوش خاتون تپ دق کے ایک مریض کو جو غالباً ان کے شوہر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں، چند لوگوں کی مدد سے ٹھیلے پر ڈال کر لے آئیں۔ انہیں وزیر اعظم کا نام لے کر فوراً سینی ٹوریم میں داخل کرایا گیا۔ ایک بہن کو زچہ خانہ میں داخلہ نہیں ملا تھا۔ ان کو لوگ لے آئے۔ چند

ہی منٹوں میں ایمبولینس کار کے آنے سے قبل گیٹ کے باہر وکٹوریہ روڈ پر بغیر کسی قسم کی طبی امداد کے ایک ننھے پاکستانی نے بخیریت جنم لیا۔ واہ! کیا شانِ حکومت ولیڈری تھی اور رعایا کی کیا کیا توقعات اس در سے پوری نہیں ہوتی تھیں۔ کہیں ملازمتیں، کہیں اسکولوں اور کالجوں میں داخلے دلوائے جارہے ہیں۔ کہیں شادی بیاہ کے لئے چپکے سے مالی امداد کی جارہی ہے۔ الحاصل جو کوئی اُس دربار میں آیا، فیضیاب ہوکر گیا۔ کسی کی زبان سے اپنے وزیراعظم کے متعلق حرف شکایت نہیں سنایا گیا۔ اُس زمانہ میں لوگ اتنے قانع وصابر تھے کہ وہ اپنے نوشتۂ تقدیر کو سکون وصبر کے ساتھ ہنستے ہوئے برداشت کرتے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، پاکستان کے حالات سنبھلنے لگے جس سے ہندوستان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ پاکستان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا اور نہ اُس کی بددعاؤں سے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا۔ وہ بمصداق کھسیانی بلی، کھمبا نوچے ان مصیبت زدہ ہندوستانی مسلمانوں کو جو مسلم لیگ اور پاکستان کے حامی تھے، بری طرح نوچنے اوران کی جائیدادوں کو ہتھیانے لگا کہ یہ ہندوستان میں نہیں رہیں گے، یہ پاکستان چلے جائیں گے یا ان کا پاکستان جانے کا ارادہ ہے۔ بہت سے مسلمانوں کو جن کا پاکستان آنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا، انہیں ایسا مجبور کردیا گیا کہ وہ صرف جسم کے کپڑے پہنے ہوئے کھوکھراپار کی طرف سے پاکستان میں داخل ہوئے۔ نوابزادہ صاحب نے اپنے دورِحکومت میں ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جو لوگ ابتدا میں پاکستان آئے، بھارت نے ان کی جائیدادوں پر قبضہ کرکے انتقام کی مہم شروع کردی اور حکومت ہند کی ہمت یہاں تک بڑھی کہ اس نے شائستگی، تہذیب، رواداری اور ذوق سلیم کو ٹھکرا کر قائداعظمؒ کی بمبئی میں ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ والی کوٹھی کو ہمارے مایۂ ناز گورنر جنرل کو تارکِ وطن قرار دے کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ گورنر جنرل پاکستان کے بعد وزیراعظم کی باری آنا یقینی تھی۔ ان کی کرنال اور مظفر نگر کی تمام جائیداد مع کوٹھیوں کے اوران کی نئی دہلی ہارڈنگ ایوینیو کی کوٹھی موسوم بہ ''گلِ رعنا'' کو ضبط کرلیا گیا۔ جب ان دونوں مقتدر ہستیوں پر بے

باکی کے ساتھ ہاتھ ڈالا گیا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

بمبئی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا میں وزیراعظم نے میری ضبطیٔ جائیداد کی خبر پڑھ کر مجھے فوراً طلب فرمایا اور یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی جائیداد کی ضبطی کی بھی خبر اس ہی اخبار میں جلی حروف میں بہت نمایاں جگہ پر شائع کی گئی تھی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس قہقہہ میں ایثار، صبر وقناعت اور راضی برضا ہونے کے جذبات مستور تھے۔ میں اپنی شرط کے مطابق سات آٹھ مہینے سے اعزازی خدمت کر رہا تھا۔ اب انہیں مجھے چھیڑنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اُنہوں نے سوالیہ انداز میں فرمایا: ''کہیے اب تنخواہ لیں گے یا نہیں؟'' میں نفی میں کیسے جواب دیتا۔ خود ہی فرمایا جائنٹ سیکرٹری کی ماہانہ تنخواہ ساڑھے تین ہزار روپیہ ماہماہ وصول کیجئے۔ اُنہوں نے میرے اصرار پر کہ مجھے، میری بیوی اور بچی کو پیٹ بھر روٹی کھانے اور صاف ستھرا کپڑا پہننے کے لئے ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہوار کافی ہوں گے، میری اتنی ہی تنخواہ مقرر کی جس میں سے انکم ٹیکس اور فرنیچر کا کرایہ وغیرہ کٹا کرتا تھا۔

سرکاری ملازمت کی حلقہ بگوشی کا اس طرح آغاز ہوا لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وزیراعظم نے کبھی مجھے اپنا ماتحت نہیں سمجھا اور نہ کبھی یہ محسوس ہونے دیا کہ وہ وزیراعظم اور میں ان کا سیکرٹری ہوں۔ ان کی کرم گستری تھی کہ اُنہوں نے مجھے ہمیشہ اپنا دوستِ صادق، لائق اعتماد اور بھائیوں سے بڑھ کر سمجھا۔ غیر ملکی معزز مہمانوں سے جب کبھی انہوں نے میرا تعارف کرایا تو کمال شفقت و بزرگی سے فرمایا کہ یہ میرے رفیق کار ہیں۔ ایک دفعہ ایک سرکاری افسر نے جب کہ افسروں کے فرائض تقسیم کئے جا رہے تھے، مشورہ دیا کہ جب وزراء وزیراعظم سے ملنے یا کابینہ کے اجلاس کے لئے آئیں تو معتمد سیاسی کو ان کا استقبال کرنا چاہیے جسے سن کر ان کے چہرہ پر برہمی کے آثار ہویدا ہوئے اور فرمایا ''یہ نہیں ہوسکتا۔ میرے لئے صدیق علی خاں وزیر سے کم نہیں ہے۔'' میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پاکستان بننے سے قبل ان کا میرے ساتھ جو دوستانہ اور برادرانہ سلوک تھا، اس میں تازیست سرمو بھی فرق نہیں آیا بلکہ پاکستان میں مسلسل

رفاقت وقربت کی وجہ سے دوستانہ تعلقات میں اتنی زیادہ اپنائیت پیدا ہوگئی کہ لوگ مجھے ان کا بھائی سمجھنے لگے اور آج بھی سمجھتے ہیں۔ان حالات میں عالم الغیب ہی جانتا ہے کہ ان کی دائمی مفارقت سے میری جان پر کیا گزر رہی ہوگی۔

دل ویراں ہے تیری یاد ہے تنہائی ہے
زندگی درد کی باہوں میں سمٹ آئی ہے

(شباب کیرانوی)

وزیراعظم صاحب کے لئے حکومت کرنا اور قیادتِ قوم کو اپنے عقیدتمندوں کی توقعات کے مطابق نبھانا آسان کام نہیں تھا۔خزانہ خالی اور تعمیر نو جاری رکھنا تھا۔بھوکی اور ننگی لیکن صابر اور پاکستان پر مرمٹنے والی قوم کو کھلانا اور کپڑا پہنانا ضروری تھا۔ٹڈی دل جیسے آنے والے مصیبت زدگان کی دیکھ بھال اور ان کو بسانا فرض اوّلین تھا۔خودمختاری کو قائم رکھنے کے لئے سرحدوں کی پاسبانی سے غفلت خودکشی کے مترادف تھی۔دشمن قوم وملک سے چوکنا رہنا اور پاکستانی افواج کو کیل کانٹے سے لیس کرنا لازمی تھا۔غیرملکی وفود کا ان کے شایانِ شان استقبال ومہمان نوازی کرنا' غیرملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے وفود بھیجنا' کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنا' غیرممالک کی کانفرنسوں میں شرکت کرنا پاکستان کی ترقی وبقا اور شہرت کے لئے ضروری تھا۔ان تمام فرائض کی انجام دہی کے واحد جوابدار وزیراعظم تھے۔خوش نصیبی سے ان کی کابینہ کے وزراء کا ان کے ساتھ مثالی عملی تعاون تھا اور ہر وزارت کا کام باہمی مشورہ اوران کی صلاح سے اطمینان بخش طریقہ پر سرانجام پاتا تھا۔جیسے ہمارے عزیز دوست عزیز کارٹونسٹ کی لکیریں بولا کرتی ہیں' اُس ہی طرح وزیراعظم کے کابینہ کے کمرہ میں اجمل حسین صاحب کی بولتی ہوئی لکیریں دیوار پر آویزاں تھیں۔ وہ زبان حال سے پکار پکار کر بولتی تھیں کہ ہم تمام اراکین کابینہ کھیل کود اور مل جل کر وزیراعظم کی زیرسرپرستی خندہ جبینی کے ساتھ فرائض انجام دیتے ہیں۔

حکومت کی مشینری میں رخنے نہیں پڑے تھے۔وہ بہت ہی اچھی طرح چلتی تھی۔جب

وزیراعظم منصف مزاج، حق گو، دیانتدار، قواعد کا پابند خویش نوازی اور اقربا پروری سے سخت متنفر، قوم و ملک کا سچا بہی خواہ اور بے لوث خادم ہو تو وہ قوم و ملک کی خدمت بڑی دلیری کے ساتھ کر سکتا ہے اور قوم بھی اس پر اعتماد کرتی اور اُسے بہت چاہتی ہے کیونکہ وہ خود غرض اور زر و جاہ پرست نہیں ہوتا۔ وہ اپنے عہدۂ جلیلہ سے اگر قوم کا اعتماد اٹھ جائے تو ہر وقت مستعفی ہونے کو تیار رہتا ہے۔ یہ ہی حالت نوابزادہ صاحب کی تھی۔ اس ہی لئے قوم اُن پر ہمیشہ اپنی جان چھڑکتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نوابزادہ صاحب کبھی کرسی کے پیچھے نہیں دوڑے۔ برخلاف اس کے کرسی ان کے پیچھے دوڑی اور اُن سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی، یہاں تک کہ عرش و کرسی کے مالک نے انہیں اپنے پاس بلوا کر ہمیشہ زندہ رہنے والے شہید کی کرسی بخشی۔

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

(تاثیر)
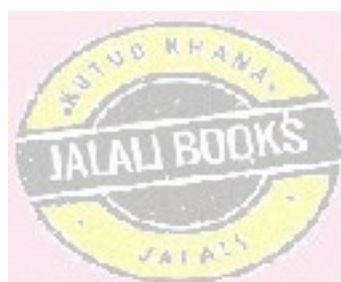
قائداعظمؒ

کچھ احسان فراموش اور دریدہ دہنوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ قائداعظمؒ نے حصول پاکستان کے لئے سوائے اس کے اور کیا کیا جو ایک وکیل کرتا۔ انگریزوں نے تو ملک چھوڑنے کا طے کرلیا تھا اور وہ ملک کو سر پر رکھ کر لے جانے سے رہے تھے۔ نتیجتاً سب ہندوستانی آزاد ہو جاتے۔ بہر حال یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے دیدہ و دانستہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ حق بات سننا اور کہنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے بارہ میں ارشاد باری ہے: **فَـأَغۡشَيۡـنَـا هُـمۡ فَهُـمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ ۔**

ایک دانشور جو اپنی بے تکی باتوں سے بارہا یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ عقلی طور پر دیوالیہ ہو گئے ہیں، اُنہوں نے ایک مرتبہ اپنے ذہن مبارک سے عقل و ہوشمندی کے چند موتی یہ کہہ کر اُگلے کہ پاکستان قائداعظمؒ کی زندگی میں نہ بنتا تو ان کی وفات کے بعد ضرور بن جاتا کیونکہ مطالبۂ پاکستان ایک قومی مسئلہ تھا اور اس لئے وہ کیسے رد کیا جا سکتا تھا۔ اس وقیع رائے دہی کے بعد اُنہوں نے ایک اور بات کہہ ڈالی کہ قائداعظمؒ کو مسلمانوں سے وہ تقویت نہیں پہنچی جو انہیں ملنی چاہئے کیونکہ مسلمانوں میں اختلاف تھا اور وہ کئی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اگر یہ دلیل درست ہے تو 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی کیسے نصیب ہوئی؟ حکومت برطانیہ اور کانگریس نے آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت کیوں تسلیم کیا؟ مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر کے برطانیہ اور کانگریس نے کیوں متحدہ ہندوستان کے دو ٹکڑے کر ڈالے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ان سچے اور بے غرض حامیوں اور قائداعظمؒ کے احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کرنے والوں پر گندگی کیوں پھینکی جاتی ہے۔ قائداعظم کے عظیم

کارنامے کی اہمیت کو کیوں گھٹایا جارہا ہے۔

قائداعظمؒ کی ذات گرامی ہم سب کے لئے بہت مقدس ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ان کی شاندار اسلامی خدمت کی گھناؤنی تنقید کسی بھی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی، چاہے ناقد یا رائے دہندہ پاکستان تو کیا دُنیا کا کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوؤں کی اکثریت اور خود مہاتما گاندھی اس بنا پر مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے سے منکر تھے کہ ان مسلمانوں کے آباواجداد ہندو تھے۔معترضین یہ بھی کہتے تھے کہ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان ایک غیر فطری، غیر اقتصادی اور ایک غیر قومی چیز ہے لیکن دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ قائداعظمؒ نے اسے ایک روشن حقیقت بنا کر اُجاگر کیا اور تمام معترضین اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گئے۔اسی طرح اس امر کے متعلق بھی دو رائے نہیں ہوسکتی کہ اگر قائداعظمؒ اپنی زندگی میں ہندوستان کو تقسیم کرانے میں خدانہ کرے ناکام ہوتے تو ہندوستان قیامت تک اکھنڈ بھارت اور مہا بھارت رہتا اور وہاں آج رام راج ہوتا۔ ذرا سوچئے تو سہی ایک راہ گم کردہ منتشر قافلہ بغیر کسی ایسے میر کارواں کے کس طرح منزلِ مقصود پر پہنچتا اور ایک بھٹکی اور طوفان میں گھری ہوئی کشتی بغیر جہاندیدہ ناخدا کے کیونکر سلامتی کے ساتھ ساحل مراد پر پہنچتی۔ اگر عوام کا جوش وخروش قائداعظمؒ جیسے صاحبِ فراست و دوربیں کی قیادت میں نظم وضبط اور آئین کے سانچے میں ڈھال نہ لیا جاتا تو تمام دشمن عناصر مسلمانوں کا قلع قمع کر دیتے اور بیخ وبن سے اُکھیڑ پھینکتے۔تاریخ عالم شاہد ہے کہ کسی قوم نے بغیر اچھے قائد کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کی۔کیا پاکستان کا موجودہ خلفشار صحیح قیادت کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے۔تعجب ہے کہ اس ایٹمی دور میں بے پر کی اُڑانے والوں اور زہر کی پڑیا چھوڑنے والوں کو گڈو کے دماغی امراض کے ہسپتال میں کیوں نہیں بھیج دیا جاتا۔اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری قوم اور ملک کو ایسے شرپسندوں سے بچائے۔

یہ صحیح ہے (1) وہ وکیل تھے لیکن ایسے ویسے نہیں بلکہ چوٹی کے جولندن کی پریوی کونسل میں وکالت کرتے تھے۔ہم اس حقیقت سے کیوں چشم پوشی کرتے ہیں کہ رب العالمین نے

(2)انہیں امور پارلیمانی کا ماہر بنایا تھا اور (3) ایسی سیاسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ وہ دشمنان اسلام اور بدخواہانِ مسلمین کی پوشیدہ چالوں کو تاڑ جاتے تھے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ان تین خوبیوں اور صلاحیتوں کے انسان شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ارحم الراحمین کا بے پایاں فیض وکرم تھا کہ اس نے مسلمانان ہند کی قیادت کے لئے قائداعظمؒ کو منتخب فرمایا۔

ہمیں کیا ہوگیا ہے؟ ہم تو ایک زندہ اور آزاد قوم کے افراد ہیں۔ ہم اپنے محسنین' ان کے شاندار کارناموں اور اپنے اس آڑے وقت کو کیوں بھلا رہے ہیں جب ہم انگریزوں کے غلام اور ہندوؤں کے مظالم کے شکار تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ رہا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ تمام اختیارات کانگریس کو سونپ کر جانا چاہتا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے حصہ کے اختیارات انگریزوں سے چھینے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان اختیارات کو کانگریس بغیر ڈکار کے ہڑپ کر جانا چاہتی تھی اور اُنہوں نے اُسے کانگریس کے حلق سے اگلوادیا؟

قائداعظمؒ نے تین لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل کے رقبہ کا ملک بنام پاکستان حاصل وقائم کیا۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ یہ کٹا پھٹا ملک ہے۔ یہ حصہ اور وہ حصہ بھی شریک کرنا چاہئے تھا۔ ان کی یہ دلیل اپنی جگہ اور بہت سی ایسی ہی دلیلیں بالکل بجا اور درست ہیں لیکن یہاں وہ کھیل تو نہیں ہوا جو برطانوی نوآبادیات میں اور بالخصوص مشرقی افریقہ میں کھیلا گیا تھا۔ وہاں تو انگریز آبادکاروں کو حکومت برطانیہ کی طرف سے اذنِ عام تھا کہ کینیا میں جہاں تمہارا جی چاہے' جاؤ۔ گھوڑا سرپٹ دوڑاؤ۔ وہ جہاں رُک جائے یا جہاں تم روک دو' وہاں تک اس زمین پر قبضہ کرلو۔ چنانچہ بہت سے انگریزوں نے نو ہزار فٹ مرتفع وہموار زمین پر میلوں کانٹے دار تار لگا کر قبضہ جمایا اور اس طرح برطانیہ کی سرپرستی اور مالی اعانت سے کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ مقامی باشندے یعنی افریقیوں کو جو اس ملک کے اصلی مالک تھے' اجازت نہیں تھی کہ وہ ہل چلا کر کھیتی باڑی کریں۔ وہ صرف اپنے مکانوں کے اطراف چھوٹے چھوٹے قطعات پر کدال سے گڑھے

کھود کر مکائی (مکئی) اور آلو اگاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں پاکستان چاندی کے طشت میں رکھ کر پیش نہیں کیا گیا۔ ہمیں تو بھارت ماتا کو کاٹ کر اور اپنا گرم گرم خون بہا کر حصہ لینا پڑا۔ کینہ پروروں، شر پسندوں اور احسان فراموشوں کو ہمارا کھلا چیلنج ہے کہ کوئی سپوت پاکستان کے سویں حصے کے برابر ہی مسلمانوں کا ایک ملک قائم کر کے دکھلا دے۔ چلو جانے دو، یہ بہت بڑا رقبہ ہے۔ اگر کوئی ماں کا لال جیکولین کے شوہر اوناسس کے جزیرہ کے برابر ہی کا رقبہ کسی ملک کے رقبہ میں سے حاصل کر کے بالشتیا ملک ہی قائم کر کے دکھلا دے تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا یہ کارنامہ دنیا کے مثالی عجائبات میں شامل ہو جائے گا اور ہم اپنی ہار تسلیم کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

دور بیں حضرات یہ سوچتے ہوئے لرزتے ہیں کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم تو ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے اور ہمارے ساتھ ہریجنوں سے بدتر سلوک کیا جاتا جیسا کہ آج کل کیا جا رہا ہے۔ غور تو کیجئے جو ہمارے بدنصیب بھائی ہندوستان میں مقیم ہیں، وہ کس حال میں ہیں۔ ان کی بیچارگی کے حالات کا جب علم ہوتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ اکثریت کا جب جی چاہتا ہے تو ان گنت مسلمانوں کو کالی مائی پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے تو انہیں بھیڑ بکری کے ریوڑ سمجھ کر سرحد پار ہانک دیا جاتا ہے۔ ان حالات میں کیا پاکستان ایک نعمت غیر مترقبہ نہیں ہے اور کیا اس کا بانی ہماری ستائش، احسان مندی اور اعترافِ عظمت کا مستحق نہیں ہے۔

مجھ سے پوچھئے قائداعظمؒ کیا تھے۔ قائداعظمؒ قوم کا دماغ تھے۔ قائداعظمؒ قوم کی زبان تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے سب سے بڑے نباض تھے۔ قائداعظمؒ چارہ گر تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے دلی جذبات کے واحد عکاس تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے درد کا درماں تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے غمگسار تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے بہی خواہ تھے۔ قائداعظمؒ قوم کی ڈھال تھے۔ قائداعظمؒ پیروِ اسلام تھے۔ قائداعظمؒ مجاہدِ اسلام تھے۔ قائداعظمؒ نہتی قوم کے بے تیغ سپہ سالار تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے بے تاج بادشاہ تھے۔ قائداعظمؒ قوم کے محسن اعظم تھے۔ قائداعظمؒ پاکستان کے بانی تھے۔ قائداعظمؒ

قوم کے قائداعظمؒ تھے۔الحاصل قائداعظمؒ ہمارے سب کچھ تھے اور تا قیامت سب کچھ رہیں گے۔

گھٹائیں ابر رحمت کی تیری تربت پہ چھا جائیں
صدا حوریں فرشتے آ کے تجھ پر پھول برسائیں

(اقبالؒ)

☆☆☆☆☆
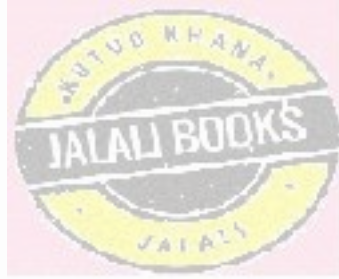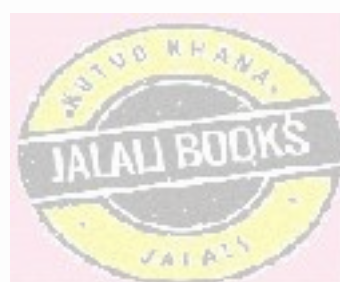
مردِ مومن

(اسلامی کردار)

میں قائداعظمؒ کی خانگی زندگی کے متعلق کچھ کہنے یا لکھنے کو سوئے ادبی سمجھتا ہوں لیکن اگر ایسا نہ کروں تو ان کی زندگی کا اسلامی پہلو روشن نہیں ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی ناکام رہی اور اُنہوں نے اولاد کا سکھ اس لئے نہیں دیکھا کہ صاحبزادی اپنی ماں کے انتقال کے بعد ہمیشہ نانی ہی کے ساتھ رہیں حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کا مذہب اختیار کرلیا اور یہ ہی گہرا رنج وغم انہیں گھن کی طرح لگ گیا تھا۔ عائلی زندگی میں داخل ہونے سے قبل ہی انہیں سیاست، وکالت اور اسمبلی کے کاموں سے خاص لگاؤ تھا لیکن جب مشیت ایزدی نے انہیں رفیقۂ حیات کی رفاقت سے محروم کردیا تو وہ اپنی پرانی مرغوبِ خاطر دلچسپیوں میں زیادہ منہمک ہوگئے۔ غالباً یہ خیال مدنظر ہوگا کہ غم غلط ہوجائے گا یا انتہائی مصروفیت پرانی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کو تازہ نہیں ہونے دے گی۔ یہ غم ان کی زندگی پر چھایا ہوا تھا اور وہ ان کے اٹھنے بیٹھنے، رہن سہن، بول چال، تنہائی پسندی، کام کی حد تک بات، الغرض شعبۂ حیات کے ہر حصہ پر بری طرح اثر انداز تھا۔ اُنہوں نے اکثر کسی سے دل کھول کر بات نہیں کی۔ جی بھر کر نہیں ہنسے، عام طور سے کسی کو اپنے سے زیادہ قریب نہیں کیا۔ ایک حدِّ فاصل مقرر کردی۔ کام کی بات کی اور ملاقات ختم۔ یہ رویہ عمر بھر تقریباً سب کے ساتھ رہا لیکن چند خوش نصیب لوگ اس سے مستثنیٰ تھے اور وہ اتنی قلیل تعداد میں تھے کہ انہیں صرف انگلیوں ہی پر گنا جا سکتا تھا۔ کبھی جی چاہا تو ان لوگوں سے دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ بات کرلی اور بس یا کبھی گھٹن سی محسوس ہوئی اور حسن اتفاق سے یہ لوگ موجود ہوئے

تو ذرا دل کھول کر بات کر ڈالی۔ آج کل کچھ لوگ اور خصوصاً چند سرکاری ملازمین جو حقیقتاً قائداعظمؒ سے اتنے ہی دور تھے جتنا کہ مریخ کرۂ ارض سے ہے' مفت کی ہر دلعزیزی حاصل کرنے یا اپنی شخصیت کو لوگوں کی نظروں میں اہم ثابت کرنے کے لئے رفاقت اور قربت کے قصے گھڑتے ہیں۔ سمجھ لیجئے کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ اس لئے کہ قائداعظمؒ کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ دوستی کے پینگ بڑھاتے اور بالخصوص سرکاری ملازمین جن سے وہ کبھی کھلے ملے نہیں اور انہیں ہمیشہ اپنے سے دور رکھا اور خود سرکاری ملازمین بھی مارے خوف کے کہ کہیں وہ ملازمت کے قواعد کے گرفت میں نہ آجائیں جس سے انگریز حکام بالا ناراض ہوجائیں' نزدیک نہیں پھٹکتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمت قومی کے لئے وقف تھا۔ اخباروں اور بیانات کا روزانہ عمیق مطالعہ' تراشوں کو محفوظ کرنا' بیانات جاری کرنا' اہم مراسلات کے جواب دینا' دشمنانِ مسلم لیگ کی گہری چالوں پر کڑی نگاہ رکھنا اور ان کو زیر کرنے کے لئے جوابی چال چلنے سے وقت کب بچتا تھا کہ خوش گپیاں کرتے یا دعوتوں میں وقت ضائع کرتے۔ کبھی کبھار سینما دیکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ پیکر اَلم تھے' اس لئے المیہ فلم پسند فرماتے تھے۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی' ایک خاص بات لکھنے قلم اٹھایا تھا لیکن وہ سب کچھ کہہ گیا جو سوچا بھی نہیں تھا۔ بہرحال موضوع سے کچھ نہ کچھ دور ہی کا سہی' تعلق ضرور ہے۔

مسٹر جناح نے جن خاتون کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کا ارادہ کیا تھا' وہ غیر مسلمہ پارسی النسل تھیں۔ ان کے اسلامی اور قانونی دماغ نے مشورہ دیا کہ جب تک ان خاتون کو مشرف بہ اسلام نہ کیا جائے' اس وقت تک نکاح حرام ہے۔ اللہ اللہ کر کے یہ تمام مراحل برضا و رغبت طے ہوگئے۔ اس انمول سنجوگ سے صرف ایک ہی اولاد پیدا ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد محترمہ بھی جنت کو سدھاریں۔ باپ کی بڑی خواہش تھی کہ بیٹی کا عقد کسی مسلم نوجوان کے ساتھ ہو۔ افسوس یہ نہ ہوا۔ باپ کے ساتھ بیٹی کا انحراف و بغاوت اور باپ کے مذہب سے ارتداد کی وجہ سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا لیکن ایک قابل تقلید نیک مسلمان کے قانونی اور مذہبی دماغ نے فوراً حل نکال

لیا۔صاحب اولاد اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں' باپ نے شرع کے مطابق اپنی اکلوتی ایک بیٹی سے ایسی علیحدگی اختیار کی کہ پھر زندگی بھر اس کا منہ نہیں دیکھا یہاں تک کہ میّت پر بھی اس کا سایہ نہیں پڑا۔

ایک تاریخی واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام پاکستانیوں اور خاص طور سے ہمارے نوجوان طبقے کے لئے باعث دلچسپی وپُر از معلومات اور موجبِ افتخار ہوگا۔ بادشاہ انگلستان جارج ششم کے زمانہ میں حکومت برطانیہ کی دعوت پر قائداعظمؒ ہندوستان کے لئے مزید اصلاحات حاصل کرنے انگلستان تشریف لے گئے۔گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا کہ قصر بکنگھم سے ظہرانہ کی دعوت موصول ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز آقاؤں کی شان وشوکت' رعب وداب' وقار ودبدبہ میں کچھ فرق نہیں آیا تھا اوران کی بہت عزت کی جاتی تھی۔اس کی کئی وجوہات تھیں کہ وہ حاکم وقت' کرتا دھرتا اوراَن داتا تھے۔ان کی شہرت کو چار چاند لگانے والے اوران کی ملوکیت کے مداح ہمارے لاکھوں ہندوستانی بھائی بند تھے۔اگرانگریز حاکم کسی ہندوستانی کی طرف صرف سر پرستانہ نگاہ ڈالتا تو وہ پھولے نہ سماتا اوراگرٹوٹی پھوٹی اُردو میں ہمکلام ہوتا تو صرف باچھیں ہی نہیں بلکہ دل کے باغ کھل جاتے۔ چنانچہ ایسے زمانہ میں قصر بکنگھم کی دعوت ایک اعزاز ہی نہیں بلکہ ایک بڑا یادگار موقع ہوتا تھا۔اس حقیقت سے کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا کہ قصر بکنگھم میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ وہاں تو صرف بادشاہوں' شاہی خاندان کے لوگوں' بین الاقوامی شہرت رکھنے والے' چوٹی کے رہنماؤں اور بڑے بڑے روٗسا کو شاہی دستر خواں پر بٹھلا کر عزت بخشی جاتی تھی۔ہم نے آج تک نہیں سنا کہ کسی مہمان نے معذرت کی ہو۔ ہاں بیماری' آزاری اور موت الگ بات ہے لیکن ہمارے عظیم رہنما یہ کہہ کر عذرخواہ ہوئے کہ یہ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے۔اس میں مسلمان روزہ رکھتے ہیں۔اس ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کا ذکر ناظرین کے لئے خالی از مزید دلچسپی نہ ہوگا۔آپ کو یاد ہوگا کہ 1944ء میں بمبئی میں جناح گاندھی مذاکرات کبھی کبھی دودو تین تین دن کے وقفہ کے بعد ہوا

کرتے تھے۔ایک مرتبہ گاندھی جی اکیس ماہ رمضان کو بات چیت کرنا چاہتے تھے قائداعظمؒ نے بذریعہ اخباری بیان یہ کہہ کر معذرت کی کہ چونکہ اس دن حضرت علیؓ مشکل کشا کا ''یومِ شہادت'' ہے' اس لئے وہ گفت وشنید نہیں کریں گے۔ قائداعظمؒ کا اخباری بیان پڑھ کر مولٰینا ظفر الملک صاحب نے لکھنؤ سے قائداعظمؒ پر اعتراض کیا کہ شیعہ عقیدہ کو مسلمانوں سے منسوب کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' اس زمانہ میں بدنصیبی سے لکھنؤ میں کچھ مسلمان مدح وقدح صحابہ کی تحریک میں دست وگریباں اور ایک دوسرے پر گندگی اچھال رہے تھے۔ قائداعظمؒ جس دن سے ہزہائی نس آغا خاں کی امامت سے منکر ہوئے' اس دن سے انہوں نے تادمِ مرگ ایک اچھے اور حقیقی مسلمان کی حیثیت سے خود کو ایسی بلندی پر رکھا جہاں کسی بھی عقیدہ کا گزر نہیں تھا۔ اُنہوں نے مولٰینا کو اپنے روائتی انداز میں مختصر سا جواب یہ کہہ کر دیا: ''مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کے جیسے کوتاہ نظر مسلمان ہنوز موجود ہیں۔ یہ صرف شیعہ عقیدہ کا سوال نہیں ہے۔ حضرت علیؓ خلیفۂ چہارم تھے۔ رمضان کی اکیس تاریخ کو بیشمار شیعہ وسنی مسلمان بلالحاظ عقائد یومِ شہادت مناتے ہیں۔''

آخر میں قائداعظمؒ کی اوائل عمری کا بھی ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جب کہ قائداعظمؒ کی عمر مشکل سے سولہ یا سترہ برس کی ہوگی۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب 1947ء کے اواخر میں گورنر سندھ سر غلام حسین اور لیڈی ہدایت اللہ نے کراچی کلب میں گورنر جنرل قائداعظمؒ کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ قائداعظمؒ نے خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں جس سے ان کے بچپنے ہی سے پیغمبرؐ اسلام سے والہانہ عقیدت اور شیدائیت ظاہر ہوتی تھی' فرمایا: ''میں نے لنکنز اِن میں اس لئے داخلہ لیا تھا کہ اس کے صدر دروازہ پر دنیا کے ممتاز قانون دینے والوں کی فہرست میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نام شامل تھا۔''

''اسلام وقائداعظمؒ زندہ باد''

قائداعظمؒ کا اسلامی کردار اگر آپ حقیقی معنوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس شعر کے

آئینہ میں دیکھئے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
(اقبالؒ)

☆☆☆☆☆
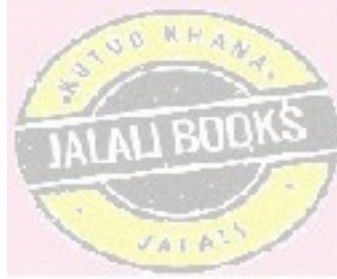
خطوط کے آئینہ میں

یوں تو پروردگارِ عالم نے قائداعظمؒ کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں لیکن تین خوبیاں ایسی تھیں جنہوں نے ان کی عظمت کو چار چاند لگائے اور کامیابی سے ہمکنار کیا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ خوبیاں شاذونادر ہی ایک انسان میں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں اور اگر ہم یہ کہیں تو بے جانہ ہوگا کہ ان ہی کی بدولت قائداعظمؒ نے پاکستان حاصل کیا۔ تقریر برجستہ مدلل، تحریر مجمل و واضح، گفتگو اثر آفریں و قابلِ تسلیم، مجھے یقین ہے کہ جن خوش نصیب انسانوں کو انہیں سننے یا ان کی تحریر دیکھنے کا موقعہ ملا ہے، وہ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ ان کے ان تینوں اوصاف میں یکسانیت و مطابقت تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی زنجیر کی یہ تین کڑیاں ہیں۔

اس وقت ہمیں قائداعظمؒ کو ان کے خطوط کے آئینہ میں دیکھنا ہے۔ ان کے خطوط کو چار طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے وہ سیاسی خطوط ہیں جو کانگریسی رہنماؤں مہاتما گاندھی، بابو سبھاش چندر بوس، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور راجگو پال اچاریہ وغیرہ کو لکھے گئے۔ ان خطوط کا تمام تر تعلق مسلم لیگ کے مطالبات، ان کی وضاحت اور ان کو منوانے کے سلسلے میں ہے۔ دوسرے وہ خط ہیں جو وائسرائے ہند، برطانوی وفود کے اراکین یا گورنروں کو لکھے گئے۔ یہ خطوط بھی مسلم لیگ کی تجاویز، مطالبات، مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت، ان کے تحفظات اور انہیں کانگریس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اختیارِ خصوصی کو استعمال کرنے کے متعلق ہیں۔

تیسرے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے بحیثیت صدر مسلم لیگ اپنے رفقائے کار کو تنظیم، مشورہ یا فرض کی کامیاب انجام دہی پر لکھے ہیں۔ چوتھی قسم ان بیانات کی ہے جو ضابطہ کی رو سے

خطوط کے زمرہ میں نہیں آتے لیکن ان کا بنیادی تعلق خطوط سے بہت قریبی ہے جیسے چہرہ کا گیسو سے۔ الحاصل یہ دونوں لکھنے والے کی ذہنی صلاحیتوں، خیالات وجذبات اور کردار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

قائداعظمؒ کے دو خطوں کے عکس جو انگریزی زبان میں لکھے گئے ہیں، پیش خدمت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قائداعظمؒ ہر چیز کو قانون کی عینک سے دیکھا کرتے تھے اور جب اس کی تشریح فرماتے یا ترجمانی کرتے تو فریق کی امارت یا غربت، دوستی یا دشمنی پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق قانون کی نظر میں سب یکساں تھے۔ دراصل اُن سے چند استفسارات کئے گئے تھے اور مداخلت کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ دیکھئے جواب کیسا مدلل وواضح ہے۔

آئین پسندی اور مصلحت بینی ملاحظہ فرمائیں کہ مسلم لیگ اور اسٹیٹس مسلم لیگ کو کس طرح جدا رکھا گیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ احتیاط یہاں تک برتی گئی کہ ہمیشہ مسلم لیگ کے اجلاس کی برخواستگی کے بعد نواب بہادر یار جنگ کو اپنی صدارت میں جلسۂ عام کو مخاطب کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ خطوط پیش خدمت ہیں۔ زحمت مطالعہ کے بعد آپ پر ہر چیز بخوبی روشن ہو جائے گی۔

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ قائداعظمؒ وقت کی قدر و قیمت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور اس کو فضول گوئی اور لمبی تحریریں لکھ کر ضائع نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے تقریر، تحریر اور بات چیت میں نپے تلے الفاظ ہوتے تھے کیونکہ اوائل عمری سے اُنہوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں بیرسٹری شروع کی اور عرضی دعویٰ لکھنے اور بحث کرنے سے ان کے اس کمال کو پوری طرح جلا ہوگئی تھی۔ لہٰذا ان کے خطوط میں آپ الفاظ کی بندش، فقروں کی چستی اور اختصار کے ساتھ مطالب کی ادائیگی پائیں گے جس سے ان کے تبحر علمی کے مختلف پہلو بڑی اچھی طرح اُجاگر ہوتے ہیں۔ اپنے استدلال میں آپ کے سامنے قائداعظمؒ کے صرف تین خطوط کے حوالہ جات واقتباسات نمونۃً پیش کر کے درخواست کروں گا کہ آپ ان کو ان ہی کے خطوط کے آئینے میں دیکھئے۔ یہ یاد رہے کہ اصلی خطوط انگریزی زبان میں ہیں۔ میں تو یہاں وہاں سے صرف اُردو ترجمہ پیش کروں گا لیکن یہ بتلا دوں کہ ترجمہ چاہے وہ کتنا ہی اچھا ہو، بالآخر ترجمہ ہے۔ جب لارڈ

چیمسفورڈ وائسرائے ہند نے ''رولیٹ ایکٹ'' کی جو عرف عام میں ''کالا قانون'' کہلاتا تھا' منظوری دی تو قائداعظمؒ نے 28 مارچ 1919ء کو ایک کھلی چٹھی بنام وائسرائے ہند لکھی اور بطور احتجاج امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ استعفیٰ کی وجوہات جو انہوں نے بیان کیں' وہ یہ تھیں:-

1- حکومت کا غیر سرکاری ممبروں کی رائے اور رائے عامہ کو ٹھکرا دینا۔

2- حکومت کا حق و انصاف کے بنیادی اصولوں اور لوگوں کے آئینی حقوق کو پامال کرنا۔

آپ نے اپنے مکتوب میں فرمایا کہ جو حکومت امن کے زمانہ میں بلاوجہ جور و استبداد کرے' وہ مہذب کہلانے کی مستحق نہیں ہے اور میری خودداری اجازت نہیں دیتی کہ میں اس کے ساتھ تعاون کروں۔

یہ تھے خوددار محبّ وطن ہندوستانی لیڈر مسٹر محمد علی جناح

قائداعظمؒ کا دوسرا خط مورخہ 21 جولائی 1941ء بمبئی کے گورنر سر راجر لملے کے خط کے جواب میں ہے۔ وائسرائے ہند لارڈ لینلتھ گو نے ہندوستان کی جنگی مساعی کو قومی شکل دینے کے لئے 30 ممبروں کی ایک نیشنل ڈیفنس کونسل بنائی تھی۔ کانگریس تو بگلا بھگت بن کر اپنا دامن جھٹک کر الگ ہو گئی۔ وائسرائے نے دنیا پر ثابت کرنے کے لئے کہ مسلم قوم برطانیہ کے ساتھ ہے' اپنے الفاظ میں ''عظیم مسلم قوم'' کے نمائندوں کو نامزد کیا۔ اتفاق سے آسام' بنگال' پنجاب اور سندھ کے وزرائے اعظم مسلمان تھے جن میں سے آسام' بنگال اور پنجاب کے وزرائے اعظم مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ قائداعظمؒ نے اپنے جواب میں وائسرائے پر کڑی نکتہ چینی کی کہ انہیں اپنے طور پر ان مسلم لیگیوں کو نامزد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا تاوقتیکہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری حاصل نہ کر لیتے اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ وائسرائے نے اپنے اس غیر آئینی و غیر دانشمندانہ فعل سے مسلم لیگ کی صفوں میں جو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے' انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تھے آل انڈیا مسلم لیگ کے قانون دان، اخلاقی جرأت وسیاسی بصیرت رکھنے والے عظیم رہنما۔

قائداعظمؒ نے اپنے 17 ستمبر 1924ء کے مکتوب میں مہاتما گاندھی کو چند لفظوں میں دوقوموں کا نظریہ سمجھایا۔ فرماتے ہیں۔ ''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کے رو سے مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔''

''ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی خاص تہذیب وتمدن، زبان وادب، فنون وتعمیرات، اسم واصطلاحات، معیارِ قدر وتناسب، تشریعی قوانین، ضوابطِ اخلاق، رسم ورواج، نظامِ تقویم، تاریخ وروایات اور رجحانات وعزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ ہمارا ایک خاص نظریۂ حیات ہے اور بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔'' دیکھا آپ نے اپنے قائداعظمؒ کو ان کے خطوط کے آئینہ میں؟ یہ تھے بیباک حق گو بانئ پاکستان قائداعظمؒ۔

''قائداعظمؒ زندہ باد''
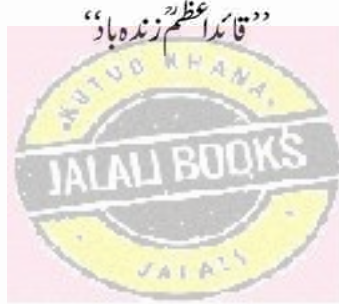
بے تیغ سپہ سالار

قائداعظمؒ صوبائی مسلم لیگ کی دعوت پر 1946ء میں پشاور تشریف لے گئے جہاں کانگریسی حکومت برسراقتدار تھی۔ چونکہ وہ بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ پہلی مرتبہ تشریف لے جا رہے تھے' اس لئے جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں چند دن قبل جا کر جلسہ جلوس کے انتظامات کی دیکھ بھال کروں تاکہ قائداعظمؒ کے اس اہم دورہ کی کامیابی کے بعد صوبۂ سرحد سے خان برادران کا ہوّا دور ہو جائے اور ہماری تنظیم کو تقویت پہنچے۔

کانگریسی حکومت کی دلی خواہش تھی کہ یہ دورہ ناکام ہو جائے اور افراتفری پھیل جائے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہر بڑے اور چھوٹے مسلم لیگی کی کتنی زبردست جوابداری تھی اور خاص طور سے مسلم نیشنل گارڈز اور میری۔ اپنے انتظامات کو مکمل کرنے اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی خاطر قائداعظمؒ کی تشریف آوری سے ایک دن قبل میں نے اکابرین صوبہ کے مشورہ سے اُن راستوں سے جلوس نکالا جہاں سے قائداعظمؒ کی سواری گزرنے والی تھی۔ راہ میں ایک مقام ایسا آتا تھا جہاں سڑک سکڑ کر ایک تنگ گلی بن گئی تھی اور وہاں خطرات کے امکانات بہت زیادہ بتلائے گئے تھے۔ چنانچہ سادہ لباس میں کچھ جری مسلم نیشنل گارڈز حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے۔ دوسرے دن پٹھانوں کی قدیمی روایات کے مطابق قائداعظمؒ کا نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔ وہ ایک کھلی بڑی موٹر کار میں فروکش تھے۔ مجھے اور ریاست دیر کے ایک نوابزادہ کو ساتھ میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

بنوں کے میرے نہایت عزیز دوست تاج علی خاں اور ان ہی کے جیسے چند اچھے نشانہ باز کار کے چپ و راست چل رہے تھے۔ خان فیض محمد خاں صاحب بابوزئی سالار صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مصروف تھے۔ ان کی ہر چیز اور ہر جگہ کڑی نگاہ تھی۔ چوک یادگار کی مناسبت سے وہ اسے یادگار جلوس بنانا چاہتے تھے اور ان کانگریسی پٹھانوں کو جو ہمارے ساتھ نہیں تھے' گاندھی آشرم کی طرف سے ہمیشہ کے لئے رخ موڑ کر صرف مہابت خان کی مسجد کی طرف کر دینا چاہتے تھے اور وہ یہ بھی دل سے چاہتے تھے کہ قصہ خوانی بازار کے قصوں میں اس تاریخی جلوس کے قصہ کا بھی اضافہ ہو جائے تا کہ قیامت تک آنے والی نسلیں منجملہ اور قصوں کے اس قصہ کو بھی سنا کریں۔

صوبۂ سرحد کی تاریخ میں واقعی یہ ایک بہت بڑا دن تھا۔ شہر پشاور نے بڑے بڑے فاتحین کو دیکھا تھا لیکن آج وہ اس فاتح کو دیکھنا چاہتا تھا جو پہلی نظر میں لوگوں کے دلوں کو فتح کر کے اس میں اپنی مستقل راجدھانی قائم کرتا تھا اور وہ اس اولوالعزم فاتح کو بھی دیکھنا چاہتا تھا جس نے وعدہ کیا تھا کہ آئینی جنگ کے ذریعہ بغیر تیر و تفنگ کے ایٹمی دور میں ایک اسلامی حکومت فتح کرے گا۔ ان حالات میں اہالیان پشاور کے بے پناہ شوقِ دید و جوشِ عقیدت کی وجہ سے قائداعظمؒ کو موٹر کی نشست کے بلند حصہ پر بے آرامی کے ساتھ بیٹھنا پڑا تا کہ ہر شخص ان کو آسانی سے دیکھ سکے۔ جب ہم اُس پُر خطر مقام پر پہنچے تو میں نے عرض کیا کہ تنگ سڑک کی وجہ سے لوگ کم ہیں' آپ تھوڑی دیر کے لیے جب تک ہم کشادہ سڑک پر نہ پہنچ جائیں' نچلی نشست پر آرام سے بیٹھ جایئے۔ وہ تو بہت بڑے قیافہ شناس و ماہر نفسیات تھے۔ میرے من کی بات کو تاڑ گئے۔ کارروائی اور مجھے کار سے اُترنے کا حکم دیا۔ میں نے سکتہ کے عالم میں حکم کی تعمیل کی۔ ارشاد فرمایا کہ نیشنل گارڈز کی چار چار قطاریں کار کے سامنے اور پیچھے ترتیب دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ تعمیل ارشاد میں پندرہ بیس منٹ صَرف ہو گئے۔ اس اثناء میں وہ انتہائی بے نیازی کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ خطرہ میں گھرے ہوئے ہیں اور منتظمین کے لئے محشر کی گھڑیاں ہیں' ہنستے ہوئے تماشہ دیکھا کئے اور وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں اور اپنی خفیف مسکراہٹ سے مجھے توکل کا سبق

دیتے رہے کہ اگر۔

دشمن قوی است نگہبان قوی تر است

نئی ترتیب کے بعد جب جلوس روانہ ہونے لگا تو مجھے اشارہ سے بلوایا اور جب میں بیٹھ گیا تو شہادت کی اُنگلی کو آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ ''خدا سب سے بڑا ہے۔'' بھلا بتلایئے تو سہی میں اس کے بعد کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یقین و اتحاد و نظم سے حاصل ہوئی نصرت
سدا تیری نصیحت مشعلِ جادہ بنائیں گے

(خورشیدؔ)

اللہ اللہ کر کے جلوس کا مرحلہ بخیریت تمام طے ہوا تو صوبائی کانفرنس کی مجوزہ کارروائیوں کی فکریں اور ان کی کامیاب انجام دہی کی تمنائیں دامنگیر ہوئیں۔ اکابرین و کارکنوں میں باوجود اتحاد و اتفاق اور باہمی میل جول ہوتے ہوئے کبھی کبھار اختلاف کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں اور خصوصاً اس وقت جب کسی صوبہ میں صرف دو رہنما ایسے ہوں جو ہم پلہ اور ہم مرتبہ ہوں۔ صوبۂ سرحد میں یہ نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ صوبہ سرحد کی دو واجب التعظیم ہستیاں سردار عبدالرب نشتر صاحب اور خان عبدالقیوم خان صاحب مرد مقابل تھے۔ خان عبدالقیوم خان صاحب جوانی سے لے کر ادھیڑ عمر تک خلافت' خدائی خدمتگار اور کانگریس جماعتوں میں رہے۔ وہ خدمت و قیادت کے وسیع تجربہ کے ساتھ حال ہی میں کانگریس سے بیزار و نالاں ہو کر حق و صداقت کا ساتھ دینے آل انڈیا مسلم لیگ میں شریک ہو گئے اور بہت ہی کم عرصہ میں وہ جماعتی بلندیوں پر پہنچے جس کے بلاشک وہ مستحق تھے۔

بات تو ذرا سی تھی لیکن اسے بہت بڑا افسانہ بنا دیا گیا تھا یعنی کانفرنس کی صدارت کا مسئلہ درپیش تھا۔ افسوس ہے کہ مفاہمت نہ ہو سکی۔ قائداعظمؒ صدارت فرماتے تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا لیکن اُن سے کانفرنس کی افتتاح کرنے کی بہت پہلے گزارش کی گئی تھی جسے انہوں نے

قبول فرما لیا تھا۔ گتھی کو ظاہر ہے کہ سلجھانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن جوں جوں دماغ گرہ کشائی کی طرف رجوع ہوئے تو پیچ پر پیچ پڑتے گئے۔ قائداعظمؒ اور شماتتِ ہمسایہ کے خوف سے معزز مہمانوں یعنی نواب صاحب ممدوٹ، میجر شوکت حیات خاں اور میاں افتخار الدین صاحب کی طرف نظریں اٹھیں۔ شرط یہ تھی کہ صوبہ کے ان دو دیو پیکر انسانوں کی نظر ان تینوں دوستوں میں سے صرف ایک ہی شخص پر پڑے۔ افسوس ہے کہ کچھ تنگ دامنئ نظر کی وجہ سے دونوں کی نگاہیں باری باری لوٹ آئیں اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ بس اب جگ ہنسائی اور نااتفاقی دست و گریباں ہونے والی ہی تھی کہ ایک نیا حل نکالا گیا۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ ہمارے اکابرین میں سے کوئی بزرگ کانفرنس کی صدارت کرتے لیکن جب بزرگ خود متفقہ طور پر کسی خورد کے سر کوئی حکم زبردستی تھوپ دیں تو خورد جو سپاہی بھی ہو، کیسے سرتابی کرسکتا ہے۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی یہ ہی ہوا کہ مَان نہ مَان تجھے صدارت کرنی پڑے گی۔ میرے لئے تو واقعی یہ ایک قابلِ یادگار اور بہت بڑا دنیاوی اعزاز تھا۔ ایک شیر دل پٹھان نے قائداعظمؒ کے نحیف کندھوں پر ایک چوغہ اوڑھا کر اور میرے قائد کے طفیل میں دوسرے چوغہ سے مجھے نواز کر صرف اپنا مرہون منت ہی نہیں کیا بلکہ میری صدارت کو چار چاند لگا دیے۔

مجھے فخر ہے کہ میرے قائد نے مسلم نیشنل گارڈز کی اعلیٰ خدمات اور حسن کارکردگی پر سالار صوبہ سرحد کو ایک شکریہ اور مبارکباد کا خط تحریر فرما کر اظہار خوشنودی فرمایا اور توقع ظاہر کی کہ مسلم نیشنل گارڈز اپنے جذبۂ خدمت و نظم وضبط کی بدولت قوم کے لئے باعث افتخار ہوں گے۔ قائداعظمؒ کے انگریزی مکتوب گرامی کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

شفیق بزرگ

یہ وہ زمانہ تھا جب قائداعظمؒ آل انڈیا مسلم لیگ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ 25 ‘26 اور 27 دسمبر 1941ء کی صدارت کرنے ناگپور تشریف لائے تھے۔ اس وقت صوبائی حکومت نے ایک بہانہ بنا کر مجھے ڈیفنس رولز کے تحت اعلیٰ حضرت رضا شاہ کبیر شہنشاہ ایران کی حمایت اور حکومت برطانیہ کے ایران پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی مذمت کرنے پر جیل میں مقید[1] کر دیا تھا۔ جب رہا ہوکر میں گھر لوٹا تو میری اہلیہ خورشید آرا بیگم نے قائداعظمؒ کی بزرگانہ شفقت کا ایک واقعہ سنایا۔ آپ بھی ان ہی کی زبانی سنیے جسے انہوں نے ریڈیو پاکستان کی نشریات اور ’’ماہِ نو‘‘ کے لئے 10 دسمبر 1957ء کو کولمبو میں قلمبند کیا تھا۔

’’قائداعظمؒ سے ملنے اور دور سے دیکھنے کے مجھے بارہا مواقع ملے ہیں۔ میں نے آپ کو بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ دیکھا اور بحیثیت گورنر جنرل پاکستان بھی لیکن جس قدر قربت

1۔(ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت دورانِ جنگ حکومت برطانیہ کے خلاف منافرت پھیلانے کے جرم میں اسسٹنٹ کمشنر مسٹر میں پرائس۔ آئی۔ سی ایس نے سرسری سماعت کے بعد تین مہینہ قید بامشقت کی سزا سنائی۔ دراصل مجھے یہ اقدام اس لیے کرنا پڑا تھا کہ قائداعظم اور مسلم لیگ کے مخالفین نے ایک زوردار مہم چلا رکھی تھی کہ ایران پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور ٹوڈیوں کی جماعت (مسلم لیگ) خاموش بیٹھی ہے۔ قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے ایچ خورشید صاحب سے ورکنگ کمیٹی کی وہ احتجاجی تجویز حاصل کی گئی جو بمبئی میں پاس کی گئی تھی اور جس کی اشاعت حکومتِ ہند نے ڈیفنس رُولس کے تحت ممنوع قرار دی تھی۔ قائداعظمؒ اور مجلس عاملہ کی اس اسلامی خدمت اور اہم کارگزاری کے چرچہ کو دور دور تک پھیلانے اور پہنچانے کے لیے ناگپور کے ایک جلسۂ عام میں مجلس عاملہ کی ممنوعہ تجویز پڑھی اور تائیدی تقریر کی گئی تھی لیکن صوبائی حکومت نے بجا آوریٔ سزا کو تا حکم ثانی موقوف کر کے عارضی رہائی عطا کی اور اس طرح اپنی نکٹی ناک کی پلاسٹک سرجری کی۔)
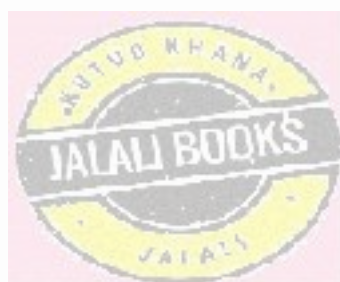
کا شرف میرے شوہر نواب صدیق علی خاں صاحب کو بحیثیت سالارِ اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور ممبر لجسلیٹو اسمبلی دہلی حاصل رہا ہے، وہ مجھے نصیب نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم قائداعظمؒ کے متعلق جو میرے تاثرات ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک بیباک مسلمان، دور بین رہنما، ماہر سیاسیات ہی نہیں تھے بلکہ شفیق و مہربان دوست، قدرداں اور ہمدرد بزرگ بھی تھے۔ مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے کہ جب سی پی کی کانگریس گورنمنٹ نے 1941ء کے دسمبر میں میرے شوہر نامدار کو اس لئے دوبارہ[2] بستۂ زنجیر و رسن کیا کہ اس کانفرنس کو جو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سی پی کی طرف سے منعقد ہونے والی تھی اور جس میں قائداعظمؒ محض اپنے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے شرکت فرمانے والے تھے اور جس کی کامیابی کے لئے میرے شوہر شب و روز تگ و دو کر رہے تھے، ناکام بنائی جائے۔ بہرحال کانفرنس ہو کر رہی اور قائداعظمؒ بھی تشریف لائے۔ چونکہ میں اپنے شوہر کی گرفتاری کی وجہ سے پریشان تھی اور زیادہ تر اس لئے کہ کانگریس گورنمنٹ ان کے ساتھ نہایت سخت اور برا سلوک کر رہی تھی۔ میں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ان کی فرودگاہ پر گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ جن کی بھائی سے والہانہ محبت ضرب المثل ہے، مجھ سے پہلے ملیں اور نہایت شفقت سے نواب صاحب کے متعلق دریافت کرتی رہیں۔ میں نے قائداعظمؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ محترمہ

2- پہلی مرتبہ اکتوبر 1940ء میں مسجد شطرنجی پورہ ناگپور میں عین عصر کی نماز کے دوران پولیس جوتے پہنے ہوئے مسجد میں داخل ہوئی اور مُصلّیوں پر لاٹھی چارج کر کے مسجد سے باہر نکال دیا تا کہ ہندو جلوس مسجد کے سامنے سے باجہ بجاتے ہوئے گزر جائے۔ پولیس کے ظلم ناروا اور مسجد کی بے حرمتی پر مصنف نے ایک جلسۂ عام میں سخت احتجاج کیا تھا جس کی پاداش میں اسے نقض امن و اقدام قتل کا سنگین جرم لگا کر یکم رمضان المبارک کو افطاری سے قبل گرفتار کیا گیا اور چند دن تک یکطرفہ کارروائی کر کے چار ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ناگپور کی یہ ایک بہت یادگار مسجد ہے جو صرف تاریخ ہی نہیں بلکہ تقدس کی بھی حامل ہے۔ یہاں ایک سالک بزرگ حضرت بغدادی صاحبؒ کو اندازاً ستر سال قبل مسجد کے صحن میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ پچیس تیس سال کے بعد جب پرانی مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کی گئی تو حضرت کے لیے نئی قبر اور مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ نقل مکانی کے وقت حضور کا کفن اور جسم اطہر جیسا کا ویسا ترو تازہ پایا گیا۔ تین دن تک شب و روز بے حساب عقیدت مند مشرف بہ زیارت ہوئے۔)

نے جو ہمیشہ قائداعظمؒ کی انتہائی مصروفیات سے پریشان خاطر رہتی تھیں اور مزید مصروفیات پیدا کرنے سے پہلوتہی کرتی تھیں، محض میرے خیال سے ملاقات کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ قائداعظمؒ انتہائی مصروف تھے تاہم وہ تھوڑی دیر کے لئے اندر تشریف لائے۔ مجھ سے ملتے ہی فرمایا: ''صدیق علی خاں کو کانگریس گورنمنٹ نے پکڑ لیا ہے مگر گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارا پہلا مسلم لیگی ہے جو دومرتبہ جیل گیا۔'' اس کے بعد آپ باہر چلے گئے اور میں گھر لوٹ آئی۔ اگرچہ مجھے کسی قدر اطمینان تو ہوا لیکن بے چینی کا ازالہ نہ ہوسکا۔ دوسرے روز صبح ناگپور کے ممتاز لیڈر ابراہیم خاں فنا صاحب نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ قائداعظمؒ نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں میرے شوہر کی رہائی کے مطالبہ کی تجویز پاس کی اور اسی وقت یعنی رات کے ایک بجے چیف سیکرٹری سی پی گورنمنٹ کو روانہ کر دی اور جب تک جواب موصول نہیں ہوا آپ برابر برآمدے میں ٹہلتے رہے اور بے چین رہے۔

مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں کہ تجویز پاس کرنے سے پہلے یا بعد کا واقعہ ہے لیکن یہ بخوبی یاد ہے کہ کانفرنس کے انعقاد کے زمانہ میں ہی عید قربان آئی۔ میں عید کیا مناتی۔ میرے قائد کو میرا خیال آیا اور وہ عیدگاہ[3] جاتے ہوئے معہ محترمہ فاطمہ جناح صاحبہ میرے ظلمت کدے میں ضیا بار ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی عزت بخشی۔ راستے میں بہت کم گفتگو ہوئی مگر نماز کے بعد محترمہ فاطمہ جناح مجھے سمجھاتی رہیں کیونکہ دفعتاً میری آنکھوں نے ضبط کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

یہ تھے ہمارے بلند پایہ قائداعظمؒ جو اپنے کام کرنے والوں کے ساتھ شفقت وعنایات و دلجوئی فرماتے تھے اور جو انسانی جذبات و کیفیات کو چہروں سے پڑھ لیتے اور اس کی ترجمانی اپنے عمل سے کرتے تھے۔''

3- عید کی نماز مسلمانانِ ناگپور و کامٹی نے اپنے محبوب قائداعظم کے ساتھ ناگپور کے مشہور کستور چند پارک میں جہاں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس ہوا تھا' ادا کی۔ مسلمانوں کا یہ بہت بڑا تاریخی اجتماع تھا اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دن ناگپور کی کسی مسجد یا کسی عیدگاہ میں نماز عید ادا نہیں کی گئی۔

مرض الموت

نمی دانم حدیث نامہ چوں است
ہمی بینم کہ عنوانش بہ خون است
(سعدیؔ)

اس باب کی شروعات اس واقعہ سے کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن کے کسی گوشہ میں ضرور محفوظ تھا لیکن مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ غالباً دو یا تین سال کا عرصہ ہوا کہ میں اپنے بزرگ رہنما چودھری خلیق الزماں صاحب کو سلام کرنے اور مزاج پرسی کے لئے ان کے دولت کدہ پر گیا معلوم نہیں یہ ذکر کیسے چھڑا۔ چودھری صاحب نے یاد دلایا کہ جب قائداعظمؒ دہلی میں سخت بیمار ہو گئے تھے تو میں نے پریشانی کے عالم میں چودھری صاحب سے دریافت کیا تھا کہ اب کیا ہوگا اور اب پاکستان کیسے بنے گا؟ چودھری صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے میری ڈھارس بندھائی اور فرمایا کہ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ قائداعظمؒ اچھے ہو جائیں گے اور پاکستان بن کر رہے گا۔ یہ واقعہ اس لئے دھرا رہا ہوں کہ اس سے ایک ایسا واقعہ منسلک ہے جس کا تعلق صرف مرض الموت سے ہے۔ قائداعظمؒ کے ذاتی پارسی معالج ڈاکٹر پٹیل بمبئی سے بلوائے گئے۔ مریض کو ان پر کلی اعتماد تھا۔ چونکہ شافئ مطلق نے ڈاکٹر پٹیل کو دستِ شفا عطا فرمایا تھا' اس لئے ان کی دوا سے قائداعظمؒ شفایاب ہو گئے۔ بمبئی واپس جاتے ہوئے ڈاکٹر پٹیل سرگوشی کے انداز میں مجھ سے بڑی مایوسی کے ساتھ کہہ گئے کہ قائداعظمؒ زیادہ نہیں جئیں گے۔ وہ صرف اپنے آہنی عزم اور طاقتِ خود ارادی کے بل بوتے پر جی رہے ہیں۔ وہ اب اپنی توانائی (وائی ٹالٹی) کے محفوظ ذخیرہ کو خرچ

کر رہے ہیں جو ظاہر ہے کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے تیزی سے صرف ہو رہا ہے۔ اس بات کا علم مجھ جیسے حقیر عقیدتمند کے لئے کسی طرح خطرہ کی گھنٹی سے کم نہیں تھا۔ مجبور انسان کی زبان سے صحت یابی و درازیٔ عمر کی دعا نکلی جو کروڑوں مسلمانوں کے زندہ باد کے نعروں میں مل گئی لیکن موذی مرض جو نزلہ، بلغم اور ہلکی کھانسی پر مشتمل تھا' برابر پرورش پاتا رہا۔ کبھی بھی باقاعدہ علاج نہیں کرایا گیا۔ ایک تو ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ دوسرے ڈاکٹروں پر بالعموم اعتماد نہیں کرتے تھے کیونکہ پچھلے زمانہ میں بڑے بڑے ماہرین نے ان کے مرض کی غلط تشخیص کی تھی اور ایک دوسرے کی رائے میں تضاد اور وہ بھی اِتنا اُتنا نہیں بلکہ بُعد المشرقین کے برابر پایا گیا تھا۔ کسی نے عملِ جرّاحی کے لئے کہا۔ کسی نے کہا تمہیں دل کا مرض ہے۔ کسی نے کہا کہ معدہ خراب ہے۔ جرمنی کے ماہرین کی رائے تھی کہ یہ سب بکواس ہے۔ قائداعظمؒ نے ذاتی طور پر جو نتیجہ اخذ کیا' وہ یہ تھا کہ ان کا اصل مرض صرف معدہ کی خرابی ہے اور وہ اپنی اس رائے پر کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش کی کئی بار کی تشخیص تک اڑے رہے اور بعد میں معدہ کی خرابی کے ساتھ کرنل صاحب کے کہنے پر پھیپھڑے کی خرابی کو مان لیا۔ کرنل صاحب کی آمد تک وہ ڈاکٹروں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ پرانے زمانے میں دوائیں کھانے سے گریز کرتے تھے۔ نرس کی موجودگی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی اور علاج کرانے میں ہمیشہ ٹال مٹول کرتے تھے۔ الغرض جب وہ بہت تھک جاتے اور گمان ہوتا کہ بستر پر پڑ جائیں گے تو ماتھران یا کشمیر چلے جاتے۔ لیٹ پوٹ کر اُٹھ جاتے اور سمجھتے کہ تندرست ہوگئے۔ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلسل امتیازی عملی حصہ' حصولِ پاکستان کے لئے رات دن جدوجہد اور بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام ان کے چراغِ زندگی کے روغن کو روز بروز کم کئے جا رہا تھا یہاں تک کہ پاکستان قائم ہوگیا۔

انسانیت بربریت میں تبدیل ہوگئی۔ خون پانی سے بھی ارزاں ہوگیا۔ مسلمان بچوں کو تلوار اور کرپان سے کاٹا گیا۔ ننھے منے شیرخوار بچوں کو ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر چیرا گیا۔ بھولی بھالی کم سن دوشیزاؤں کا زبردستی اغوا' مساجد کی بے حرمتی' ہزاروں لاکھوں کا جبری انخلا' الحاصل ظلم و تعدی کے خونچکاں واقعات نے قائداعظمؒ کے انسان دوست ہمدرد دل اور مسلمانوں کی بہتری

سوچنے والے دماغ کو بُری طرح سے مجروح کیا۔ لازمی نتیجہ یہ تھا کہ موذی مرض نے زور پکڑا۔ بہتر سے بہتر دوا بے اثر ثابت ہونے لگی لیکن تندرستی کبھی اُبھری اور کبھی گری۔ کبھی افاقہ ہوگیا تو بستر سے اٹھے، کچھ چلے پھرے، پھر لیٹ گئے لیکن ہر حالت میں کام کرتے رہے۔ کبھی مثلوں کا انبار لگ گیا تو ڈاکٹروں اور جاں نثار بہن کے منع کرنے پر بھی دیر دیر تک مثلوں کا ملاحظہ کر کے احکامات صادر کئے۔ تکان کبھی زیادہ ہوگئی اور بیماری بڑھی تو سمجھے معدہ کی خرابی ہے۔ اس طرح تندرستی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ اس اُمید کے ساتھ کہ پہاڑ کی آب وہوا آپ کو راس آجائے گی، زیارت تشریف لے گئے۔ وہاں نمایاں افاقہ ہوا کیونکہ زندگی کا مشن ہنوز ختم نہیں ہوا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد قائداعظمؒ نے اپنے دست مبارک سے اپنے دیرینہ نیازمند سیٹھ فخر الدین ولی بھائی کے ولیکامل کا سنگ بنیاد رکھ کر صنعت وحرفت کا آغاز کیا اور انہیں اوّلیت کا شرف بخشا جس کے وہ ہر نقطۂ نظر سے مستحق تھے۔ یہ تو بسم اللہ تھی۔ انہیں ایک اور اہم کام انجام دینا تھا۔ اس لئے پاکستانیوں کے آقا نے سوچا کہ ملک بن گیا، ذہنی اور جسمانی آزادی مل گئی لیکن اقتصادی غلامی کا طوق تو ہنوز گردن میں ہے اور ہندوستان کا ریزرو بنک ہمارا مالک بنا بیٹھا ہے جس کے اشارہ کے بغیر ہماری اقتصادی ناؤ تیر نہیں سکتی اور جس وقت یہ بدخواہ دشمن ملاح چاہے تو اس کشتی کو گہرے سمندر میں ہمیشہ کے لئے ڈبو سکتا ہے۔ وہ توکّل، عزم وارادہ کا سہارا لے کر کوئٹہ سے لکڑی ٹیکتے ہوئے زندگی میں آخری مرتبہ اپنے ملک کی آخری خدمت انجام دینے کے لئے طیارہ سے کراچی پہنچے اور اس اسٹیٹ بنک کا افتتاح کیا جس کی گورنری کے لئے زاہد حسین صاحب کے جیسے ماہر اقتصادیات، نیک مزاج، راست باز، دیانت دار، درویش صفت انسان کو مکمل اعتماد کر کے منتخب کیا تھا۔ زاہد حسین صاحب نے بھی اپنی حسن کارگزاری سے ثابت کردیا کہ وہ ہی ایک ایسے پاکستانی ماہر تھے جو اس آڑے وقت میں اقتصادی عمارت کو اتنی اچھی اور پائیدار بنا سکتے تھے۔

قائداعظمؒ اپنے اس آخری تاریخی کارنامے کے ذریعہ پاکستان کو اقتصادی آزادی دلوا

کر زیارت چلے گئے اور پہنچتے ہی صاحبِ فراش ہوگئے۔ جس بہن نے اپنے صاحبِ عظمت بڑے بھائی کی برسہا برس سے شب و روز خدمت کی اور اس طرح ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی خدمت انجام دے کر ان کے دل موہ لئے تھے' بھائی کی حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھی اور قائداعظمؒ سے بغیر پوچھے کرنل الٰہی بخش صاحب کو طلب کیا۔ اُنہوں نے مختلف ماہر ڈاکٹروں کی مدد سے مرض کی پہلی مرتبہ صحیح تشخیص کی۔ وقت بہت گزر گیا تھا۔ مرض بھی کہنہ ہونے کی وجہ سے بہت بڑھ گیا تھا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ عمر اور کمزوری بھی اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ مرض کا مقابلہ اور استیصال بعید از قیاس تھا۔ بہر حال اللہ پر بھروسہ اور کرشمۂ قدرت کی توقع کے ساتھ علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ اور ڈاکٹر محمد علی مستری کے جیسے مشہورِ زمانہ ماہر ڈاکٹروں کو مشوروں اور معالجہ میں شریک کیا گیا۔

جب آس بڑھی تو یاس نے اُسے پیچھے دھکیل دیا۔ جب صحت نے منہ دکھلایا تو بیماری جھپٹ کر آئی اور اُسے روپوش کر دیا۔ الغرض ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' بیچاری قوم اور چھوٹے اور بڑے عمالِ حکومت حقیقت سے بے خبر قائداعظمؒ کی درازیٔ عمر اور صحت یابی کے لئے برابر دعا کرتے رہے۔ تپ دق پہلے ہی سے کیا کم جان لیوا تھا کہ نمونیہ بھی ہوگیا۔ اس پر علاج معالجہ سے قابو پایا گیا تو نقاہت نے زوردار حملہ کر دیا اور پیر متورم ہو گئے۔ موت و زیست کی جنگ تو کب ہی کی شروع ہوگئی تھی لیکن اب موت کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ راز داں مقربین بالعموم ڈاکٹر صاحبان جن کے علاج سے بالخصوص قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناحؒ بالکل مطمئن تھے' اس نازک حالت سے سخت پریشان ہوئے اور ''ڈوبتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق ڈاکٹروں نے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی بہت عرصہ پہلے کی ہدایت پر جبکہ انہیں کسی ذریعہ سے قائداعظمؒ کی علالت کی خبر ملی تھی، حکم دیا تھا کہ ان کے علاج کے لئے دُنیا کے کسی بھی گوشہ سے جتنے بھی ماہرین کی ضرورت ہو' فوراً بلوایا جائے' ہمارے سفیر مسٹر ایم اے ایچ اصفہانی نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ طلبی پر بہترین ڈاکٹر کو امریکہ سے بھجوائیں گے۔ ان باتوں کے پیش نظر مٹھی بھر مخصوص راز دانوں نے

بلاشک محترمہ فاطمہ جناحؒ کی رضامندی سے امریکہ سے ایک ماہر ڈاکٹر کو مشورہ کے لئے بلوانے کا طے کیا۔ محترمہ نے اس سلسلے میں اصفہانی صاحب کو بغیر کسی تاخیر کے فوراً خط لکھنے کا وعدہ کیا لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس شدید علالت کو بھائی کے خیال وخوف سے ایک رازِ سربستہ بنا رکھا تھا۔ پوری دنیا میں بہن کے مقابلہ میں بھائی کی طبیعت کو اور کون بہتر طور پر جان سکتا تھا۔ جو لوگ بھائی کی طبیعت سے بخوبی واقف ہیں، وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قائداعظمؒ سرکاری خرچ پر غیر ملکی ڈاکٹر کو پاکستان کی انتہائی غیر تشفی بخش اقتصادی حالت کے پیش نظر بلوانا ہرگز پسند نہ کرتے۔ وہ اپنی جیب خاص سے بھی خرچ کر سکتے تھے لیکن وہ موجودہ علاج کو کافی وافی سمجھتے تھے۔ بہرحال وہ وقت بھی آ گیا جب انہوں نے مکمل سوجھ بوجھ کے ساتھ کرنل الٰہی بخش سے ہیہات فرما دیا کہ میری زندگی کا مشن ختم ہوگیا اور اب علاج معالجہ بے سود ہے لیکن انہوں نے بحیثیت حامیٔ نظم وضبط ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ تعاون کرنے میں رتی برابر کمی نہیں کی اور نحیف کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹیکے لگوائے اور دوائیں پیں۔

11 ستمبر 1948ء کا منحوس دن نکلا۔ قسم لے لیجئے کہ پاکستانی قوم بالکل ناواقف تھی کہ آج اُن پر سب سے بڑا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے۔ جب دوپہر کے سورج کی تمازت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو اپنے سالار کے ساتھ ایک چھوٹا سا قافلہ مشتمل بہ محترمہ فاطمہ جناحؒ، کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر محمد علی مستری، ڈاکٹر ریاض علی شاہ، کوئٹہ کی ایک تجربہ کار عمر رسیدہ لائق انگریز نرس اور گورنر جنرل کا اسٹاف ہوائی جہاز سے بغیر کسی اطلاع کے کراچی کے لئے روانہ ہوا کیونکہ رات کے سوا دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کو رب العالمین کراچی گورنمنٹ ہاؤس سے اپنی حضوری میں طلب فرمانے والے تھے۔ لہٰذا تاخیر کیونکر ہوتی جبکہ ارشاد ربانی ہے: ''لاَ یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّ لاَ یَسْتَقْدِمُوْنَ'' ۔ چنانچہ سالار قافلہ نے تعمیل حکم خداوندی کی اور اس طرح قافلہ بغیر سالار کے رہ گیا ۔

''آسماں راحق بود گر خون ببارد بر زمین''

12 ستمبر کو واشنگٹن میں اصفہانی صاحب کو دل ہلا دینے والے سانحۂ عظیم کی اطلاع کے ساتھ محترمہ کا غیر معمولی تاخیر سے لکھا ہوا خط بھی ملا کہ فوراً کسی ماہر ڈاکٹر کو بھیجئے:۔

"کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ"

دنیا سے بلاخوف گزرنے والے
جز حق کے کسی سے بھی نہ ڈرنے والے
تو زندۂ جاوید ہے اے رشکِ مسیح
مرنا کیسا کبھی نہ مرنے والے

☆☆☆☆☆

سفرِ آخرت

پیغام آرہا ہے دل بے قرار کا
قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

قائداعظمؒ نے آج آخری منزل کے لئے آخری سفر اختیار کیا جہاں پر بالآخر ہر انسان کو جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نیا مسافر کب کا مسلسل جدوجہد، پریشانیوں اور فکروں کے باعث تھک کر چور چور ہو گیا تھا اور اسے آرام کی سخت ضرورت تھی اور زندگی کا بہت اہم، تاریخ ساز اور آخری مشن بھی تو بخیر وخوبی ختم ہو گیا تھا۔ خدمت لینے والے نے دیکھا کہ کام پورا ہو گیا ہے تو اس نے اپنے پاس بلوا لیا تاکہ اپنے تابعدار کو اس کی حسن کارکردگی کا صلہ بصورت انعام و اکرام عطا کرے۔ بندہ، بندہ ہی پیدا ہوا اور اس نے ہوش سنبھالتے ہی بندگی شروع کی اور تازیست بندگی ہی کرتا رہا یہاں تک کہ بندہ ہی کی حیثیت سے سرِنیاز جھکا کر بارگاہ احکم الحاکمین میں اپنے کاروان کو تنہا چھوڑ کر حاضری دینے چلا گیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ بندہ دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے لیکن برخلاف اس کے ہمارے میرِ کارواں کے ساتھ گراں قدر رختِ سفر تھا۔ اس کی کچھ تفصیل سن لیجئے۔ اللہ کی بندگی اور رسولؐ سے عقیدت و محبت، خدمتِ دینِ اسلام و خدمتِ مسلمان، خدمتِ خلق، خلوص، دیانتداری، بے باکیٔ مومن، حق گوئی، صداقت پسندی، شفاعت کے لئے درود و سلام کے بے بہا تحفے، مغفرت کے لئے کلام پاک کی اَن گنت تلاوت، کروڑوں کی مغفرت کی دعائیں، کروڑوں کی اللہ کا نیک بندہ ہونے کی شہادت، مختصراً یہ تھا ہمارے میرِ کارواں کا زادِراہ۔ ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اس جہانِ فانی سے خالی ہاتھ نہیں گئے اور انہوں نے جاتے ہوئے بھی اس دُنیا میں اپنی شہرت،

اپنے چرچے، اپنی شاندار خدمات، اپنی نیک نامی، ثوابِ جاریہ کے اوقاف اور اپنا قائم کردہ پاکستان باقیات الصالحات میں چھوڑ گئے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں ان کے تاریخی کارناموں کو تاقیامت یاد رکھیں اور گواہی دینے کے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھیں کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اللہ کے بڑے نیک بندے تھے۔

سلام مابہ روحِ پاک آں باد
کہ از بندِ غلامی کرد آزاد

(خورشیدؔ)

☆☆☆☆☆
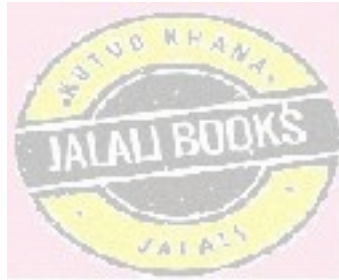
چہ می گوئیاں

ہمیں بدنام کرنا مشغلہ ہے یار لوگوں کا
یونہی کچھ جی بہلتا ہے ان بیکار لوگوں کا

(ناطق)

کچھ لوگوں کو اُدھیڑ بن کی عادت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ پتنگ اڑا کر دل بہلایا کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو شر آمیزی میں لطف آتا ہے۔ کچھ لوگ گڑے ہوئے مردے اکھیڑ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ بال کی کھال نکالنا حاصلِ حیات سمجھتے ہیں اور کچھ سادہ لوح لوگ یوں ہی حالات کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔

کوئٹہ اور زیارت میں قائداعظمؒ کے علاج کے جو مقامی انتظامات کئے گئے تھے' وہ بہت معقول تھے اور جو ان کے ماہر معالجین تھے' ان کا کسی اور جگہ ذکر کیا گیا ہے' وہ ہمارے ملک کے چوٹی کے ڈاکٹر تھے میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں اگر کسی کے دل میں کوئی شک وشبہ ہو تو دور ہو جانا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ قائداعظمؒ کی شدید علالت کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' یہ کارروائی صرف قائداعظمؒ کی دلی خواہش کے احترام میں کی گئی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی اپنے ذاتی معاملات کے بوجھ کو خود اٹھانے کی خوگر ہوگئی تھی۔ وہ اپنی ذاتی تکالیف اور پریشانیوں کو تنِ تنہا سہنے کے عادی ہو گئے تھے اور انہیں ہرگز یہ پسند نہیں تھا کہ ان کے مہلک مرض کی اطلاع سے ان کے عقیدتمندوں اور جان نثار قوم کو پریشان کیا جائے۔ اس عظیم انسان کی بہن اپنے بھائی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ آپ اس سے کیسے توقع رکھتے کہ وہ بھائی کی مرضی کے خلاف کچھ کام کرے گی۔ ڈاکٹر نے اپنے ضابطۂ اخلاق کے پیش

نظر سب سے قریبی رشتہ دار یعنی صرف محترمہ فاطمہ جناحؒ کو مرض کی نوعیت سے مطلع کیا۔
قائداعظمؒ نے جب اس اطلاع دہی کی خبر کرنل صاحب سے سنی تو وہ بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ آپ کو مس جناح کو میرے مرض کے متعلق ہرگز اطلاع نہیں دینی چاہئے تھی۔ ان تمام توضیحات سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظمؒ کے مرض کو محترمہ نے جو واحد راز دان تھی' کیوں صیغۂ راز میں رکھا اور کراچی میں آمد کی اطلاع کسی کو نہیں دی اور نہ کسی مرحلہ پر وزیراعظم سے مشورہ کیا یا انہیں اعتماد میں لیا۔

ایک اور شوشہ چھوڑا گیا ہے کہ قائداعظمؒ قائد ملت سے ناراض تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو قائداعظمؒ کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ وہ انہیں کسی بھی وقت وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیتے اور کس کی مجال تھی کہ ان سے باز پرس کرتا۔ علاوہ ازیں انہیں اپنے کسی اختیار کو بھی استعمال کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں تھی کیونکہ نوابزادہ صاحب نے حلف اٹھانے کے فوراً بعد اپنا استعفیٰ لکھ کر قائداعظمؒ کو دے دیا تھا تاکہ وہ جس وقت چاہیں' انہیں علیحدہ کر دیں۔

افسوس ہے کہ اس کی نقل دستیاب نہ ہو سکی' اس لئے اس کے شائع کرنے سے قاصر ہوں۔ بہرحال ان کا وہ استعفیٰ جو انہوں نے ہندوستان کے وزیرخزانہ بننے سے قبل قائداعظمؒ کو دیا تھا۔ بطور دستاویزی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کی شہادت کے بعد اپوا میگزین کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ دونوں استعفوں میں سوائے چند لفظوں اور عہدوں کے ہیر پھیر کے بڑی مماثلث ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس امر واقعی سے بھی ہر شخص واقف ہے کہ قائداعظمؒ نے نوابزادہ صاحب پر یہاں تک اعتماد کیا کہ انہیں اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح اور بمبئی کے محمد علی چائے والا کے ساتھ اپنی جائیداد کا 30 مئی 1931ء کو تیسرا ٹرسٹی مقرر کیا۔ اگر وہ ناراض تھے تو ان کو کب کا نکال دیے ہوتے' لہٰذا کابینہ میں ان کی مسلسل موجودگی اور ٹرسٹی ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ بالکل غلط قیاس آرائی ہے۔

ہم کسی بھی زاویہ سے دیکھیں اور اگر ہر طرح کی چھوٹ دیں یا رعایت کریں، پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس چھان بین یا ایسی لغو باتوں کے کرنے سے خود کو، قوم کو یا ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ فرض کر لیجئے کہ اگر آپ کی تحقیقات کا نتیجہ آپ کے خیال کے مطابق درست نکلا تو یاد رکھنا چاہئے کہ جو عظیم ہستیاں جواب دہ ہو سکتی ہیں، وہ اپنی صفائی یا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ کی بات غلط نکلی تو آپ نے گناہِ بے لذت کیا اور سزا کے مستوجب ہو گئے۔ میرا دردمند دل نہایت خلوص سے اپیل کرتا ہے کہ ہمیں ایسی حرکتوں سے باز آ جانا چاہئے کیونکہ

''یکے نقصانِ مایہ دوئم شماتت ہمسایہ'' کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

☆☆☆☆☆
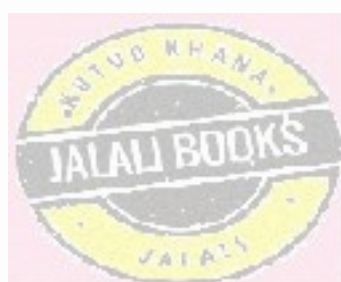
قائدین

(قائداعظمؒ اور قائدملت)

میرا انتخاطب صرف قائداعظمؒ اور قائدملت سے ہے لیکن حاشا وکلاً دونوں کی شخصیتیں، دونوں کی خدمات یا دونوں کے عملی حصہ لینے کا موازنہ کرنا یا اپنے دیگر واجب التعظیم قائدین کی گرانمایہ خدمات کو کم کر کے دکھلانا مقصود نہیں ہے۔ چونکہ میرا موضوعِ سخن صرف ''قائدین'' ہے، اس لئے ان اوراق میں آپ صرف ان دو ہی کا ذکر پائیں گے۔ ویسے تو موازنہ کرنا بھی بڑی گستاخی اور قائدملت کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ ان کے وہم وگمان میں کبھی ایسی بات نہیں آئی ہوگی، اس لئے کہ اُنہوں نے جب سے سیاست میں قدم رکھا تو قائداعظمؒ سے ان کو بے پناہ محبت اور عقیدت ہوگئی اور اُنہوں نے ان کو اپنا راہ نما بنایا اور اس میں تا زیست رتی برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔

آپ کی خدمت میں نوابزادہ صاحب کے اس خطبۂ صدارت کا اقتباس پیش کروں گا جو اُنہوں نے بحیثیت صدر اجلاس پراونشل مسلم لیگ کانفرنس بمبئی منعقدہ 6، 7، 8 اپریل 1941ء ارشاد فرمایا تھا اور اس کانفرنس کا افتتاح قائداعظمؒ نے کیا تھا۔ ان جواہر پاروں سے ثابت ہوجائے گا کہ ''قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری۔'' دیکھئے اُنہوں نے کن الفاظ میں دل کی گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

''مسلم لیگ کی ولادت بیشک ڈھاکہ میں ہوئی لیکن اس کو تقویت بمبئی سے پہنچی۔ عروج ہر دور میں بمبئی سے ہوا۔ حتیٰ کہ اس نئے جمہوری اور تنظیمی دور کی طرح بھی 1936ء میں یہیں پڑی اور پھر عظمت اور عزت کی ان بلندیوں پر مسلم لیگ کا جھنڈا کس نے گاڑا؟ اس بلند

ہمت، کوہِ وقار، غرور شکن مردِ جلیل ہی نے تو جس کا مسکن یہیں قریب مالا بار ہل پر ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بمبئی کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے انہیں اتنا بڑا لیڈر دیا کہ جس نے بہ تائید الٰہی مسلمانوں کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو اپنے نحیف ہاتھ سے روک دیا اور اب طوفان و تلاطم میں مردانہ وار ناخدائی کر رہا ہے۔

میں اس کے صوبے میں آ کر اس کے شہر میں آ کر مسلم لیگ کی صدارت کروں! یہ کیسے ہو رہا ہے۔ اے ساکنانِ صوبۂ بمبئی میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ قائداعظمؒ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں یہ ذکر برمحل ہوگا کہ قائداعظمؒ کے بھی نوابزادہ صاحب کے متعلق کیا خیالات تھے اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ قائداعظمؒ کبھی بھی کسی کے متعلق عجلت کے ساتھ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے کئی سال تک نوابزادہ صاحب کو مسلم لیگ کی خدمت کرتے دیکھا اور کئی مرتبہ ان کی دہلی والی کوٹھی گل رعنا میں قیام فرمایا۔ اس سے یہ ہوا کہ وہ نواب زادہ کی خدمت قوم سے ہی نہیں آگاہ ہوئے بلکہ ان کو بہت قریب سے دیکھ کر ان کے متعلق رائے قائم کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں 26 دسمبر 1943ء کو فرمایا "نوابزادہ لیاقت علی خان میرے دست راست ہیں۔ وہ شب و روز کام اور خدمت کرتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ اپنے کندھوں پر کتنا بڑا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک نوابزادہ ہیں لیکن وہ عوام الناس میں سے ایک ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اور نواب ان کی مثال پر چلیں گے۔"

جن دو ہستیوں میں ایسے باہمی روابط اور ایک دوسرے کے لئے عزت ہو وہ ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ بتائید ایزدی ایسے بلند مقام پر پہنچے تھے اور اُنہوں نے ایک ایسا حیرت انگیز کارنامہ یعنی حصولِ پاکستان انجام دیا تھا جو شاید ہی اب کوئی انجام دے

سکے۔ اب تو ہمارا صرف یہ فرض رہ گیا ہے کہ جو امانت قائداعظمؒ نے اپنی قوم کو سپرد کی اور جس کے وہ حقیقی وارث ہیں' اس کی ایسی دیکھ بھال کریں کہ کوئی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ یا دورِ جناح کا جب ذکر آ جاتا ہے تو دونوں قائد ہماری نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں کا اس جماعت کی تنظیم نو اور اس کی کامیابی میں اتنا قریبی واسطہ اور عملی حصہ رہا ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں صدر اور سیکرٹری ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے محبّ صادق اور مخلص رفیق کار رہے اور جیسے انسان کا دل و دماغ باہمی رابطہ سے ایک انسان کی دنیا کو چلاتے اور قائم رکھتے ہیں' اس ہی طرح ان دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے کردار کو ادا کیا۔ قائداعظمؒ کے احکامات و جذبات کی نوابزادہ صاحب نے جس خلوص و دیانتداری سے تعمیل و ترجمانی کی' وہ واقعی قابل تقلید ہے' لہٰذا دونوں کا نام ایک دوسرے کے ساتھ آتا ہے جیسے پاکستان کے ساتھ قائداعظمؒ اور پاکستان سے نوابزادہ کے نام کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ الحاصل قائداعظمؒ بانیٔ پاکستان تھے اور قائد ملت معمارِ پاکستان۔

ہمارے موضوع سخن کی حدود صرف یہاں تک محدود ہیں کہ ہم دیکھیں گے کہ قائد ملت نے اپنے قائد کی رفاقت کس طرح نبھائی۔ کتنا تعاون کیا اور ان کی ہدایات پر کہاں تک چلے۔ رفاقت کا جہاں تک تعلق ہے' اس کے متعلق میں اپنے علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کی میعاد نے چودہ' پندرہ برس سے زیادہ تجاوز نہیں کیا۔ ہم نے دیکھا کہ اس رفاقت کو نبھانے میں نوابزادہ اور بیگم رعنا لیاقت علی خان نے بہت ایثار و قربانی سے کام لیا۔ دنیا جانتی ہے کہ نوابزادہ رئیس ابن رئیس تھے اور ان کا شجرۂ نسب نوشیروان عادل سے جا ملتا ہے۔ اُنہوں نے ناز و نعمت کی گود میں جنم لیا۔ انہیں عیش و آرام' سکھ چین سب کچھ میسر تھا۔ اُنہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں علیگڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں انہیں فارسی کے لیکچرار کی جگہ پیش کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں رئیسوں کے لئے ملازمت اختیار کرنا بڑی

معیوب چیز سمجھی جاتی تھی۔ وہ وطن لوٹ آئے۔انہیں موسیقی سے کچھ لگاؤ تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کشتی سے بھی واقفیت رکھتے تھے کیونکہ جب رستم زماں گاما پہلوان اُن سے کراچی میں ملے تو اُنہوں نے پٹیالہ میں زبیسکو کے ساتھ رستم زماں کی کشتی کا حال یوں بیان کیا کہ وہ کرنال سے کشتی دیکھنے بذریعہ کار پٹیالہ گئے تھے اور ہنستے ہوئے فرمایا کہ وہ آرام سے اپنی نشست پر بیٹھ کر اس خیال سے کہ بڑے کانٹے کی کشتی ہے' کافی دیر تک رہے گی' سگریٹ منہ میں رکھ کر جلایا ہی تھا کہ بس اتنی سی دیر میں زبیسکو پچھاڑ دیے گئے اور انہیں اس دھوبی پچھاڑ سے سب طرف تارے اور صرف تارے ہی نظر آ رہے ہوں گے۔

رستم زماں اپنے ہر دلعزیز وزیراعظم سے خاص طور سے ملنے کے لئے لاہور سے تشریف لائے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے بھائی امام بخش ان کے ساتھ تھے اور حمیدا پہلوان بھی۔شکایت وفریاد کرنے آئے تھے کہ غلہ کی راشننگ کی وجہ سے انہیں غذا اتنی کم ملتی ہے جیسے اونٹ کی داڑھ میں زیرا۔ اُنہوں نے اپنی پریشان کن مالی مشکلات کا بھی ذکر کیا کہ ہندوستان کے مہاراجگان کے درباروں سے جو انہیں مالی وظائف ملا کرتے تھے' صرف وہ ہی بند نہیں ہو گئے بلکہ وقتاً فوقتاً جو دنگل ہوا کرتے تھے جس سے انہیں خاصی آمدنی ہو جاتی تھی' وہ بھی ختم ہو گئے۔اب روٹی ہی پیٹ بھر کر نہیں ملتی تو یخنی اور ٹھنڈائی کا کیا ذکر۔ان حالات میں ہمارا فن کیسے آب وتاب اور بالادستی کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔

اس ملاقات کے بعد ریاست بہاولپور اور ریاست خیرپور سے رستم زماں اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو جو وظائف ملتے اور بعد میں بند کر دیے گئے تھے' وزیراعظم کی سفارش پر جاری کر دیے گئے۔نوابزادہ صاحب تادم زیست ان لوگوں کی سرپرستی کرتے رہے۔کراچی میں دارالصحت (بھولو کا اکھاڑہ) قائم کیا گیا جس کے مقامی سرپرست بزرگ صفت' ہمدرد بنی نوع انسان' خداترس وہر دلعزیز کلکٹر کراچی محمد اسحٰق صاحب تھے جن کی ذاتی کوششوں اور گہری دلچسپی سے عمارت ملی اور ورزش گاہ بن گئی۔مشہور زمانہ حمیدا پہلوان روزانہ اپنے بھانجوں بھولو'

اسلم اور اکرم کے ساتھ وزیر اعظم کی قیام گاہ پر آیا کرتے تھے۔ وہ مجھے ناگپور سے جانتے تھے جہاں انہوں نے پچاسوں دنگل مارے تھے۔ یہ کہنے کی مجھے اجازت دیجئے کہ اس عظیم اور قابل احترام خاندان کے افراد نے غیر منقسم ہندوستان میں رؤسا اور مہاراجگان کی سرپرستی میں فن کشتی کو بڑا فروغ دیا اور متحدہ ہندوستان میں مایۂ ناز سمجھے جاتے تھے۔ اب اس خاندان کی نئی نسل رستم زماں بھولو پہلوان اعظم، اسلم، اکرم، گوگا وغیرہ باوجود فکر معاش میں مبتلا رہ کر اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر خاندانی روایات کو اور اپنے ملک پاکستان کے نام کو بلند کئے ہوئے ہیں۔ الحمدللہ! آج دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ان کا ثانی نہیں ملتا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس برتری کو ہمیشہ قائم رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کی دامے درمے اور قدمے مدد کرکے دنیا میں ان کا اور اپنا سر بلند رکھیں۔

نوابزادہ کے لئے ہر طرف زر و دولت بکھری ہوئی تھی۔ چنانچہ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد ان کو پیسہ کمانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے شخص کے لئے سیاست کی وادیوں میں داخل ہو کر بھٹکتے پھرنا اور ان راہ گزاروں سے گزرنا جہاں صرف پگڑی ہی نہیں اچھالی جاتی بلکہ گندگی بھی پھینکی جاتی ہو اور جہاں کا مسافر بے آرامی، صعوبت اور افلاس کے ساتھ زندگی گزارتا ہو، واقعی ایک بڑا ایثار تھا اور اس ایثار میں بھی بیگم رعنا لیاقت علی خان نے برابری کا بلکہ کچھ زیادہ ہی حصہ لیا۔ ویسے بھی وہ ازدواجی زندگی کے ہر معاملہ میں برابر کی شریک تھیں اور نوابزادہ نے سیاست میں قدم رکھنے سے قبل بیگم صاحبہ کو سب نشیب و فراز، ناہموار راستے اور نامساعد حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس طرح نوابزادہ نے قائداعظمؒ سے لندن میں اپنے کئے ہوئے وعدہ کو نبھایا اور قائداعظمؒ نے بھی اپنے مخلص، قابل اعتماد رفیق کار کو اپنی زندگی میں اپنے سے جدا نہیں کیا۔

دونوں کے اقوال و افعال میں کتنی مماثلت و مشابہت تھی، وہ ذیل کے دو واقعات سے روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جائے گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب قرارداد پاکستان 1940ء میں لاہور میں پاس ہوئی اور تاحصول پاکستان یعنی 14 اگست 1947ء تک صرف مسلمانان ہند کو ہی

نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے اکابرین نے یہ اذنِ عام دیا تھا کہ جو اسلامی حکومت قائم ہو رہی ہے، وہ مسلمانوں کا مامن ہوگا اور چونکہ اس کے مالک سب مسلمان ہوں گے، اس لئے ہر وہ شخص جس کا جی چاہے، آ سکتا ہے۔ آنے والے یا ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی تین اقسام تھیں اور اس بناء پر اُنھوں نے تقسیم ہند سے قبل پاکستان کی خدمت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، دوسرے نمبر پر انگریز اور عیسائی تھے اور تیسرے نمبر پر چند ہندو۔ دوسری قسم ماہرین، صنعت کار اور تجار کی تھی جن سے قائداعظمؒ بانیٔ پاکستان نے اپیل کی تھی کہ وہ پاکستان آ کر اس نئی مملکت کی تعمیر میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ تیسری قسم ان بدنصیبوں کی تھی جن کے لئے ہندوستان میں ہندوؤں نے عرصۂ حیات یہاں تک تنگ کر دیا تھا کہ وہ اپنا مال و متاع، گھر دار چھوڑ کر صرف اپنی جان بچانے اپنے مامن یعنی پاکستان آ گئے۔ ان میں سوسائٹی کے ہر طبقے کے لوگ تھے یعنی امیر و غریب، تعلیم یافتہ و جاہل۔ ان میں اکثر و بیشتر کا سہارا صرف اللہ تھا۔ دوسروں کو دنیاوی سہارا بھی حاصل تھا۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے قائداعظمؒ کی اپیل پر مسلم لیگ فنڈ کے لئے بڑے بڑے عطیہ دیے تھے اور قائداعظمؒ کو مہاجرین کے کیمپوں کے معائنہ کے وقت ان کی دستخط کردہ رسیدیں دکھلائی تھیں۔ قائداعظمؒ انہیں اور دوسرے قابلِ رحم تباہ حال مہاجرین کو دیکھ کر اتنے زیادہ متاثر ہوئے تھے کہ ان کی تندرستی یہاں تک خراب ہوئی کہ وہ بالکل صاحبِ فراش ہوگئے اور اللہ سے جا ملے۔

قائداعظمؒ نے کئی بار اعلانیہ اپنے بیانات و تقاریر میں احسان مندی کا بھرپور اظہار کیا۔ میں بھی دُکھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے قائد کی تقلید کرتے ہوئے اُن تمام معلوم و نامعلوم مجاہدین و مہاجرین جنھوں نے پاکستان حاصل کرنے میں بے انتہا خلوص کے ساتھ تن من دھن کی بازی لگا دی تھی، قابلِ صد ستائش و مستحقِ احسان شناسی سمجھتا ہوں اور میں اس سلسلہ میں ذاتی طور پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا ایثار و قربانی و خدماتِ جلیلہ ایسی ہیں کہ اگر میری پلکیں اُن راہگذاروں کو چومیں جہاں سے وہ گزرے ہیں تو بھی شمّہ برابر اعترافِ احسان نہیں ہوسکتا۔

یاغفورالرحیم ان سب کواجرعظیم عطافرما۔آمین۔

مقامی حالات' مسموم فضا وتباہ کن ماحول سے مجبور ہوکراپنے وطن اور گھر کوخیر باد کہنے والوں میں نوابزادہ صاحب کے بڑے بھائی کرنال والے نواب سجادعلی خاں صاحب' ان کی والدۂ محترمہ اور خاندان کے دیگر افراد تھے۔روانگی سے قبل نواب سجادعلی خاں صاحب نے والدہ محترمہ کی طرف سے اپنے بھائی اوران کے بیٹے نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو جو پاکستان کے وزیراعظم تھے' پیغام بھیجا کہ موٹر کا انتظام کیا جائے تاکہ سب لوگ آجائیں۔ ہمارے وزیراعظم جن کا خاندانی تعلق جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' نوشیروان عادل سے تھا' کچھ تو عدل کی قدیم خاندانی روایت اور اسلامی مساوات کے پیش نظر بیٹے نے ماں کو کہلوایا کہ میں آپ لوگوں کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں کرسکتا۔آپ اس ہی طرح آیئے جس طرح کہ اور مہاجرآرہے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ تاریخ میں مشکل سے کوئی ایسی مثال ملے گی۔

آپ کو یاددلانا چاہتا ہوں کہ جب وائسرائے ہند کی کابینہ کی نئ اور آخری تشکیل کانگریس اور مسلم لیگ کے اشتراک سے ہوئی تو قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے حصہ میں سے ایک نشست ہریجنوں کے رہنما مسٹر جوگندرناتھ منڈل جن کا آل انڈیا مسلم لیگ سے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے کوئی تعلق نہیں تھا' کودی۔اس نامزدگی کوسیاسی تدبر کہہ سکتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے کانگریس کومجبوراً حق شناس بنناپڑااور ساتھ ہی ہریجنوں کے حقوق کی مکمل نگہداشت ہوگئی اور معترضین کا یہ کہنا کہ قائداعظمؒ کی یہ ایک سیاسی چال تھی' جھوٹ ثابت ہوا کیونکہ قائداعظمؒ نے پاکستان کے قیام کے بعداچھوتوں کے ساتھ دوبارہ عملی ہمدردی کا ثبوت جوگندرناتھ منڈل کواپنی کابینہ میں شریک کرکے دیااور دنیا پرثابت کردیا کہ ہندوؤں کی اس ٹھکرائی ہوئی جماعت کو وہ پاکستان میں مسلمانوں کے ساتھ صرف مساویانہ حقوق ہی نہیں دینا چاہتے بلکہ ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک بھی کرنا چاہتے ہیں اور جواقلیتیں عیسائی' پارسی اور ہندو پاکستان میں رہتے ہیں' انہیں وہ تمام شہری مذہبی' سماجی حقوق وغیرہ حاصل ہوں گے جواکثریت یعنی مسلمانوں کو حاصل

ہیں۔ قائد ملت اور تمام حکام نے قائداعظمؒ کی ان نیک خواہشات اور اعلان کردہ پالیسی کے پیش نظر سختی کے ساتھ عمل کیا۔ پاکستان کی قلیل عرصہ کی تاریخ بتلاتی ہے کہ اقلیت کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا گیا اور پاکستان میں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے آپ ہر آئے روز دیکھتے اور سنتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا خون پانی سے زیادہ ارزاں سمجھا اور بہایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اقلیت کے افراد بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور اب بھی فائز ہیں۔ واقعی ہم اپنی اقلیتوں پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کی طرح وفادار رعایا ہیں بلکہ اس ملک کو وہ اتنا ہی اپنا سمجھتے ہیں جتنا کہ اکثریت سمجھتی ہے۔

ہم دو مثالیں دے کر آپ کو یہ بتلائیں گے کہ قائد ملت کا اقلیت کے افراد کے ساتھ کیا سلوک تھا اور اُنہوں نے قائداعظمؒ کی پالیسی پر کہاں تک عمل کیا۔ حال ہی کا واقعہ ہے' اس لئے یقین ہے کہ لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہوگا کہ نوابزادہ 10-وکٹوریہ روڈ کراچی میں رہتے تھے۔ یادش بخیر ذہن میں اور چیزیں بھی آ گئیں۔ عجیب اتفاقاتِ زمانہ ہیں کہ 10-ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن سے وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے ملکۂ معظمہ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کا پروانہ دیا۔ قائداعظمؒ کی کوٹھی 10-اورنگ زیب روڈ دہلی سے مملکت خداداد پاکستان کے قیام اور قائداعظمؒ کے پہلے گورنر جنرل ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں کہ حکومت 10-ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن سے 10-اورنگ زیب روڈ دہلی منتقل ہوئی اور وہاں سے مستقلاً 10-وکٹوریہ روڈ کراچی آ گئی۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ وزیراعظم کی قیام گاہ میں انگریزوں کے زمانہ میں کمشنر مال رہا کرتا تھا۔ یہ عمارت بہت پرانی اور بوسیدہ تھی اور کسی بھی حالت میں حکومت پاکستان کے وزیراعظم کے قیام کے لئے موزوں نہیں تھی لیکن اس وقت سوال صرف سر چھپانے کا تھا۔ لہٰذا عمارت کی مرمت اور خوب لیپا پوتی ہوئی لیکن 8-بی ہارڈنگ ایونیوئ دہلی کی کوٹھی ''گل رعنا'' سے 10-وکٹوریہ روڈ کا اتنا ہی فرق تھا جتنا ذرہ اور آفتاب میں ہوتا ہے۔ کھانے کا کمرہ اتنا چھوٹا

تھا کہ مشکل سے صرف چوبیس آدمی کی میز لگتی تھی۔ اس ہی زمانہ میں افغانستان سے ملا شور بازار تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں نشستی کھانا بجائے کھانے کے کمرہ کے برآمدے میں دیا گیا لیکن قانع وصابر وزیراعظم کی زبان سے کسی نے بھی ایک حرفِ شکایت نہیں سنا۔

رفقائے کابینہ نے اپنے وزیراعظم کی اس مستقل تکلیف کا احساس کر کے پرزور الفاظ میں کہا کہ وہ کسی شایانِ شان مکان میں منتقل ہو جائیں اور اُنہوں نے فریئر ہال کے پاس اس شاندار عمارت کی نشان دہی کی جو پتھر کی بنی ہوئی ہے اور جس کی تمام اندرون خانہ دیواریں برما کے ساگون سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس عالی شان عمارت میں بڑے بڑے کمرے اور کشادہ برآمدے ہیں۔ خوبصورت باغ بھی لگا ہوا ہے۔ وزیراعظم کے دریافت کرنے پر بتلایا گیا کہ کراچی کے مشہور لکھ پتی پارسی تاجر مسٹر ایڈلجی ڈنشا اُس عمارت کے مالک ہیں۔ اس عمارت کو واقعتاً ضرورت کے پیش نظر حاصل کیا جا سکتا تھا یا اگر مسٹر ڈنشا سے کہا جاتا تو وہ خود بخوشی حکومت کے ساتھ تعاون کرتے اور وزیراعظم پاکستان کی سرکاری قیام گاہ کے لئے اس مکان کو خود ہی پیش کر دیتے لیکن وزیراعظم نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ مسٹر ڈنشا پاکستانی ہیں اور اقلیتی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بعد میں حکومت امریکہ نے اس عمارت کو غالباً گیارہ یا بارہ لاکھ میں اپنے سفیر کی رہائش کے لئے خرید لیا۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ گوش گزار کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا گیا۔ کراچی پولیس کی سفارش پر وزارت امور داخلہ نے وزیراعظم کے سامنے تجویز پیش کی کہ مسٹر کنڈا والا (پارسی) کا مکان جو 10-وکٹوریہ روڈ سے اتنا زیادہ ملحق تھا کہ درمیان میں صرف دیوار حائل تھی اور وزیراعظم کے نشست اور استراحت کے کمرہ سے بالکل قریب تھا، حاصل کیا جائے تاکہ حفاظتی تدابیر مکمل اور اطمینان بخش ہوں ورنہ ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہے گا۔ وزیراعظم نے اس تجویز کو جسے وہ بغیر کسی پس و پیش کے حفاظت کی خاطر قبول فرما سکتے تھے، فوراً مسترد کر دیا۔ سبب یہ بتلایا کہ چونکہ مسٹر کنڈا والا کا یہ رہائشی مکان ہے، اس لئے ان کو وہاں سے منتقل کرنے سے انہیں اور ان کے

خاندان کے افراد کو تکلیف ہوگی۔ یہ تھے ہمارے پاکستان کے ہمدرد اور فرض شناس وزیراعظم جن کی نظر میں اقلیت اور اکثریت یکساں تھی اور وہ اپنے قائداعظمؒ کے نقشِ پا پر چلنے کو اپنا مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔

پاکستان پائندہ باد

پرسوں کی بات ہے کہ ملک کے نامور شاعر جناب رئیس امروہوی نے قائدملت کالج کی تقریب حلف وفاداری میں چند اشعار پڑھے جنہیں ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ اس میں قائدین کی خدمت میں بہترین نذرانۂ عقیدت اور نونہالانِ وطن کے لئے نصیحت ہے۔

علم و دانش سیکھئے تدبیر و حکمت سیکھئے
رمزِ وحدت سیکھئے رازِ سیاست سیکھیے
یہ ادارہ قائد ملت کی ہے اک یادگار
اس ادارے میں رموز ملک و ملت سیکھئے
نسل تازہ سے یہی کہنا ہے مجھ کو اے رئیس
درسِ دانش لیجیے درس حقیقت سیکھئے
قائداعظمؒ کے صدقے میں لیاقت کی قسم!
قائد ملت کے کالج میں لیاقت سیکھئے

☆☆☆☆☆

محسن قوم

جب مسلمانان عالم' مسلمانانِ ہند اور آل انڈیا مسلم لیگ کا ذکر آتا ہے تو ہمارا تمام دھیان ہز ہائینس دی آغا خاں کی طرف کھنچ کر چلا جاتا ہے۔ وہ صرف بین الاقوامی شہرت ہی کے مالک نہیں تھے بلکہ دنیا کا ہر ملک ان کو اپنا باشندہ سمجھتا تھا اور وہ جس کسی ملک میں جاتے' وہاں ان کا شاہانہ استقبال کیا جاتا تھا۔ دنیائے اسلام اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ان کے پیرو اور معتقدین تجارت پیشہ اور متمول ہونے کی وجہ سے سکھ وچین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جن ممالک میں وہ آباد ہیں' وہاں کی شہری زندگی میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ آغا خاں کی سرپرستی کی وجہ سے وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور سوسائٹی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہز ہائی نس کی نگاہ کرم اور خصوصی توجہ کی بنا پر اسماعیلی بچوں کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام کیا گیا ہے۔ دکھیوں کے دُکھ دور کرنے کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے اور سستے کرایہ کے صاف ستھرے مکانات ان کی رہائش کے لئے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ہونہار طالب علموں کو غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف دیے جاتے ہیں۔ بیماری آزاری کو کیونکر نظر انداز کیا جاتا' چنانچہ زرِ خطیر خرچ کر کے اچھے اچھے شفاخانے قائم کئے گئے ہیں تاکہ وہ لوگ جن کے جیب بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ معقول علاج' قیمتی اور اچھی دواؤں سے محروم نہ رہ جائیں۔ الحاصل ہز ہائی نس کے مذہبی پیرو بہت منظّم اور فرمانبردار ہیں۔ غالباً یہ ہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

عروس البلاد کراچی اپنی قسمت پر جتنا ناز کرے' اتنا ہی کم ہے کیونکہ اسے یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی گود میں قائداعظمؒ پیدا ہوئے اور اس ہی کی گود میں پلے پوسے اور بڑے ہوئے اور

اب تو اس ہی کی آغوش میں ابدی استراحت فرما رہے ہیں۔ دوسرے نامور سپوت ہز ہائی نس دی آغا خاں جنہوں نے اس کی گود میں آنکھیں کھولیں، وہ اتنے بڑے آدمی بنے کہ وہ کسی ایک خاص ملک کے نہیں رہے بلکہ دنیا نے دعویٰ کیا کہ وہ ہمارے ہیں لیکن قدیم ہندوستان اور پاکستان نے اعلان کیا کہ ہم ان کو خالص اپنا سمجھتے ہیں اور وہ ہمارے بڑے محسن ہیں۔ اُنہوں نے ہمارے ہر آڑے وقت میں ہم کو کبھی فراموش نہیں کیا اور دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوئے، ہماری خدمت کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ ان کی خدمات گنوانے کے لئے بہت وقت درکار ہوگا اور دفتر کے دفتر لکھنے پڑیں گے۔ مجملاً وہ گھوڑ دوڑ کی دنیا میں بھی ایک مانے ہوئے خوش طبع، مشتاق و ماہر کھلاڑی تھے۔ لیگ آف نیشنز کے صدر رہے اور گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ میں اس باب میں ان کے متعلق چند خاص باتیں، وہ بھی اختصار کے ساتھ بیان کروں گا کیونکہ پاکستان اور مسلمانان ہند سے آغا خاں کا اتنا قریبی تعلق رہا ہے کہ کسی ایک کو دوسرے سے جدا اور خصوصاً کوئی چیز لکھتے وقت تو بالکل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں اسلام کی تعلیم کے مطابق بھی یہ ایک خوشگوار فریضہ ہو جاتا ہے کہ جس کسی انسان نے احسان کیا ہو اس کا ضرور ذکر کیا جائے اور اس کا احسان مانا جائے۔ مسلمانانِ ہند و پاکستان آغا خاں کے مرہونِ منت ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ انہوں نے ہماری ہر دور اور ہر زمانہ میں خدمت و قیادت کی۔ مذہب کی تبلیغ میں اُنہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بین الاقوامی معاملات میں صرف دلچسپی ہی نہیں بلکہ انہیں کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی سعیٔ بلیغ کی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں اور ہم انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

میری یادداشت یہ بتلاتی ہے کہ وہ آج سے تقریباً ستر سال قبل سیاست کے میدان میں داخل ہوئے۔ فرقۂ اسماعیلیہ کی مذہبی پیشوائی انہیں وراثتاً ان کے بزرگوں سے نسلاً درنسلاً ملی تھی۔ اُنہوں نے مسلم لیگ کو اپنی سرپرستی میں پیدا ہوتے ہوئے اور مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ مسلم لیگ کے وفود کی قیادت کی۔ مسلمانانِ ہند کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرا کر

جداگانہ انتخاب منظور کرایا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ قائم کی۔ الحاصل ہر وہ کام جس سے مسلمانوں کا بھلا ہو' انجام دینے میں وہ پیش پیش رہے۔ انہیں کیا کیا دقتیں پیش آئیں اور اُنہوں نے کیا کیا ایثار کیئے' وہ آپ کو ان کے چند مکتوب کے مطالعہ سے جو تبرکاً شائع کر رہا ہوں' اظہر من الشمس ہو جائیں گے۔

سیاست میں ہز ہانس نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کو شروع ہی سے ان کی قربت حاصل رہی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ابتدا میں قائداعظمؒ اور ان کا خاندان آغا خاں کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا تھا۔ ولایت سے واپسی پر جب قائداعظمؒ کی ہمشیرہ کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا تو جیسا کہ قائداعظمؒ نے ایک نجی ملاقات میں حاجی عبدالستار سیٹھ صاحب' دیگر لوگوں اور مجھ سے فرمایا تھا کہ آغا خاں سے ان کا اختلاف ہو گیا اور اس حد تک پہنچا کہ وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے لیکن قوم و ملک کی خدمت اور سیاست میں دونوں شانے سے شانہ ملا کر سرگرم عمل رہے۔ شکر ہے کہ جماعت سے انقطاع باعث نزاع و قطع تعلق نہ بنا۔ ایک دوسرے کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ ہز ہائینس کو قائداعظمؒ کی قانونی صلاحیتوں کا یہاں تک اعتراف تھا کہ قائداعظمؒ گورنر جنرل بننے تک ان کے قانونی مشیر رہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہز ہائی نس نے تحریک قیامِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اس کے ایک بڑے ثبوت کا مجھے ذاتی علم ہے۔ ہوا یوں کہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ہمارے چند اکابرین جنہیں ہز ہائی نس سے بے پناہ عقیدت تھی اور وہ انہیں اپنا رہنما مانتے تھے' قائداعظمؒ کے ساتھ اس وقت تک تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوئے جب تک انہوں نے ہز ہائی نس کی اجازت نہ لے لی اور ان کے خیالات سے آگاہ نہ ہو گئے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہز ہائی نس قیامِ پاکستان کے خلاف ہیں۔ جس زمانہ میں ہز ہائی نس میڈنس ہوٹل دہلی میں مقیم تھے اور اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا' اُنہوں نے از راہِ کرم مجھے شام کی چائے پر مدعو فرمایا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور انہوں نے مجھے اپنے بیڈ روم میں یاد فرمایا ہے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ اس ہی وقت

تین ممبران اسمبلی سر محمد یامین خاں' ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور محمد نعمان صاحب (پٹنہ) پہنچے۔ مجھے اس وقت تک ہز ہائنس سے ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ میری پہلی ملاقات تھی اور غالباً مجھے اس لئے دعوت دی گئی تھی کہ میں ہز ہائی نس کے خیالات اوران کے اس مشورہ سے جو انہوں نے مذکورہ تین مدعوئین کو دیئے قائداعظمؒ کو آگاہ کر دوں۔ علالت کی وجہ سے وہ بستر میں لیٹے رہے اور پرنس صدر الدین جن کی عمر شاید دس سال کے لگ بھگ ہوگی' میزبان کے فرائض ادا کرنے لگے۔ قصہ کوتاہ انہوں نے دل کھول کر بات چیت کی اور اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قائداعظمؒ کا بغیر کسی چون و چرا کے ہاتھ بٹائے تاکہ ان کے ہاتھ اتنے طاقتور اور مضبوط ہو جائیں کہ پاکستان آسانی سے اور بہت جلد حاصل ہو سکے۔ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ دل و جان سے قائداعظمؒ کے ساتھ ہیں کیونکہ اس نازک وقت میں وہ بالکل صحیح رہنمائی کر رہے ہیں۔ اس عصرانہ کے چند دنوں بعد ہز ہائی نس نے کونسل آف اسٹیٹ اور سنٹرل اسمبلی کے مسلم اراکین کے اعزاز میں میڈنس ہوٹل میں ایک عشائیہ دیا۔ اصلی غرض قائداعظمؒ سے علی الاعلان مل کر شکوک وشبہات رفع کرنا اور دلی تعاون کا یقین دلانا تھا۔ ایسے ہی مواقع نکال کر قائداعظمؒ اور آغا خاں کی ملاقاتیں ہوتیں اور وہ دونوں تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی یہ ہی ہوا کہ میزبان عالی مرتبت نے قائداعظمؒ کو معزز مہمان خصوصی قرار دے کر اپنے دست راست پر بٹھلایا۔ مہمانوں نے یہ دیکھا کہ دوران عشائیہ یعنی تقریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے تک یہ دونوں واجب التعظیم ہستیاں تفریحی ماحول سے بالکل بے نیاز ہو کر انتہائی انہماک کے ساتھ ہمکلام رہیں۔ عصرانہ اور عشائیہ کی تقریبات کے بعد وہ تمام اراکین جنہوں نے صرف آغا خاں کو اپنا واحد رہنما مانا ہوا تھا، قائداعظمؒ کی طرف جھکے اور انتہائی وفاداری کے ساتھ تائید کر کے حصولِ پاکستان کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کے اس رویہ کو دیکھ کر نمبر 2 قسم کے رہنما جو تذبذب میں مبتلا تھے' کھل کر میدان میں آ گئے اور اس طرح مسلم لیگ بڑی مضبوط جماعت بن گئی۔ میں آگے چل کر ہز ہائی نس کے اُس مکتوب کو بھی پیش کروں گا جس میں اُنہوں نے مجھے

ہدایت کی ہے جواب ان کے انتقال کے بعد میرے لئے وصیت میں منتقل ہوگئی ہے کہ جب کبھی میں ان کے اور قائداعظمؒ کے تعلقات کا ذکر کروں تو ایک خاص معاملہ کا ضرور حوالہ دوں جسے اُنہوں نے اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے اور جو آپ کے ملاحظہ کے لئے درج کیا جارہا ہے۔

باوجود اس امر کے کہ وہ ایک خاص فرقے کے مذہبی پیشوا تھے لیکن وہ اسلام کی ہمہ گیری اور اخوت اسلامی کے دل سے معترف تھے۔ تبلیغ کرنا اور اسلامی تعلیمات کو پھیلانا ان کا شعارِ زندگی تھا۔ اگر وہ چاہتے تو فرقہ وارانہ تبلیغ کر کے صرف اپنے فرقہ کے اعداد وشمار کو تیزی سے بڑھا سکتے تھے اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہوتے کیونکہ وہ تبلیغ پر اپنی جیبِ خاص سے ہزاروں پاؤنڈ خرچ کیا کرتے تھے۔ متمول مسلمانوں کو اس اوّلین اور اہم اسلامی خدمت کی انجام دہی کی رغبت دلانے کے لئے اُنہوں نے صرف پیش قدمی ہی نہیں کی بلکہ عملی حصہ لے کر راہ دکھلائی۔ افریقہ میں عیسائیت پھیلانے کے لئے تقریباً تمام عیسائی ممالک عرصۂ دراز سے بے دریغ پیسہ خرچ کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے پادری گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر اپنے مذہب کی تبلیغ مدرسوں اور شفاخانوں کے ذریعہ اور فلاح و بہبود کے کام کر کے انجام دے رہے ہیں۔ وہ اپنی خدمات سے اتنے بااثر ہوگئے ہیں کہ اپنے مرکزوں میں بیٹھ کر سیاسی امور میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی دلی خواہش تھی کہ شمالی افریقہ کے جنوب میں اس ساحل سے اس ساحل تک ایک عیسائی مملکت قائم ہوجائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جماعت احمدیہ نے اپنے فرقہ کی تبلیغ کے لئے افریقہ میں قدم رکھا لیکن ان کے آنے سے بہت پہلے آغا خاں نے اپنی دوربین نگاہوں سے اُس تماشہ کو دیکھ لیا تھا جو افریقہ کے اسٹیج پر کھیلا جانے والا تھا۔ اُنہوں نے فرقہ بازی کے محدود دائرہ سے آگے نکل کر اور بہت بلند ہو کر تبلیغ کے مسئلہ کو ایک خالص اسلامی اور عالم اسلام کا مسئلہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا ابتدا میں تمام بوجھ ہز ہائی نس پر پڑا لیکن بعد میں کریم جی خاندان اور بہت سے مخیرّ حضرات نے اس بوجھ کو ہلکا کیا۔ پھر عام مسلمانوں نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق چندہ دیا لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہز ہائی نس کا حصہ پچاس

فی صدر رہااور اُنہوں نے تبلیغ کے جذبے کو پھیلانے اور ہر مسلمان کوثواب کمانے کا موقعہ حاصل کرنے کے لئے یہ طے کیا کہ اگر تبلیغ کے لئے کوئی پانچ ہزار روپیہ جمع کرے گا تو وہ اپنی جیبِ خاص سے پانچ ہزار روپیہ دے کر رقم کو دوگنا کر دیں گے۔ اس طرح وہ فراخدلی سے پیسہ خرچ کرتے رہے۔

وہ تعلیم کے پرانے دلدادہ تھے' اس لئے وہ اپنی قوم کو جاہل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے افریقہ کے ساحلی علاقوں' گھنے جنگلات اور فلک بوس پہاڑیوں پر مسجدوں کے ساتھ مدرسوں کی تعمیر بھی کروائی جو نومسلموں کی تعلیم کے لئے قائم کئے جاتے تھے۔ تکنیکی تعلیم کے لئے ممباسہ میں اُنہوں نے ایک مدرسہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے علیگڑھ کے نمونہ پر ایک شاندار عمارت تعمیر کر کے کھولا۔ اُنہوں نے اسلام دوستی' رواداری اور فراخدلی کا عملی ثبوت ایسٹ افریقن مسلم ویلفیئر سوسائٹی کا جو دراصل تبلیغی ادارہ تھا' ممباسہ والے سیٹھ ملاّ قادر بھائی صاحب کو صدر بنا کر دیا۔ اس طرح اُنہوں نے تبلیغی مسئلہ اور ادارہ کو ملی حیثیت عطا کی۔ ان کے بہت سے خطوط میں سے جو چند خطوط شائع کئے جا رہے ہیں' ان سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ وہ اسلام کی تبلیغ' مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے متعلق کتنے مفتکر رہتے تھے اور اس کے حصول کے لئے اُنہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔

اس اسلامی مملکت کے قیام کے بعد ہز ہائی نس پاکستان تشریف لائے۔ اس بات کا افسوس ہے کہ وہ قائداعظمؒ کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں اپنی علالت کی وجہ سے نہ آ سکے لیکن اللہ کا احسان ہے کہ اُنہوں نے اپنی برسہا برس کی محنت کا ثمرہ یعنی پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ بیج تو اُنہوں نے اپنے رفقائے کار کی معیت میں اور مدد سے میدان ہموار کر کے بویا تھا اور پھر وقتاً فوقتاً آبیاری بھی کرتے رہے۔ اگر ہمارے یہ بزرگ ابتدائی مشکلات کے مراحل طے نہ کرتے مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت نہ کرتے اور نئی مراعات جن کے ہم جائز حقدار تھے' حاصل نہ کرتے تو پاکستان کیونکر عالم وجود میں آتا۔ باوجودیکہ وہ علیل تھے لیکن کراچی میں سب

سے ملتے جلتے رہے۔ انہیں پاکستان کی اقتصادی کمزوری اور صنعتی پستی کا شدت سے احساس تھا۔ اس لئے اُنہوں نے اپنی جماعت کے آسودہ حال افراد کو ہدایت کی کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں صنعتی ادارہ کھولیں۔ تجارت میں حصہ لیں اور پاکستان کی خدمت کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اسماعیلی بھائی ان کی نصیحت پر عمل کرر ہے ہیں۔ ان کے اعزاز میں جو دعوتیں دی گئیں، ان میں بڑی خوشی سے شریک ہوئے۔ اُنہوں نے کچھ دعوتیں اپنی طرف سے بھی دیں جس میں بے شمار لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ ان کے کراچی کے دوران قیام کی ایک شام بڑی یادگار تھی جو ان کے ساتھ خوش نصیب تعلیم یافتہ لوگوں اور اکابرین نے زاہد حسین صاحب کے برنس روڈ والے دولت کدہ پر گزاری۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ شام تکلیف دہ حد تک سرد تھی لیکن ہز ہائی نس نے سامعین کے دلوں کو خلفائے راشدین اور بزرگانِ سلف کے کارناموں کو یاد دلا کر گرما دیا۔ اُنہوں نے ماضی میں ہم نے کیا نہیں کیا اور مستقبل میں ہمیں کیا کرنا ہے بتلا کر جادۂ مستقیم کی نشان دہی کی۔ دوران تقریر زبان کا مسئلہ چھڑ گیا۔ مردمومن کی طرح اُنہوں نے بہت بیباکانہ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ملت اسلامیہ کو قریب تر لانے اور قرآن پاک کو اصلی معنوں میں سمجھنے کے لئے اُنہوں نے پرزور سفارش کی کہ عربی زبان کو ملک پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ لوگوں نے افسوس ہے کہ اس وقیع مشورہ کو صرف اس کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال ہی نہیں دیا بلکہ چند لوگ سخت برہم ہوئے۔ پاکستان حال ہی میں بنا تھا اور اس کے بننے میں اُردو کا بڑا ہاتھ تھا' اس لئے پاکستان کے لوگ دیوانگی کی حد تک اُردو کے شیدائی تھے۔ ان کے دلوں میں قرآن کی زبان بے شک بہت مقدس تھی اور ہمیشہ رہے گی لیکن لوگ روزمرہ بولی جانے والی اُردو زبان کو کسی بھی قیمت پر ترک کرنے تیار نہیں تھے۔ یہ تو وقت ہی بتلائے گا کہ فیصلہ درست یا غلط تھا لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہز ہائی نس کی رائے بڑی صائب تھی۔ کاش ہم اس پر عمل کرتے۔ بہر حال جو ہونا تھا' وہ ہوا لیکن ہز ہائی نس کی عظمت اور دور بینی ثابت ہوگئی۔ وہ بہت بڑے آدمی اور بہت بڑے مسلمان تھے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دَوام ما
(حافظؔ)

☆☆☆☆☆
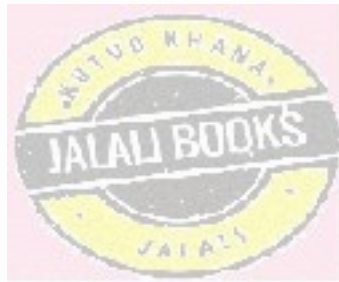
نذرانہ

اب کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
(جوشؔ)

اس کم حجم والی کتاب میں قائدملت نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی خدمات کا مفصل تذکرہ جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ بہرحال میں ان کی چند اہم خدمات کومختصراً بیان کروں گا۔ سب جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ اپنی زندگی میں اپنی خداداد قابلیتوں' صلاحیتوں اور اثر انداز شخصیت کی وجہ سے سیاست اور امور مملکت پر اس غالبیت کے ساتھ چھائے ہوئے تھے کہ ان کے رفقائے کار انہیں اپنے سے بہت بہتر سمجھ کر بطیب خاطر ان کے پیچھے چلنے والوں میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن ان پیچھے چلنے والوں میں سے اُنہوں نے اپنی گہری نظرِ انتخاب سے اپنے دستِ راست اور جانشین کا بہت پہلے انتخاب کرلیا تھا اور ان کو اپنی نگرانی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری' مرکزی اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر' متحدہ ہندوستان کا وزیرخزانہ اور پاکستان کا وزیراعظم بنا کر اور مکمل تربیت دے کر صحیح جانشینی کے فرائض ادا کرنے کے لئے تیار کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان کو اتنا قابل اعتماد دوست سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے 1939ء میں انہیں اپنی ہمشیرہ اور دوسرے دوست مسٹر محمد علی چائے والا کے ساتھ اپنی ذاتی ملکیت کا ٹرسٹی نامزد کیا تھا۔

جب قائداعظمؒ اللہ کو پیارے ہوئے تو ملک پاکستان میں سب طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ لوگوں کے دل بیٹھنے لگے۔ پاکستان کی بنیادی بُری طرح ہل گئیں۔ بزدل دشمن کے حوصلے بلند ہوئے اور اس نے حیدرآباد دکن پر پولیس ایکشن کے نام سے ہلہ بول دیا۔ پاکستان

کا مستقبل سب کو ڈراؤنا نظر آنے لگا۔ ہزاروں اندیشے اور ہزاروں خطرے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے لگے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا ''اب کیا ہوگا؟'' نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کی ملی زندگی کا یہ بڑا نازک وقت تھا اور ان کی بڑی آزمائش تھی۔ ان کا ایک غلط قدم ان کی بنی بنائی زندگی اور ملک کے استحکام اور بقا کو حرف غلط کی طرح مٹا سکتا تھا۔ انہیں خالی جگہ پُر کرنی تھی اور وہ بھی قائداعظمؒ کی خالی کردہ جگہ اور امور مملکت کو خوش اسلوبی سے چلانا تھا جیسا کہ قائداعظمؒ کے زمانہ میں چل رہے تھے۔ اُنہوں نے سب سے بڑا معاملہ فہمی اور اتحاد باہمی کو قائم رکھنے کا ثبوت ایک مرنجان مرنج خدا ترس نیک بزرگ کو جس کے لئے عوام کے دل محبت اور عزت سے لبریز تھے، گورنر جنرل بنا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کے انتخاب کو ہر کس و ناکس نے بہت سراہا۔ قائداعظمؒ کی ناخدائی کے اختتام پر پاکستان کی کشتی ہچکولے کھانے لگی تھی اور غرق کردینے والے بھنور میں پھنسا چاہتی تھی لیکن مشیتِ ایزدی کا تو اٹل فیصلہ تھا کہ ''مرد سے از غیب برون آید و کارے بکند۔'' دنیا جانتی ہے کہ نوابزادہ صاحب نے تین ہفتہ کے اندر جب ملک میں ہر طرف انتشار ہی انتشار پھیلا ہوا اور مہاجرین کا اُمنڈتا ہوا سیلاب چلا آرہا تھا، خالی خزانہ، کشمیر کا تنازعہ اور کمزور فوجی نظام ورثہ میں ملا تھا، اُنہوں نے مملکت پاکستان کے طول وعرض کا دورہ کر کے قوم کا اطمینان، خود اعتمادی و سکون جو اس سے چھن گیا تھا، واپس دلوا دیا اور قوم پر روزِ روشن کی طرح اپنے قول و فعل سے واضح کردیا کہ قائداعظمؒ نے اپنی جانشینی کے لئے صحیح آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے کردار سے یہ بھی ثابت کردیا کہ وہ قائداعظمؒ کے پکے دوست اور سچے عقیدتمند تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ جب قائداعظمؒ کے رخصت ہونے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا تو اسے نواب زادہ صاحب نے قائداعظمؒ کے بتلائے ہوئے اصولوں اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر اس خوبصورتی کے ساتھ پُر کیا کہ دنیا حیران رہ گئی اور دشمن انگشت بدنداں۔ درحقیقت نوابزادہ صاحب نے بانئ پاکستان کی ناگہانی رحلت کے بعد اس نوزائیدہ ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی جسے پاکستان تاقیامت فراموش نہیں کرسکتا اور احسانمندی کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے گا۔

ان کی دوسری بڑی خدمت تسبیح کے اُن منتشر دانوں کو جو عرصہ سے یہاں اور وہاں بکھرے ہوئے پڑے تھے، پھر سے پرو کر تسبیح کی شکل دی تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور اغیار مسلمانوں کی متحدہ قوت کے پیش نظر اپنی ہوس اور جاہ پرستی کا آسانی سے انہیں شکار نہ بنا سکیں۔ یہ دراصل بڑا مشکل کام تھا کیونکہ اکثر مسلم حکومتیں ''ہم چومن دیگرے نیست'' کے فریب میں مبتلا تھیں۔ وہ فوراً یہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ نئی حکومت جو ابھی عالم وجود میں آئی ہے، قدیم حکومتوں کی قائد بننا چاہتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری پرانی روایات ہیں اور ہماری پرانی درخشندہ تاریخ ہے، لہٰذا صرف ہم ہی قیادت کے اہل ہیں۔ دوئم وہ غیروں کے زہریلے پروپیگنڈا سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہ نئی حکومت سامراجی طاقتوں کے اشارہ پر رہنما بننے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ پہلے تو یہ خود بہت کمزور ہے، اسے اپنے قدموں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہونا چاہئے کیونکہ اس نئی مملکت کے قصر کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہیں اور یہ ریت پر بنا ہوا گھروندہ کسی بھی وقت گر پڑے گا۔ نوابزادہ صاحب نے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بار بار اعلان کرتے رہے کہ اسلامی دنیا کی لیڈری آپ کو مبارک ہو۔ ہمارے وہم وگمان میں لیڈر بننے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا اور نہ آئے گا۔ ہم تو اسلام اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور ہم خادم بننے اور کہلانے میں بڑا اشرف محسوس کرتے ہیں۔ الحاصل ان کی نیک کوششیں بارآور ہوئیں اور عروس البلاد کراچی میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس زیر صدارت مفتی اعظم سید امین الحسینی منعقد ہوا اور تمام اسلامی ممالک کے ممتاز نمائندوں نے شرکت کی۔ اسلامی اخوت کو زندہ کرنے اور پاکستان کو اسلامی ممالک سے روشناس کرانے اور قریب تر کرنے کا یہ بہت بڑا قدم تھا جس کا سہرا نوابزادہ صاحب کے سر ہے۔ آپ شاہد ہیں کہ خدمتِ اسلام کا یہ ہمہ گیر جذبہ نوابزادہ صاحب کے آخری دم تک کارفرما رہا اور یہ ہی اُس آخری تقریر کا موضوع بننے والا تھا جو 16 اکتوبر کو راولپنڈی میں ''برادرانِ ملت'' سے شروع ہوئی اور ''لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' اور ''اللہ پاکستان کی حفاظت کرے''، پر ختم ہوئی۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شہید ملت کو تب وتابِ جاودانہ کا صلہ مل گیا لیکن میں ایک خودغرض انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں تو سب کچھ کھو چکا اور میں تنہا کھونے والا نہیں ہوں بلکہ میری پوری قوم اور میرا پورا ملک اس نا قابل تلافی نقصان سے کچل کر رہ گیا کیونکہ نوابزادہ صاحب ملک وقوم کا سرمایہ اور قائداعظمؒ کے بعد واحد سہارا تھے۔

ہماری شومئ قسمت دیکھئے کہ ابھی تک ہمیں ہماری ان دو بزرگ واجب التعظیم ہستیوں کے صحیح جانشین نہیں ملے حالانکہ چند پاکستانیوں نے قائداعظمؒ ثانی، محافظ ملت اور دبیر الملت بننے کی کوششِ نامعقول ضرور کی۔ اُن میں مرحومین کی صلاحیتیں کہاں تھیں۔ وہ تو اپنے چند جھوٹے خوشامدیوں پر تکیہ کرتے تھے۔ بالآخر ان کا حشر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی ان کی مٹی بہت پلید ہوئی۔ ہم نے تو آج تک اتنا زمانہ انتظار ہی انتظار میں بتا دیا۔ اب تو ہم اپنے اللہ ہی سے قائداعظمؒ اور قائد ملت کی طرح جانشین مانگتے ہیں جس کی ترجمانی حضرت بہزاد لکھنوی نے اپنے حسب ذیل شعر میں کی ہے جو میرے اور تمام پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے۔

میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ میری شمع کہاں ہے
جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے

حالانکہ ان کی دائمی جدائی کے اٹھارہ سال بیت گئے لیکن جہانگیر پارک کی ان کی تقریریں ابھی تک کانوں میں گونجتی ہیں اور خصوصاً وہ تقریر جس میں ملک کے غداروں کو متنبہ کر کے اُنہوں نے اعلان کیا تھا کہ اگر میرا لڑکا ملک کے ساتھ غداری کرے گا تو میں اپنے ہاتھوں سے اُسے سر بازار پھانسی پر لٹکا دوں گا۔ ہمارے جمہوریت پسند وزیراعظم قانون ساز جماعت کی اہمیت کو برقرار رکھتے ہوئے خود کو پاکستان کے عوام کے سامنے جوابدہ سمجھ کر حکومت اور تمام وزارت کی کارروائیوں سے یوم آزادی پر یعنی 14 اگست کو عوام کو اپنے اعتماد میں لے کر آگاہ کیا کرتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم کی تعمیل میں پاکستان پر اچانک حملہ کرنے کے لئے ہندوستانی افواج بڑی تعداد میں پاکستان کی سرحدوں پر جمع ہو گئیں تھیں۔

نزاعِ حق و باطل کا تقاضہ ہے کہ اے مومن
پہن لے جوڑا شاہانہ نہالے آبِ خنجر میں
(کلاّم)

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے محبوب وزیراعظم نے کراچی سے صرف گھونسہ دکھلا کر ہندوستان کی افواج کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کیا لیکن یاد رہے کہ اُنہوں نے اس نازک موقعہ پر ایک اہم پیش کش اور ایک مخلصانہ گزارش کی تھی۔ اعلان بہت مختصر سا تھا کہ پاکستان کی حفاظت وبقا کے لئے لیاقت جس کے پاس سوائے اس کی جان کے اور کچھ نہیں ہے' دینے میں دریغ نہیں کرے گا۔ مزید فرمایا تھا کہ باہر کے دشمنوں کو میں نمٹ لوں گا کیونکہ اللہ کے فضل وکرم سے ہماری فوجی طاقت ایسی ہے کہ وہ دشمن کا آخری قطرۂ خون تک بہا سکتی ہے۔ آپ پاکستان کو اندر کے دشمنوں سے بچایئے۔ اعلان کے مطابق قائد ملت نے اپنا وعدہ اپنی جانِ عزیز دے کر پورا کیا تاکہ ہم باقی اور محفوظ رہیں اور ہماری کشتِ ویران ان کے خونِ پاک سے سیراب ہوکر سرسبز و شاداب ہوجائے اور ہمیشہ لہلہاتی رہے جس سے قوم کے تمام لوگ مستفید ہوں۔ امن وسلامتی کے ساتھ ملک میں صنعت وحرفت کا دور دورہ ہو۔ جہالت دور ہو اور علم کی روشنی پھیلے۔ امیر و غریب سکھ چین کی زندگی بسر کریں اور سدا پھولتے پھلتے رہیں۔

مرنے والا وعدہ کے مطابق ملک وقوم کے لئے ایثار عظیم کر کے دہلی سے جیسے خالی ہاتھ آیا تھا' ویسے ہی خالی ہاتھ ہم سب کے دامن خوش حالی' سکھ اور چین کے موتیوں سے بھر کر شہادت کا خون آلود کفن زیب تن کئے ہوئے اللہ کے پاس چلا گیا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے گریبان میں ذرا جھانکیں اور جائزہ لیں۔ ہمارے دل کا آئینہ ضرور غمازی کرے گا کہ نہ تو ہم نے ملک کو اندرونی دشمنوں سے بچایا اور نہ اپنی جان سے زیادہ عزیز اور ہردلعزیز وزیراعظم کی بیش بہا جان کی حفاظت کی۔ واقعات شاہد ہیں کہ ہم نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں کی اور اَن سنی کر کے رکھ دیا۔ ہماری لاپرواہی اور غفلت سے ایک بے گناہ تن ومند انسان اور معمارِ پاکستان ایک شقی

القلب کی دوخطانہ ہونے والی گولیوں کا نشانہ بن گیا اور اس طرح جمہوریت کا دن دھاڑے برسر عام گلا گھونٹ دیا گیا۔

دنیا کہتی ہے کہ وقت غم کو بھلا دیتا ہے اور زمانہ زخم کو مندمل کر دیتا ہے لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ اس قاعدہ کلیہ کا ذرا سا بھی نفاذ بیگم رعنا لیاقت علی خاں' ان کی اولاد' ان کے رفقاء اور ان کی سوگوار قوم پر نہیں ہوا۔ رنج وغم تازہ اور زخم ہنوز ہرا ہے۔ آنسو بلاشک تھم گئے ہیں لیکن دل تو برابر روئے جا رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے غیر محسوس طریقہ پر غم کی گھٹا سوتے جاگتے دل پر منڈلاتی رہتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ یاد کچھ کم ہو جائے لیکن بقول مولانا حسرتؔ موہانی ؎

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں

دو گولیاں

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانہ کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

ابھی آسماں پر چاند کی تیز نقرئی روشنی میں ستارے جھجک جھجک کر چمک رہے تھے اور رات کی آخری میٹھی لوریاں دنیا کے ہر ذرہ کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلا رہی تھیں کہ 16 اکتوبر کی صبح کاذب اس پرسکون سیمگون منظر میں آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور میں کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھا کیونکہ مجھے قائد ملت کے ہمراہ راولپنڈی جانا تھا۔

حسب معمول ٹھیک ساڑھے سات بجے صبح میں وزیراعظم کی کوٹھی پر پہنچ گیا اور بڑے زینہ کے سامنے کھلے برآمدے میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ بند کالر کا سفید سوٹ زیب تن کئے نپے تلے قدم سیڑھیوں پر رکھتے ہوئے میاں اشرف اور اکبر کے ساتھ جو بغل میں بستے لٹکائے ہوئے بالکل آپ کے عقب میں آرہے تھے برآمد ہوئے۔ چہرہ پر وہی مستقل مسکراہٹ تھی۔ اُنہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے چلنے کی ہدایت کی۔ جب ہم ان کی ذاتی سیاہ کیڈلک کار کے قریب پہنچے تو میاں اکبر نے کہا۔ ''ڈاڈ! ہم آپ کے ساتھ پنڈی چلیں گے۔'' محبت و تحکم میں ڈوبے ہوئے انداز میں نورِ نظر سے فرمایا: ''نہیں، تم اپنے اسکول جاؤ گے'' اور دونوں صاحبزادوں کو خدا حافظ کہا۔ بچے عازم اسکول ہوئے اور ہم عازمِ طیران گاہ۔

ہم سب اس حقیقت سے قطعی بے خبر تھے کہ آئندہ چند گھنٹوں میں ہم پر کیسی ناگہانی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے۔ حسب عادت آپ نے مجھے اپنی کار میں برابر کی نشست پر

بٹھلایا۔ میں نے کہا۔''اطلاع ملی ہے کہ راولپنڈی میں موسم سرد ہوگیا ہے۔'' فوراً اپنے ملازم خاص عبدالغنی سے دریافت کیا''تم نے کمبل رکھ لیا ہے یا نہیں۔''اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس دن ماری پور کا راستہ بھی بہت جلد طے ہوگیا۔ طیران گاہ پر جو اصحاب خدا حافظ کہنے آئے تھے' وزیراعظم اُن سے مل کر رخصت ہوئے اور ہوائی جہاز میں جا بیٹھے۔ جہاز نے ٹھیک آٹھ بجے فضا میں پرواز کی اور اپنے اس عظیم المرتبت مسافر کو لے کر اس منزل کی طرف تیزی سے روانہ ہوا جہاں شہادت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

چونکہ مجھے ہمیشہ اپنا دوست اور قدیم رفیقِ کار سمجھتے تھے' اس لئے اپنے کیبن میں نشست دی اور عبدالغنی کو ساڑھے نو بجے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ ہم ساڑھے نو بجے تک اخبارات پڑھتے رہے اور مختلف عنوانات پر گفتگو ہوتی رہی جس میں قابل ذکر موضوع گفتگو اُس ہوائی جہاز کے متعلق تھا جو آپ کے لئے خاص طور پر بنایا جا رہا تھا۔ ناشتہ کے بعد ڈپٹی پرائیویٹ سیکرٹری میاں منظور محمد نے وزارت دفاع سے اس تقریر کا وصول شدہ مسودہ پیش کیا جو 17 اکتوبر کو کیمبلپور میں صد سالہ ری یونین کے موقعہ پر پڑھی جانے والی تھی۔ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے لفظ سلطنت کو جو تقریر میں تین جگہ لکھا گیا تھا' قلم زد کر اس کی بجائے لفظ مملکت لکھا اور مسودہ نقل کرنے کے لئے ڈپٹی سیکرٹری صاحب کو واپس دے دیا۔ مجھ پر چونکہ ہمیشہ سے خاص عنایات تھیں اور مجھے اجازت بھی تھی' اس لئے میں اظہار رائے کرنے میں تکلف نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے عرض کیا گستاخی معاف مسودہ میں ایک جملہ قابل توجہ ہے۔ فرمایا وہ کیا؟ میں نے اس مخصوص جملے کو بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا۔ فرمانے لگے۔ کیا ہونا چاہئے۔ میں نے کہا بجائے مرنے والوں کی روحوں کو مبارکباد دینے کے ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے تو انسب ہوگا۔ بہت خوش ہوئے۔ مسکراتے ہوئے فرمایا نہایت اچھی ترمیم ہے۔ جملہ فوراً درست کر دیا گیا۔ لیجئے ہم ٹھیک وقت پر چک لالہ کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ وقت روز ازل سے ہی قضا و قدر کا تابع رہا ہے لیکن آج غیر معمولی طور پر ہر کام وقت پر ہو رہا تھا۔ جانثار پرستاروں نے آپ کو اپنے

جھرمٹ میں لے لیا۔ ہر ملاقاتی کے لئے اس کے مذاق کے مطابق دلچسپ فقرے چست کرتے رہے جس سے سب لوگ لطف اندوز ہوئے۔ ہر شخص خنداں وفرحاں نظر آ رہا تھا۔

سرکٹ ہاؤس پہنچنے پر اسمٰعیل ٹیلر کو فوراً بلوایا گیا تا کہ ان دو سوٹوں میں جو اس کی فرم میں سلوائے گئے تھے' قطع و برید کر کے نقائص دور کئے جائیں۔ درزی بھی فوراً آن پہنچا۔ اُسے مناسب ہدایات کے ساتھ سوٹ دے دیے گئے اور تاکید کی گئی کہ کراچی کی روانگی سے پیشتر تیار کر کے لے آئے۔ اُنہوں نے یہ بھی دریافت کرنے کے لئے فرمایا کہ کیمبل پور کا فاصلہ کتنا ہے اور کتنی دیر میں یہ راستہ طے ہوگا۔ پھر نواب صاحب گورمانی کی آمد پر اُن سے ڈرائنگ روم میں جا کر ملے اور وہاں چپکے چپکے کچھ اہم باتیں ہونے لگیں۔ میں دفتر کے کمرے میں چلا گیا کیونکہ وہاں کچھ لوگ میرے منتظر تھے جو مجھے کمپنی باغ لے جا کر جلسے کے انتظامات دکھانا چاہتے تھے۔ میں نے جب وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان لوگوں کی خواہش کا ذکر کیا تو مجھے حکم ملا کہ میں جا کر وہ تمام انتظامات خود دیکھ لوں جو مسلم لیگ نے کئے تھے۔ اس منحوس جلسہ کے انتظامات کراچی سے 11 اکتوبر کو ڈپٹی کمشنر مسٹر ہارڈی کے ذریعہ بحکم وزیر اعظم صاحب کئے گئے تھے۔ ٹیلیفون پر جلسہ کا پیش نامہ مقامی مسلم لیگ کے عہدہ داروں کی رضامندی سے طے ہوا تھا اور ڈائس بنانے کے متعلق بھی احکامات صادر کئے گئے تھے۔ یہ سب کارروائی میرے توسط سے طے پائی تھی۔ یہ بھی ظاہر کر دوں کہ مقامی حکام یا حکومت پاکستان کی طرف سے کسی نے جھوٹے منہ بھی وزیر اعظم کے اس دورہ یا جلسہ کی مخالفت نہیں کی اور نہ ملتوی کرنے کا کہا تھا۔

جلسہ گاہ سے واپسی پر میں ڈیڑھ بجے کے قریب ان کے کمرے میں رپورٹ دینے گیا تو دیکھا کہ تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ انتظامات کی تفصیل بتلا کر میں نے عرض کیا کہ جلد کھانا کھا کر آرام کیجئے۔ فرمایا کھانا منگوالیا ہے اور کھانے کے بعد آرام کروں گا۔

عجیب بات ہے کہ اس روز میں راولپنڈی پہنچنے کے بعد کچھ گم سم ہو گیا اور ایک مشینی آدمی کے جیسے کام کرنے لگا۔ بھوک پیاس بالکل غائب ہوگئی۔ قسم لے لیجئے جو دوپہر میں ایک

دانہ کھایا ہو یا بستر پر ایک لمحہ کے لئے آنکھ جھپکی ہو۔ دل میں انجانے اندیشے اور اضطراب تھا جسے میں سمجھنے سے بالکل قاصر رہا۔ ضعیف الاعتقادی کی بات کرنا مقصود نہیں ہے لیکن کیا 15 اکتوبر کی شام کی شفق جو بڑی ہیبت ناک اور بہت دیر تک سرخ رہی اور جس نے بیگم رعنا لیاقت علی خاں کو یہاں تک پریشان کر دیا تھا کہ انہوں نے وزیراعظم کو پنڈی جانے سے بہت منع کیا؟ کیا یہ مظہریاتی کیفیت غیر محسوس طریقہ پر مجھ پر اثر انداز تھی؟ واللہ اعلم بالصواب۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی بڑا سانحہ پیش آنے والا ہو تو انسانی دماغ میں نئے نئے اندیشے جنم لیتے ہیں اور چھٹی حس بیدار ہو کر ایک غیر مرئی طاقت کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے لگتا ہے لیکن ہمارے وزیراعظم کی رفتار و گفتار سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی۔

سرکٹ ہاؤس سے ٹھیک تین بج کر سینتالیس منٹ پر روانگی کی منحوس گھڑی آن پہنچی۔ کار کی پچھلی نشست میں کمشنر صاحب، وزیراعظم کے ساتھ جا بیٹھے۔ میں اگلی نشست میں ڈرائیور کے نزدیک بیٹھنے کے لئے بڑھا ہی تھا اور ابھی پوری طرح کار کا دروازہ بھی کھولنے نہیں پایا تھا کہ فرمایا: ''آپ میرے پاس آ کر بیٹھئے۔'' حسب حکم میں دونوں کے درمیان جا بیٹھا۔ کار روانہ ہوئی اور وزیراعظم نے سگریٹ سلگایا۔ راستہ میں لوگ کثیر تعداد میں جلسہ گاہ کی طرف جاتے ہوئے ملے۔ بالآخر ہم جلسہ گاہ پہنچ گئے اور آپ نے آداب جلسہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سگریٹ نوشی کا لامتناہی سلسلہ اس آخری سگریٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھ سے بجھا کر ختم کر دیا۔

گیٹ پر چند مقامی ہستیوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہار پہنائے۔ آپ نیشنل گارڈز کی دو رویہ قطار کے درمیان تلواروں اور نیزوں کے سایہ میں سلام لیتے ہوئے ڈائس کی طرف خراماں خراماں چلے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر اور ''زندہ باد'' کے نعرے لگا کر اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔ آپ ایک بڑی کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ قوم کے نوشہ کے گلے میں جو ہار پڑے تھے، ان میں کی چند گنگا جمنی مقیش گستاخ لڑیاں بار بار رخسار بوسی کر رہی تھیں جنہیں میں نے بڑھ کر ہٹا دیا۔ قاری صاحب نے تلاوتِ قرآن پاک سے جلسہ کا آغاز کیا۔ شیخ مسعود صادق

صاحب چیئرمین بلدیہ راولپنڈی نے سپاسنامہ پڑھا اور پیش کیا۔ صدر مقامی مسلم لیگ محمد عمر صاحب نے اہالیان راولپنڈی کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہا اور یقین دلایا کہ پاکستان کی حفاظت وبقا نیز کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ہر طرح کی قربانی پیش کی جائے گی۔ پھر اُنہوں نے درخواست کی کہ وزیراعظم اپنی سحر بیان تقریر سے مشتاق حاضرین کو مستفیض فرمائیں۔ میں حسب عادت کرسی کے بالکل عقب میں فرش پر بیٹھ گیا۔ پاکستان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا واحد سہارا' غریبوں ومہاجرین کا ملجا و ماوا' آٹھ کروڑ مسلمانوں کا دلارا' قائداعظمؒ کا دستِ راست اور صحیح جانشین' اتحاد' یقین محکم' تنظیم' عزم کا مجسمہ اور صلح وآشتی کا علمبردار نہایت وقار ومتانت' سکون و اطمینان کے ساتھ آلۂ مکبر الصوت کی طرف مشتاقانِ دید و بیقرار سامعین کو مخاطب کرنے کے لئے بڑھا۔ تقریباً ایک لاکھ حاضرین نے تالیاں بجا کر اور ''لیاقت علی خاں زندہ باد'' ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگا کر مسرت کے پھول نچھاور کئے۔ مجمع ٹکٹکی باندھے اپنے محبوب وہر دلعزیز رہنما' اپنے صاحبِ تدبیر وپیکرِ فہم وذکا وزیراعظم کی طرف دیکھ رہا تھا کہ لب ہلے اور ''برادرانِ ملت'' کی اخوت انگیز آواز کانوں سے ابھی اچھی طرح نہ ٹکرانے پائی تھی کہ دو گولیوں کے یکے بعد دیگرے چلنے کی دلدوز ودحشت خیز صدا نے فضا میں خوفناک انتشار پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بے تابانہ ان کی طرف لپکا اور دیکھا کہ بائیں طرف کے حصہ جسم کو جنبش ہوئی اور پاکستان کا روشن مینار دیکھتے ہی دیکھتے گرنے لگا۔ میں نے اُسے تھامنے کی کوشش کی لیکن آپ کا سر مبارک جس نے پاکستان کے مشکل سے مشکل مسائل ذرا سی جنبش سے حل کئے تھے' میرے سینے سے آلگا اور آپ نے نہایت اطمینان اور بلند آواز سے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا۔ وہ گرتے جارہے تھے اور میں انہیں سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے دوبارہ کلمۂ طیبہ ادا کیا۔ میں اتنی دیر میں زمین پر بیٹھ گیا اور آپ کے مقدس سر کو جو تمام قوم کی امانت تھا' اپنے زانو پر رکھ لیا۔ چاروں طرف سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھی۔ لوگ جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے یا کرسیوں اور صوفوں کے نیچے چھپ گئے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس

ہوا کہ کہیں کوئی گولی ان کے پاکیزہ چہرہ کو زخمی نہ کردے۔ چنانچہ میں نے اپنے دونوں بازوؤں کو اس طرح پھیلایا کہ وہ ان کے چہرہ کے لئے سپر بن گئے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہیں آیا کہ میں خود گولیوں کی زد میں ہوں بلکہ دل میں یہ آواز تڑپتی رہی کہ کوئی گولی مجھے بھی آ لگے۔ الغرض تمام خطرات سے بے خبر میں جھکا ہوا ان کے چہرہ کو تکتا رہا قائد ملت نے اپنی دور بین و مردم شناس آنکھیں کھولیں۔ میری طرف محبت سے دیکھ کر فرمایا: ''مجھے گولی لگ گئی ہے۔'' میں نے ڈھارس دینے کی خاطر کہا۔ ''حضور آپ کیا فرمار ہے ہیں۔'' میرا یہ جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اُنہوں نے صاف لیکن دھیمی آواز میں فرمایا: ''پاکستان کی خدا حفاظت کرے۔''

یہ تھے آخری الفاظ اس شہید قوم کے جس کے دل و دماغ پر زندگی کے آخری لمحہ میں بھی پاکستان چھایا ہوا تھا۔ اس وقت انہیں اپنی بیکس بیگم کا خیال آیا اور نہ معصوم بچوں کا۔ میں نے انہیں آرام پہنچانے کی خاطر شیروانی کے بٹن کھول دیے اور ریشمی قمیص کو اُلٹ کر دیکھا تو بائیں طرف پسلیوں کے وسط میں دو انچ کے قطر میں چنے برابر دو نشان اوپر نیچے ایک ہی سیدھ میں نظر آئے جن کے منہ پر کچھ خون دکھائی دے رہا تھا۔ طبی معائنہ سے تصدیق ہوئی کہ پہلی گولی نے دل کو پاش پاش کر دیا اور دوسری گولی اپنا رُخ موڑ کر کولہے کی طرف گئی اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ الحاصل ایک گولی جسم کے اندر پیوست ہو کر رہ گئی اور وہ جان لیوا ثابت ہوئی۔ دوسری گولی کے متعلق بتلایا گیا تھا کہ وہ اتنی خطرناک نہیں تھی جس سے جانبری نہ ہو سکتی۔ پہلے زخم سے تو خون بہا ہی نہیں، دوسرے سے کچھ نکلا جو میری شیروانی پر خشک ہو گیا تا کہ میں اپنی مغفرت کے لئے اس شہید کے پاک خون کا واسطہ دے سکوں۔ میں نے چلا کر پانی لانے کو کہا۔ راولپنڈی کے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر جن کا نام غالباً چودھری رفیق تھا' پانی کی کپی لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ میں نے پانی پلانے کی کوشش کی۔ غالباً اس ہی اثنا میں مسٹر ہارڈی نیچے سے ڈائس پر آئے۔ چند قطرے تو حلق میں اُتر گئے لیکن باقی ماندہ پانی منہ کے دونوں طرف سے بہہ نکلا۔ اس ہی وقت میرے دکھی دل نے اس کھلی حقیقت کو محسوس کیا کہ پاکستان کا درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔ ان کی

بڑی بڑی آنکھیں کچھ نیم واسی رہ گئی تھیں۔ میں نے پپوٹوں کو نیچے کی طرف ہلکے ہلکے پھیلا دیا اور افسوس وہ ابدی گہری نیند میں آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ جب ہم وزیراعظم کے نیم مردہ جسم کو ہاتھوں پر اٹھائے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لے جانے اور وہاں آخری طبی امداد حاصل کرنے کے لئے جلسہ گاہ سے باہر پہنچے ہی تھے کہ ایک کار آ کر رکی اور اس میں سے نواب صاحب گرمانی نمودار ہوئے۔ چلو سواری تو آسانی سے میسر ہو گئی۔ نواب صاحب ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے اور ان کی جنبش لب سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ ورد کر رہے ہیں۔ میں نے کار کی نچلی نشست میں قومی قیمتی سرمایہ کو اپنے زانو پر رکھ لیا اور پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ وزیراعظم کے پیروں کو تھام کر بیٹھ گئے۔ اسپتال کے صدر دروازے کے باہر کچھ فاصلہ سے ایک موٹر پر میں نے کرنل (بریگیڈیئر) سرور کو مخالف سمت موٹر سائیکل پر بہت تیز جاتا ہوا دیکھ کر اشارہ کیا۔ اسپتال میں جیسے ہی ہماری کار رکی' وہ پہنچ گئے اور کار ہی کے اندر ایک انجکشن دے دیا۔ جب وزیراعظم کو اسٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر لے گئے' اس وقت صرف میں اور گرمانی صاحب ان کے ساتھ تھے۔ جہاں کرنل (جنرل) میاں اپنے محبوب وزیراعظم کی خدمت اور علاج کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اُنہوں نے فوراً اپنے ہاتھوں سے دل کی بہت مالش کی جسم کو خوب ہلایا جھلایا۔ پیر کی ایک رگ کاٹ کر تازہ خون جسم کے اندر پہنچانے کی کوشش کی لیکن ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی کیونکہ یہ ہی مشیتِ ایزدی تھی۔ جب کرنل میاں نے اعلان کر دیا کہ وزیراعظم کی پاک روح نے ان کے بھاری بھرکم جسم کی رفاقت چھوڑ دی تو نواب گرمانی مجھے دلاسا دے کر فوراً اپنے دولت کدہ چلے گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب کرنل میاں نے اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پا لیا تو وہ دوسرے کمرہ میں جہاں میں لاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا' تشریف لائے۔ مجھے پرسا دیا اور میت کو غسل دینے کی اجازت مانگی۔ میں اس وقت تنہا اور غم سے نڈھال تھا۔ عرض کیا کہ بزرگوں کا قول ہے کہ شہید کو غسلِ میت اور کفن کی حاجت نہیں ہوتی۔ اسے اس ہی حالت میں دفن کر دینا چاہئے جس حالت میں اس نے جام شہادت نوش کیا ہو لیکن بہتر ہے کہ نواب صاحب گرمانی سے مشورہ

کرلیا جائے۔ نواب صاحب کو ٹیلیفون کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو اطلاع نہیں دی جاسکتی' وہ کانفرنس میں مشغول ہیں۔ دوبارہ میرے اصرار پر ٹیلیفون کیا گیا لیکن دونوں وقت یہ ہی اطلاع ملی کہ کمرہ کے اندر کوئی نہیں جاسکتا' وہ غلام محمد صاحب کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں۔ بالآخر کرنل میاں تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا: بحثیت ڈاکٹر کے آپ کی کیا رائے ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ غسل دینا ضروری ہے کیونکہ جسم میں خون ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ہے۔ ہم اسے نکال لیں گے تاکہ لاش خراب نہ ہونے پائے۔ شہید قوم کو غسلِ میت دیا گیا۔ اسپتال کے مریض فوجیوں نے نماز جنازہ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم سب نے نو بجے کے قریب نماز جنازہ ادا کی۔ اس کے بعد میں کفنائی ہوئی لاش کے پاس بیٹھ کر اپنے اکابرین کی آمد کا گیارہ بجے رات تک انتظار کرتا رہا اور ان کی تشریف آوری کے بعد ہم لوگ طیران گاہ روانہ ہوئے۔

آہ! ان جان لیوا دو گولیوں کے لگنے کے بعد ان کے چہرۂ روشن پر نہ کرب واضطراب کی کیفیت تھی' نہ تنفس میں غیر معمولی تیزی' نہ ہونٹوں پر لرزش' نہ آنکھوں میں کھچاوٹ۔ وہی باوقار پُر شکوہ چہرہ اور وہی سکون واطمینان موجود تھا جو بقید حیات ہوا کرتا تھا۔ آپ نے درحقیقت نہایت شجاعت ودلیری سے موت کا مقابلہ کیا۔ افسوس راولپنڈی کی سرزمین میں دن کے سوا چار بجے لاکھوں کروڑوں پاکستانیوں کی اُمیدوں کا منور چراغ بجھ گیا۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

اس چراغ کے گل ہونے سے دو معصوم بچے اشرف واکبر یتیم ہو گئے اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کا سہاگ لٹ گیا۔ وہ بیگم جس کے متعلق ان کے شوہر نامدار نے بارہا کہا تھا کہ پاکستان و اسلام کو غیر ممالک میں روشناس کرانے اور پاکستان کے وقار کو بڑھانے میں نیز خود وزیر اعظم کی عظمت وشان کو چار چاند لگانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ دراصل خان لیاقت علی خاں صاحب

ایک بیباک مردِ مومن کی شان سے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ وزیر دفاع کی شیروانی کی بائیں جیب سے جو دل کے قریب تھی، بجائے ریوالور اور پستول کے چھوٹی حمائل شریف سبز کپڑے میں سلی ہوئی برآمد ہوئی جس سے ان کا خدا پر توکل اور اسلام دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ہم نے جب کبھی آپ سے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے لئے کہا تو آپ نے اس کا مذاق اڑایا اور صاف صاف کہا کہ موت کی گھڑی اٹل ہوتی ہے اور جب وہ گھڑی آن پہنچے گی تو کوئی بچا نہ سکے گا۔ ہمارے وزیر اعظم نے حقیقتاً ایک مہاجر کی زندگی بسر کی اور ایک مہاجر کی موت بغیر کوئی اثاثہ چھوڑے مرے۔ بعد میں ان کے بنک اکاؤنٹ سے پتہ لگا کہ وزیر اعظم صاحب جن کا مقروض نہیں بلکہ متمول رئیسوں میں شمار ہوتا تھا' واقعتاً ایک روایتی غریب مسلمان تھے۔ ہندوستان میں ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے' اتنی تھی کہ انہیں کم از کم لکھ پتی ہونا چاہئے تھا لیکن اُنہوں نے اپنے دامن کو لالچ' زر پرستی اور مالی آلائش سے ہمیشہ پاک رکھا۔کئی بھارتی ہندو دوست ان کی ہندوستان کی جائیداد کے بدلے میں اپنی وہ جائیداد دینا چاہتے تھے جو پاکستان میں تھی۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ دو صاحبوں کی پیش کش میرے توسط سے وزیر اعظم تک پہنچائی گئی تھی۔ پہلے صاحب دہلی کے رئیس سرسو بھا سنگھ تھے۔ وہ اپنی لاہور کی جائیداد دے کر دہلی اور مظفر نگر کی جائیداد لینا چاہتے تھے۔ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ جب تک پاکستان میں آخری مہاجر نہیں بس جائے گا' مجھ پر پاکستان کی ایک انچ زمین بھی حرام ہے۔ دوسرے صاحب بھارت کی وزارت زراعت کے سیکرٹری سردار تارا سنگھ تھے جو ممدوٹ ولا میں مقیم تھے اور اپنی لائل پور کی جائیداد دینا چاہتے تھے۔ایسے تمام خواہشمندوں کے لئے صرف ایک ہی مذکورہ بالا جواب ہوتا تھا۔اس طرح اس نیک' راست باز' انصاف پسند اور مخلص قائد کا دامن بے داغ رہا اور وہ اللہ کے پاس دنیوی اعتبار سے خالی ہاتھ چلا گیا۔

آپ نے 14 اگست 1951ء کو یومِ آزادی کے موقعہ پر جہانگیر پارک کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: میرے پاس دولت ہے نہ جائیداد اور میں اس میں خوش ہوں کیونکہ یہ ہی دو چیزیں ہیں جو ایمان میں خلل ڈالتی ہیں۔آپ نے مزید فرمایا تھا: میرے پاس صرف

میری جان ہے جسے میں پہلے ہی اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے وقف کر چکا ہوں اور ضرورت کے وقت اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ واللہ آپ نے اپنی جان اور اپنے پاک خون کی خوب نذر پیش کی۔ قائد ملت لیاقت علی خاں صاحب سے بڑھ کر کوئی دوسرا خوش نصیب انسان نہیں ہوسکتا جس کو ماہ محرم کی تیرھویں تاریخ کو حیاتِ جاودانی نصیب ہوئی۔ اس ماہ میں آپ نے جام شہادت نوش فرما کر سیدنا حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے جلو میں اپنے لئے جگہ محفوظ ومخصوص کرلی۔ لاریب ان کے کارنامے اہالیان پاکستان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتے۔ وہ زندہ ہیں اور تا ابدالآباد زندہ رہیں گے۔

جس کی حکمت پر ہر اک اہل وطن کو ناز تھا
بجھ گئی وہ شمع جس پر انجمن کو ناز تھا
صحن گلشن کی فضا میں کیوں نہ افسردہ رہیں
پھول وہ توڑا گیا جس پر چمن کو ناز تھا

(شہید ملت زندہ باد - پاکستان پائندہ باد)

شہادت کے سلسلے میں سرکاری بیان بھی ملاحظہ کیجئے جو انگریزی زبان میں شائع کیا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

بٹوارے
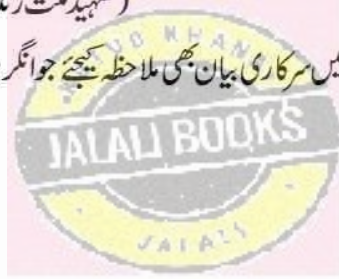
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

17 اکتوبر کو 4 بجے کے قریب اُس شہید کے جسد خاکی کو جسے 16 اکتوبر کو ملٹری ہسپتال میں 9 بجے شب غسلِ میت دے کر سفید کفن میں ملبوس کیا گیا تھا، قبر کی کھردری زمین پر کعبہ کی طرف رخ کر کے لٹا دیا گیا۔ مٹی مٹی سے جا ملی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اور نہ ہے۔ مٹی ہمیشہ مٹی سے ملتی رہی ہے اور تا قیامت ملتی رہے گی۔ ذرا دیکھئے تو مٹی کو مٹی میں ملانا انسان نے کیسے سیکھا اور کس نے سکھایا۔ سورہ المائدہ میں مرقوم ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند ہابیل کو دوسرے فرزند قابیل نے قتل کیا تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مردہ بھائی کی لاش کا کیا کیا جائے۔ وہ سخت فکر و پریشانی میں مبتلا تھے کہ ''پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تاکہ اس کو دکھلا دے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی۔'' انسان کے اس اولین قتل کے بارے میں اللہ فرماتا ہے کہ ''وہ تمام لوگوں کے قتل کے برابر ہے اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خون ناحق کتنا سنگین جرم ہے اور قاتل کی سزا سوائے دوزخ میں جلنے کے اور کچھ نہیں۔ ہاں جس جسد خاکی کو ہم لوگوں نے سپرد خاک کیا' وہ خون آلود تھا اور خون لاریب ایک شہید کا تھا۔ قرآن پاک میں شہید کی تعریف یوں کی گئی ہے:
''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ '' یہ درست ہے کہ ہم نے خاکی پتلے کو قبر کے اندر حفاظت کے ساتھ ضرور بند کر دیا لیکن وہ زندہ ہے

اور اُسے حیاتِ ابدی کی بشارت دی گئی ہے۔

اس طویل داستان غم کے چند اوراق یہاں سے اور وہاں سے پیش کرتا ہوں۔ تسلسل قائم نہ رہ سکے یا تکرارِ مضمون ہو تو میں نہیں بلکہ قوت اظہار اور شدت غم جواب دار ہے۔ اگر کوئی تلخ باتیں زبان پر آ جائیں تو بدنیتی یا گستاخی پر نہ محمول کیا جائے۔ میرا کام تو اپنے ذاتی تاثرات و مشاہدات پیش کرنا و حق گوئی سے کام لینا ہے۔ کسی کی توہین کرنا یا کسی پر گندگی اُچھالنا یا کسی کو بغیر گواہ پڑاوے کے کسی جرم میں ملوث کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ شہید ملت کے چند رفقائے کار یعنی چند اراکین کابینہ اس جانکاہ وقوعہ کے بعد جب کہ میت اسپتال میں رکھی ہوئی تھی، برطانوی اور امریکی روایت کو فوراً تازہ کرنے بیٹھ گئے یعنی ''بادشاہ مر گیا اور بادشاہ زندہ باد۔'' میں جانتا ہوں کہ جانشین کی تلاش اور ان کا یہ فعل کوئی جرم نہیں تھا مگر ان کی یہ حرکت بڑی بھونڈی، دل آزار اور انسانیت کے منافی تھی جو ہر ایک کی نظر میں آ گئی اور لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ ان لوگوں نے اس حادثۂ رُوح فرسا کو وہ اہمیت نہیں دی جو اس ملک کے اتنے بڑے رہنما کے اچانک آنکھ بند ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر یہ کانا پھوسی، حصہ بخرے، طویل نشست کانفرنسیں وزیراعظم کے سپرد خاک کرنے کے بعد یا موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر فاتحہ سویم کے بعد ہوتیں تو بہت انسب ہوتا۔ اس بدذوقی اور عاقبت نااندیشانہ حرکت نے نتیجتاً لوگوں کے منہ میں کڑوا مزہ اور ان کے دل میں بیرحمی کی شکایت کی ایک کسک پیدا کر دی۔ غالباً میں سب سے زیادہ اس درد کا اس لئے شکار ہوا کہ میں نواب زادہ صاحب کے رفقاء سے جو دوستی اور جانثاری کے دعوے کرتے اور ہمیشہ دم بھرتے تھے، ایسی غیر ہمدردانہ حرکت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو ویسے ہی ہوا کہ صدر امریکہ جان کینیڈی کا دم اُکھڑا اور فوراً وائس پریذیڈنٹ مسٹر لنڈن جانسن کے ہوائی جہاز سے اُن کی صدارت کا اعلان ہوا لیکن یہ تو دونوں برطانوی اور امریکی روایتیں سربراہِ مملکت کے متعلق ہیں جس کی رُو سے یہ کارروائی لازمی ہے مگر ہمارے معاملہ کو ان روایتوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صرف ایک جگہ پُر کرنی تھی جو وقت اور روایات کی قید و بند سے آزاد تھی۔

گو ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

(خاطر غزنوی)

اگر ہمارے ملک کا اس قسم کا کوئی آئین ہوتا یا ہمارے ملک کا کوئی بادشاہ ہوتا تو اس روایت کا ضرور اطلاق ہوسکتا تھا لیکن یہاں تو وزیراعظم کی کرسی بہ نشانۂ دو گولی خالی ہوئی تھی۔ پہلے بھی یہ کرسی جب وزیراعظم بیرون ملک کے دورہ پر گئے تھے تو عارضی طور پر کئی بار خالی ہوئی تھی اور عارضی طور پر کسی سینئر رفیق کار سے پُر کردی گئی تھی۔ اب بھی صرف وزیراعظم ہٹے تھے لیکن سب اراکین کابینہ اور گورنر جنرل موجود تھے۔ اگر نئے وزیراعظم کی تقرری مقتول وزیراعظم کی تجہیز و تکفین کے بعد ہوتی تو میں پوچھتا ہوں کہ اس تاخیر سے کیا آسمان ٹوٹ پڑتا' کیا زمین پاکستان کو (خدا نہ کرے) نگل جاتی۔ کیا دشمنانِ اسلام پاکستان پر حملہ کرکے اسے ہڑپ کرجاتے۔ میں اتنے طویل عرصہ کے بعد آج بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ قائداعظمؒ کے جانشین کی میت گھر میں رکھی ہے۔ عزیز و اقارب اور تمام قوم گریہ و بکا میں مبتلا ہے لیکن ان کے قریبی اور حقیقی رفقائے کار نا گوار عجلت کے ساتھ جانشین کے انتخاب میں جیسے کہ ان صاحبوں کی خود موت کا سوال آن پڑا ہو بغیر کسی توقف کے متواتر سرگرداں تھے۔

کرنل اب جنرل میاں کے فوراً اعلان کے بعد کہ وزیراعظم کی روح پاک جسد خاکی کو چھوڑ کر پرواز کرگئی ہے' دو صاحبوں نے یعنی غلام محمد صاحب جو پنشن پر جانے سے قبل اپنی رخصت کے دن روالپنڈی والے اپنے عزیز ڈی۔ ایم ملک صاحب کے گھر گزار رہے تھے اور نواب مشتاق احمد خاں گرمانی وزیر امور کشمیر جو پنڈی میں مقیم اور موجود تھے' فوراً کانفرنس کرڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی دو رکنی نشست میں گورنر جنرل اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں کے لئے دو آدمیوں کا انتخاب کرلیا گیا۔ پہلے عہدہ پر خواجہ ناظم الدین صاحب کو برقرار رکھا گیا اور قلمدانِ وزارت عظمیٰ غلام محمد صاحب کو سپرد کرنے کا طے کیا گیا۔ اس پہلی غیر ملتوی شدہ کانفرنس

کی دوسری باقاعدہ نشست گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین صاحب کی نتھیا گلی سے پنڈی تشریف آوری پر شروع ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ اس سہ رُکنی نشست میں طول طویل بحث وتمحیص کے بعد خواجہ ناظم الدین صاحب نے پہلے تیار کردہ خاکہ کا تختہ اُلٹ کر یہ منوالیا کہ غلام محمد صاحب گورنر جنرل اور وہ خود وزیراعظم ہوں گے۔ اس طرح یہ ژولیدہ مسئلہ گرمانی صاحب کی صلح جویانہ مداخلت سے کم از کم ان دو اُمیدوار صاحبوں کے درمیان بڑی حد تک طے ہوگیا۔ ہمیں اس بحث میں اُلجھنا نہیں ہے کہ یہ طریقہ آئینی تھا یا غیر آئینی؟ کیا یہ تین صاحبان جن میں سے دو غرض مند تھے، مسلم لیگ پارٹی اور قومی اسمبلی کو نظرانداز کرکے ایسی ناجائز کارروائی کرنے میں حق بجانب تھے؟ بعد میں گورنر پنجاب سردار عبدالرب صاحب نشتر جو اس سانحۂ عظیم کی خبر سن کر ہی پنڈی پہنچے تھے کہ براہِ راست کانفرنس میں فوراً طلب کئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تیسری نشست میں ان تین صاحبوں نے اُس اہم فیصلے کو جو دوسری نشست میں طے کرکے صیغۂ راز میں رکھا اور وزارتِ عظمیٰ کی کرسی یوں ہی جھوٹ موٹ سردار عبدالرب صاحب نشتر کو پیش کی گئی تاکہ طے شدہ خفیہ کارروائی طشت از بام نہ ہوجائے۔ دوسرے دن علی الصباح میت کے کراچی پہنچنے کے فوراً بعد گورنمنٹ ہاؤس میں پوری کابینہ کا اجلاس شروع ہوا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ کراچی میں شہادت کی خبر ملنے کے فوراً بعد جو وزراء موجود تھے، اُنہوں نے وزارتِ عظمیٰ کے لئے غیر رسمی باہمی مشورے شروع کردیے اور یہ سلسلۂ گفت وشنید میت کے پہنچنے تک برابر جاری رہا۔

آخری دیدار کے لئے ہزاروں لوگ آتے جاتے رہے اور وقت تیزی سے گزرتا رہا لیکن کابینہ کے اجلاس میں ایک دوسرے کو ریوڑیاں بانٹنے اور راولپنڈی کے فیصلے منوانے میں اتنی زیادہ تاخیر ہوئی کہ عوام چیخ اُٹھے۔ گرمی قسم کھائے بیٹھی تھی کہ میں آلۂ حرارت کے پارہ کو انتہا تک پہنچا کر ہی دم لوں گی۔ دو گولیوں کے گہرے زخم شدت گرمی سے جسم کے اندر متواتر رس رہے تھے اور کچھ خون ناک کی راہ سے بہہ رہا تھا۔ عطرپاشی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد برابر کی جارہی تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرہ میں ایک بجے کے قریب لاش کو منتقل کیا گیا اور کئی من برف کی سلیں

نیچے اور آس پاس رکھ کر برقی پنکھوں کی مدد سے اُسے صحیح وسالم رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ کانفرنس جاری تھی اور کابینہ کے جاں نثار رفقاء اور گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں میت کیسے اُٹھائی جاتی۔ آخر کار نواب زادہ کے خاص وقریبی دوست کرنل جعفر نے جو صبح ہی سے لاش کے پاس میرے پاس موجود تھے اور لیلیٰ ٔ وزارت کے مجنونوں کے تماشے میرے ساتھ دیکھ اور سُن رہے تھے، تنگ آ کر اور بحیثیت ڈاکٹر تمام نازک حالات کا جائزہ لے کر گورنمنٹ ہاؤس میں آخری پیغام بھجوایا کہ اگر آپ لوگ فوراً نہیں آتے ہیں تو ہم میت کو لے کر دفن کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ غالبًا اب بانٹنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا تھا اور حسب منشا تمام معاملات طے ہو گئے تھے اس لئے یا ہماری خطرناک دھمکی کے پیش نظر ہمارے اکابرین آن پہنچے اور شہید ملت کا آخری جلوس ان کی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا ؎

سلام اُس قتیل پر، جو قوم کی سپر بنا
سلام اُس شہید پر وطن میں جس کا خون بہا
سلام اُس پہ قوم کا
جو ملک پر فدا ہوا

(سوز شاہجہاں پوری)

شدتِ غم سے لوگوں کے دماغ ماؤف ہو گئے تھے۔ ان کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور کس جرم کی پاداش میں ہمارے ہر دلعزیز رہنما اور بہی خواہِ قوم وملک وزیر اعظم کو اس بیدردی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جب لوگوں کا غم ذرا ہلکا ہوا اور انہیں فرصتِ فکر ملی اور اخبارات میں چہ می گوئیوں اور افواہوں نے خالی الذہن لیکن غمزدہ دماغوں میں ہلچل پیدا کی تو اُنہوں نے ٹھنڈے اور کھلے دل ودماغ سے سوچ بچار شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ شہید ملت کو کسی گہری سازش کے تحت قتل کیا گیا اور نوبت بہ اینجا رسید کہ لوگ بغیر کسی مبینہ شہادت کے سازشیوں کے نام بھی گنوانے لگے۔ آپ ہی انصاف فرمائیے کہ شک وشبہ کی بنا پر بغیر کسی عینی یا

کم از کم قرائینی شہادت کے کسی کو اس بیسویں صدی میں سولی پر تو نہیں چڑھایا جا سکتا لیکن اس مسلمہ قول کی ہمہ گیری سے بھی کوئی بالکل چشم پوشی نہیں کر سکتا جس کی رو سے کہا گیا ہے کہ ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔'' بہر حال نکیرین کے دفتر میں قاتلوں اور سازشیوں کے نام درج ہوں گے جنہیں عالم الغیب خوب جانتا ہے۔

اس ہی اثناء میں نئے گورنر جنرل اور نئے وزیر اعظم کے ناموں کا اعلان اور تقریب حلف وفاداری کی خبریں اور تصاویر شائع ہوئیں۔ الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل کی گدّی کو برضا و رغبت خود چھوڑ کر وزیر اعظم بن بیٹھے اور غلام محمد صاحب جنہیں وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے ان کی شدید علالت کی وجہ سے وزیر خزانہ کے عہدہ سے شہادت سے چند دن قبل سبکدوش کر کے رخصت پر راولپنڈی جانے کی اجازت دے دی تھی اور جنہیں خاکسار نے وزیر اعظم کی طرف سے کراچی چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر خیبر میل میں سوار اور رخصت کر کے خدا حافظ کہا تھا' گورنر جنرل کی خالی گدّی پر براجمان ہو گئے۔ ان کی اس بیمار اور نامعقول تقرری نے تو لوگوں کو حیرت سے انگشت بدنداں کر دیا لیکن خواجہ صاحب کی تخت سے دست برداری اور کمتر عہدہ کی قبولیت کو ان کی حب الوطنی، منکسر المزاجی اور ایثارِ نفسی پر محمول کیا گیا۔

ان دونوں بزرگوں کے متعلق لب کشائی سے قبل یہ عرض کر دوں کہ یہ ہر دو میرے لئے واجب التعظیم تھے اور تاحین حیات رہیں گے۔ ان دونوں میں ایسی خوبیاں اور کمالات تھے کہ شاذ و نادر ہی کسی انسان میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھنے کے لئے قلم کو جنبش دے رہا ہوں۔ وہ بڑے متقی و پرہیزگار اور احکامِ خداوندی کی تعمیل میں یعنی صوم و صلوٰۃ کے معاملہ میں سب سے آگے تھے۔ اسلامی اخوت اور رواداری برتنے میں بے مثل انسان اور سادگی و عاجزی میں بزرگانِ سلف کا بہت اچھا نمونہ، مہمان نوازی و خوش خلقی میں یکتائے زمانہ، دل آزاری اور نقصان رسانی ان کی فطرت میں نہیں تھی۔ گورنر جنرل کے عہدے کے لئے چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی اُن سے بہتر اور موزوں انسان نہیں مل سکتا تھا اور یہ ہی

سب سے بڑا سبب تھا کہ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد قائد ملت نے اُن کا اس عہدۂ جلیلہ کے لئے انتخاب کیا تھا۔

یہ بھی یاد رہے کہ خواجہ صاحب کی بحیثیت گورنر جنرل تقرری سے قبل کچھ رائے زنی ضرور ہوئی تھی۔ کسی نے کہا کہ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کو گورنر جنرل مقرر کرنا چاہئے تھا لیکن رائے دینے والے بھول بیٹھے تھے کہ ہز ہائی نس ہندوستانی رعایا اور بھوپال کے تاج وتخت کے مالک تھے۔ وہ کیونکر اس تقرری کو قبول کرتے اور انہیں کس طرح یہ پیش کش کی جاتی۔ یہ بات کچھ زیادہ پھیلی نہیں اور بہت جلد ختم ہوگئی۔ دوسرا خیال پہلے خیال سے زیادہ پسند کیا گیا۔ قائداعظمؒ سے بے پناہ عقیدت اور جذباتِ غم کی فراوانی میں بہنے والے چند لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس عہدۂ جلیلہ کے لئے محترمہ فاطمہ جناحؒ سے بڑھ کر کوئی دوسرا موزوں اُمیدوار نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وہ قائداعظمؒ کی چہیتی بہن ہیں جنہوں نے اپنے بڑے بھائی کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال میں اپنی زندگی تمام کردی اور بھائی کے فیضِ قربت سے ایک اعلیٰ سیاست دان، بہترین مدبر اور عمدہ منتظم بن گئی ہیں۔ اس زمانہ میں یہ افواہیں بھی گرم تھیں اور چند معتبر لوگوں نے بھی کہا کہ محترمہ کی بھی یہ ہی خواہش تھی اور ہوسکتا ہے کہ جس کی تکمیل نہ ہونے پر بتقاضائے فطرتِ انسانی ان کے دل میں وزیراعظم کی طرف سے کچھ میل آ گیا ہو لیکن وزیراعظم نے کبھی بھی ان کے ادب واحترام میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنے دیا۔ قائداعظمؒ ٹرسٹ کے سلسلے میں وزیراعظم ہمیشہ کئی مرتبہ مشورہ کے لئے محترمہ سے وقت لے کر ان کے دولت کدہ فلیگ اسٹاف ہاؤس گئے۔ محترمہ کے شایانِ شان اسٹاف اور پولیس پہرہ وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا۔ قائداعظمؒ کی زندگی تک جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، وہ تنہا ملک رانی اور قیادتِ قوم کے ذمہ دار تھے لیکن ان کی رحلت کے بعد قیادت اور حکمرانی کا نقشہ ہی دگرگوں ہوگیا تھا' لہٰذا اس بھاری بوجھ کو اٹھانے کے لئے مشرقی ومغربی پاکستان کا عملی تعاون اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے روح اور جسم کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے غیر جذباتی وزیراعظم نے اسلامی مساوات اور

ملکی سالمیت کے پیش نظر خواجہ صاحب کو گورنر جنرلی کے عہدہ کے لئے نامزد کیا۔

سچ پوچھئے تو خواجہ صاحب نے اپنے کو اس انتخاب کا بالکل اہل ثابت کر کے دکھلا دیا لیکن وہ اتنے میاں آدمی تھے کہ چند خود غرض اور بدخواہ انسان نواب زادہ صاحب کی ملک سے غیر حاضری کے موقعہ پر ان کے کانوں میں زہر گھولا کرتے تھے کہ گورنر جنرلی میں کیا رکھا ہے آپ کو تو وزیر اعظم بننا چاہئے تھا تاکہ آپ بااختیار حاکم ہوتے۔ آپ نے دیکھا کہ اُس نیک انسان کے دل میں یہ شوق پیدا کیا گیا جو برابر پلتا رہا اور بالآخر یہ شوق بہت مہنگا پڑا یعنی غلام محمد صاحب کے زمانہ میں ان کی تباہی و بربادی اور سیاسی موت کا باعث ہوا۔ کاش وہ اپنی جگہ پر قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے تو وہ کبھی بھی یہ روزِ بد نہ دیکھتے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی جگہ دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں چھین سکتی تھی اور وہ بجائے دُکھ اور بدسلوکی سہنے کے سکھ اور چین کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ اللہ ان کو اپنی جوارِ رحمت اور شفاعتِ رسولؐ عطا کرے۔ آمین۔

اب اُس ہستی کے متعلق خامہ فرسائی کرنا چاہتا ہوں جسے بچپنے میں لاڈ سے ''گاما'' کہا جاتا تھا لیکن یہ صاحب علیگڑھ پہنچے تو پنجاب کو چھوڑ کر یوپی کے باشی ہو گئے اور وہاں ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ علیگڑھ کی تعلیم، یوپی کی تہذیب اور علی برادران، حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب، شعیب قریشی صاحب، عبدالرحمٰن صدیقی وغیرہ کی رفاقت نے انہیں وہ جلا دی کہ صف اول کے نیشنلسٹ اور مہذب ترین تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ اُن کے ماہر مالیات ہونے کے اعتراف میں ایڈیٹر ڈان الطاف حسین صاحب نے اپنے ایک اداریہ کی سرخی ''مالیات کا جادوگر'' رکھی تھی۔ اُنہوں نے پاکستان کے خالی خزانہ اور پاکستان کی ناداری کو اپنی بھرپور شخصیت اور اقتصادیات و مالیات پر غیر معمولی عبور کی وجہ سے خوان پوش بن کر پاکستان کا فاضل بجٹ پیش کیا تھا۔ ہمارا ملک اُن کے ان کارناموں کو کیسے بھول سکتا ہے۔ وہ بڑے دل گردہ کے مالک تھے اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں وہ بہت بے باکی سے اپنے سے بڑے انگریز عہدہ داروں سے ٹکر لیتے تھے۔ وہ حق پر ہوتے

تھے؛ اس لئے کوئی اُن کا بال تک بیکا نہ کر سکا۔ اُنہوں نے اپنی ملازمت کے زمانہ میں سینکڑوں ہی مسلمانوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں دیں۔ دورانِ جنگِ عظیم سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں رہ کر کتنے ہی مسلمانوں کا بھلا کیا۔ وہ بڑے یار باش اور دوست نواز تھے۔ دوستوں کو نوازنے کے لئے وہ اکثر قواعد کی حد بندی کو توڑ دیتے تھے۔ ویسے وہ منہ پھٹ بھی بہت تھے۔ حسن فیروز صاحب سے جوان کے ایک بے تکلف دوست رہے ہیں؛ پوچھئے کہ جب گالی دینے پر اُتر آتے تھے تو ایک سیر وزنی گالی دینے سے بھی نہیں چوکتے تھے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہنس کر گالی کھانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ الحاصل وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میرے عزیز دوست اور محسن تھے۔ وہ ہمیشہ صاف گوئی پسند کرتے تھے۔ جب وزیر اعظم لاہور میں مقیم تھے؛ وہ وہاں کراچی سے کابینہ کے اجلاس کی شرکت کے لئے تشریف لائے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو ایک دم مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ کیا پاکستان کا مطالبہ درست تھا؟ میں نے ایک لمحہ کے لئے اُنہیں حیرت سے دیکھا اور جواب دیا کہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو غلام محمد صاحب ہندوستان میں وزیر خزانہ نہ بنتے۔ وہ جھینپتے ہوئے مسکرا کر چپ ہوگئے۔ نواب زادہ صاحب کی شہادت کے بعد اُنہوں نے جو کردار ادا کیا، اُسے لوگوں نے بہت سراہا۔ اُنہوں نے بیگم رعنا لیاقت علی خان صاحبہ کی تاحین حیات پنشن؛ دونوں بچوں کا پچیس سال کی عمر تک تعلیمی وظیفہ؛ بیگم صاحبہ کی رہائش کے لئے باتھ آئی لینڈ میں سرکاری مکان جس کا نام ''قائد ملت ہاؤس'' ہے کی منظوری دے کر بے سہارا؛ بے زر؛ بے گھر، مصیبت زدہ خاندان کی فوری پریشانیاں دُور کر دیں۔ ''قائد ملت ہاؤس'' کا نام زبان پر آیا تو دل میں معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ جب موت مکین کی آنکھیں وقتِ مقررہ پر آ کر موند دے گی تو اشرف میاں اور اکبر میاں کو سر چھپانے کے لئے کراچی میں کوئی چھپر بھی میسر نہیں ہوگا، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جو مکان نواب زادہ صاحب کے نام سے موسوم ہے، وہ معمارِ پاکستان شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب کی دلدادہ جاں نثار بیگم رعنا لیاقت علی خان کو مستقلاً دے دیا جائے تا کہ اشرف میاں اور اکبر میاں اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا سکیں کہ ان کی دِلّی کی کوٹھی

''گلِ رعنا'' چھن گئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ انہیں اُس کے معاوضہ میں اور معمارِ پاکستان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے'' قائدملت ہاؤس'' مل گیا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غلام محمد صاحب جیسے زیرک' ہوشمند اور دوراندیش انسان نے اپنی قابل رحم' گری ہوئی صحت کے عالم میں اور جو تیزی سے برابر گرتی ہی جارہی تھی، ملک رانی کا ناقابل برداشت بوجھ کیوں اٹھایا؟ کیا وہ'' مرد چوں پیر شود حرص جوان می گردد'' کا ذہنی شکار ہوگئے تھے؟ کیا اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے پیرومرشد کے توسط سے صرف دنیاوی جاہ وجلال ہی مانگا تھا؟ معلوم نہیں اُنہوں نے کیوں اتنے سارے جلیل القدر کارناموں کے بعد اپنے لئے گورنر جنرلی تجویز کر کے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا لیا؟ کوئی اس کا کیا جواب دے سکتا ہے۔ اللہ کی مصلحتوں اور رازوں کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ اے ارحم الراحمین! آپ ہم سب کی اور ان کی کمزوریوں' لغزشوں' خطاؤں اور گناہوں کو معاف کر دیجئے اور انہیں اور ہمیں بہشت بریں میں جگہ عطا کیجئے۔ آمین۔

زمانۂ بعد کے حالات نے ایک معنی خیز راز کا انکشاف کیا جو آپ کی معلومات کے لئے پیش ہے۔ غلام محمد صاحب اور خواجہ ناظم الدین صاحب کا یہ گٹھ جوڑ مجموعی طور پر دونوں کے لئے تباہ کن اور ملک کے لئے آئین شکن بربادی اور آمریت کا پیش خیمہ ہوا کیونکہ عہدہ سنبھالتے ہی دونوں میں اقتدار اور اختیارات کی گتھم گتھا شروع ہوگئی اور اس وقت تک رسہ کشی جاری رہی جب تک غلام محمد صاحب نے خواجہ صاحب کی موٹر کار اور سرکاری رہائش گاہ سے پاکستانی پرچم اور جھنڈی نہ اُتروالی' ٹیلیفون نہ کٹوا دیا اور ان کو نظر قید نہ کر دیا۔

بدنصیبی یہ تھی کہ غلام محمد صاحب بحیثیت گورنر جنرل اُن تمام اختیارات کو تنہا استعمال کرنا چاہتے تھے جو قوم نے قائداعظمؒ کو ان کی بے مثال مسلمہ قیادت اپنے اعتمادِ کلی اور ان کی قدرت کی طرف سے عطا کردہ غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر سونپی تھی جس کے وزیراعظم نوابزادہ ہمیشہ دل سے معترف رہے اور قائداعظمؒ کو ہمیشہ ان کی حیات میں اور ممات کے بعد اپنے سے بالاتر سمجھا۔

غلام محمد صاحب یہ بھول بیٹھے کہ ان کا اور قائداعظمؒ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔'' دوسری طرف خواجہ صاحب نے یہ ستم ظریفی کی کہ جب وہ گورنر جنرل تھے، اس وقت وزیراعظم نواب زادہ جس طرح صاحبِ اختیار تھے' وہ بھی اُس ہی طرح صاحبِ اختیار وزیراعظم بننا چاہتے تھے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ غلام محمد صاحب مدمغ گورنر جنرل جو بھولے سے بھی اپنی ناک پر مکھی کے بیٹھنے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، صرف نمائشی سربراہ بن کر رہنا گوارا کرتے۔ غلام محمد صاحب باوجود چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی نمایاں دقتوں کے مزاجاً و فطرتاً اس محکومانہ پوزیشن کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔

خواجہ صاحب نے گورنر جنرل کو ہٹانے کے لئے ایک ترکیب کی۔ یعنی اُنہوں نے جب وہ دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے تو آئین کے تحت ملکۂ انگلستان سے غلام محمد صاحب کی برخواستگی کی پُرزور سفارش کی جسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت ہمارا ملک رسمی طور پر تخت و تاجِ برطانیہ کے زیرِنگیں تھا۔ حالی موالیوں نے جب یہ وحشت انگیز خبر غلام محمد صاحب کو پہنچائی تو وہ مارے غصہ کے پارے کی طرح تھرتھر کانپنے لگے اور یہاں تک آگ بگولہ ہوئے اور ان کے سینہ میں آتشِ انتقام ایسے زوروں سے بھڑکی کہ انہوں نے تہیہ کرلیا کہ وہ خواجہ ناظم الدین صاحب کو ایسا سبق سکھلائیں گے کہ وہ مرتے دم تک سر نہ اُٹھا سکیں۔ کاش یہ جذبۂ انتقام خواجہ صاحب کی ذات تک رہتا لیکن غلام محمد صاحب نے انتقام کی پیاس کو بجھانے کے لئے ملک کے آئین کی دھجیاں بکھیر دیں اور اسے معطل کر کے رکھ دیا جس کا خمیازہ قوم آج تک بھگت رہی ہے حالانکہ یہ درست ہے کہ اس غیر آئینی کارروائی کو آئینی جواز کا آئینی فتویٰ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے دیا جسے پاکستانی قوم کو بغیر پس و پیش کے تسلیم کرنا پڑا۔

بالآخر بیچارے خواجہ صاحب باوجود ہر دلعزیز اور جمہوری وزیراعظم ہونے کے اپنے مفلوج لیکن تلوار کی دھار سے زیادہ تیز زبان رکھنے والے اور بھالے کی تیز نوکدارانی سے زیادہ

گہرائی میں جانے والے دماغ کے گورنر جنرل سے بُری طرح پسپا ہوگئے اور کرایہ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگئے لیکن آفرین ہے اُن پر کہ وہ غلام محمد صاحب کی وفات کے بعد ان کی تدفین میں شریک ہوئے۔

نواب زادہ صاحب کی شہادت کے سلسلے میں تین ایسے سوالات اُٹھائے گئے جو ہر کس وناکس کے دماغ میں موجود ہیں اور آج تک ان کا اطمینان بخش جواب نہیں ملا اور نہ آئندہ کوئی اُمید ہے کیونکہ وقت بہت گزر گیا ہے۔ اخباروں کی رپورٹ اور اسمبلی میں سوال و سرکاری جواب سے ظاہر ہے کہ ریکارڈ اور مثلیں دفتر سے غائب ہیں۔ عدالتی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر ہوا۔ غیر ملکی سراغ رسانوں نے بھی بہت اُلٹ پلٹ کی۔ اعلیٰ ملکی پولیس نے بھی چھان بین کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہاڑ ضرور کھودا گیا لیکن ضرب المثل چوہیا بھی نہیں نکلی۔ غواص نے عمیق دریا میں غوطہ لگایا لیکن جب پانی کی سطح پر برآمد ہوا تو اپنی دونوں خالی ہتھیلیاں دکھلا دیں۔ سب سے بڑی اسلامی مملکت کا ہر دلعزیز وزیر اعظم رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن کے چار بجے جب درختوں کے سایہ پوری طرح دراز نہیں ہوئے تھے اور آفتاب کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی کہ ایک بدنہاد روسیاہ نے وزیر دفاع پر تابڑ توڑ دو گولیاں چلائیں اور پاکستان کی روشن شمع کو آناً فاناً گل کر دیا۔ اس نمبر ایک دشمنِ پاکستان کو کانپور کے ایک مہاجر قصاب پہلوان نے دبوچ کر بے دست و پا کر دیا تھا۔ اس طرح قاتل بغیر کسی خراش کے زندہ صحیح و سالم قبضہ میں آ گیا اور اس کے زندہ بچ جانے کے ساتھ وجہِ اقدامِ قتل، قتل و سازش کے تمام ثبوت بھی حفاظت کے ساتھ ہاتھ لگ گئے تھے۔ اس قابلِ ستائش کارروائی سے قاتل کا دار پر چڑھنا اور سازشیوں کا ارتکاب جرم میں ماخوذ ہونا اور سزا پانا یقینی ہو گیا تھا لیکن جو نقشہ پہلے سے بنایا گیا تھا، غالباً اس کی رُو سے قاتل کا فوراً پتہ کاٹ دیا گیا۔ وہ غیر ملکی تھا۔ اُس دوزخی کا پاکستان میں کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا جو اُس کی موت پر دو آنسو بہاتا۔ وہ صرف اس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا کہ دو گولیاں کامیابی کے ساتھ نشانہ پر چلا کر بڑا انعام پائے۔ انعام دینے کا وعدہ تو صرف لالچ دینے اور قتل کرنے کے لئے آمادہ کرنا تھا۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ انعام کی کچھ پیشگی رقم ارتکاب جرم سے پہلے ادا کر دی گئی تھی جو اُس کے جیب سے جامہ تلاشی کے بعد برآمد ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ کس چالاکی سے قاتل کو جو زمین پر اوندھے منہ مہاجر بھائی کی مضبوط گرفت کی بدولت لاچارگی کے عالم میں پڑا تھا، ایک پولیس آفیسر نے دو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا کہ نہ بانس رہے اور نہ بجے بانسری۔ ہم کیسے مان لیں کہ شرکائے جلسہ نے آپے سے باہر ہو کر اُسے سزائے موت دی یا وہ اتنا خطرناک ہو گیا تھا کہ اُسے گولی مارنے کے سوا مفر نہیں تھا۔ آپ قاتل کی بے بسی کو دیکھ چکے کہ وہ جسمانی طور پر کسی خطرناک اقدام کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ آپ کی نظر سے اُس سانحۂ عظیم کی تصاویر گزری ہوں گی جس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ گولی چلنے کے بعد جلسے میں وہ بھگدڑ مچی کہ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے صوفوں اور کرسیوں کے پیچھے مردوں کے جیسے دبے پڑے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ جوشِ انتقام سے اندھے ہو گئے تھے اور ان لوگوں نے خود قاتل کو شدید زخمی کر کے موت کے گھاٹ اُتارا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پولیس نے مشتعل ہجوم سے قاتل کو بچانے کے لئے کیا کارروائی کی؟ میں تو بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مجھ جیسے لاکھوں بلکہ کروڑوں پاکستانیوں کا دل اور عقل سلیم کہتی ہے کہ ایک بڑی گہری سازش کے تحت وزیراعظم کو صفحۂ ہستی سے مٹایا گیا۔ ابھی تک تو ہمیں یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ ہم غیر ملکیوں کی بری عادتیں سیکھتے ہیں لیکن ہم نے استعجاب کے ساتھ دیکھا کہ امریکہ نے ہماری تقلید کر کے اپنے صدر جان' ایف کینیڈی کو گولی کا نشانہ بنا کر نہ صرف قاتل کو گولی ماردی بلکہ شہادت' ثبوت اور سازش کو بھی جیسا کہ ہمارے یہاں ہوا' گولی ماردی گئی۔ آپ کسی بھی زاویے سے دیکھیں، سیاسی قتل کے معاملہ میں آپ کو دنیا گول ہی نظر آئے گی۔ اسی طرح آپ اس خونِ ناحق کو جیسا کہ ناخن گوشت سے جدا نہیں ہو سکتا، سازش سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔

اس بے درد قتل کی تحقیقات کئی اقساط میں عدم دلچسپی اور عدم توجہ کے ساتھ کی گئی۔ جن بہت سے لوگوں کو مددگار بنایا گیا تھا، وہ دیگر کاموں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ یہاں تک

کہ اس اہم تحقیقات کے لئے ان لوگوں کو جتنا وقت دینا چاہیے تھا، وہ نہ دے سکے۔ اس سہمی ہوئی، ٹھٹکتی ہوئی اور خانہ پری کرنے والی کارروائی سے مجھ جیسے لاکھوں پاکستانی صرف غیر مطمئن ہی نہیں بلکہ نالاں تھے اور ہیں۔ ہر شخص کا دوامی مطالبہ اور دل کی پکار تھی اور جب تک دل حرکت کرتا رہے گا، رہے گی کہ سازشیوں کا کھوج لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ وقت بہت گزر گیا ہے اور سرکاری مثلیں غائب کرادی گئی ہیں اور چند اہم دستاویزات جو آئی جی اسپیشل پولیس مرزا اعتزاز الدین احمد صاحب کی تحویل میں تھے اور جن کی رو سے تحقیقات اور سراغ ملنے میں مدد مل رہی تھی، وہ ہوائی حادثہ کے نذر ہو گئے گویا سانپ نکل گیا، اب لکیر پیٹا کرو۔ یہ دیکھنے میں آیا اور اخباروں نے بھی بہت چیخا چلایا کہ جو افسر جائے وقوع پر موجود تھے، اُنہوں نے اپنے فرائض ٹھیک طور پر ادا نہیں کئے اور ان کی غفلت اور چشم پوشی سے اتنا بڑا سانحہ ہوا۔ اگر ان کی آنکھیں صرف نیم وا بھی ہوتیں تو قوم کو وہ منحوس دن دیکھنا نہیں پڑتا۔ یہ ضروری تھا کہ ان افسروں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی لیکن اس کے برعکس ان کی سرپرستی کی گئی اور ترقی دے کر نوازا گیا۔ ظاہر ہے کہ غیر ملکی تحقیقاتی افسروں کو ہمارے دُکھ بھرے معاملہ سے کوئی بہت گہری دلچسپی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو آئے، دفتر میں براجمان ہوئے، مثلیں جو دستیاب تھیں یا انہیں دی گئیں، انہوں نے ان کے اوراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔ بہت سی اُلٹی اور تھوڑی سیدھی باتیں کیں۔ اپنی فیس اور راہ خرچ وصول کیا اور یہ گئے وہ گئے۔ بھلا یہ لوگ کیا سراغ لگاتے۔ وہ تو ہماری اشک شوئی کے لئے بلائے جاتے تھے اور اپنی ناقابل قبول رائے دے کر چلے جاتے۔ امریکہ نے اپنے سراغرسانوں کی خدمات اس معذرت کے ساتھ پیش نہ کیں کہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات تحقیقات کے بعد ممکن ہے کہ کشیدہ ہو جائیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب زادہ صاحب کی شہادت کے فوراً بعد کئی پنشن یافتہ مہاجر سی۔ آئی۔ ڈی افسروں نے اپنی اعزازی خدمات پیش کی تھیں اور معاون کی حیثیت سے بھی کام کرنے کے لئے رضامند تھے۔ سب کے نام تو یاد نہیں رہے لیکن جن تین صاحبوں کے نام یاد ہیں، وہ خان بہادر محمد حسام الدین صاحب،

خان بہادر نیاز احمد خان صاحب اور خان صاحب سید ولایت حسین صاحب تھے۔ ان تینوں صاحبوں کی حسنِ کارکردگی کی وجہ سے انہیں سی پی و برار سے باہر ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں جہاں صوبائی پولیس تفتیش میں ناکام ہوجاتی تھی، وہ معاملے ان کے سپرد کئے جاتے تھے اور اللہ انہیں کامیاب کرتا تھا۔ کہا گیا کہ ان کی خدمات کو حاصل کرنے سے پاکستان سی آئی ڈی کے وقار کو ٹھیس لگے گی اور قابل افسروں کی اہلیت پر دھبہ آئے گا۔ چنانچہ اعزازی خدمات پیش کرنے والے اپنے انسانی، ملی اور قومی جذبات کو مجروح کرکے نامراد گھر لوٹ گئے اور اس طرح مخلص تفتیش کنندگان کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی ہمارے ملک میں بہت سے ایثار پیشہ، وفادار اور بہی خواہانِ ملک پولیس افسر موجود ہیں جو گڑے مردے اُکھیڑ کر قتل اور سازش کے پردے چاک کرسکتے ہیں۔

یہ امر بھی ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ مسٹر ایم اے عبداللہ نے جو نواب زادہ کے زمانہ میں کراچی کے پولیس چیف تھے، بذریعہ ایک اخباری بیان جو اخبار ''ڈان'' میں 13 نومبر 1962ء کو شائع ہوا تھا، گزارش کی تھی کہ اگر ان کو جان کی امان ملے اور ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے تو وہ تین مہینہ کی قلیل مدت میں قتل کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عبداللہ صاحب کی اس پیش کش کو جو پاکستان کے سابق پولیس افسر تھے، پیروں تلے روند دیا گیا ہوگا یا ان کے بیان کو نذرِ آتش کردیا یا ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا ہوگا اور اس طرح سازش و قتل کا پتہ لگانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

اب وزیراعظم کے اللہ پر توکل کو دیکھئے۔ ایک عرصہ سے گمنام خط موصول ہورہے تھے جن میں بالعموم وزیراعظم کو قتل کی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ کبھی بم سے اُڑا دینے، کبھی گولی کا نشانہ بنانے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ کچھ خباثت پسندوں کے خطوط گالی گلوچ سے پُر ہوتے تھے۔ یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ وزیراعظم صاحب سے میرا براہِ راست تعلق تھا۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی افسر نہیں تھا۔ وزیراعظم صاحب کی ذاتی اور غیر سرکاری ڈاک کھول کر ضروری

کارروائی کرنا میرے فرائض میں تھا۔ جب اس نوعیت کے خطوط آنے لگے تو میں نے روزانہ وزیراعظم صاحب کو مطلع کرنا شروع کیا۔ دو ایک دن سنتے اور ہنستے رہے۔ پھر فرمایا: ''آپ جانتے ہیں کہ میں کتنا مصروف ہوں اور اپنا قیمتی وقت ان گمنام خطوط کو سن کر ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں اُس وقت تک زندہ رہوں گا جب تک اللہ کا حکم ہے۔'' میں ان خطوط کو متعلقہ افسروں کے پاس باقاعدگی سے ڈاک کے رجسٹر میں درج کروا کر بھیج دیا کرتا تھا۔ اگر بھولا بھٹکا کوئی سرکاری افسر میرے پاس آ جاتا تو اُس کی اس پرخطر دھمکیوں کی طرف ذاتی توجہ مبذول کراتا' کچھ نیک افسر سنتے اور ہمدردی کی باتیں کر کے چلے جاتے۔ میں سوائے اپنا فرض ادا کرنے کے اور کیا کرسکتا تھا کیونکہ میں قانوناً سرکاری محکموں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی پارٹی میں ایک اعلیٰ افسر سے یہ ذکر چھڑا ہی تھا کہ وہ برہم ہو کر بولے کہ ''تمہارا کاغذات کا بھیجنا تضیع اوقات ہے۔ ان خطوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا کرو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر چرچل کو بھی لوگ گمنام خطوط بھیجا کرتے ہیں' لہٰذا ایسے خطوں کا نوٹس نہیں لینا چاہیے۔'' ان مشفقانہ و ناصحانہ کلمات نے میرے فکرمند و مجروح دل پر نمک پاشی کا کام کیا۔ ایسی ہی بے اعتنائی گاندھی جی کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس کے راوی مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ہیں۔ اُنہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وزیرداخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل سے بارہا کہا گیا کہ مہاتما جی کی جان خطرہ میں ہے حالانکہ مہاتما نے خود بڑے زعم و وثوق سے یہ بھول کر کہ موت و زیست کسی اور ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اعلان کیا تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں سوا سو سال سے پہلے نہیں مریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فخریہ اور بڑے بول والے دعوے کو ناتھورام گھوڑسے نے گولی مار کر باطل اور بے حقیقت کر دیا۔ میں کیا کرتا، وزیراعظم کان نہیں دھرتے تھے۔ افسروں نے اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا لیکن میں کبھی ضروری دفتری کارروائی سے نہیں چوکا یعنی گمنام خطوط کے حاشیہ پر تحریری گزارش کرتا رہا کہ ضروری کارروائی کیجئے۔ یہاں تک کہ ایک ایسا خط موصول ہوا جس کا مطالعہ میرے لئے ہوش ربا تھا اس

لئے کہ اس میں ایسی باتیں درج تھیں جو بالکل درست تھیں۔ اس خط کے وصول ہونے کے چوبیس گھنٹہ قبل وزیراعظم صاحب ایک اشد ضروری کام کے سلسلے میں چند گھنٹوں کے لئے ہوائی جہاز سے لاہور تشریف لے گئے تھے اور مغرب سے پہلے لوٹ آئے۔ میں ان کے ساتھ انہیں ہوائی جہاز پر سوار کرانے ماری پور گیا تھا اور شام کو چار بجے کے بعد ان کو لینے ماری پور جانے لگا تو اکبر میاں جو ایک چھوٹے منے بچے تھے، میرے ساتھ جانے کے لئے ضد کرنے لگے۔ بیگم صاحبہ سے اجازت لی گئی اور وہ میرے ساتھ ماری پور گئے۔ ماری پور سے وزیراعظم نے اپنی کیڈلک میں مجھے داہنے ہاتھ پر بٹھلا کر ہمیشہ کے مطابق عزت بخشی۔ ہم 10 وکٹوریہ روڈ کے لئے روانہ ہوئے۔ اکبر میاں اچھی طرح تماشہ دیکھنے کے لئے میرے اور نواب زادہ صاحب کے درمیان اگلی سیٹ کے بالائی حصہ کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ماری پور کا راستہ ایک پر پیچ و تنگ سڑک سے گزر کر کشادہ بندر روڈ پر آن ملتا ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ اللہ میاں کا احسان مانو کہ آج تمہارے معصوم بچے نے اس گلی میں جہاں ہم نے تمہیں گولی سے اڑا دینے کا خطانہ ہونے والا منصوبہ بنایا تھا، تمہارے سامنے کھڑے ہو کر جان بچائی۔ اگر گولی داغی جاتی تو تمہارے بجائے اُسے لقمۂ اجل بناتی۔ یاد رکھو آج تو تم بچ گئے، آئندہ نہیں بچو گے۔ میں گھبرایا ہوا وزیراعظم کے پاس گیا اور خط کی تفصیلات بتلائیں وہ مجھے پریشان دیکھ کر زیر لب مسکرائے اور بڑے اطمینان کے ساتھ فرمایا: ''میں آپ کو کئی بار منع کر چکا ہوں کہ ایسے خطوں کا آپ نوٹس نہ لیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے اور اُس میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں ہوگی۔ اگر آپ مجھے کسی مضبوط قلعہ کے اندر سیسا پلائی ہوئی دیوار کے پیچھے بھی رکھیں گے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکے گی۔'' میں خاموش ہو کر دفتر میں آ کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں وزیراعظم کے ایمان کی پختگی اور توکل خدا کی داد دے کر ان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا رہا۔

میں اکیلا نہیں کہتا، اخبارات کہتے ہیں۔ رپورٹیں، لوگ اور دُنیا کہتی ہے کہ حفاظتی تدابیر نامکمل ہی نہیں بلکہ بہت ناقص اور انتہائی بے دلی سے اختیار کی گئی تھیں۔ یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ یہ

کام بہت اہم ذمہ داری کا ہے۔ اس میں تساہل و لاپرواہی کرنا بڑا سنگین جرم ہوگا۔ یہ معاملہ وزیراعظم ووزیر دفاع کی موت وزیست کا ہے۔ ہمیں ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے۔ اگر ان کی جان کی حفاظت کرنے میں ذرا سی بھول چوک ہوئی تو ملک کا تمام نظام تہہ و بالا ہو جائے گا اور ہم اپنی قوم کو منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ، ان باتوں سے کیا حاصل ہے کیونکہ ان کا وقت آ گیا تھا اور اس اس طرح ان کی موت واقع ہونے والی تھی یا یہ کہہ کر ہم سے صبر کی تلقین کی جائے کہ بھئی ہم سے جو کچھ ہوسکتا تھا، ہم نے اُس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ سازش کا پتہ لگانے کے لئے ہم نے کوہ و بیابان کی خاک چھانی، گہرے سمندروں کی تہہ تک غوطہ لگایا۔ پولیس کے ریکارڈ کی ورق گردانی کی۔ ہوٹلوں کے رجسٹروں کے اندراجات دیکھے لیکن کچھ خاک نہیں ملا۔ ہاں صرف اتنا پتہ ضرور لگا کہ قاتل افغان تھا۔ انگریزوں کے زمانہ سے نظر قید تھا اور گزر اوقات کے لئے اسے حکومت پاکستان ہر مہینہ مشاہرہ دیتی تھی۔ اُس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ دودھ پی پی کر اور اس ملک کا نمک کھا کر بڑا ہوا اور ملک کے محبوب وزیراعظم کو اُس نے مارِ آستین بن کر چپکے سے نہیں ڈسا بلکہ جلسہ گاہ میں کئی گھنٹہ قبل پہنچ کر اس جگہ کا انتخاب کر کے اپنا مورچہ سنبھالا جہاں سے وار خالی نہ جائے۔ دیکھئے اُسے ہماری دیدہ ودانستہ غفلت سے اس بلا کا اطمینان میسر تھا کہ وہ نہایت چین کے ساتھ پھلوں کے ٹن کھول کر اپنی شکم پری کرتا رہا۔ میں پوچھتا ہوں پولیس اور سی آئی ڈی کہاں تھی؟ دو ہی جواب ہوسکتے ہیں: (1) یہ لوگ موجود نہیں تھے یا (2) اگر موجود تھے تو آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور قاتل کو عام اجازت تھی کہ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ قاتل کے متعلق جن احکامات پر عمل ہونا چاہئے تھا، وہ بھی سن لیجئے۔ صبح وشام اس امر کا اطمینان کیا جانا ضروری تھا کہ یہ نظر بند قیدی میونسپلٹی کے حدود کے اندر موجود ہے یا نہیں کیونکہ اُسے شہر اور ضلع کی حدود سے باہر جانے کی سخت ممانعت تھی لیکن ہوتا کیا ہے کہ اسے وزیراعظم کے خفیہ پروگرام کا جسے صرف حکومت اور اس کے چند خاص عمال جانتے تھے، کئی دن پہلے علم ہو جاتا ہے اور وہ اس ناپاک مہم پر بغیر کسی روک ٹوک کے روانہ

ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا علم پولیس، سی آئی ڈی اور حکام کو کیونکر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بستی اور ضلع کو چھوڑ کر دوسرے ضلع اور شہر میں بے خوف وخطر جاتا ہے اور مکمل سکون واطمینان کے ساتھ شہر کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے اور وزیر دفاع کی آمد کا اُس شہر میں انتظار کرتا ہے جہاں جنرل آرمی ہیڈکوارٹرز بھی ہے۔ پولیس، سی آئی ڈی، ان ٹیلی جنس بیورو، سول حکام وفوجی محکمۂ ان انٹیلی جنس ومتعلقہ وزارتیں سب آنے والا خطرہ اور اُس کے سنگین نتائج سے بے خبر ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اس زمانے میں وزیر دفاع کی ہندوستان کو گھونسہ دکھلانے کے بعد مقبولیت اور ہر دلعزیزی عزت وشہرت کی سب سے بلند چوٹی کو سر کر چکی ہے۔ پاکستان کی کل دنیا سوائے چند شقی القلبوں کے وزیراعظم کے زیر احسان ہے۔ ملک میں ان کا کوئی دشمن نظر نہیں آتا ہے۔ ہر جگہ ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ دشمن بھی اُن سے لرزاں ہیں۔ باہر کے ممالک بھی ان کا لوہا ماننے لگے ہیں۔ ان کا شمار بین الاقوامی اکابرین میں ہونے لگا ہے اور ان کا ستارۂ اقبال انتہائی عروج پر پہنچ چکا ہے۔ ان حالات میں اس عظیم انسان کو ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں، باوردی پولیس، مختلف بھیسوں میں سی آئی ڈی اور دوسرے متعلقہ محکموں کے چیدہ افسروں، رضا کاروں اور صدہا جان نثاروں کی موجودگی میں ایک سیاہ دل نے جسے وزیراعظم سے کوئی عناد نہیں تھا اور جس نے صرف ان کی تصویر دیکھی تھی اور نام سنا تھا، کیونکر اُن کا بہیمانہ قتل کیا۔ کیا یہ سازش نہیں تھی؟ کیا حفاظت کے انتظامات معقول تھے؟ کیا وزیر دفاع کی جان کی حفاظت اس ہی طرح کی جاتی ہے؟ کیا وزارت امور داخلہ نے یہ جانتے ہوئے کہ وزیراعظم کی جان خطرہ میں ہے اور نظر قید صیدا کبر وزیراعظم کو بغیر کسی جھجک اور روک ٹوک کے اپنا صید بنانے کی دوزخی مہم پر روانہ ہو چکا ہے، وزیراعظم کی سلامتی کے لئے معقول انتظامات کئے تھے؟ کیا اتنے بڑے ملک کے اتنے بڑے وزیراعظم کو قاتلوں اور سازشیوں کے رحم وکرم پر اس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے؟ اور خصوصاً وہ وزیراعظم جو صرف اللہ کے توکل پر جیتا تھا اور وہ وزیر دفاع جو خطرہ کے خوف سے زرہ نہیں پہنتا تھا اور جیب میں کارتوسوں سے بھرا ہوا پستول نہیں رکھتا تھا۔

صنم گرانِ وزارت جواب دو مجھ کو
کہاں ہیں قائد ملت جواب دو مجھ کو
جواب دو کہ کہاں ہے متاعِ امن و سکوں
کہاں ہے قوم کی دولت جواب دو مجھ کو
کہاں گیا تھا بوقتِ شہادتِ قائد
تمہارا نظمِ حکومت جواب دو مجھ کو

(آرزو اکبرآبادی)

شہادت کے بعد جب وزیراعظم کی جیبوں میں سے سامان نکالا گیا تو کیا چیزیں برآمد ہوئیں۔ایک سفید رومال' سگریٹ کیس' لائٹر اور شیروانی کی بائیں بالائی جیب سے جو دل سے قریب تھا،ایک بہت ہی چھوٹا سا سبز کپڑے میں لپٹا ہوا قرآن شریف ملا۔اس قتل عمد سے میں پوچھتا ہوں کہ کس کا نقصان ہوا؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ملک اور قوم ایک سچے' تجربہ کار' دیانت دار خادم قوم سے محروم ہوگئی۔ کیا ایک خاندان کا سرپرست نہیں اُٹھ گیا؟ کیا رفیقوں کے ساتھ رفاقت کرنے والا نہیں چل بسا؟

ایسا اُجڑا ہے اُمیدوں کا چمن تیرے بعد
پھول مرجھائے بہاروں پہ خزاں چھائی ہے

(شبابؔ کیرانوی)

الحاصل ہر زاویہ سے،ہم سب اور ملک کا ناقابل تلافی نقصان عظیم ہوا۔

اب ہم جائزہ لیں کہ نواب زادہ صاحب کا کیا بگڑا اور اُن کا کیا بگاڑا گیا؟ جواب میں کچھ نہیں ہی کہنا پڑے گا۔ وہ تو رب العالمین کے سامنے انتہائی سرخروئی کے ساتھ اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔ قاتل تو مارا گیا اور سازشی بڑی صفائی سے بچ گئے یا صحیح معنوں میں ان کو بچا دیا گیا لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان سب کا کیا حشر ہوگا؟ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں یہ شقی لوگ کیفر کردار کو

پہنچیں گے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہمارے پاکستان اور ہماری دنیا میں ان مجرمین کا کھوج لگا کر قرار واقعی سزا دینے کی کون سی مزید موثر اور مخلص کوشش کی گئی یا اُن ذمہ دار افسروں کے خلاف جن کی غفلت اور چشم پوشی سے ہم پر مصیبت کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا جس سے کتنے ہی بغیر موت کے ہلاک ہوگئے' کتنے ہی اس صدمہ سے نیم جان اور مجروح ہوگئے اور پورا ہی ملک کچل کر رہ گیا، کوئی بتلائے سازشیوں سے چشم پوشی کرنے والوں اور ذمہ دار افسروں کے خلاف کیا کارروائی کی گئی؟ تاریخ بتاتی ہے کہ غیر ملکوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ غفلت کے سرزد ہوجانے پر رائے عامہ کے احترام میں وزارتیں ٹوٹ گئیں۔ حکومتیں بدل گئیں۔ خوددار وزراء نے استعفیٰ دے دیا لیکن ہمارے یہاں کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا اور اپنی کرسیوں سے بری طرح چپکے رہے کیونکہ اب تو نواب زادہ کے چلے جانے کے بعد ان کی کرسیاں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی تھیں۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے جس سے ہمارے اور ہمارے ملک کے ماتھے سے کلنگ کا ٹیکہ دور ہو۔ وقت رہتا نہیں اور وہ وقت ضرور چلا گیا لیکن اب بھی وقت ہے اور یہ وقت چلاّ چلاّ کر ہمیں پکار رہا ہے۔

''مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت''

میں اور میرے جیسے لاکھوں پاکستانی اس خون ناحق کا پتہ لگانے کے لئے بیتاب ہیں اور رات دن ماہئ بے آب کی طرح تڑپتے ہیں اور جب تک سازشیوں کا پتہ نہ لگ جائے، تڑپتے رہیں گے۔ کیا عجب ہے کہ تائیدایزدی سے یہ معاملہ جو لاینحل سمجھا جاتا ہے، حل ہوجائے۔ لوگوں نے تو چھان بین کر کے ایک عرصۂ دراز کے بعد یہ ثابت کر کے دکھلا دیا ہے کہ سینٹ ہیلینا میں نپولین بوناپارٹے کو مچھلی میں آرسینک (زہر) دے کر مارا گیا تھا۔ دیکھیں اللہ کیا کرتا ہے۔ ہماری تو آخری فریاد اُس ہی سے ہے۔

کبھی تو کام آئے گی یہ بے تابی میرے دل کی
تڑپ کر موج دریا میں خبر لاتی ہے ساحل کی

نواب زادہ صاحب راولپنڈی سے واپسی پر اپنے جس طے کردہ منصوبہ پر عمل کرنے والے تھے، آپ کو اس کا بھی حال سنا دیا جائے۔

(1) چند مسلم تاجر جن کے سرغنہ حاجی حبیب پیر محمد صاحب اور حاجی ولی محمد دادا صاحب تھے، وہ غیر ملکیوں کا کثیر سرمایہ کسی غیر ملک سے ہمارے ملک میں لانا چاہتے تھے۔ وزیر اعظم کے حکم اور ان کی طرف سے میں گفت وشنید کر رہا تھا۔ لاکھوں کا نہیں بلکہ کروڑوں کا معاملہ تھا۔ وزیر اعظم کی ملک دوستی اور دور اندیشی کا کیا کہنا۔ ان کا منصفانہ فیصلہ غیر ملکی تاجروں کے پاکستانی نمائندوں نے قبول کر لیا تھا۔ پنڈی سے واپسی پر ملک کی دولت میں بڑا اضافہ ہوتا اور ملک کی خوشحالی میں نمایاں فرق نظر آتا۔ وزیر اعظم نے یہ طے کیا تھا کہ جو سرمایہ باہر سے لایا جائے گا، وہ انکم ٹیکس ایکٹ کے نفاذ سے مبرا ہوگا بشرطیکہ اس میں سے ستر فی صد سے نئی صنعت وحرفت کے کارخانے کھولے جائیں اور باقیماندہ تیس فی صد سرمایہ خانگی اخراجات یا تجارت کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ افسوس یہ منصوبہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔

(2) بڑھتے ہوئے کاموں کی زیادتی کی وجہ سے نواب زادہ صاحب نائب وزیر اعظم مقرر کرنے والے تھے تاکہ ان کے اعتماد کا ایک آدمی اُن کا ہاتھ بٹا کر ان کا بوجھ ہلکا کرے۔ اُنہوں نے اپنا آدمی بھی منتخب کر لیا تھا اور وہ پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب صاحب نشتر تھے جو لاہور سے آکر پنڈی میں ملنے والے تھے۔ وزیر اعظم میاں ممتاز دولتانہ صاحب بڑی مشکل سے نواب زادہ صاحب کے اصرار پر سردار صاحب کی علیحدگی کے لئے راضی ہو گئے تھے۔ سردار صاحب علیگڑھ کے اولڈ بوائے اور پرانے خلافتی تھے۔ علیگڑھ کی تعلیم نے انہیں بہت اُبھارا اور ایسی جلا عطا کی کہ وہ صرف شعر وادب میں ہی نہیں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی خوب چمکے۔ شروع میں وہ کٹر قسم کے کانگریسی تھے، اس لئے ہماری صفوں میں بہت دیر میں آکر ملے لیکن اپنی ذہنی صلاحیتوں، صداقت وخلوص کی وجہ سے

بہت کم وقت میں بہت اونچے ہو گئے۔ یہاں تک کہ قائداعظمؒ نے ان کو اپنی مجلس عاملہ میں لے لیا اور باوجود صوبائی انتخاب میں ناکام ہونے کے حکومت برطانیہ سے مصالحت کی بات چیت کے وقت اپنے مشیروں میں شامل کیا اور بعد میں ان کو وائسرائے کی کونسل میں مسلم لیگ کی نمائندگی کا شرف بخشا۔ نواب زادہ صاحب کے زمانہ میں بھی ان کا وہ ہی اعتماد اور وہ ہی احترام کا پرانا مقام قائم رہا۔ میرے بڑے کرم فرما تھے۔ جب وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے، مجھے قائداعظمؒ کی تعمیل ارشاد میں ان کا ہمسفر ہونے اور ہندو مسلم فساد زدہ سابق پنجاب اور سابق صوبہ سرحد کے علاقوں کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ اللہ کی مہربانی سے مجھے ان کی قربت اور اتنا اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی کی خالی جگہ کو پر کرنے کے وقت شہید ملت نے سردار قوم کو راضی کرنے کی اہم ڈیوٹی میرے سپرد کی جسے میں نے اللہ کے حکم سے سردار صاحب کی متوقع کرم گستری اور دوست نوازی کا سہارا لے کر کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ الحمدللہ۔

تری خوبیاں غیر کیا جانتا ہے
تو کیا ہے اسے میرا دل جانتا ہے
(شیفتہ)

اس خالی ہونے والی اسامی کے لئے نئے گورنر کا بھی انتخاب کر لیا گیا تھا۔ وہ ہمارے معزز اور واجب التعظیم رہنما نواب محمد اسماعیل خاں صاحب تھے۔ اتفاق سے اِن دنوں وہ کراچی اپنے صاحبزادوں اور عزیزوں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ نواب زادہ صاحب نے ان کو بمشکل راضی کیا اور وعدہ لیا کہ وہ دو ہفتہ میں ہندوستان سے لوٹ کر اپنا عہدہ سنبھالیں گے۔ نواب زادہ صاحب کی پنڈی کی روانگی سے دو چار دن قبل نواب صاحب میرٹھ گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ مصطفیٰ کیسل میں اپنے عزیزوں اور اپنے ان گنت عقیدتمندوں سے منہ موڑ کر اللہ کے حضور چلے گئے۔ اس جگہ میں اپنے اُن مجسمۂ ایثار و

خدمت بزرگ کی جناب میں اپنا حقیر نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یوں تو مجھے اپنی طویل سیاسی زندگی میں جس کا بیشتر حصہ خدمت خلق میں گزرا، ہندوستان کی سینکڑوں ممتاز ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا اور چند کی قیادت میں کام کرنے کا موقعہ ملا اور اس طرح میں ان خوش نصیب انسانوں میں سے ایک ہوں جسے فضل الٰہی سے یہ دونوں سعادتیں بیک وقت کانفرنسوں، مسلم لیگ کے اجلاس اور مرکزی اسمبلی دہلی میں حاصل ہوئیں۔ اس وقت تو میرا رُوئے سخن صرف اس منبع سعادت کی طرف ہے جس سے میں فیضیاب ہوا اور وہ میرے بزرگ اور میرے دیرینہ کرم فرما نواب محمد اسماعیل خاں صاحب تھے جنہوں نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا جو شعر و ادب، مذہب و ثقافت اور شرافتِ انسانی کا گہوارہ تھا۔ ایسے مشرقی ماحول اور پاکیزہ فضاؤں میں جو شخص چھوٹے سے بڑا ہوا، وہ کیونکر بڑا انسان نہیں ہوتا اور میری حقیر دانست میں ایسے بڑے انسان کا صرف ذکر بھی فیوض و برکات سے خالی نہیں ہوتا۔

نواب اسماعیل خاں صاحب بلاشک رئیس ابن رئیس تھے۔ اُن میں پیدائشی بوئے رئیسی موجود تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ خوئے قلندری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ باوجودیکہ وہ طویل القامت وقوی الجثہ نہیں تھے لیکن چہرہ سے وقار، تمکنت اور رعب وجلال ٹپکتا تھا۔ دھڑکنے اور تڑپنے والا قلب مومن رکھتے تھے۔ بہت عجز و انکساری سے ہر ایک شخص سے ملتے۔ جو شخص ان کی رائے میں خلوص اور دیانتداری کے معیار پر پورا اُترتا، اس کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتے۔ وہ دوسرے سیاسی رہنماؤں کے جیسے اپنے بلند مقام اور شہرت کو قائم رکھنے کے لئے سیاسی ہتھکنڈے استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان کے ذاتی جوہر خود ان کی عزت، عظمت اور عقیدت مندی کے ضامن تھے۔ وہ عزت، حشمت و شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے بلکہ یہ چیزیں تو ان کے جلو میں رہتی تھیں۔ باوجود خود اتنے بڑے ہونے کے وہ بڑوں کا احترام کرتے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ جس محفل میں چلے جاتے، وہاں ان کی شمع دوسروں کی شمع کے مقابلہ میں زیادہ فروزاں نظر آتی۔

خلافت کے زمانے سے تادمِ زیست ان کے تمام ہمعصر ہندوستان کے چوٹی کے لوگ تھے۔ وہ اپنی سلامت روی، صلح جوئی، اتحاد پسندی، حریت نوازی، بہی خواہئ قوم و ملک اور اسلام دوستی کے بدولت لوگوں کے قلوب میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اور اس اعلیٰ مقام پر تا زیست فائز رہے اور تا ابد رہیں گے۔ ان کے عقیدت مندوں میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور غیر ممالک کے لوگ بھی تھے۔ ہر شخص ان کی راست گوئی، خوش خلقی اور سیاست دانی کا دل سے قائل تھا۔ تعمیری کام کرنا ان کے خمیر میں تھا اور وہ تخریبی کام کرنے والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے اور دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں سے بھی وہ متنفر رہتے جو مسلم لیگی ہو کر جماعت میں انتشار پیدا کرتے یا اپنے اکابرین کو ان کے پیچھے بُرا کہتے۔

یہ حقیقت ہے کہ نواب اسماعیل خاں صاحب کی جیسی اولوالعزم ہستی کی شمولیت کے طفیل آل انڈیا مسلم لیگ ایک ہر دلعزیز عوامی جماعت بنی۔ قائد اعظمؒ نواب صاحب کا موجودگی ہو یا غیاب بہت احترام کیا کرتے تھے اور ہر اہم اقدام سے قبل ان سے مشورہ کرتے۔ قائد اعظمؒ کو ان کی سیاسی بصیرت، ہوشمندی اور دور اندیشی پر مکمل یقین تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ادارہ میں صدارت کے عہدہ کے بعد سب سے بڑا اور اہم عہدہ صدر مجلس عمل کا تھا جس پر نواب صاحب فائز تھے۔ بسا اوقات قائد اعظمؒ کی غیر حاضری میں نواب صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت بھی فرمایا کرتے تھے۔ باوجود ان تمام صلاحیتوں و عظمتوں کے وہ اپنی کسر نفی اور ایثار کیشی کی وجہ سے کبھی کسی سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ کے خواہ مرکزی یا صوبائی وزارت ہی کیوں نہ ہو، متمنی نہیں ہوئے۔ ہمیشہ خود پیچھے رہے اور لوگوں کو آگے بڑھایا۔ اگر کوئی نااہل کبھی کسی بلند مقام پر پہنچ گیا تو مجال ہے کہ ان کی جبیں پر بل آیا ہو۔ قائد اعظمؒ کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ میں صرف نواب صاحب کی ایک ایسی ہستی تھی جو دوسروں کے مقابلہ میں ہندوستان بھر میں بہت زیادہ مقبول اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ نواب صاحب بلاشک قوم کے محسنین کی صف اوّل کے پاک دل و پاک طینت رہنما تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں نواب صاحب کا نام اور

شاندار خدمات زرّیں حروف میں لکھی جائیں گی۔ سچ ہے ایسے لوگ مرتے نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم کو ہر زمانہ میں حیاتِ نو ملی

(3) طے شدہ منصوبہ کے مطابق سردار عبدالرب نشتر کو وزارتِ خزانہ بھی سونپی جانے والی تھی۔

(4) خواجہ شہاب الدین صاحب کو وزارتِ داخلہ سے علیحدہ کر کے مصر کی سفارت دی جانے والی تھی۔

(5) نواب مشتاق احمد خاں صاحب گرمانی بھی علیحدہ کئے جانے والے تھے۔

مذکورہ بالا تقرریوں اور علیحدگیوں کے علاوہ بھی کئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں تاکہ مملکت کے کام اَور اچھی طرح انجام پائیں لیکن ہر چیز جہاں کی وہاں رہ گئی اور تعمیری انقلاب لانے والی ہستی کو تخریب پسند عناصر و دشمنانِ وطن نے مار ڈالا۔ اُنیس سال میں اُنیس خزائیں آئیں اور کہنے کو چلی گئیں لیکن اصلی بہار نے تو کبھی ہمارے گلشن پاکستان میں جھوٹے منہ بھی جھانک کر نہیں دیکھا۔ کیا کہا جائے' کتنا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔ قلم و دل لرزاں ہیں۔ لوگ برابر آئیں گے اور جائیں گے مگر ہماری داستانِ غم نامکمل ہی رہے گی۔ دل کا بوجھ بھی وقت کے ساتھ ہلکا ہونے کے بجائے بھاری ہوتا جائے گا اور دل کی اُداسی اور اضمحلال میں بھی کمی کا کوئی امکان نہیں۔ خدارا اٹھو۔ آگے بڑھو۔ قفل سکوت توڑ دو۔ رازِ سربستہ فاش کر دو۔ سازش کے پردے چاک کر دو۔ خونِ ناحق کرنے والوں کا پتہ لگاؤ۔ ڈرو اُس دن سے جب زمین کو بھونچال ہلا ڈالے۔ ڈرو اس دن سے ''جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اُون دُھنی ہوئی۔'' ہاں! اُس دن لیاقت علی خان کے خونِ ناحق کے متعلق ضرور پرسش ہوگی۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

جب وزیرِاعظم خاک میں مل گئے جنہیں ارادتاً اور سازشاً خاک میں ملایا گیا تو ان کے منصوبے اور علم نہیں کہ کتنے ہی منصوبے جو دل میں محفوظ تھے، دو گولیوں سے پاش پاش ہو گئے

اوران کے ساتھ خاک میں دفن ہو گئے لیکن وہ، ان کی قوم اور اُن کا ملک جس کی بقا اور حفاظت کے لئے اُنہوں نے دعا کی تھی، زندہ ہیں اور انشاءاللہ تا قیامت زندہ رہیں گے۔

میں لٹ کے رہِ حق میں ہوا زندۂ جاوید
خوش ہوں کہ فنا میں بھی بقا میرے لئے ہے

☆☆☆☆☆
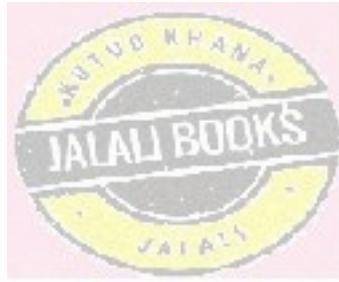
معمارِ پاکستان

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
(ناصؔر کاظمی)

یوں تو دھرتی نے بہت سے ملکوں کو جنم دیا لیکن ان میں سے ایک قابل ذکر ملک ہندوستان ہے۔ درحقیقت یہ ایک جڑواں بچہ تھا جس کی بقا کے لئے شروع ہی سے عمل جراحی کر کے دونوں کو جدا کر دینا چاہئے تھا لیکن ظاہر ہے کہ مقررہ وقت سے قبل کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' دونوں بچوں کی جان اتنے خطرہ میں ہوگئی کہ ان کے وجود کے لالے پڑ گئے۔ متعلقہ لوگوں کے باہمی مشورہ اور متفقہ فیصلے سے طے پایا کہ ان کی درازئ عمر' زندگی' خوشحالی اور ترقی کے لئے لابدی ہے کہ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ کر دیا جائے۔ دھرتی کے مالکِ حقیقی نے اس کٹے چھٹے کمزور بچے کی نگہداشت اور پرورش کی عظیم خدمات بھی ہندوستان کے باشیوں میں سے اپنے ایک نیک مسلمان بندہ محمد علی جناح کو منتخب کر کے سپرد کی جو اس بچے کے خودمختار وجود کو ایک عرصہ سے تسلیم کرانے میں کوشاں تھے اور بالآخر کامیاب ہوگئے لیکن وہ ضعیف العمر اور بیمار تھے۔ اللہ کی سپرد کردہ اس نئی امانت کی مشکل سے ایک سال تک نہایت جانفشانی اور دیانتداری سے دیکھ بھال کی۔ پھر اس بارامانت کو اپنے جانشین لیاقت علی خاں کو منتقل کر کے قوم کو روتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گئے۔ اس یکسالہ بچہ کی پرورش کی تمام تر ذمہ داریاں جانشین کے بڑے سر' مضبوط کندھوں اور کشادہ سینہ پر رکھ دی گئیں۔ اس زمانہ میں حالات صرف ناگفتہ بہ ہی نہیں تھے بلکہ اس صغیر سن بچے کے لئے انتہائی ناسازگار اور نازک تھے۔ دشمن صرف

بددعائیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ بچہ کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے۔ وہ اُسے بھوکا پیاسا مارنا چاہتے تھے اور وہ دل سے یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کمزور فاقہ زدہ' تشنہ و جان بہ لب بچے کو ہمارے حوالہ کردیا جائے تا کہ ہم بڑے بچے اور اس چھوٹے بچے کو یکجا رکھ کر پرورش کریں لیکن اللہ کے فضل وکرم سے دشمنوں کی بددعائیں بے اثر ثابت ہوئیں اور بلّی یعنے ان کے نصیب سے چھیکا نہیں ٹوٹا۔ اس نئے امین نے بیمار بچے کو بادوباراں اور سرد گرم سے بچا کر پرورش شروع کی۔ اسے گھٹنے چلنا بیٹھنا، پیروں پر کھڑا ہونا اور پیروں چلنا سکھلایا۔ اس ننھے منے بچے سے یہ توقع رکھنا قرین دانش نہیں تھا کہ وہ اصول فطرت کے خلاف جلد جوان کیوں نہیں ہوگیا۔ وہ آسمان کے تارے کیوں توڑ کر نہیں لایا۔ اس نے محلات کیوں نہ بنائے۔ اس نے ملک میں دودھ کی نہریں کیوں نہیں بہائیں۔ اس نے بنجر زمینوں اور ریگستان میں لہلہاتی کھیتیاں اور سبز باغ کیوں نہیں اُگائے۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں میں بھاری سی تلوار تھام کر کئی سر کیوں قلم نہیں کئے۔ بڑے بڑے اسلحہ خانہ کیوں نہیں قائم کئے۔ مل و صنعتی کارخانے کیوں قائم نہیں کئے۔ مزدوروں اور عوام کا معیار زندگی کیوں بلند نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔ ہم جلد دولت مند اور ترقی یافتہ کہلانے کیلئے اپنی خود غرضی میں اس بچے کی عمر، اہلیت وصلاحیت، مواقع اور اس کے گردوپیش کے حالات کو بھول بیٹھے اور بچے کو اور اس کے دیکھ بھال کرنے والوں کو کوسنا کاٹنا شروع کردیا اور ان کے کاموں میں کیڑے ڈالنے لگے اور اب تو رات دن انہیں سوائے برائی کے اور کسی نام سے یاد ہی نہیں کرتے۔ یقین کیجئے کہ ہماری یہ تمام حرکتیں اخلاقی اور ذہنی پستی کا مظہر ہیں۔ اگر آپ یہ طعنہ دیں کہ ہندوستان نے سب کچھ حاصل کرلیا اور تم 1947ء سے 16 اکتوبر 1951ء تک صغیر سنی کا عذر کرکے راہِ فرار اختیار کرتے ہو تو یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ اگر آپ میری بات سن کر دوبارہ غور وخوض کرنے اور اپنی رائے کو بدلنے کے لئے تیار ہوں تو عرض کروں کہ جس بچہ کی مدت عمر کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ اتنا قلیل عرصہ ہے کہ دل یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ''کئے آمدی و کئے پیر شدی۔'' غور تو کیجئے کہ تقسیم سے ہندوستان کا کیا بگڑا۔ وہ تو اس وقت سے قائم ہے جب سے

دھرتی نے جنم لیا۔ ہاں یہ کئی بار ہوا کہ ہندوستان کی حکومت نے کئی وقت ہاتھ بدلے۔ پہلے تو مقامی حکمرانوں نے ایک دوسرے کو نکال باہر کیا۔ پڑوسی ملکوں اور سمندر پار والوں کو جب ہندوستان کی خانہ جنگی کا علم ہوا تو وہ لاؤ لشکر کے ساتھ آ گئے۔ کچھ عرصہ قیام کیا اور چلے گئے۔ اب زمانۂ قریب میں کانگریس نے مضبوطی کے ساتھ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ان کی حکومت، ان کی فوجیں، ان کی کچہریاں اور ان کی راجدھانی قائم تھی۔ ان کو کوئی نئے انتظامات نہیں کرنے پڑے اور نہ ایک انچ اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ انہیں ہر چیز بنی بنائی ملی۔ جہاں بیٹھے تھے، وہیں بیٹھے رہے۔ انگریزوں کے قانون کو بھی ڈاکٹر امبید کر نے چند ترمیمات کے ساتھ اپنا لیا۔

انگریز حاکموں کی سابقہ ہندونواز پالیسی کی بدولت صنعت وحرفت کے کارخانے' فلاح و بہبود کے ادارے' اسلحہ سازی کی سولہ یا سترہ فیکٹریاں' رسدگاہیں' ہوائی جہاز بنانے کا کارخانہ' کپڑے کے بڑے بڑے پچاسوں ہی مل وغیرہ وغیرہ سب کچھ بہت پہلے سے ہندوستان میں قائم تھے۔ یہاں تو لوگ پھٹے پرانے کپڑے پہنے' گردآلود چہرے لئے، تھکے ہارے دور دراز کی مسافت طے کر کے گرتے پڑتے' لٹتے پٹتے اور کٹتے صرف آسمان کے سایہ میں افلاس و بیماریوں کو ساتھ میں لے کر آن پہنچے۔ انہیں صرف فضلِ ربی کا سہارا تھا۔ ان نامساعد حالات میں قدرت کے کرشمے بار بار ظاہر ہوتے رہے جنہوں نے اس نوزائیدہ ملک کو خطرات و بربادی سے بچا کر زندہ وسلامت رکھا اور آج یہ روزِ سعید دکھلایا، لہٰذا ہمارے تمام گلے شکوے غیر فطری' غیر آئینی اور غیر معقول ہیں۔

معمار پاکستان کے بارے میں چند لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُنہوں نے آئین سازی میں تساہل سے کام لیا۔ معترضین بھول جاتے ہیں کہ قائداعظمؒ کی رحلت' مہاجرین کا سیل رواں' مسئلہ کشمیر' سرحدوں پر ہندوستانی افواج کا اجتماع وفوج کشی کا مستقل خطرہ ایسی کھلی حقیقتیں تھیں جن میں نوابزادہ کی باقی ماندہ مختصر زندگی کے شب و روز مصروفِ عمل پیہم رہے لہٰذا یہ اعتراض بالکل لغو ہے۔ باوجود اپنی جان لیوا مصروفیات کے وہ آئین سازی سے غافل نہیں تھے۔ اُنہوں

نے 12 مارچ 1949ء کو مولینا شبیر احمد عثمانیؒ کے مشورہ و رضا مندی سے ایک عظیم الشان اور تاریخی قرار دادِ اغراض و مقاصد منظور کرائی۔ قرار دادِ اغراض و مقاصد کا جاننا آپ کے لئے بہت ضروری ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ کتنی ٹھوس خدمت تھی اور اگر ان کی زندگی کچھ اور عرصہ تک وفا کرتی تو بڑے دوررَس نتائج نکلتے اور پاکستان کا مثالی اسلامی آئین بنتا۔ بہر حال آئین کی کس طرح داغ بیل ڈالی گئی۔ آپ ملاحظہ فرمائیں:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیر حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔

لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق واختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے استعمال کرے۔

جس میں اصول جمہوریت وحریت ومساوات ورواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے اس کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے

مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اوران پر عمل کرسکیں اوراپنی ثقافتوں کوترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جواب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہوجائیں، ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ متعینہ اختیارات کے ماتحت خودمختار ہوں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اوران حقوق میں قانون اخلاق عامہ کے ماتحت مساواتِ حیثیت سے مواقع قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اورسیاسی عدل' خیال' اظہار' عقیدہ، دین' عبادات اورارتباط کی آزادی شامل ہو۔

جس کی روسے اقلیتوں اور پس ماندہ وپست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی روسے نظام عدل کی آزادی کامل طور پرمحفوظ ہو۔

جس کی روسے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اوراس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کے بحروبراورفضا پر سیادت کے حقوق' شامل ہیں' تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہل پاکستان فلاح وخوش حالی کی زندگی بسر کرسکیں۔ اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اورممتاز مقام حاصل کرسکیں اورامن عالم کے قیام اورنوع انسان کی ترقی وبہبود میں کماحقہٗ اضافہ کرسکیں۔''

جس موضوع پر میں اظہارِ خیال کررہاہوں، وہ بہت بسیط ہے لیکن تنگیٔ وقت کے پیش نظر میں اجمالی طور پر روشنی ڈالوں گا۔ یہ اللہ کا بڑا فضل تھا کہ قائداعظمؒ نے اپنے دست راست نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کوان کی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں اوراہلیت کی وجہ سے ہندوستان کے وائسرائے کی کابینہ میں سب سے بڑے اوراہم قلمدان یعنی وزارت خزانہ کے لئے مسلم لیگ کی طرف سے نامزد کرکے کانگریس کوشکست فاش دی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس عہدہ کوایک ہندوستانی کے سپرد کیا گیا۔ کانگریس نے شرارتاً اس یقین کے ساتھ کہ مسلم لیگ کے اکابرین میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جواس عہدہ کوسنبھال سکے، انکار کردیا تھا۔

میں اپنے ایک خوشگوار فرضِ حق شناسی واحسان مندی کی عدم ادائیگی سے مجرمانہ کوتاہی کا مرتکب ہوجاؤں گا اگر یہ ظاہر نہ کروں کہ جب پاکستان کا قیام یقینی نظر آنے لگا تو وہ سول حکام جو در پردہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے حامی تھے کھل کر خدمت کرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ اور تو اور بری، بحری اور فضائی افواج کے افسر و سپاہی جن کی بیرکوں اور چھاؤنیوں میں بھی سیاست دوربین سے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اور جن کے داخلہ پر شجرِ ممنوعہ کی طرح سخت پابندی عائد تھی، باہر نکل آئے۔ اب ان فوجیوں نے جوشِ ایمانی و جذبۂ خدمتِ اسلامی سے سرشار ہوکر پاکستان کی حفاظت و بقا کے لئے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر اپنے بے تیغ سپہ سالار کی بے تیغ افواج میں ہراول بن کر مورچے سنبھال لئے۔ دفاتر، محکمہ رسل ورسائل، انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس کی دُنیا بھی جو اُجڑی پڑی تھی، آباد ہونے لگی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ دلی لگن، جان نثاری، وفاداری اور خلوص سے سنبھالی اور برسراقتدار لوگوں کا ہاتھ بٹایا۔ کچھ لوگ تو مسلسل خدمت سے اتنے تھک گئے کہ موت کا شکار ہوگئے اور کچھ دل کے مرض میں مبتلا۔ اللہ ان سب کو وہ ہی اجرِ عظیم عطا فرمائے جس کا وعدہ اُس نے اپنے نیک بندوں سے کیا ہے۔

بات تھی ایک اہم قلمدانِ وزارت کی لیکن عمرو عیار کی زنبیل کی طرح اور ہی کچھ بات نکل آئی۔ بہرحال اس کا بھی تانے بانے کا جیسا تعلق ہے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ کپڑا نہیں بن سکتا۔ اسی طرح میرے دل کی بھی بات نامکمل رہے جاتی۔ اللہ کا خاص کرم تھا کہ اس زمانہ میں بے شمار مسلم ماہرین اقتصادیات ہندوستان کی مالی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ممتاز افراد کے نام درج کئے جاتے ہیں جن کے باہمی مشوروں اور عملی تعاون کا یقین دلانے کی وجہ سے قائداعظمؒ نے اس نئی اقتصادی دُنیا میں قدم رکھ کر کانگریس کو نیچا دکھلایا۔ اقتصادی دنیا کے چند اکابرین کے نام ملاحظہ ہوں: غلام محمد صاحب، زاہد حسین صاحب، یعقوب شاہ صاحب، چودھری محمد علی صاحب، عبدالقادر صاحب، سعید حسن صاحب، غلام عباس صاحب، محمد ہاشم صاحب، محمد شعیب صاحب، شجاعت علی حسنی صاحب، ممتاز

حسن صاحب، مسعود رضا صاحب وغیرہ وغیرہ۔ دراصل مذکورہ بالا حضرات میں چودھری محمد علی صاحب نے بہت نمایاں کردار ادا کیا اور اس نئی مملکت کی بغیر شور و شغب کے بہت ٹھوس خدمات انجام دیں۔ وہ اپنی کسر و ایثار نفسی کی وجہ سے ہمیشہ پس پردہ رہے لیکن ہندوستان اور پاکستان میں تمام بنیادی اور اہم دفتری کام کر کے نواب زادہ کی ہندوستانی وزارتِ خزانہ اور پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کی کامیابی میں ہاتھ بٹا کر چار چاند لگائے۔ متواتر خدمت کی وجہ سے ان کی تندرستی پاش پاش ہوگئی لیکن انہوں نے کبھی اس کا گلہ نہیں کیا۔ فریضۂ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد خدمتِ ملک کو انہوں نے ہر کام پر ترجیح دی۔ تحریر و تقریر کی دُنیا میں اُن کا شمار چوٹی کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جیسے اور لوگوں کو پاکستان کے باشندے ہمیشہ یاد رکھیں گے، اسی طرح اُن تمام میں چودھری صاحب ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت سے جلوہ گر رہیں گے۔

یہ ایسا اہم قلمدانِ وزارت ثابت ہوا کہ کانگریس کے مردِ آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی چیخ اُٹھے اور کہا کہ مجھے اپنی وزارت میں ایک چپراسی کو بھی مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تاریخی پس منظر اس لئے پیش کیا گیا کہ نواب زادہ صاحب نے ہندوستان کا قابل یادگار عوامی بجٹ پیش کیا تھا اور وہ مالیات اور اقتصادیات کے تمام رموز سے کماحقہ، آگاہ ہوگئے تھے اور یہ ہی سبب تھا کہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد اور بالخصوص قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہ اپنے ملک پاکستان کو معاشی طور پر آزاد رکھنا چاہتے تھے اور انتخابی مہم کے دورہ میں جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، اُنہوں نے اپنی تقریروں میں جن سے پاکستان کے تمام روزنامے بھرے پڑے رہتے تھے، ہمیشہ کہا کہ ''لیاقت اپنی قوم کو ننگا اور بھوکا دیکھنا گوارا کرے گا لیکن ملک کی سالمیت پر کبھی آنچ نہیں آنے دے گا۔'' وہ مجمع کو مخاطب کر کے گرجدار آواز میں فرماتے: ''دیکھو پنڈت جواہر لال نہرو بھیک کا ٹھیکرا لے کر امریکہ گئے لیکن تمہارے لیاقت نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے اور وہ صرف اپنے اللہ سے مانگتا ہے۔''

یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ وہ صرف اپنے ہی ملک کی معاشی آزادی نہیں بلکہ ہر اسلامی

ملک کی قولاً وفعلاً معاشی آزادی چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اس کے حصول کے لئے 1949ء میں عملی اقدام کیا اور 25 نومبر کو ایک بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کی جو پاکستان کے دارالسلطنت کراچی میں منعقد ہوئی، افتتاح فرمائی۔ یہ صرف پاکستان کی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کا ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ پہلی مرتبہ اس نوعیت کی کانفرنس ہوئی جس میں تمام اسلامی ممالک کے تجارت، صنعت وحرفت کے نمائندوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ نواب زادہ صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں کانفرنس کی غرض وغایت اور انعقاد کے صرف دو اغراض و مقاصد بیان کئے۔ غرض وغایت کے متعلق یہ فرمایا کہ ہم پڑوسی ہیں اور بحیثیت پڑوسی کے اسلامی روایات کے متعلق ہمیں ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہو کر اُسے خوشحال بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ آپ کے اور ہمارے درمیان اور بھی کئی مضبوط رشتے ہیں جو ہمیں قریب تر کرتے ہیں۔ وہ ہمارا مذہب، تہذیب وتمدن ہیں اور ہمارا عظیم اسلامی برادری سے گہرا تعلق اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم مسلمانانِ عالم اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی تدابیر اختیار کریں۔ اس بین الاقوامی کانفرنس سے جو دو بڑی توقعات جنہیں آپ کانفرنس کے اغراض و مقاصد کہہ سکتے ہیں، وابستہ کی گئی تھیں۔ وہ یہ تھیں: (1) صنعتی ترقی کا منصوبہ بنانا اور (2) اسلامی ممالک کے مابین تجارت کو فروغ دینا تاکہ اسلامی ممالک میں ترقی کی لہر دوڑ جائے اور لوگ خوش حال ہو جائیں اور تجارت کے دائرہ کو بھی اسلامی ممالک کے حدود سے بڑھا کر دُنیا کے طول وعرض تک پہنچایا جائے تاکہ ہر اسلامی ملک کی معاشی آزادی مکمل ہو جائے۔ پاکستان کے باشندے اچھی طرح جانتے ہیں کہ قائد ملت کے اقبال کا ستارہ فضلِ خداوندی سے اوج پر تھا اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ ہر معاملہ میں تائید ایزدی شاملِ حال تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں دودھ کی نہریں نہیں بہہ رہی تھیں اور نہ شہد کے چشمے اُبل پڑے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ہم اپنی ابتدائی ارتقائی منزل سے گزر رہے تھے، اشیائے خوردنی بہ افراط دستیاب تھیں اور تن ڈھکنے کو نئے ملوں کا کپڑا میسر تھا۔ مرضئ مولیٰ تھی کہ اس نادار ملک کی اقتصادی حالت اَور

بہتر ہو جائے تو آپ نے دیکھا کہ کوریا کی جنگ چھڑ گئی اور پاکستان کے خام مال کی مانگ اتنی بڑھی کہ اس نئے عُسرت زدہ ملک میں دولت کی ریل پیل ہونے لگی جس سے بڑی حد تک پاکستانی عوام بھی مستفید ہوئے۔ ملک کی خوشحالی اور معیشت شاہراہِ ترقی پر گامزن تھی کیونکہ ٹیکسوں کی چھوٹ، کپڑے، پٹ سن وغیرہ کے ملوں کا قیام، بینکوں کی روزافزوں ترقی اور نئے بینکوں کا اجرا، صنعت وحرفت کے کارخانوں کا قیام، تجارت کی سہولتیں، یہ ایسی بنیادی چیزیں تھیں جس سے ملک کی معاشی حالت بہتر سے بہتر ہونے لگی تھی۔ اس ہی زمانہ میں کئی خودمختار و آزاد مملکتوں نے اپنی معاشی بدحالی کے پیش نظر اپنے سکہ کی قیمت گھٹانے کا فیصلہ کیا۔ بالخصوص ہمارے پڑوسی ملک نے جس سے ہمارے کچھ نہ کچھ تجارتی تعلقات قائم تھے، اپنے روپیہ کی شرح میں کمی کا اعلان کیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ کسی ملک کے سکہ کی قیمت گرنے سے بازار کے نرخوں میں ایک انقلاب عظیم بپا ہو جاتا ہے اور ملکوں کی معیشت پر مجموعی طور پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ درآمدات و برآمدات بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان حالات میں متاثرہ ممالک کی مالیات کے ماہرین کی کئی کئی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی مہربانی سے قائد ملت اور اُن کے رفقاء وزراء رات کو چین کی نیند سوتے تھے۔ دُنیا کی نگاہیں پاکستان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے اپنے متوحش چہروں کے ساتھ وزیراعظم کے فیصلہ کو سننے کے لئے ہر دَر کے چکر کاٹتے تھے کہ کہیں سے بھی کچھ سراغ مل جائے تو خبر بھیجنے میں سبقت لے جائیں۔ خیر وہ دن آ ہی گیا اور قائد ملت نے اپنی کابینہ کا متفقہ فیصلہ سنا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا کہ پاکستان کے روپیہ کی قیمت بدستور قائم رہے گی اور اس طرح اُنہوں نے چاردانگِ عالم میں پاکستان کی معاشی آزادی وخوشحالی کا ڈنکا بجا دیا۔

''قائد ملت زندہ باد''

ہم نے تو نواب زادہ صاحب کی اس کارگزاری پر ''احسنت'' کہا اور فرط جوش میں ''زندہ باد'' کا نعرہ بھی لگا دیا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کا کیا ردعمل ہوا۔ وزیراعظم کو کتنی اُن

دیکھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اوران کی کیسی کڑی آزمائش ہوئی۔آپ کومعلوم ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ جس کے اقتدار اور حکومت کی وسعت اس کرۂ ارض میں اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ زبان زدِعام مثل کے مطابق جہاں آفتاب چوبیس گھنٹے طلوع رہتا تھا، اب وہ سکڑ کر اتنی چھوٹی ہوگئی تھی کہ آفتاب کبھی کبھار بمشکل نظر آتا تھا۔اس جنگ میں برطانیہ فاتح ہونے کے باوجود مفتوح ممالک جرمنی وجاپان کے مقابلہ میں اقتصادی پستی کی کسی گہرائی میں کہیں دبا دبایا پڑا تھا۔اُسے دنیا کی منڈیوں میں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے اُس پاؤنڈ کی شرح کو جس کا چہار جہت میں ہر زبان پر چرچا رہتا تھا، بار بارکم کرنا پڑتا تھا۔1949ء میں برطانیہ کے دیوالیہ ہونے کا ایک اور موقعہ آیا لیکن اس نے فوراً اپنے سکہ کی شرح کم کردی جس سے حکومت ہند کی اقتصادی کشتی ڈوبنے لگی تو اُس نے برطانیہ کی تقلید کی اور غرقابی سے بچنے کے لئے اپنے روپیہ کی شرح کم کرکے سلامتی کے ساحل پر پہنچ گئی۔

اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہر خودمختار ملک اپنی مالی پالیسی میں ہر وقت ردّوبدل کرسکتا ہے لیکن پاکستان کی یہ حرکت یعنی اپنے سکہ کی شرح کم نہ کرنا بھارت کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔اس بیسویں صدی میں خلیل خان کے فاختہ اڑانے اور ڈنڈے کے زور سے اپنی رائے منوانے کا زمانہ تو چلا گیا تھا، اس لئے بھارت نے اپنے دل کی دہکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پاکستان کے زرِمبادلہ کی شرح کو ماننے سے انکار اور تجارت کا مقاطعہ کیا۔ بھارت نے ہماری ریلوں اور کارخانوں کومفلوج کرنے کے لئے کوئلہ نہ دے کر اپنے ماتھے پر قشقے کے بجائے کالک لگائی اور سیاہ رو ہوگیا۔اس آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لئے نواب زادہ نے ڈھاکہ میں کابینہ کا اجلاس طلب کیا۔اُس وقت پاکستان کی اقتصادی حالت اتنی مضبوط تھی کہ غیر ممالک سے کوئلہ درآمد کرنے میں کوئی مالی دقت نہیں ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ روئی اور پٹ سن کی برآمد ہندوستان کو یک لخت بند کردی جائے۔ پاکستان کا تو کچھ بگڑا نہیں، حکومت نے پٹ سن خریدنے کے لئے نیشنل بنک آف پاکستان قائم کیا اور ریلوں کے لئے ڈیزل انجن خریدے جانے لگے۔

تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد بھارت نے گھٹنے ٹیک دیے اور پاکستانی سو روپیہ کے معاوضہ میں بھارتی ڈیڑھ سو روپیہ دینا قبول کرلیا۔

نواب زادہ کے دورِ حکومت و زندگی کے چند اہم تاریخی واقعات کو روایتی کمزور حافظہ کی یادداشت قائم رکھنے کے لئے سپردِ قلم کر رہا ہوں تاکہ یہ تحریری و دستاویزی سند رہ جائے اور اس عظیم شخصیت کے چند شاہکار کارنامے محفوظ ہوجائیں۔ ان واقعات کے بیان کرنے اور مطالعہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گا کہ نواب زادہ کی نظروں میں قائداعظمؒ کا کتنا بلند مقام تھا۔ وہ اس مملکت پاکستان کو کیا بنانا چاہتے تھے اور اُسے کیا سمجھتے تھے۔ آزادیٔ کشمیر کے کتنے زبردست حامی تھے۔ مسلمانانِ ہند پر ہٹلری مظالم اور پرجا کے دن دھاڑے جور وستم سے کتنے دکھی رہتے تھے۔ ان واقعات کا ہم اگر اپنے دل کو ٹٹول کر جائزہ لیں اور اُن کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کے دیکھیں تو وہاں سوائے قلبِ مخلص اور پُر درد کے اَور کچھ نہیں پائیں گے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو مسلمان اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یا اپنی رضامندی یا قوتِ برداشت کی بدولت ہندوستان میں رہ گئے انہیں ہندوؤں نے للّٰہی بغض، کینہ پروری اور اسلام دشمنی کے باعث اپنی خونیں پیاس بجھانے کے لئے تختۂ مشقِ ستم بنایا۔ ہندوستان سے رات دن اطلاعیں موصول ہونا شروع ہوئیں کہ وقت کے ہر لمحہ کے ساتھ مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی جارہی ہے۔ ان کی عزت و آبرو ختم ہی نہیں کی جارہی ہے بلکہ اُسے پیروں تلے مسلا جارہا ہے۔ چوری چھپے عصمت دری نہیں کی جارہی ہے بلکہ جب جی چاہا، اُسے دن دھاڑے سر بازار لوٹ لیا۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں کی جان کیڑے مکوڑے اور مکھی کی جان سے زیادہ ارزاں ہوگئی تھی۔ شیر کا ہا کہ نہیں بلکہ مسلمان کا ہا کہ جب جی چاہا گھیرا ڈال کر کیا اور اپنے بے بس شکار کو تیر، بھالا، تلوار، کلہاڑی اور لاٹھی سے مار ڈالا۔ اس سفاکانہ قتل و نیست و نابود کرنے والی مہم کا واحد سبب یہ تھا کہ یہ وہ گردن زدنی مسلمانانِ ہند تھے جو کلمۂ حق بلند کرنے میں پیش پیش رہے اور حصولِ پاکستان میں دوسروں کے مقابلہ میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مصیبت کی داستانیں اتنی دلخراش

اور اتنی بڑھتی جا رہی تھیں کہ وزیرِاعظم کا دردمند دل بہت دُکھا۔ ان کے زوردار بیانات اور پُرزور تحریر کا جب ہندوستانی حکومت اور سنگ دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اُنہوں نے ان حالات میں بالمشافہ گفتگو کو بہتر سمجھا۔ قائدِاعظمؒ کے انتقالِ پرملال کے بعد پاکستان میں وزیرِاعظم کو واحد دنیاوی سہارا سمجھا جاتا تھا، لہٰذا پاکستانی اتنی قیمتی جان کو یقینی خطرہ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہر سمت سے مخالفت ہوئی۔ زبانی و تحریری احتجاج کئے گئے لیکن وزیرِاعظم کو اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو اُن لاکھوں معصوم جانوں کو خطرہ سے نکال کر اُن کی جان و مال و عزت کی حفاظت و ضمانت چاہتے تھے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے اور بزرگانِ دین کی دعاؤں کے ساتھ امن و آشتی کے جہاد پر روانہ ہوئے۔ بھارت کے راشٹر بھون میں ٹھہرائے گئے۔ اُنہوں نے خوشگوار فضا قائم کرنے کے لئے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جا کر پھول چڑھائے۔ کانگریس کے مردِ آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل کی جو مرضِ دل کی آہنی گرفت میں موم سے زیادہ نرم ہو گئے تھے، عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ وزیرِاعظم کے اس اسلامی اور شریفانہ فعل سے سردار پگھل کر رہ گئے اور لیاقت نہرو معاہدہ کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ دورانِ قیام راشٹر یہ بھون کے دو طویل و عریض کمرے دکھلائے گئے جنہیں عجائب خانہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہاں موہنجوداڑو کے وہ تاریخی اور قیمتی عجائبات جو پاکستان بننے سے قبل پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بہانہ سے دِلّی منگوائے تھے کہ اس کی نمائش کی جائے گی موجود تھے اور وہ خاص طور پر نواب زادہ صاحب کو دکھلائے گئے۔ ہندوستان کو ہمارے ان عجائبات کے رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن جو ملک کشمیر جنت نظیر پر عالمی رائے عامہ کو ٹھکرا کر اور اپنے حتمی وعدوں کی کھلی خلاف ورزی کر کے اپنا غاصبانہ قبضہ جمائے بیٹھا ہو، اُسے اخلاقی قدروں کا کیونکر پاس ہوگا۔

لیاقت نہرو معاہدہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ مسلمانانِ ہند اور پاکستانیوں نے چین کا سانس لیا اور تشدد کی پالیسی اور چنگیزانہ رویہ میں نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اس کے بعد نواب زادہ کی زندگی میں ہندوستان میں صرف معمولی فرقہ وارانہ جھڑپیں یا اکے دکے واقعات ہوئے تو نوابزادہ

نے لیاقت نہرو معاہدہ کا حوالہ دے کر ہندوستان کو للکار دیا۔ بس بات آئی گئی ہوگئی اور نواب زادہ کی اہمیت وعظمت کو چار چاند لگ گئے۔ نواب زادہ کی ایک ٹوک بات کو جو وہ جواہر لال نہرو کے لگا تار بیانات کے جواب میں ایک دفعہ کہہ دیتے، اُسے بہت پسند کیا جاتا تھا۔ نہرو جی معاہدہ کے چند مہینہ بعد ملاقاتِ بازدید کے لئے پاکستان تشریف لائے۔ اسلامی مہمان داری میں سرمو فرق نہیں آنے دیا گیا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مزید خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لئے تاکہ مسلمانانِ ہند کو زیادہ سکھ اور چین نصیب ہو، پنڈت جی کو محسوس کرایا گیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کو جتنا خوش رکھیں گے، اتنی ہی پاکستان میں ان کی عزت اور ہر دلعزیزی بڑھے گی۔ ہندوستان میں نواب زادہ کی راست گوئی اور صلح جوئی کی وجہ سے اُن کی مقبولیت یہاں تک بڑھ گئی کہ جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو لال قلعہ میں ایک تعزیتی جلسۂ عام ہوا جس کی صدارت بھارت کے راشٹر پتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی تھی۔ الحاصل نواب زادہ کا دلّی کا دورہ ہر نقطۂ نگاہ سے بہت کامیاب رہا اور وہ اپنے بھارتی مسلمان بھائیوں کی بڑی اہم خدمت کر کے وطن بامراد لوٹے۔

یوں تو لندن میں دولت مشترکہ کانفرنس کا انعقاد ایک معمولی رسمی ونمائشی چیز بن کر رہ گیا تھا لیکن اس مرتبہ ہمارے وزیراعظم نے ٹھان لی تھی کہ وہ اس کانفرنس کے چہرہ سے اُن تمام نقابوں کو اُلٹ کر اس کے اصلی روپ ورنگ کو حق وصداقت کے آئینہ میں دکھلائیں گے' لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کو ضرور اُٹھائیں گے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی رہ جائے۔ جب حکومت برطانیہ کو وزیراعظم کے بدلے ہوئے تیور کا علم ہوا تو تمام برطانوی مشینری حرکت میں آ گئی۔ تفصیلات میں بغیر گئے اتنا بتلا دوں کہ وزیراعظم کی شرکت کے بغیر دولت مشترکہ کانفرنس کا انعقاد اتنا ہی بے اثر ہوجاتا جیسے علاؤ الدین بغیر چراغ کے۔ اس لئے وزیراعظم آسٹریلیا سر رابرٹ مینز یز کو جو لندن کے لئے روانہ ہوگئے تھے، راہ میں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا راستہ بدل کر کراچی پہنچیں یا اگر اس راہ سے سفر کر رہے ہوں تو کراچی میں رُک کر وزیراعظم صاحب کو منا سمجھا کر اپنے ہمراہ لندن لائیں۔ دسمبر 1950ء کے اواخر میں کانفرنس

ہونے والی تھی لیکن کانفرنس کی تاریخ بڑھانی پڑی کیونکہ وزیراعظم نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک کانفرنس کے پیش نامہ میں مسئلہ کشمیر داخل نہیں کیا جائے گا، وہ لندن نہیں جائیں گے۔ بہرحال کئی دن کی بحث وتمحیص و برقی پیغامات کی ادلی بدلی کے بعد حکومت برطانیہ نے ہمارے وزیراعظم کے سامنے سر جھکا کر اُن کے مطالبہ کو منظور کرلیا۔ ہمارے چند کور چشم ملکی بھائی جنہوں نے ہمارے وزیراعظم کے عظیم کارناموں کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، اوچھی اوچھی باتیں کرنے لگے کہ لندن کے جانے میں اس لئے تاخیر ہورہی ہے کہ بیگم صاحبہ کے وہ لباس جو وہ لندن میں زیب تن کرنے والی تھیں، درزی کے تساہل کے باعث وقت پر سل نہ سکے۔ صاحبِ سمجھ نیک بندوں نے ان ہوائی باتوں کو حقارت سے سنا اور کوئی اہمیت نہیں دی۔ میں بھی کوئی تبصرہ کر کے آپ کا وقت کیوں ضائع کروں۔ خبر سنانے کا ضرور گنہگار رہوں لیکن یہ گناہ صرف اس لئے مول لے رہا ہوں کہ آپ کو بتلاؤں کہ وزیراعظم ہمیشہ خشت باری وسنگباری کا نشانہ رہتے تھے اور پھولوں کی سیج کے بجائے ان کا بچھونا کانٹوں کا ہوتا تھا۔

نواب زادہ صاحب نے اس دولت مشترکہ کانفرنس میں تن تنہا اپنا کارِ منصبی بڑی خوبی سے ادا کیا اور سوائے ہندوستانی وزیراعظم کے تمام وزرائے اعظم کو اپنا ہمدرد اور ہم خیال بنایا۔ نہرو جی اپنے بگلے بھگت پنے کو نباہ نہ سکے۔ بہت ہاتھ پیر مارے اور لش ہوکر پڑ گئے کیونکہ فضا، ماحول اور زبانی دوستی کا دم بھرنے والے چندار اکین کی خاموشی کی وجہ سے نہرو جی مغلوب ہو گئے اور نواب زادہ نے کشمیر کے مسئلہ کو جو کھٹائی میں پڑ گیا تھا، زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا جس کی وجہ سے دولت مشترکہ کے دوخود مختار اور غیر جانبدار ملکوں یعنی نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا نے افواج کی پیش کش کی تا کہ ان کے زیرِ نگرانی آزاد ماحول میں باشندگانِ کشمیر الحاق، علیحدگی یا آزادی کے متعلق رائے دے سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ پنڈت نہرو جی نے اس تجویز کو کوئی اہمیت نہیں دی یا اپنی ضدی عادت کے مطابق کہ ''میری مرغی کی ایک ٹانگ'' کہہ کر لاکھوں کی آزادی کے معاملہ کو ہٹلرانہ انداز میں ختم کردیا لیکن یہ تو حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نواب زادہ نے

کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی ہمیشہ سعیٔ بلیغ کی اور وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

کشمیر کے متعلق ابھی تک دو باتیں منظر عام پر نہیں آئی ہیں اور ابھی تک پس پردہ ہیں۔ آج میں وہ پردہ ہٹا دینا چاہتا ہوں۔ ہماری شومیٔ قسمت پر جتنا افسوس کیا جائے اتنا ہی کم ہے کیونکہ ہماری کمند اُس وقت ٹوٹ گئی ''دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا۔'' واقعہ یوں ظہور پذیر ہوا جس کا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اب تو اُس کا ذاتی علم رکھنے والے بھی چند لوگ رہ گئے ہیں۔ شیخ عبداللہ صاحب اپنے پرانے رفیق' بھارت کے مہامنتری پنڈت جواہر لال نہرو سے کشمیر کا مسئلہ طے کرنے دہلی تشریف لے گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے اپنے ایک نہیں بلکہ اُس زمانہ کے دو دستِ راست کو لاہور بھیجا۔ اُس وقت قائداعظمؒ کراچی میں تھے۔ یہ کشمیری رہنما (1) بخشی غلام محمد اور (2) جی ایم صادق ممدوٹ ولا ڈیوس روڈ میں نواب صاحب ممدوٹ کے مہمان ہوئے۔ اگرچہ مدت مدید گزر گئی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی بات ہے اور اس لئے بھی شیر کشمیر کے نمائندوں کے نام اور اُن کا حلیہ تک میرے لوحِ حافظہ پر ابھی تک محفوظ ہے۔ قیاس آرائی و مشتبہ بیانی میرا شیوہ نہیں۔ میں مقتدر میزبان سے لاہور جا کر ناموں کی مزید تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ آج اور کل کرتا رہا، وہ کل نہیں آئی اور اب تو کبھی نہیں آئے گی۔ ایک دن اپنے تساہل اور ٹال مٹول پر سر پیٹ کر بیٹھ گیا۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور میجر شوکت حیات بھی روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن میں ان کی بے پناہ سیاسی مصروفیتوں اور نواب صاحب ممدوٹ کے اب صرف قیامت کے دن ملنے کی وجہ سے لاہور نہیں گیا اور نہ اب مجھے زیادہ چھان بین کی ضرورت باقی رہی ہے۔ نواب صاحب ممدوٹ کا نام لیتے ہی کئی واقعات کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ علیگڑھ و حیدرآباد کے قیام نے ان کو معہ وراثتی پنجابی کلچر تین کلچروں کا مالک بنا دیا تھا اور ان سب کی خوشگوار آمیزش سے ایک ایسے لطیف دل موہ لینے والے کلچر نے ممدوٹ ولا میں جنم لیا جو نواب صاحب کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بول چال میں بڑے نمایاں طور پر ہمیشہ ظاہر ہوتا تھا۔ ان کی مقناطیسی شخصیت خوش خلقی' انسانیت و ہمدردی ہر کس و ناکس کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور ہر

ملنے والا اُن سے بار بار ملنے کا خواہشمند ہوتا تھا۔صوبائی و آل انڈیا سیاسی جنگ میں اُنہوں نے بڑے خلوص و بلند حوصلے سے حصہ لیا۔آخری سیاسی دوڑ میں ممدوٹ ولا کا 10-اورنگ زیب روڈ اور 8-بی ہارڈنگ اے وینیو کے بعد تیسرا نمبر تھا حالانکہ پنجاب میں اُس کا پہلا نمبر تھا۔قائداعظمؒ اور قائد ملت لاہور میں ہمیشہ نواب صاحب کے مہمان ہوتے اور مجھ جیسے بے بضاعت آدمی کو بھی وہ محبت بھرے شدید اصرار کے ساتھ ہمیشہ ممدوٹ ولا میں ٹھیرا کر عزت بخشا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ ان کو بہت چاہتے تھے اور اگر کچھ عرصہ زندہ رہ جاتے تو نواب صاحب کو کسی صوبہ کا گورنر بناتے جس کے لئے قائداعظمؒ ان کو بالکل اہل اور انتہائی موزوں سمجھتے تھے۔ممدوٹ وِلا میں کئی اہم اور تاریخی فیصلے مسلم لیگ کے نظام اور حصولِ پاکستان کے سلسلے میں کئے گئے۔الحاصل ہمارا پاکستان نواب صاحب ممدوٹ اور ان کے والدمحترم نواب سر شاہنواز خان مرحوم و مغفور کا ہمیشہ رہینِ منت رہے گا۔

نواب صاحب ممدوٹ وزیراعلیٰ پنجاب نے میرے ذریعہ وزیراعظم کو جو ان دنوں لاہور میں مقیم تھے،ان نمائندوں کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔میں بحکم وزیراعظم ان مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہنے اور مزاج پرسی کرنے ممدوٹ ولا پہنچا تو میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کیونکہ نواب صاحب نے فرمایا کہ شیخ صاحب نے اپنے دونوں ساتھیوں کو فوراً دہلی طلب فرما لیا ہے اس لئے کہ پنڈت جی نے شیخ صاحب کے تمام مطالبات مان لئے ہیں۔ایک موقعہ اور آیا جب کہ کشمیر کے الحاق کے بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل نے پنڈت جی کو نیچا دکھانے کیلئے یہ پیش کش کی کہ اگر قائداعظمؒ (1) جونا گڑھ،مانا ودر اور منگرول کے تسلیم کردہ الحاق کو مسترد کردیں اور (2) ریاست حیدرآباد دکن کی حمایت نہ کریں تو وہ اس معاملہ کو آگے بڑھائیں۔ پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس قسم کی موہوم انفرادی ڈنڈی مارنے والی سودابازی سے مسئلہ کشمیر کا اصلی حل نہ نکلتا۔ دوئم جونا گڑھ وغیرہ کا الحاق ایک موعودہ حقیقت اور طے شدہ امر تھا۔سوئم پاکستانی فریق جو خاتم المرسلین کا پیرو تھا،وہ کیونکر بدعہدی کرتا جب کہ اُس کے رہبر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح

حدیبیہ کی پانچویں شرط کے مطابق ایفائے وعدہ میں حضرت ابوجندلؓ کو پابہ زنجیر واپس کر کے ایک ایسی شاندار مثال قائم کی تھی جسے ہر انصاف پسند انسان ہمیشہ دل سے سراہے گا۔ کیا آپ بھول گئے کہ حضورؐ نے ایفائے عہد کے پیش نظر ابوجندل کی طرف دیکھا اور فرمایا تھا ''ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام لو۔ خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے'' (سیرۃ النبیؐ حصۂ اول۔ صفحہ 421)۔ علاوہ ازیں قائداعظمؒ جیسے قانون دان اور اصول پسند انسان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ایسی ناز یبا اُمید فردا اور ٹلّہ بازی کی باتوں میں آ کر اپنے وعدہ وعید کا اس طرح خون کرتے۔ کاش ہمارا کشمیر علامہ اقبالؒ کی 1930ء کی تجویز کے مطابق پاکستان میں شامل ہو جاتا اور بڑی طاقتوں کی سیاسی مصلحتوں کا شکار نہ بنتا۔ مسئلہ کشمیر ہنوز کھٹائی میں پڑا ہوا ہے اور اُسے بین الاقوامی بساط شطرنج پر چند بڑی طاقتوں کے ماہر کھلاڑیوں نے ایک ناکارہ مہرہ بنا کر ایسے خانہ میں رکھ دیا ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھ کر بازی نہیں جیت سکتا۔ کشمیر کے سلسلے میں قائداعظمؒ کی رائے عالیہ بھی سن لیجئے اور دیکھئے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کو کتنا اہم سمجھتے تھے: ''کشمیر سیاسی اور فوجی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خوددار ملک اور قوم اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کر دے۔ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ ایک ایسا حصہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

میں اپنے دیرینہ کرمفرما دوست جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک مختصر سی نظم بعنوان ''خون کے چراغ''، جس میں اُنہوں نے اُستادانہ و ماہرانہ اندازِ لطیف میں سرزمین کشمیر کی خونیں داستان کی عکاسی کی ہے، پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ وہ شاعرِ اسلام ہیں جن کا شاہنامۂ اسلام اور ''قومی ترانہ'' دو ایسی اہم تاریخی یادگاریں ہیں جنہوں نے اُنہیں زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ دُنیائے اسلام اور دُنیائے پاکستان ان کو ان کے ان دو شاہ پاروں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

خون کے چراغ

سرخ پھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے لالہ رو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار
معرکہ اس خاک پر گزرا ہے دار و گیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے شمشیر کا
لالہ رویہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ
ہم نے اپنے خون سے روشن کئے ہیں یہ چراغ
سرفروشو ان چراغوں سے ضیاء لیتے ہوئے
آگے اور آگے بڑھو نام خدا لیتے ہوئے

جیسے فلسطین اسلامی ممالک کی شہ رگ ہے، ویسے ہی کشمیر پاکستان کے لئے ہے۔ یہ دونوں مسئلے یہودیوں اور ہندوؤں کی ہٹ دھرمی، زبردستی اور ہوس جہانگیری کی وجہ سے طے ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مسلمانوں کا احتجاج، ان کی چیخ و پکار گویا ایک فلک بوس آہنی دیوار سے ٹکرا کر بے اثر لوٹتی ہے مگر فضا میں برابر گونجتی رہتی ہے۔ بڑی طاقتوں کی یہود اور ہندونواز پالیسی و پشت پناہی سے ان کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے غاصبانہ قبضوں سے دستبردار ہونے کے بجائے مزید ملک گیری کے خوابوں کو حقیقت سے بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہم دیدہ و دانستہ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ عالمی رائے عامہ جس دن ہمارے موافق ہو جائے گی، ہمارے مقبوضات بغیر کسی جدوجہد کے ہمیں واپس مل جائیں گے۔ ہمیں یہ طفل تسلی بھی دی جاتی ہے کہ اگر حالات سازگار ہو جائیں اور ہماری فوجی تیاری مکمل ہو جائے تو ہم جب چاہیں، اپنے

علاقوں کو خالی کرا سکتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے کچھ پٹھو یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ میاں جہاں بیٹھے ہو بس اُسی کو اپنے ملک کی نئی سرحد سمجھو۔ الحاصل جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ قول و عمل کبھی ایک دوسرے کا آمنا سامنا نہیں کرتے اور نہ آنکھ سے آنکھ ملاتے۔ انہیں ہمیشہ ایک دوسرے سے گریزاں پایا گیا ہے۔ آج تک خالی خولی باتوں سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہم نے فلسطین، کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ، مانا ودر، منگرول وغیرہ کے متعلق انفرادی اور مجموعی طور پر اتنی باتیں کی ہیں کہ جس کا کوئی حساب نہیں۔ اس قسم کی یہ بے اثر، بے معنی اور بے نتیجہ باتیں ہمیں مقصد اعلیٰ سے دُور ہٹاتی جاتی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایک دن ہم اپنے اس مقصد کو بھول جائیں۔ غازی صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی کی آمد کا انتظار ''دل کو بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے۔'' کسی کے بھروسہ پر کبھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ علامہ محمد اقبال والا ایقان پیدا کریں تو پھر کچھ کام بن جائے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ گالی دینا، کوسنا، بددعا کرنا مجاہد کا وطیرہ نہیں۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا یا کوئی توقع وابستہ کرنا مومن کا دستور نہیں۔ مومن تو بقول علامہ اقبال بغیر تیغ کے بھی لڑتا ہے۔ مومن تو اقلیت میں ہو کر ارشادِ ربانی کے مطابق اکثریت سے مقابلہ کرنے پر فتحیاب ہوتا ہے۔ مومن تو فاقہ کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑتا ہے۔ مومن تو کئی دن تک پیاسا رہ کر لڑتا ہے۔ مومن تو شیر خوار بچہ اور کڑیل جوانوں کی قربانی دیتا ہے۔ مومن تو باطل کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ مومن تو حق و صداقت کے لئے سر کا نذرانہ دیتا ہے۔

حسین کا سر ہے آسماں پر کہ رہ چکا تھا کبھی سناں پر
تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو

(ظفر علی خان)

وزیر اعظم کے امریکہ کے مئی و جون 1950ء کے دورہ کو عرفِ عام میں خیر سگالی کا

دورہ منسوب کیا گیا لیکن درحقیقت آپ مانیں یا نہ مانیں، میں تو اُسے تبلیغی دورہ کہوں گا۔ اپنے بیان کے ثبوت میں ان کی تقاریر کا وہ مجموعہ جو موسوم بہ ''پاکستان: دی ہارٹ آف ایشیا'' مطبوعہ ہارورڈ یونیورسٹی پریس پیش کیا جا سکتا ہے اور اگر آپ زحمت مطالعہ گوارا کریں تو پہلے صفحہ سے آخر صفحہ تک اسلام کی تبلیغ، قیامِ پاکستان کے وجوہ، قائداعظمؒ کا ذکرِ خیر وان کی شاندار اسلامی خدمت اور نئی اسلامی فلاحی مملکت کی تشکیل اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کا ذکر پائیں گے۔ نواب زادہ نے اپنی ایک تقریر میں مملکت پاکستان میں کیسا منصفانہ معاشی اسلامی نظام ہوگا بڑے پسندیدہ انداز میں اس طرح واضح کیا کہ اگر کوئی خیرات بانٹنے جائے تو کوئی حاجت منداور مفلس اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھے گا کیونکہ وہ خوش حال اور آسودہ خاطر ہوگا۔

فیض بخشی پہ کریم آیا گدا ملتا نہیں

نوابزادہ صاحب کے اسلامی نظریات، ان کے شاندار کارنامے اور ان کی عظیم قربانی کے پیش نظر ان کے پاک کفن پر گندگی پھینکنا انتہائی ذلیل فعل ہے لیکن چند لوگ عوام کو بیوقوف بنانے اور اپنی برتری وفضیلت کا ڈنکا بجانے کے لئے کہتے ہیں کہ ان کھوٹے سکّوں کو جو اُنہوں نے اپنی دروغ گوئی کی ٹکسال میں ڈھالے ہیں، کھرا مان لیں اور سقراط کی طرح دیدہ ودانستہ زہر کا پیالہ پی لیں لیکن ان حضرات کو جن میں چند سن رسیدہ اہل شعور اور مذہبی پیشوا بھی ہیں، زیب نہیں دیتا کہ قیامِ پاکستان کے تیئیس سال بعد ہمارے ان مخلص اکابرین کے بارے میں جو تحریک پاکستان کے روحِ رواں تھے کہنا کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلامی آئین کیا ہوتا ہے اور اُنہوں نے اسلامی آئین کے حامیوں کا منہ بند کرنے کے لئے قراردادِ مقاصد پاس کی تھی۔ افسوس یہ لوگ بھول گئے کہ قراردادِ مقاصد دراصل اسلامی آئین کا بنیادی خاکہ تھی جس کی ترتیب و تدوین میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ شومئی قسمت کہ اجل نے انہیں اور نوابزادہ کو ہم سے چھین لیا ورنہ آج ہمارے ملک میں اسلامی آئین مروّج ہوتا۔

بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے بھی امریکہ میں ایک اہم تقریر کی جس میں اُنہوں نے

پاکستانی بہنوں کی سماجی زندگی پر روشنی ڈالی تھی۔ میری ناچیز رائے میں اس موقعہ پر یہ کہنا بالکل بامحل ہوگا کہ محترمہ بیگم رعنالیاقت علی خان نے پاکستان کے قیام کے بعد خواتینِ پاکستان کی وہ وہ خدمات انجام دیں جو بھلائے سے بھی نہیں بھلائی جاسکیں گی اور وہ ایسے تعمیری کام ہیں جو بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم کئے گئے جس سے موجودہ اور آنیوالی نسلیں برابر مستفیض ہوتی رہیں گی۔ ان کی نوعیت تعلیمی، فلاحی، اصلاحی و معاشی ہے جس سے سوسائٹی کا پسماندہ طبقہ اپنی زندگی کو سنوار بنا رہا ہے اور ہمیشہ سنوارتا اور بناتا رہے گا۔ دراصل ان کی یہ عظیم ٹھوس خدمت ملک کی خوشحالی و ترقی میں آگے کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ میں تمام تفصیلات میں جاکر ہر چیز کا جائزہ لوں لیکن وقتِ اشاعت اتنا کم رہ گیا ہے اور کتاب کے کورے اوراق بھی اتنے کم بچ گئے ہیں کہ مدعائے دل پورا نہیں ہوسکتا۔ بہرحال دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی رائیگاں کر کے اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ ابتدا میں بیکس مہاجر عورتوں اور بیواؤں کے لئے صنعتی ادارے کھولے گئے، ابتدائی طبی امداد کا بندوبست کیا گیا، بچوں کی تعلیم کے لئے سڑک کے پلوں اور نیم کے درختوں کے سائے میں مدرسے کھولے گئے۔ اگر واقعی یہ دریافت کیا جائے کہ مصیبت زدہ، بے سہارا لوگوں کے لئے بیگم صاحبہ نے کیا کیا نہ کیا تو بیجا نہ ہوگا اور یہ سب کچھ خدمت بیگم صاحبہ کی ذی شان قیادت کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے ان تمام نیکی کے کاموں کو انجام دینے کے لئے ادھر اُدھر سے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر خواتین کو اپنا رفیق کار بنایا اور ان کی صلاحیتوں کو جگایا۔ قائدملت نے بھی ان تمام رفاہی کاموں کی بحیثیت وزیراعظم سرپرستی کی۔ اس سے کام کرنے والوں کے حوصلے بہت بڑھے اور بیگم صاحبہ نے کتنی ہی مفید ترقی و بہبود کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنایا اور نئے نئے اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اپوا، پاکستان ویمنس نیشنل گارڈز اور پاکستان ویمنس نیول ریزرو قائم کر کے بیگم صاحبہ نے اپنی انتھک کوششوں، بے نظیر قیادت اور علمی صلاحیتوں سے پاکستانی عورت کا دنیا میں سربلند کیا اور بہت ہی کم مدت میں اس کے لئے بہت ہی اونچا بین الاقوامی مقام حاصل کیا۔ اب تو بالخصوص نوابزادہ صاحب کی دائمی

مفارقت کے بعد اُن کا حاصلِ زندگی صرف خدمت' خدمت' خدمت رہ گیا ہے۔ اللہ انہیں دونوں جہان میں سرخرو کرے۔ ان دونوں بڑی ہستیوں نے بحیثیت مجموعی ''نئی دنیا'' میں اپنے نئے ملک کا بہت پروپیگنڈا کیا اور اُسے بڑی کامیابی کے ساتھ روشناس کرایا۔ حکومت امریکہ نے بھی اس دورہ کو کافی اہمیت دی اور اُسے تاریخی قرار دیا۔ دراصل امریکہ کا دورہ تاریخی بن کر رہ گیا۔ اس طرح بوجۂ احسن خیر سگالی کا کام انجام پذیر ہوا اور اسلامی مملکت کا ممتاز نمائندہ اپنے ملک کی خدمت اور اسلام کی اپنے طور پر تبلیغ کر کے ہم خرما و ہم ثواب ہونے کا مستحق ہو گیا۔ بمصداق چراغ سے چراغ جلتا ہے، امریکہ کے پڑوسی ملک کینیڈا کا بھی مختصر سا دورہ کیا۔ وہاں بھی ان ہی خطوط پر کام کیا گیا جس کا لائحہ عمل امریکہ کے دورہ کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔ کینیڈا میں بھی وزیراعظم اور ان کی بیگم کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دونوں پاکستان کے متعلق نہ مٹنے والے گہرے اثرات نئی دریافت کردہ نئی دنیا میں بھی چھوڑ آئے۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ نواب زادہ صاحب کو کولمبیا یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف لٹریچر کا اعزاز ملا۔ دورہ کی شاندار کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے وزیراعظم کا شمار مشاہیر عالم میں ہونے لگا جو دراصل ہماری نئی مملکت اور اس کے باشندوں کے لئے سربلندی کا باعث بنا۔

چند پاکستانیوں نے اب اپنے منہ کھولے ہیں۔ کاش وہ صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد الزام تراشی کرتے تو بہتر تھا لیکن اپنے ملک میں چند لوگ بے پر کی اُڑانے کی خوئے بد میں مبتلا ہیں۔ وہ کیسے چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے آجکل یہ اڑائی ہے کہ وزیراعظم نے امریکہ کے دورہ کو روس کے دورہ پر ترجیح دی اور بجائے روس جانے کے امریکہ چلے گئے۔ یہ بات حقیقت سے اُتنی ہی دور ہے جیسا کہ کوہِ مردار (کوئٹہ) سے بحر مردار۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں روس کی دعوت عام نہیں ہوتی تھی۔ دعوت بہت کم دی جاتی تھی اور دنیا کی بہت مخصوص شخصیتوں کو کبھی کبھار یہ اعزاز بخشا جاتا تھا۔ اس دعوت کی بھی انوکھی داستان ہے۔ آپ بھی سنیں۔ جس زمانہ میں ہمارے بزرگ رہنما راجہ غضنفر علی خاں صاحب ایران میں سفیر

تھے، وہاں کسی استقبالیہ یا عشائیہ میں روسی سفیر نے راجہ صاحب سے دریافت کیا کہ اگر تمہارے وزیراعظم کو رُوس جانے کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کریں گے یا نہیں۔ راجہ صاحب کی یقین دہانی پر کہ بڑی خوشی اور شکریہ کے ساتھ روس کی دعوت قبول کی جائے گی تو حکومت روس نے دعوت نامہ بھیجا۔ وزیراعظم نے اس دعوت کو بہت اہم قرار دے کر فوراً تیاریاں شروع کر دیں۔ ہمراہیوں کا انتخاب بھی فرمایا اور اُن میں سے چند کو روس کی سخت سردی کے پیش نظر موٹے گرم کپڑے بنوانے کے لئے پیشگی رقومات بھی دی گئیں۔ الحاصل تیاریاں مکمل ہوجانے کے بعد دورۂ رُوس کی تعین تاریخ کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ بدنصیبی سے روسی حکومت نے یومِ آزادی 14 اگست یا اس کی قریب لگ بھگ کی تاریخ تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ وزیراعظم 14 اگست کی تقریب اور ملک کو چھوڑ کر اس اہم و نازک موقعہ پر باہر نہیں جاسکتے تھے کیونکہ قائداعظمؒ کے سانحہ ارتحال کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اور ان کے داغِ مفارقت سے جو خلاء واقع ہوگیا تھا، وہ ہنوز بری طرح محسوس کیا جاتا تھا۔ ان گونا گوں مشکلات میں وزیراعظم دورہ کی تبدیلئ تاریخ کے خواہشمند تھے لیکن افسوس ہے کہ اُن کی آرزو ان کی زندگی میں مرہون تکمیل ہونے نہ پائی۔ شہید ملت کی جیسی عظیم المرتبت ہستی جسے پاکستان کے لوگوں نے قائداعظمؒ کی زندگی میں ان کا دست راست مانا اور ان کی وفات کے بعد انہیں ان کے شاندار کاموں کی بدولت ان کا صحیح جانشین تسلیم کیا اور اپنی اُمیدوں کا واحد سہارا اور اپنے اعتمادِ کلی کا واحد امین سمجھا لیکن باوجود اس کے ایسے بھی چند لوگوں سے میں دوچار ہوا جن کی ذہنیت کو سمجھنے سے آج تک قاصر ہوں۔

میں چند واقعات پیش کروں گا جو صاف ظاہر کر دیں گے کہ معترضین کے انتہائی لغو اعتراضات صرف گمراہ کن ہی نہیں بلکہ تخریبی بھی ہیں۔ ہمارے کچھ وہ متفنی ومفسد لوگ جو علم کی دولت سے مالا مال ہیں، کچھ وہ لوگ جو سیدھا راستہ ترک کر کے پگڈنڈیوں پر چل کر تجارت اور صنعت وحرفت کے ذریعہ دولت بٹورنا چاہتے ہیں، کچھ وہ دولت مند لوگ جو اعلیٰ حکام کی قربت و

دوستی کے زینہ سے اوپر چڑھ کر اپنی دولت' عزت وشہرت کو بڑھانا چاہتے ہیں، کچھ وہ لوگ جو پیدائش ہی سے برسر اقتدار لوگوں کی اُس وقت تک پوجا کرتے ہیں جب تک وہ کرسی نشین رہتے ہیں اور جب دوسرا جانشین آ جائے تو اُس کے جوتے اٹھا کر اپنے سر پر رکھنا باعث عزت سمجھتے ہیں۔ کچھ وہ لوگ جو رشک وحسد وکینہ کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، کچھ وہ لوگ جو للّہی بغض کے مہلک مرض میں مبتلا ہیں، کچھ وہ شپّرہ چشم لوگ جنہیں سرے سے دن میں روشنی نظر ہی نہیں آتی، کچھ وہ لوگ جن کا شر پسندی زندگی کا مشن ہے، کچھ وہ لوگ جن کی غذا تخریبی کام ہے، ہمارے معاشرہ میں پائے جاتے ہیں اور اس قسم کے لوگ ہر سوسائٹی، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے ایک لاعلاج رستا ہوا ناسور ہیں۔ ایسے لوگ ماضی میں بھی تھے، حال میں بھی ہیں اور مستقبل میں بھی رہیں گے ۔

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

(قتیل شفائی)

ختمی مرتبت نے بیت اللہ سے بڑے اور چھوٹے بتوں کو توڑ کر باہر پھنکوا دیا تھا تا کہ بلا شرکت غیرے اللہ کی وحدانیت کو بے چون وچرا تسلیم کیا جائے اور تمام ذہنی واخلاقی برائیاں دُور ہو جائیں لیکن چند دلدادگان لات وہبل نے خودسری' خودبینی' خودغرضی' رشوت خوری' حرص و آز' ذخیرہ اندوزی' چور بازاری' ایمان فروشی' خوف خدا وآخرت سے بے نیازی اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ سے دوری کی مورتیوں کو اپنے دل کے مندر میں بطور یادگار بٹھلا لیا ہے۔ یاد رکھئے جب تک ان مورتیوں کی حکمرانی ختم نہیں ہوتی یا جب تک ہم انہیں نکال نہیں پھینکتے، اُس وقت تک ہم نبی صلعم کے سچے پیروکار نہیں بن سکتے اور نہ ہم مومن کہلانے کے مستحق ہیں۔ ہمارا عمل اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے اُسوۂ حسنہ پر ہونا چاہئے تا کہ ہماری زندگی کامیاب اور حشر بالخیر ہو۔ ماتم اس بات کا ہے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے ہیں اور اپنے کو دانشوروں میں سمجھتے ہیں لیکن باتیں غیر دانشمندانہ اور بعید از صداقت کرتے ہیں جس سے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور جس

کے بارے میں یہ بے پر کی باتیں کہتے ہیں، اس کی عظمت کو جب تک یہ الزام عقل کی ترازو میں تولا نہ جائے، بلاوجہ ٹھیس لگتی ہے۔ آیئے آپ بھی اختصار کے ساتھ سن لیجئے کہ ان لوگوں نے اپنے وزیراعظم کو کیا کچھ نہیں کہا۔ چلئے آپ کو یونیورسٹی گراؤنڈ کی سیر کرائیں۔ آج وزیراعظم زندہ دلانِ پنجاب کو مخاطب کرنے والے ہیں۔ اطلاع مل گئی تھی کہ جلسہ میں ہڑبونگ ہونے والی ہے۔ داتا کی نگری کے ان گنت مشتاقانِ دید اور سمجھدار لوگ اپنے وزیراعظم کو سننے آئے تھے۔ شر پسند چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو کر جلسہ گاہ میں پھیلے ہوئے ایسے مورچوں پر قابض تھے جہاں سے وہ کامیابی کے ساتھ شرارت اور جلسہ کی کارروائی میں بیجا مداخلت کر کے جلسہ کو درہم برہم کر دیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ تالاب کے پانی کو چند مچھلیاں ہی گندا کرتی ہیں۔ چند فساد کرنے والے عناصر اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ ان کا جمہوریت پسند وزیراعظم جو قوم و ملک کا مسلمہ رہنما بھی ہے، پولیس کی دخل اندازی و تشدد کو کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ اس احساس نے اُن کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ انتشاری قوت کو تیز تر کرنے کے لئے مہمیز کا کام دیا۔

وزیراعظم کے مائکروفون کے سامنے تشریف لاتے ہی طاغوتی ٹولیاں جو ایک منظّم سازش کے تحت مورچے سنبھالے بیٹھی تھیں، برسرِ پیکار ہو گئیں۔ اُنہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک غیرت مند، آزاد مسلم قوم کے افراد کو نہ کرنا چاہئے تھا۔ اُنہوں نے آوازیں کسنے اور مغلظات بکنے کا ایک کھلا مقابلہ کیا اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی بڑی دیر تک مسلسل کوشش کرتے رہے۔ جب جوش زیادہ بڑھا تو وفورِ جذبہ تضحیک و سفلگی میں مبتلا ہو کر بھنگڑا ناچ بھی ناچنے لگے۔ جب انہیں اس فنی مظاہرے سے بھی پوری پوری تسلی نہیں ہوئی تو اُنہوں نے بے حیائی کا آخری حربہ بھی استعمال کیا یعنی بھنگڑا ناچ کو زیادہ دلکش بنانے کے لئے آپے سے اتنے باہر ہوئے کہ جامے سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ سمجھدار شریف شرکائے جلسہ انگشت بدنداں، بے بسی کے عالم میں ندامت سے سر جھکائے خون کے گھونٹ پیتے بیٹھے رہے۔ وزیراعظم مائک کے سامنے سگریٹ کے کش پر کش لگاتے بے پیسہ کا بیہودہ تماشہ لاپرواہی سے دیکھتے اور مجسمۂ استقلال

بنے ہوئے اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑے رہے۔ آخر وہ ہی ہوا جو ہونا تھا۔ بالآخر شیطانی قوتوں نے شکست مان لی اور حق وصداقت کا بول بالا ہوا۔ وزیرِاعظم نے ایک طویل لیکن ایسی معرکتہ الآ راتقریر کی جو سامعین کے حافظہ میں تا زیست محفوظ رہے گی اور دوران وبعد جلسہ ''قائدملت زندہ باد'' کے نعرے جو پیہم بلند ہوئے، اُمید ہے کہ وہ بھی فضا میں تا قیامت محفوظ رہیں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہر دور میں اُنہوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو اُس ہی شخص سے زیر ہوتے ہیں جو انہیں منہ نہیں لگاتا اور نزدیک پھٹکنے نہیں دیتا۔ ایسے ایمان فروش لوگ بغیر ہینگ و پھٹکری کے صاحبِ اقتدار کو دبیر الملت' محافظ ملت' قائدِاعظم ثانی' پاسبان ملت وغیرہ وغیرہ لقب بخشتے ہیں اور اس طرح ہمارے نیک نام و نیک نہاد مرحوم اکابرین کا اپنے خوشامد پسند نااہل آوردوں سے موازنہ کرتے ہیں۔ یہ کوڑھ مغز وکور چشم بھول جاتے ہیں کہ ان کے آوردہ عہدہ کے ساتھ جنم لیتے ہیں اور جب عہدہ چھن جاتا ہے تو وہ حرام موت مر جاتے ہیں اور اُن پر کرایہ کے رونے والے چار آنسو بہانے کو بھی نہیں ملتے۔ وہ شخص زندہ ہے جو خدمت خلق کر کے اللہ سے قریب اور ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے۔ سوالی بن کر آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا نواب زادہ اُن میں سے ایک نہیں ہیں؟

اس باب کے اختتام پر ان چند تلخ باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو زبان زدِ عام اور اخباروں کے اوراق کی سرخیاں بنی ہوئی ہیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے، چند شرپسند اپنا سر اٹھا رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کی رگ و پے میں صوبائی عصبیت کا زہر سرایت کر گیا ہے۔ چند وہ ہیں جو نورِ سحر کو شب دیجور کہتے ہیں۔ چند اُن منافقین جیسے ہیں جو دل سے نہیں بلکہ صرف زبان سے ایمان لائے۔ چند امن کے بجائے انتشار چاہتے ہیں۔ چند ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغِ دارد'' کی مثال ہیں۔ ایسے لوگ منافرت پھیلانے، حقیقت کو مٹانے، تحقیر کرنے۔ بیزاری کا اظہار کرنے اور مصیبت کے ماروں کو خانہ بدر کرنے کے لئے مختلف بہروپ

بھر رہے ہیں۔ چونکہ وہ شتر بے مہار ہیں، اس لئے جس طرف منہ اٹھایا، چل پڑے۔ آجکل ہمارے دیس میں ڈاکٹر گوئبلس کی اعصابی جنگ اُن مارے کھدیڑے لوگوں کے خلاف شروع کی گئی ہے جو وطن سے بے وطن ہوئے، کافروں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مال و دولت اور گھر بار کو لٹا کر اس نئے وطن میں آئے جس کی بنیادوں کو اُنہوں نے اپنی مردہ لاشوں سے پاٹ دیا تھا، جس کی دیواروں اور چھتوں میں انہوں نے اپنے شیرخوار بچوں' نورس کلیوں' دودھ پلانے والی ماؤں، کڑیل جوانوں اور کنواری بیٹیوں کے خون کو چونے اور گارے میں محلول کر دیا تھا۔ آج وہ آپ سے اپنے ایثار و قربانی کا معاوضہ اور بخشش نہیں چاہتے۔ وہ تو صرف اپنی قوت سے کمائی ہوئی روٹی عزت کے ساتھ کھانا چاہتے ہیں اور آپ سے شرافت و انسانیت کے برتاؤ کے متوقع ہیں۔ وہ عزت نفس اور چین کی نیند سونا چاہتے ہیں لیکن ان کے بارے میں شب و روز دل آزار باتیں جو دل کو چھلنی کر دیتی ہیں، کہی جا رہی ہیں۔ علاوہ ازیں پرانے سیاست دانوں کی جن میں ہمارے صف اوّل کے رہنما جو قائداعظمؒ کے رفقائے کار بھی رہ چکے ہیں، ان کی وہ تضحیک و تذلیل کی جا رہی ہے کہ الامان والحفیظ۔ ان بیچاروں کے پیچھے تو چند ہوس پرست اقتدار کے بھوکے بڑے لوگ اور ان کے مکبر الصوت ساتھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اُن قابل قدر اور محسن عوام کو جنہوں نے خون پسینہ ایک کر کے پاکستان دلوایا تھا، اپنی ہٹلرانہ ذہنیت کے پیش نظر انہیں نااہل قرار دیا گیا اور ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً فتوے پر فتوے صادر ہوتے رہے یہاں تک کہ ایک دن بھونڈے الفاظ میں اعلان بھی کر دیا گیا کہ پاکستان کے عوام جمہوریت کے لائق نہیں ہیں۔

ایک خودساز ''سورما'' نے عرصہ تک یہ رٹ لگائی تھی کہ ''ہمچو من دیگرے نیست'' اور بار بار للکارتا تھا کہ اگر تم میں دم خم ہے تو میرا جیسا آدمی لے آؤ' میں ہر میدان سے ہٹ جاؤں گا۔ وہ شخص ''زندہ باد'' کے نعروں کو بہت پسند کرتا تھا اور ''آمنا و صدقنا'' کہنے والوں کو ہمیشہ چھاتی سے لگاتا اور انعام دیتا تھا لیکن ایک دن دنیا نے اطمینان کا سانس لے کر دیکھا اور محسوس کیا، ہٹلر آیا اور چلا گیا اور ایسا گیا کہ اُس کی لاش کا تک پتہ نہیں لگا۔

غرور تھا نمود تھی ہٹو بچو کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

ایک مکتبِ سیاست نے عرصہ تک صبح و شام طوطے کی طرح رٹ لگائی کہ پرانے سیاست دانوں کو اُس کے لئے میدان خالی کر دینا چاہئے کیونکہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ویسے تو اس نئے ملک میں بہت سے پرانے لوگ نانِ جوین کی فکر اور گوشۂ عافیت کی تلاش میں بہت پہلے ہی سوائے چند کے میدان سے ہٹ گئے تھے۔ اب وقت کے کروٹ لیتے ہی اس ناتجربہ کار نئے سیاستدان نے بھی کروٹ بدلی اور پرانے سیاست دانوں کو جنہیں چند دن پہلے وہ نااہل سمجھتا تھا، اپنی ٹیم مضبوط بنانے کے لئے دعوت پر دعوت دے رہا ہے۔

ایک دانشور نے اپنے منہ سے پھول جھڑاتے ہوئے فرمایا تم خود کو معمارِ پاکستان کہتے ہو۔ لو ہم بھی مانے لیتے ہیں۔ چلو تمہارا مشن ختم ہوا۔ جہاں سے تم آئے تھے، وہاں چلے جاؤ کیونکہ دنیا میں کوئی بھی معمار مکان بنا کر اُس میں رہائش اختیار نہیں کرتا۔

ایک سیاسی بازیگر جو اپنے زعم باطل میں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ''بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے'' فرماتے ہیں کہ پاکستان میں تباہی و بربادی اور انتشار ان لوگوں کی بدولت پایا جاتا ہے جو پاکستانی الاصل اور پاکستانی النسل نہیں ہیں لیکن اعتراض کرتے وقت وہ صاحب بھول گئے کہ وہ خود ہندوستانی الاصل و نسل ہیں۔ دیگر معنوں میں ان کا یہ کہنا ہے کہ ناخواندہ مہمان ناپسندیدہ لوگ ہیں۔

ایک دانش مند لیکن ناواقف سیاست جن کا کبھی کسی سیاسی تحریک سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا اور جو اب ہمارے ملک کے بازار سیاست میں کھوٹا سکہ ہونے کے باوجود بک رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان لٹے پٹے لوگوں میں سے چند کے صحیح کردار ادا نہ کرنے سے بہت سی خرابیاں اس ملک میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہیں اور بلاشبہ یہ لوگ موجودہ اور آنے والی نسلوں اور خدا کے سامنے مجرم ہیں۔ دراصل دلّی کی ٹکسالی زبان میں ان صاحب نے چند لوگوں کی

خوشنودی اور اپنی سربلندی کے لئے چوتھے درجہ کی بات کہی ہے۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

(محسن بھوپالیؔ)

اگر اس طرح کی فردِ جرم ہم بدنصیبوں کے خلاف رات دن لگائی جاتی رہے تو عجب نہیں کہ چند تخریب پسند، ابن الوقت، کرسی نشین، غیر ذمہ دار، احسان فراموش اور لبِ ساحل سے قوم کی غرقابی کا تماشہ دیکھنے والے لوگ ایک دن یہ کہنے سے بھی نہیں چوکیں گے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کو بنا کر ہمالیہ جیسی بڑی غلطی کی۔ گزارش ہے کہ ان بدنصیب خانماں برباد جھگی نشینوں اور مخلص خادمان و جاں نثارانِ پاکستان پر رحم فرما کر انہیں ان کی قسمت پر چھوڑ دیجئے۔ وہ بڑے دُکھی اور پریشان حال ہیں۔ خدارا انہیں مت چھیڑیئے۔ آخر وہ بھی دل رکھتے ہیں۔ کہیں مالک حقیقی سے فریاد نہ کر بیٹھیں کیونکہ آخر وہ انسان ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سوائے رحمت اللعالمین کے جب چند پیغمبروں کا پیمانۂ صبر چھلک گیا تھا تو اُنہوں نے بھی رب العالمین سے فریاد کرنے میں پس و پیش نہیں کیا تھا اور یہ اقتضائے بشریت ہے۔

نہ چھیڑو درد مندوں کو نہ جانے دل سے کیا نکلے
بُرا نکلے بھلا نکلے نہ جانے بددعا نکلے

ہر مسلمان ارشادِ خداوندی "**لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ**" سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہمارا ایمان بھی اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ اس کی تکمیل اور جلا ہادیٔ برحق کی بعثت کے بعد ہوئی۔ لہٰذا قرآنی تعلیم اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی مسلمانوں کے لئے جزوِ ایمان و جزوِ زندگی ہے۔ چنانچہ انسانی قدروں کے خلاف کبھی کوئی انسانیت سوز حرکت کسی فرد یا حکومت سے سرزد ہو جائے تو دل چیخ اُٹھتا اور اس کا مداوا چاہتا ہے اور مقتضی ہوتا ہے کہ ایسی سخت تدابیر اختیار کی جائیں کہ آئندہ اس قسم کی ناروا حرکات کا مکمل سدباب ہو جائے۔

زندگی معمول کے مطابق رواں دواں گزرتی ہے لیکن وہ اپنے پیچھے غیر معمولی واقعات کے کچھ ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہے جو ہمیشہ اُبھرے ہوئے رہتے ہیں۔ وقت کا بہتا ہوا دھارا انہیں مٹا تو نہیں سکتا لیکن نظر سے اوجھل کر دیتا ہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ بعد کے کچھ واقعات پر روشنی ڈالوں لیکن جس زمانہ کے حالات قلمبند کئے جا رہے ہیں، وہاں ان کا گزر کہاں۔ اگر یہ دروازۂ خاور کھل سکتا تو یہ کتاب فسانۂ عجائب سے کم نہ ہوتی۔

جب کہ ہم نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ مذہبِ اسلام کے نام پر کیا اور الحمدللہ اسے منوا لیا تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ نظریہ جو ہم نے بدیشی آقاؤں کے زمانہ میں یا تو اُن سے یا غیر ممالک سے مستعار لیا تھا، اسے فی الفورتہ خاک کر کے ہمارا صرف اسلامی تعلیم کے مطابق اسلامی نظریہ ہونا چاہیے جو خلفائے راشدین کے زمانہ میں مروّج تھا یعنی مساوات' اخوت اور عدل۔ اس زمانے میں برسر اقتدار حاکم عوام کے سامنے ہر معاملہ میں اس حد تک جواب دہ ہوتے تھے کہ خلفائے راشدین میں سے ایک اولوالعزم اور جلیل القدر خلیفہ یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں باز پرس کی گئی کہ اے عمر تمہیں تو ایک چادر ملی تھی، یہ لمبا کرتا ایک چادر میں کیسے بنا؟ کیا خلیفۃ المسلمین نے اپنے صاحب زادہ حضرت عبداللہ کو شہادت میں پیش نہیں کیا تھا؟ کیا حضرت عبداللہ نے نہیں فرمایا تھا کہ اُنہوں نے اپنے حصہ کی چادر امیر المومنین کو کرتا بنانے کے لئے دی تھی؟ ایک اور عدل کا واقعہ سماعت فرمائیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں آپ کی زرہ چوری ہوگئی۔ تلاش کے بعد پتہ چلا کہ ایک یہودی نے زرہ چرائی ہے۔ حضرت علیؓ نے اس یہودی سے اپنی زرہ طلب کی۔ اس نے دینے سے انکار کیا اور کہا، زرہ آپ کی نہیں میری ہے۔'' یہودی کی اس جسارت پر حضرت علیؓ کے دوستوں کو بہت غصہ آیا لیکن آپ نے لوگوں کو خاموش رہنے کی ہدایت فرمائی اور قاضی شُریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ قاضی شُریح نے فریقین کو عدالت میں طلب کیا۔ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی شُریح نے بھی آپ کا

کوئی ''احترام'' نہیں کیا۔امیر المومنین ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

قاضی شُریح نے یہودی سے سوال کیا: تم پر زرہ کی چوری کا الزام لگایا گیا ہے۔کیا یہ الزام صحیح ہے؟

یہودی نے انکار کیا، کہا کہ ''الزام صحیح نہیں ہے۔زرہ میری ہے۔''

قاضی شُریح نے حضرت علیؓ سے کہا'' آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کیجئے۔''

حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسنؓ اور اپنے غلام قنبر کو شہادت میں پیش کیا۔

قاضی شُریح نے کہا'ان کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کیوں؟ کیا آپ کا خیال ہے یہ جھوٹی گواہی دیں گے؟''

قاضی شُریح نے کہا: ''میرا یہ خیال نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ کے حق میں بیٹے کی اور مالک کے حق میں غلام کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔''

یہ سن کر امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ خاموش ہوگئے اور قاضی شُریح نے آپ کا دعویٰ خارج کر دیا کیونکہ آپ کے پاس دوسرے گواہ نہ تھے۔ یہودی پر اسلامی عدالت کے اس انصاف کا بڑا اثر ہوا۔اس نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ''آپ کا دعویٰ بالکل حق ہے۔زرہ میری نہیں، آپ ہی کی ہے۔ میں اسلامی عدالت کا انصاف دیکھنا چاہتا تھا۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔آپ مجھ کو حلقۂ اسلام میں داخل کیجئے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس یہودی کو کلمۂ شہادت پڑھا کر حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔

اسلام کی شاندار تاریخ کے کتنے ہی واقعات مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن مذکورہ بالا دو مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہیں کہ اصلی اسلامی جمہوریت، اصلی اسلامی مساوات اور اصلی اسلامی عدل وانصاف کے حقیقی معنی کیا ہوتے ہیں۔افسوس ہے کہ اس بیسویں صدی میں برسرِ اقتدار لوگوں نے قانون کی آہنی دیواریں بنا کر کھڑی کر لی ہیں تا کہ ان

سے کوئی باز پرس نہ کر سکے اور نہ وہ عدالت میں بلوائے جا سکیں یا کوئی ان کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کر سکے۔

خدارا سوچئے، سمجھئے۔ یہ تو ہماری قومی حمیت' خودداری' جواب داری اور شعور و پندار کو کھلا چیلنج ہے۔ بابائے قوم' علامہ اقبالؒ اور تمام حریت پسندوں نے تو ایسی مملکت کے قیام کا ارادہ اور وعدہ کیا تھا جہاں اسلام کے قوانین کا نفاذ ہوگا۔ جہاں بھوکے اور ننگے نظر نہیں آئیں گے۔ جہاں مساوات اور اخوت کی حکمرانی ہوگی۔ جہاں کسی کے ساتھ ظلم و ستم نہیں کیا جائے گا اور جہاں سلامتی ہی سلامتی ہوگی۔

قائداعظمؒ کے زرّیں ارشادات جو اُنہوں نے پاکستان کی ایک سالہ زندگی میں اپنی تقاریر میں کئے، ان کے تین اقتباسات ہدیۂ نظر ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ وہ کیسا پاکستان چاہتے تھے۔

(1) ''پاکستان کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اور اگر ہم نے دیانت داری' تندہی اور بے غرضی کے ساتھ کام کیا تو سال بہ سال یہ عظیم سلطنت ساری ملت کے لئے عظیم تر نعمت ثابت ہوتی رہے گی۔''

(2) ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔''

(3) ''ہمارا کلمہ ایک' رسولؐ ایک' قرآن ایک' پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم ایک ہو کر اپنے ملک کے استحکام اور مذہب کی اشاعت اور ملت کی خوشحالی اور سربلندی کے لئے کام نہ کریں۔ اگر آپ نے مکمل اتحاد و تعاون اور صحیح اسلامی جوش و خروش سے کام کیا تو میں

آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خدائے دو جہاں کے فضل و کرم سے پاکستان جلد ہی دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شمار ہونے لگے گا۔"

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

اس اسلامی فلاحی مملکت کے باشندوں سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، اُس کی حضرت علامہ ڈاکٹر اقبالؒ نے اس طرح تصویر کشی کی ہے ۔

دکھا دو جوشِ صدیقی رفاقت میں صداقت میں
عیاں ہو عدلِ فاروقی سیاست میں عدالت میں
عمل عثمان کا سا ہو مروّت میں ریاضت میں
نمایاں شانِ حیدر ہو شجاعت میں سخاوت میں
ستم پر صبر کرنے میں حسینی آن پیدا ہو
مرو تو یوں مرو اسلام میں ایک جان پیدا ہو

☆☆☆☆☆

لفظِ آخر

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

ناظرین کرام، ناقدین والاشعور اور دانشورانِ باتمکین، میں نے اپنے عینی مشاہدات و ذاتی تجربات کے چند واقعات کو کتابی شکل میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

یقیناً یہ کوئی معیاری کتاب نہیں ہے لیکن اس کی بھی مستحق نہیں ہے کہ اس کوڑی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ دراصل یہ میرے تاثرات اور جذبات کا ایک گلدستہ ہے جسے نذرانہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اس گلدستہ میں آپ کو موتیا، چنبیلی اور گلاب وغیرہ کے جیسے خوبصورت اور خوشبودار پھول نہیں ملیں گے۔ برخلاف اس کے اس میں بہتات سے خاردار بوگن ویلیا کے کئی رنگ والے پھول ہوں گے۔ اس میں بغیر خوشبو کے سفید و گلابی سدابہار کے پھول ہوں گے۔ اس میں ببول کے پھول بھی ہوں گے۔ ممکن ہے اس میں کاغذ کے پھول بھی نظر آئیں لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی اہلیت اور بساط کے مطابق اس گلدستہ کو سجانے کی کوشش کی ہے۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ ظاہرا خوبصورتی اور مہک پر نہ جائیے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کسی بھی قسم کے کیوں نہ ہوں، آخر پھول ہیں اور ویسے تو یہ صرف عقیدت کے پھول ہیں جو اُن قائدین والا قدر اور مخلص خادمانِ قوم کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں جن کے نام بلاشک آپ کے محسنین کی فہرست میں بھی شامل ہیں۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ ان گلہائے عقیدت کو اپنے خانۂ دل کے کسی گوشہ میں جگہ دے کر مجھے سرفراز کیجئے۔

بمطابق ''ہل جزاء الاحسان الّا الاحسان'' اپنے کرم فرماؤں کی حوصلہ افزائی اور بالخصوص اپنی اہلیہ کا مرہونِ منت ہوں جن کی اعلیٰ علمی و ذہنی صلاحیتوں، قلمی اعانت اور عدیم المثال دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس حقیر پیش کش پر آپ کی نظر کرم پڑ رہی ہے۔ اللہ ان سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ سب کو فی امان اللہ کہنے سے پہلے میری آخری گزارش اور آخری دعا بھی سن لیجئے ؎

اللہ کی جانب متوجہ رہیں احباب
صف ہوگی شکستہ جو کہیں رُخ نہ رہا ایک
یا رب رہے جمعیتِ مسلم یوں ہی قائم
رُخ ایک رسولؐ ایک کتاب ایک خدا ایک

(اکبر الہ آبادی)

آپ کا دیرینہ خادم صدیق علی خاں
''مقام دوست'' 37-پی بلاک،
6-پی ای سی ایچ ایس' کراچی نمبر 29
مورخہ 16 مئی 1970ء

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

تمنائے دِلی

دل کو ہمارے دل بنا درد سے سرفراز کر!

دہر کا پاسباں ہے تو دہر سے بے نیاز کر!

منزلِ عشق دور ہے ڈر ہے قدم نہ ڈگمگائیں

نورِ یقیں بخش دے محرمِ سوز و ساز کر

جرم و خطا معاف ہو رحمتِ حق کا دے پیام

دونوں جہاں کے پاسباں تجھ پہ درود اور سلام

(نظر حیدرآبادی)

☆☆☆☆☆

آدم علوی کا خط

Muslim. Gymkhana

Havelock Road
Karachi.

14th December 1931.

Nawab Siddique Ali Khan Saheb,

N A G P U R.

Dear Sir,

I have been pleased to learn that the Muslims under your captainship won the Central Provinces Cricket Tournament for the first time and I hasten to tender my hearty congratulations to you and the members of your team on the brilliant victory achieved. All honour to you and your men. It is a matter for satisfaction that our brotherh are doing wonderfully well in the realm of sports. May they continue to progress in this and other spheres with better results is my prayer to the Almighty.

Perhaps you know that the Muslims of Karachi have won the Sind Pentangular Cricket Tournament this year for the third time. Our captain Mr. Gulam Mohamed, Mohamed Ibrahim, Abdulla, Abdul Aziz & Hyderali have been invited to play in the trial matches to be played in Patiala & Lahore in connection with the selection of the All India XI for tour to England.

With best of wishes to you and the members of your XI.

Yours brotherly

Adamali Yusufali Alavi

Hon: Secretary.

Address:-
Adamali Yusufali Alavi,
726, Napier Road,
KARACHI-CITY.

بھارت کے صدر کا خط

राष्ट्रपति भवन, नई दिल्ली-4.

RASHTRAPATI BHAVAN,
NEW DELHI-4.

12th July 1969

My dear Shah,

I am glad to go through your letter and the cutting regarding my old friend Dr.Umer Ali Shah. It was so thoughtful of you to have sent me the biographical sketch of your esteemed father.

With best wishes,

Yours sincerely,

V.V.Giri

Shri T.A.Shah,
16/N, Block 2,
Pechs,
Karachi 29.

ملبورن کی نشری تقریر

Indian view of the Test Match

When I was fortunate enough to be honoured with an invitation to attend the South Australian centenary, I was told by people in India that Australia was full of Kangaroos and Bradmans. I was not anxious to meet the Kangaroos, but an opportunity to meet Bradman, the King of Cricket, was an overwhelming temptation to visit this hospitable and charming Country. I had met Macartney, the Governor General of Cricket, but the awe associated with the prospect of meeting royalty did not deter me from my resolve. On arriving in Australia, I learnt that some newspapers were suggesting that King Bradman had abdicated, but I am glad to say that even if he had abdicated he has reascended the throne in great glory and has even surpassed himself. I hope he will wear his crown for many years to come.

As regards my impression about the Australian team, I find that it is a well balanced and sound combination. Fingleton is a sound and reliable bat, although inclined to be a slow scorer at times, which, however, is not a fault for an opening batsman. Rigg, Ward and Brown gave a very good display, which paved the way for a big score and a practically certain victory. I can not pass on without paying my tribute to the splendid batting of McCabe - the brilliant, in the first innings. I need not say anything about King Bradman's batting, as every one has either seen it or read about it.

The Australian fielding is of a very high standard. What impressed me most, however, were the two miraculous catches by Darling which by themselves were worth going miles to see. The catch by Brown dismissing Sims was also splendid. The team work of the Australians has been marvellous and it is obvious that in the battle of tactics between Allen and Bradman, the latter has won. O'Reilly and Sievers, in my opinion, deserve a place in the World XI for their excellent bowling.

My impression of the English team was also very good. The fielding, especially that of Robins, Hardstaff, Verity and Worthington was a delight to watch and the way in which the bowlers-specially Verity and Voce, kept up their accuracy of length under disheartening circumstances, was remarkable. The Captain and the whole English team were very keen and alert, right to the end of a tiring day. I thought that Hammond, the brilliantstar batsman, was out of form on Saturday, but some of the Australian players have assured me that his was a polished knock under the circumstances.

The Melbourne Cricket Ground is, I am, told, the biggest Cricket Ground in the whole World. It is also very beautiful and it is apparent that every effort has been made for the convenience and comfort of the spectators by the provision of the imposing covered stands. The scoring board is very

elaborate, showing the exact state of the game at any moment. The officials are extremely polite and ever ready to be of service. The Committee deserves congratulations for the excellent management.

The crowd was huge and the numbers were almost unbelievable. I had heard a lot about Australian barracking but to my delight I found a very well behaved, impartial and sporting crowd. The patience of the crowd during the inevitable stoppages due to rain was creditable. The knowledge of the game possessed by young and old alike was astonishing. The size of the crowd on monday suggested a very heavy mortality amongst the grand parents of Melbourne, but this excuse did not work on Tuesday, with the heads of offices, who, however, probably discovered very important work for themselves at the cricket ground.

I would have liked to speak more, but as the time is very short at my disposal I conclude with an appeal to the Board of Control for Cricket in Australia to send out a team to India, whose visit is anxiously awaited in India, and which will receive a hearty welcome and the traditional hospitality of my country. In my humble opinion, a vist of this nature will foster friendship between our respective countries in a better way than visits by politicians who usually regard each other with suspicion. In fact for the peace of the World, visits by sporting sides between various countries are much more important than the so-called peace missions. I wish the Australians the best of luck in their remaining matches.

گورنر سی پی و برار کا خط

PACHMARHI,

5th October, 1941

D.O.No.C.113/GS.

Dear Mr. Jinnah,

I am desired by His Excellency the Governor of the Central Provinces and Berar to thank you for your letter dated the 1st October 1941 and its enclosures about the deplorable Amraoti riots. His Excellency desires me to say that heavy police reinforcements have been sent to Amraoti, and, thanks to this and other measures taken, it is believed that the situation is now well in hand and that the Muslims of Amraoti need therefore be under no undue apprehension as to the immediate future.

With kind regards,

Yours sincerely
(sd) illegible

Copy.

آصف علی بیرسٹر کا خط

Kucha Chelan,
Delhi,
11th October 1939.

My dear Nawab Siddique Ali Khan,

I thank you for your kind note of 6th. I am extremely sorry to learn that a large number of Muslims have been committed to sessions in the case you mention. You may rest assured that if there is anything that I can do for them it will be done without any hesitation.

As regards the question of my defending the accused, I am afraid there are a few difficulties in the way. To begin with I have previous engagements, and it is almost impossible for me to be absent for as long as two months. I can, however, suggest a via-media. If you can send some lawyer with all the evidence and other material I shall go through the whole case and chalk out a line of defence. I need not then be present throughout the trial, because your local lawyer working under my instructions can carry on in my absence, and the copies of the proceedings can be sent to me as the case developes. I can then proceed to Nagpur or wherever the case may be for arguments. Thus the whole time for which my presence may be required can be cut down to the absolute minimum. If such an arrangement can be made, I can be available for the defence of the accused.

Ordinarily I charge Rs.450/- a day from the day I start to the day of my returning, in addition to all the other expenses - travelling, first class, stay, conveyance etc. But under the circumstances you mention it is obvious that I cannot treat it as an ordinary engagement. I trust this will find you quite well and happy.

With best regards,

Yours sincerely.

A. Asaf Ali

Nawab Siddique Ali Khan Saheb,
M.L.A.
Nagpur (C.P)

قائداعظم کا برقیہ

NAWAB SIDDIQUE
ALI KHAN NAGPUR
= MY CONGRATULATIONS YOUR STRENUOUS EFFORTS SUPPORT
INNOCENT MEN WHICH MET SUCCESS AQUITTAL OF ALL ACCUSED
JINNAH +
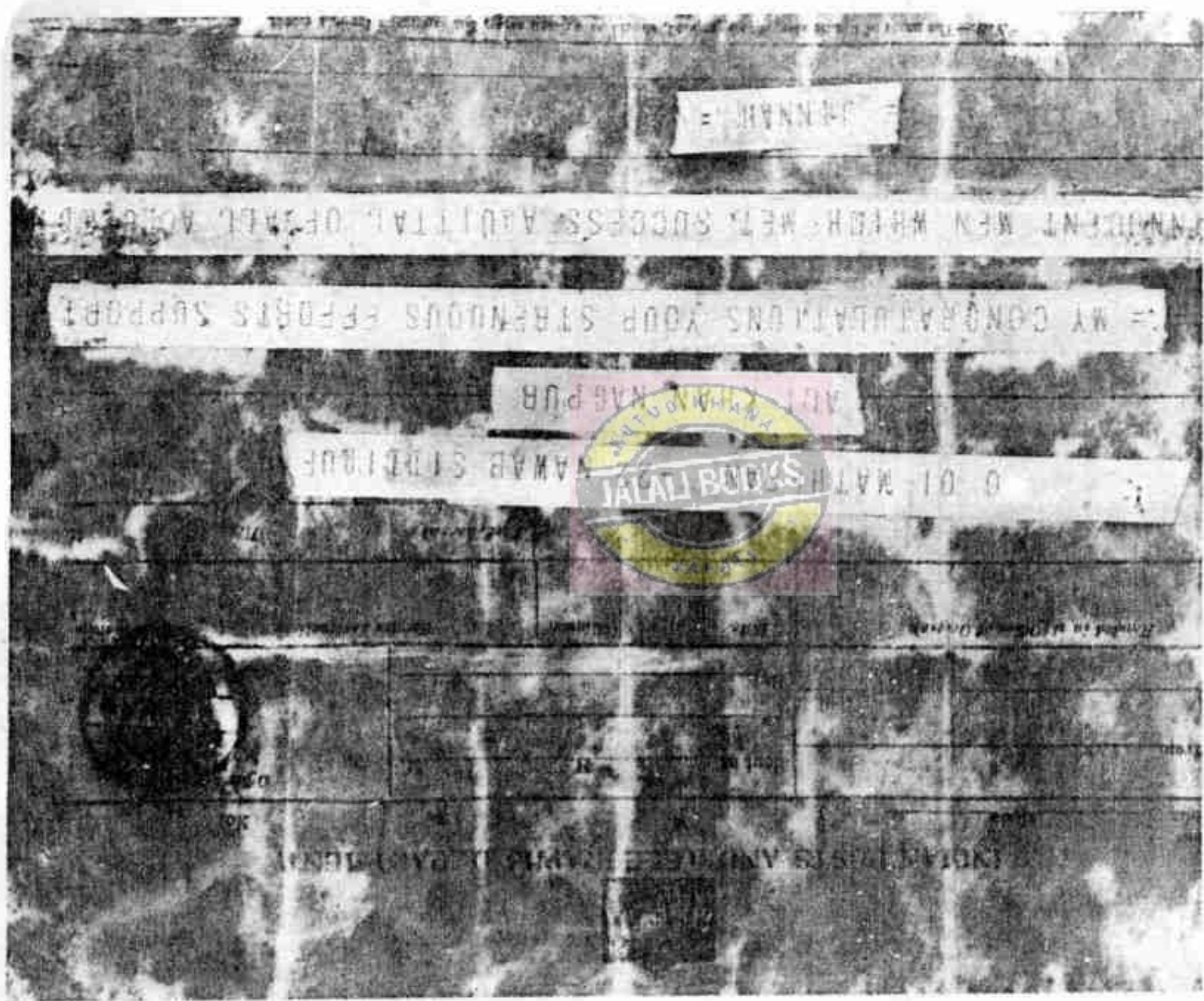
حاجی سر عبداللہ ہارون کا خط

FOREIGN OFFICE.

ALL INDIA MOSLEM LEAGUE.

President:
MR. M. A. JINNAH.
Head Office
DELHI.

(The only representative & Authoritative Body of Ninety Millions Indian Moslems.)

On the subject of this letter please communicate with:—
SIR HAJI ABDULLAH HAROON, Kt., M.L.A.
Chairman,
Foreign Sub-Committee.
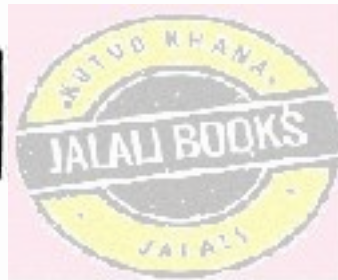
786, Napier Road,
Karachi.
India.
20th April, 1939.

My dear Siddiqali Khan,

I received your telegram which indicates that you are proceeding back to Nagpur. But I must request you to reach Lahore on the 10th along with the Begum Sahebah, as your names have already been announced and the people are growing very anxious to see you. Whatever be the conditions in C.P. you must kindly make it a point to keep up this engagement. The conditions in C.P. are irremedible so long as the curse of the Congress rule pervades your province.

My purpose in writing this is to impress upon you the urgency and the importance of your joining the deputation at any cost.

With best wishes from myself and Rashdi,

Yours sincerely,
[signature]

K.B. Nawab Siddiqali Khan M.L.A.(Central),
Nagpur (C.P.)

تقرری کا خط

Tele { grams : "MUSLIMLEAG"
phone : No. 5530.

Committee of Action
ALL INDIA MUSLIM LEAGUE

Mamdot Villa,
Lahore.
Dated:-5-5-44.

My dear Nawab Sahib,

I am glad to inform you that you have been appointed the Salar-i-A'ala of the All India Muslim League National Guards.

The committee of Action would like to meet you at the Central Office, All India Muslim League, Delhi on the 13th May, at 11. A.M. to discuss certain important matters in this connection. A telegram to this effect has already been sent x to you yesterday.

I shall be obliged if you will kindly come to Delhi to meet us on the aforesaid date.

A copy of the constitution and rules of the All India Muslim League National Guards as finally approved by the Committee of Action is enclosed herewith for your pp perusal.

Yours sincerely,

Nawabzada Leaquat Ali Khan,
Convener, Committee of Action.

To Nawab Sidiq Ali Khan Sahib M. L.A.,

بیگم مولانا محمد علی جوہر کا خط

باسمہ

قرول باغ
دہلی
٢٧ جنوری ١٩٤٣ء

پیاری بہن، السلام علیکم

امید کہ آپ اچھی ہوں گی۔ اور متعلقین بھی اللہ کے فضل و کرم سے بخیر و عافیت۔

نہ معلوم سی پی میں زنانہ مسلم لیگ کی ترقی کا کیا حال ہے۔ کتنے ضلعوں میں قائم ہوئی، کتنے شہروں تک پہنچی۔ جلسوں اور تقریروں کی کیا رفتار رہی۔ میں ان سب حالات کے معلوم کرنے کے لئے بے چین ہوں گو مجھے یقین رکھتی ہوں کہ آپ کے ہوتے ہوئے ناگپور اور سی پی کی عورتیں خوابیدہ نہیں رہ سکتیں آپ نے وہاں ضرور کچھ نہ کچھ بیدار۔ شکر ہے آپ نے ہمت سے کام لیا ہو اور عورتوں کی دنیا میں ہر طرف ہلچل ہل گئی ہوگی۔ کیسی ہلچل۔ قومی اور دینی۔ جب خط آرہا ہو۔

جواب کا منتظر

آپ کی بہن

بیگم محمد علی

حضرت احسان دانش کا خط و مولانا ظفر علی خان کی نظم "ناگپور"

افسوس ہے کہ وہ پرزہ جس پر اشعار لکھے گئے تھے گم ہوگیا اور حافظے نے بھی جواب دیدیا بہر حال چند دن پہلے میرے مخلص اور عزیز دوست حضرت احسان دانش لاہور سے کراچی تشریف لائے۔ دوران گفتگو زیر طبع کتاب اور مولینا ظفر علیخاں صاحب کے فی البدیہ اشعار کا ذکر آیا۔ انھوں نے ازراہ کرم نظم بھیجنے کا وعدہ کیا۔ ان کا کرم نامہ اور مولینا کا کلام احسانمندی کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

احسان دانش۔ مکتبہ دانش
ایبک روڈ۔ لاہور

مورخہ ۲۳ شب ماہ رواں سنہ ۶۷ء

محترم نواب صاحب السلام علیکم

آپ کی مطلوبہ نظم میری کتب میں نہیں مل سکی تھی آج ملی ہے شرمندہ ہوں کہ جلد جواب ارسال نہیں کر سکا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ (غالب)

کراچی سے آتے ہوئے راستے میں شعاع خورشید پڑھی۔ خوب ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت کے سلیقہ کے علاوہ نہایت اچھی نظمیں ہیں نسوانی دنیا میں بہت کم شاعرات نے ایسی نظمیں کہی ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب لائبریریوں کے علاوہ تشنگان ادب کے لیے بھی سامان سکون ہے میری دعا ہے کہ خدا کتاب کو مقبولیت اور مصنفہ کو دولت دارین عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

احسان دانش
۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء

اس وقت رات کا ایک بجا ہے ایک صاحب جوابی لفافے پر جواب دے رہا ہوں معاف فرمائیے

"ناگ پور"

محمدِ عربی کا غلام ہو جائے
تو ناگ پور بھی دار السّلام ہو جائے

اگر ہو فرقِ حلال و حرام اے مخدوم
تو برہمن بھی ہمارا امام ہو جائے

خدا کے فضل سے ساعت وہ سر پہ آ پہنچی
کہ کام فتنۂ گردوں کا تمام ہو جائے

بیادِ حضرت اورنگ زیب عالمگیر
زمانہ حلقہ بگوش نظام ہو جائے

سلامی اسکے بدیمیں کو جھک کے دے مہ نو
بلند اس قدر اس کا مقام ہو جائے

برا ہیں نہ ہے ظلم کا نشاں باقی
پھر اس کی تیغ اگر بے نیام ہو جائے

شراب ہو کے جو تنے کشید بطحا سے
شکستِ توبہ کا بھی اہتمام ہو جائے

پروفیسر اے ایس بخاری (پطرس) کا خط

786

Telegrams: "PAKISTAN"
Telephone: 3244.

Napier Road,
Karachi, 8th Jan; 1945.

No ________.

My Dear Nawab Sahib,

Since you have arrived here under the orders of our All India Muslim League High Command I request you to kindly help me by taking over the charge of the Sind Provincial Muslim League office and also propaganda for the Sind Assembly election work.

Yours Sincerely,

[signature]

Offg. President,
Sind Provincial Muslim League
Karachi.

To,

Nawab Siddiqali Khan,
M.L.A.(Central),
~~Member, working Committee,~~
~~All India Muslim League and~~
Salare-Ala, All India Muslim League,
National Guard, Karachi.

مرکزی اسمبلی میں نوابزادہ کی تقریر

B-17
30-7-43.

E. Andrews.

Nawabzada Mohammed Liaquat Ali Khan (Rohilkhand & Kumaon Divisions in Mohammadan Rural):

Sir, I move :

"That this Assembly condemns the cowardly attack on Mr. M. A. Jinnah and congratulates him on his providential escape"

Sir, it is not necessary for me to say much about the motion which I have the honour to place before this honourable House. The subject matter of the motion is one about which there cannot be two opinions .... and

C-1 Aiyangar 30-7-43

(N. Liaquat Ali Khan contd.)

and the personality of Mr. Jinnah is such that it does not need any introduction. He is one of the greatest Sons of India and is well known all over the World. The news of the cowardly and mean attack which was made on Mr. Jinnah on the 26th of this month in Bombay shocked every right thinking man irrespective of Caste, Creed or Colour, from one end to the other of this sub-continent. I have no doubt in my mind that every Honourable member of this House would condemn this outrage. We are indeed happy to know that God in His mercy has saved the life of Mr. Jinnah and I am sure every section of this House will join me in congratulating him on his providential escape. As for the Muslim League Party it is not possible to express adequately in words our feelings of relief, joy and thankfulness to God for saving the life of our Leader to lead us and guide us.

Qaide-Azam Zindabad.

(Ends)

قائداعظم کے دو گرامی نامے

ount Pleasant Road,
Malabar Hill
Bombay.

3rd January 1941

Dear Mr. Siddique Ali Khan

I am in receipt of your telegram of the 28th December 1940, and I am distressed about your position and I really do not know what to say. I fully sympathise with you in your having suffered in health and am sorry to hear that your wife is not well and that you lost your child.

I have no power to interfere with the decision of your Provincial League under the constitution. You can only appeal to the Working Committee if you so desire. I would like understand the position when we meet at Delhi next.

With kind regards.

Yours faithfully

M. A. Jinnah

MOUNT PLEASANT ROAD,
MALABAR HILL.

31st May 1942

Dear Nawab Siddiq Ali Khan,

I received your letter of the 29th May and thank you for it. In my opinion the All-India States Muslim League should not be mixed up with the All-India Muslim League. Their problems are different in many respects. I need not go into the details. While maintaining that we should help each other in every way we can, I think that the committee appointed by Nawab Bahadur Yar Jung should be composed of members of the All-India States Muslim League and certainly no prominent Muslim Leaguer like yourself should be the Chairman of the committee appointed by the All-India States Muslim League to help and advise the Musalmans in various Indian States in the face of external danger and internal disorder. Primarily it is for the leaders of the All-India States Muslim League to attend to this matter.

Yours sincerely

M.A. Jinnah

Nawab Siddiq Ali Khan
Nagpur.

قائداعظم کا صوبہ سرحد کے سالار کو خط

Mount Pleasant Road,
Malabar Hill,
Bombay.
Peshawar,
27th November, 1945.

Dear Mr. Faiz Mohd,

I am very thankful to you for the splendid services that you have all rendered at the Conference and in working with such great discipline at the various meetings and gatherings that were arranged during my visit here. I congratulate your very efficient and well-disciplined body, whose services I had the good fortune to witness with my own eyes. I hope that you will maintain the same spirit and discipline and organize our National Guards who will be worthy of the honour of our Nation. I wish you every success.

Yours sincerely,
M. A. Jinnah.

Faiz Mohammed, Esq:
Salar,
Frentier Province Muslim
National Guard,
N.W.F.P.

25th. October I952.

My dear High Commissioner,

I have received your letter of 2nd. October, and I hope whenever Your Excellency has the chance to draw the attention of the Moslems that the need of education for the Moslem Africans is the greatest problem there, if not they become second class citizens and the Christians first class, you will not fail to do so.

We have already lost a great deal of distance and must make a great effort now. I myself am making very big sacrifices by giving the large sums I am giving for this cause, but I am sorry to say that, with a few exceptions, the well-to-do Moslems as a body will not realize this. I make an exception of course of the Karimjee family who on the whole have been most helpful .

Yours sincerely, Agakhan

H.E. The High Commissioner for Pakistan,
Nairobi.

15th. August 1953.

My dear High Commissioner,

Thank you very much for all the courtesy you showed to my son and your friendship. Of course from Pakistan I could not expect but courtesy; however you took so much interest in his visit that I wish to thank you.

I hope you are taking into consideration all the advice I am giving about Moslem welfare to Moslems irrespective of sects and I am sure you will encourage them now to get from West Africa (British, French and Belgian colonies) facts and figures before we can do any further work. Pakistan has also interest to have more friends in Africa in view of the efforts India is making to win over African support on all occasions.

With kind regards,

[signature]

H.E. Nawab Sadiq Ali Khan,
High Commissioner for Pakistan,
Nairobi.

3rd. October 1953.

My dear High Commissioner,

I thank Your Excellency very much for your letter of 29th. September which I read with much interest.

The chief thing is to get in touch in the long run with the Moslems on the West coast as well. Nigeria may be next to Pakistan and Indonesia the biggest Moslem centre, but between East and West African Moslems there is absolutely no organised means of connection. The first step is to send an important deputation with leading members of Ismailis, Bohoras, Arabs etc... to make a tour visit of both French and British West Africa; on that foundation we can build something far more solid than it is in the present state of affairs.

All Your Excellency says about me is indeed very kind. There is one point however which you probably do not know; the Quaid-y-Azam offered me to take up the General Super Ambassadorship for Europe and America for Pakistan and on principle I would have accepted it, but while he died I was far more ill than he was and I had three operations and three years in hospital; that is why it never came to anything. Next time if you refer to my relations with the Quaid-y-Azam you should put the matter forward.

With kindest regards to Your Excellency and Her Excellency,

Yours sincerely,

H.E. Nawab Siddiq Ali Khan,
High Commissioner for Pakistan,
Nairobi.

7th January 1954

Your Excellency,

Many, many thanks for your kind greeting and I wish you all happiness and success in the coming year.

I know it is very unfortunate that Muslims since history began have always been faced with opposition amongst themselves and by this disunity they have lost worldly rights, as even now in Kenya and in spite of all they have received in India. Thank God in Pakistan there is a general understanding.

I quite understand but I too hope that with Your Excellency's example we will go on working for unity even if it does not come easily. We must also realize that there will always be a small minority against howsoever good the cause may be. Even during Sir Seyed Ahmed's time there was a small minority of munafiq. I had great opposition throughout India for the University and between 1906 until the Partition there was always opposition, but this should not discourage such distinguished people as yourself who work for unity.

شہادت کے متعلق سرکاری بیانات

PID PRESS INFORMATION DEPARTMENT

GOVERNMENT OF PAKISTAN

E. No. 3972

PRESS NOTE

ASSASSINATION OF THE QUAID-I-MILLAT

As inaccurate reports of the tragic assassination of Mr. Liaquat Ali Khan, the late Prime Minister, continue to circulate, the following authoritative account is issued for general information :-

Mr. Liaquat Ali Khan was scheduled to address a public meeting at Rawalpindi on the 16th October, 1951. The meeting was arranged for 4 p.m. in the Municipal Garden where a crowd of about 100,000 persons had assembled. A microphone and one chair had been placed on the dais, which was four feet and a half high.

Mr. Liaquat Ali Khan arrived at the Municipal Garden shortly before 4 p.m. The meeting opened with a recitation from the Holy Quran. The Chairman of the Municipal Committee and the President of the Muslim League briefly welcomed Mr. Liaquat Ali Khan.

At 4.10 p.m., Mr. Liaquat Ali Khan stood up and moved to the microphone. He had only uttered the words "Bradran-i-Islam" when the assassin, Said Akbar, fired two quick shots, followed by a third. The first two shots hit Mr. Liaquat Ali Khan, who swayed and fell. Mr. Siddiq Ali Khan, his Political Secretary, rushed to his aid and cradled the dying Prime Minister in his arms.

Mr. Liaquat Ali Khan murmured: "La Ilaha Illallah". Then, faintly: "Goli lag gai" (I have been shot).

Again, he murmured: "La Ilaha Illallah".

Then: "Khuda Pakistan ki hifazat kare" (May God preserve Pakistan!).

He then lapsed into unconsciousness, and was rushed to the Combined Military Hospital, where, despite a blood transfussion, he died.

The assassin, who was about 30 years old, was dressed in khaki. He was 8 to 10 ft. from the dais, in the front row, and fired from a sitting position. The weapon used by him was a Mauser pistol. Three empty shells were found on the spot and four live cartridges in the chamber of the pistol.

The third shot fired by Said Akbar hit Head Constable Bahadur Khan of the District Security Staff, who grappled with him immediately after the first two shots had been fired. The Head Constable was shot in the hand. Police Sub-Inspector Mohammad Shah fired twice at the assassin, who was struck by one bullet before being pounced upon and lynched by the crowd. The other bullet struck a member of the public - Allah Dad alias Niki - who was wounded in the thigh. In the melee that followed some Muslim League National Guards tried to spear the assassin. Police Sub-Inspector Tahuwwar Zaman, who was trying to secure the assassin, received a superficial wound from a spear thrust. There were 26 wounds on the assassin's body when it was recovered by the police.

Ministry of the Interior
(Home Division),
Government of Pakistan
Karachi, October 20, 1951.

FDD/ZA

"356 - 20.10.51"
21.30 Hrs.

محمڈن اسپورٹنگ کلب کلکتہ

ڈان براڈمین کرکٹ کھیلتے ہوئے

ملبورن کرکٹ گراؤنڈ آسٹریلیا۔
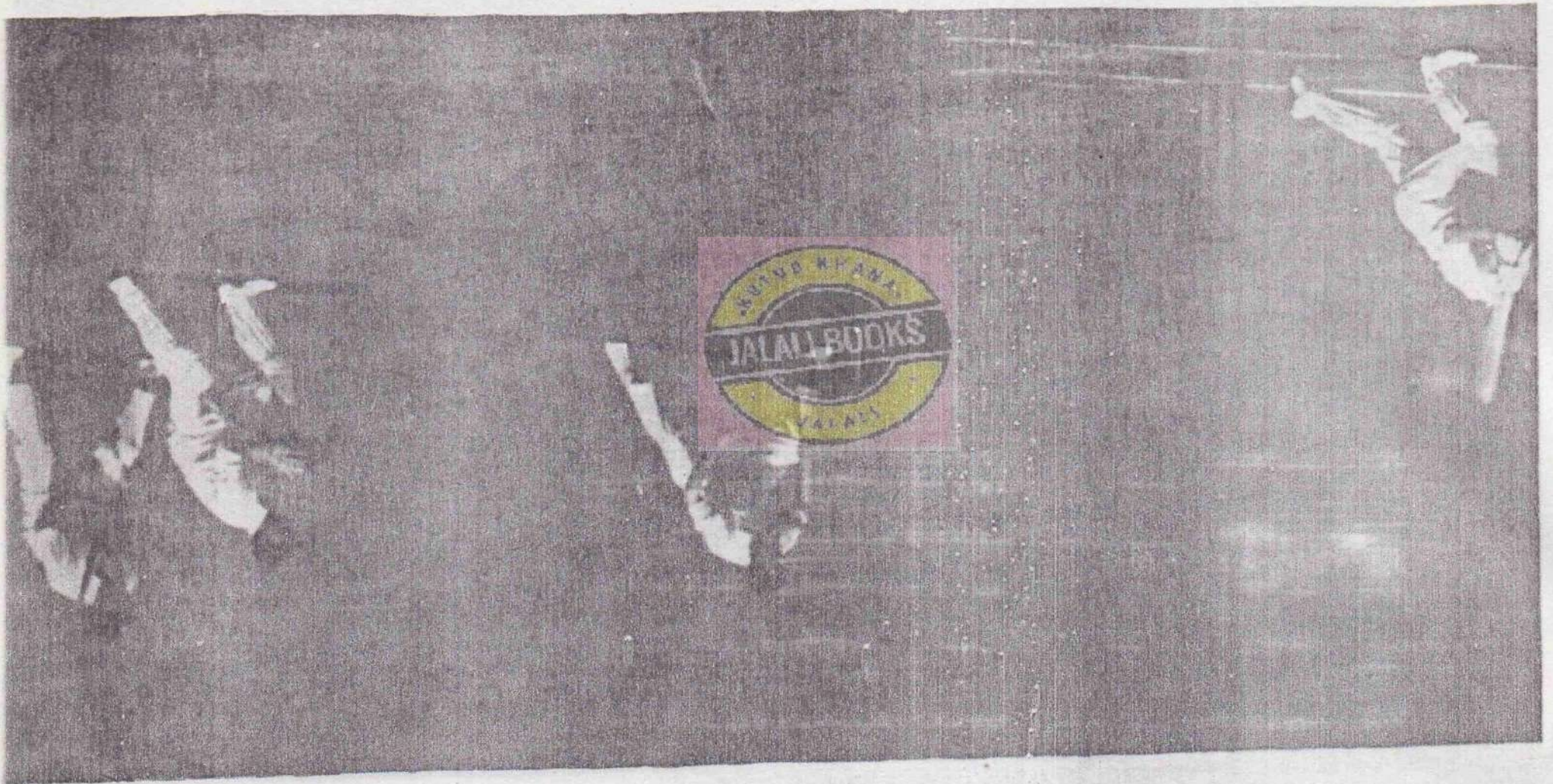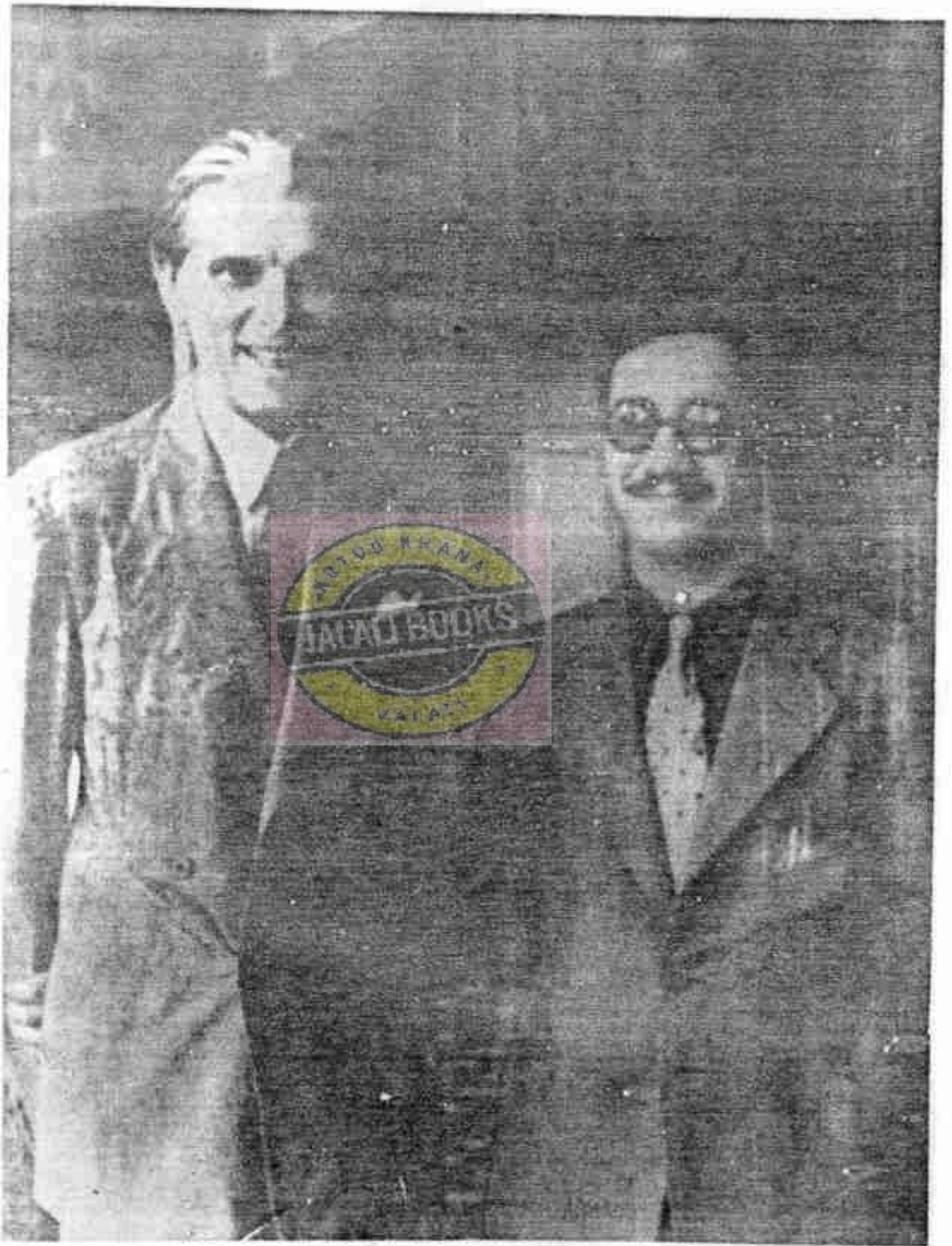
راجہ صاحب محمود آباد قائد اعظم کے ساتھ۔
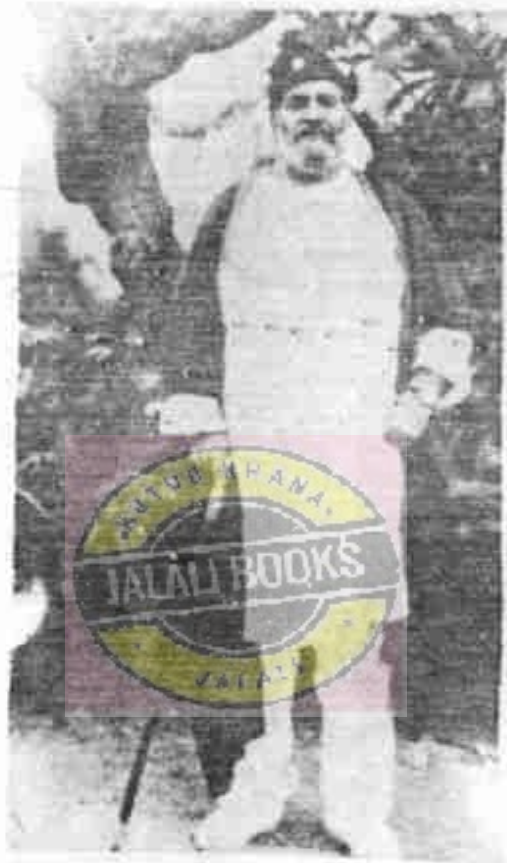
مولانا شوکت علی

قائد اعظم اراکین مرکزی اسمبلی و عہدیداران ضلع مسلم لیگ شملہ
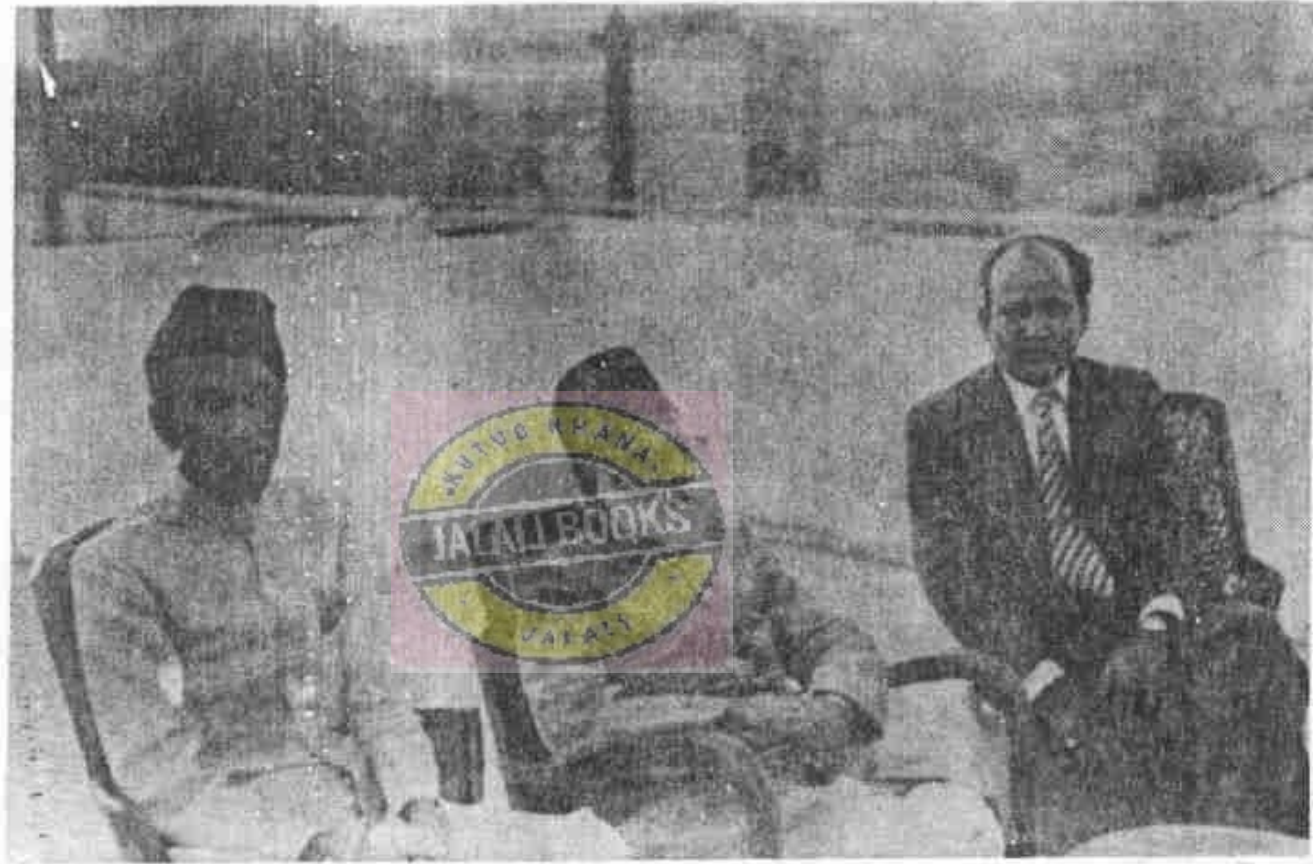
بابائے اردو مولوی عبدالحق ابراہیم خاں فناؔ الحاج تاج الدین احمد صاحب

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان فرمانروائے دکن۔

ناگپور میں ودیا مندر اسکیم کے خلاف سول نافرمانی کرنیوالوں کا جتھا ۔

۲۸ اسیران چیانتو و دبسوا۔
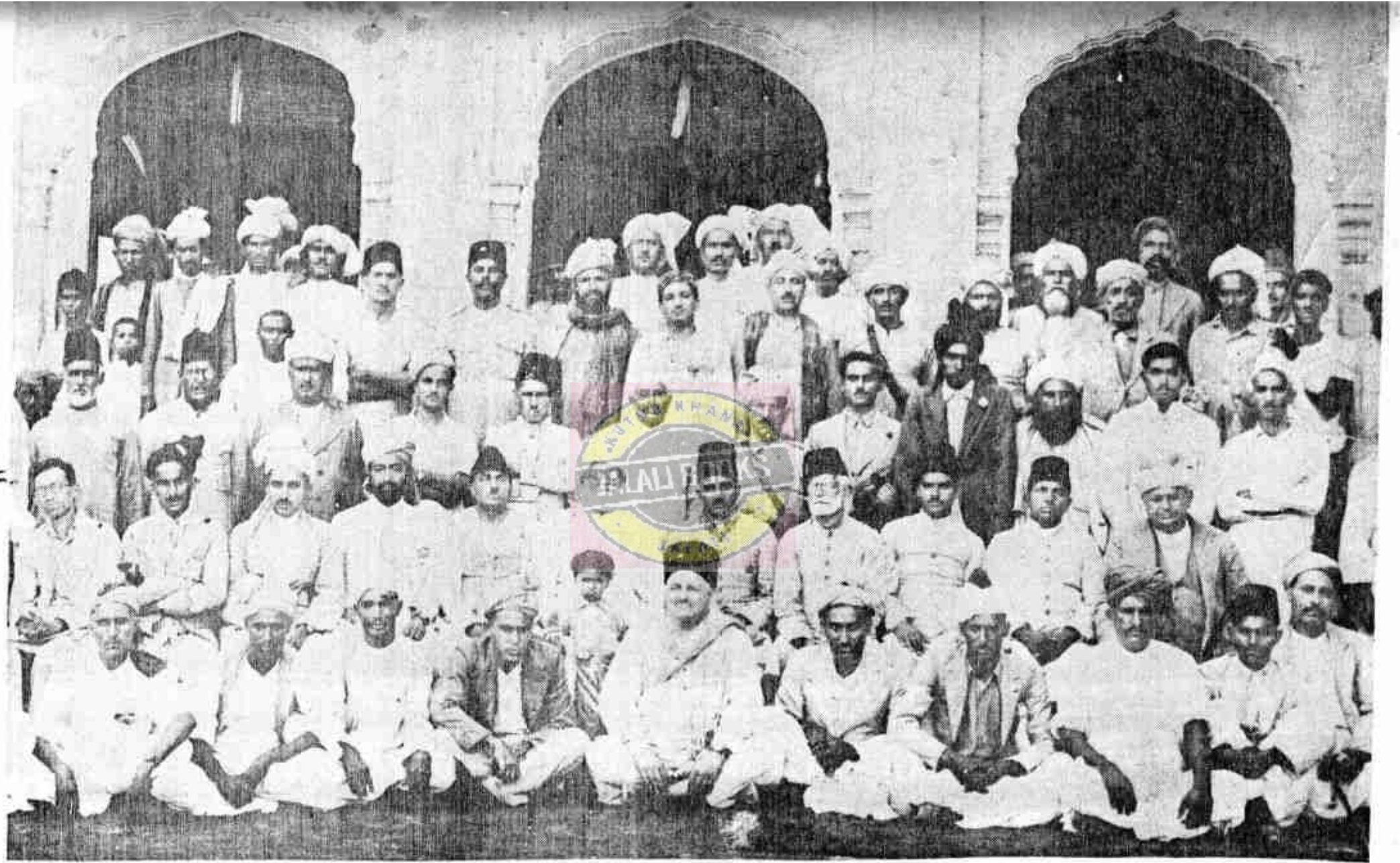
اقلیتی صوبوں کے اکابرین کا دورہ ڈیرہ اسمٰعیل حال
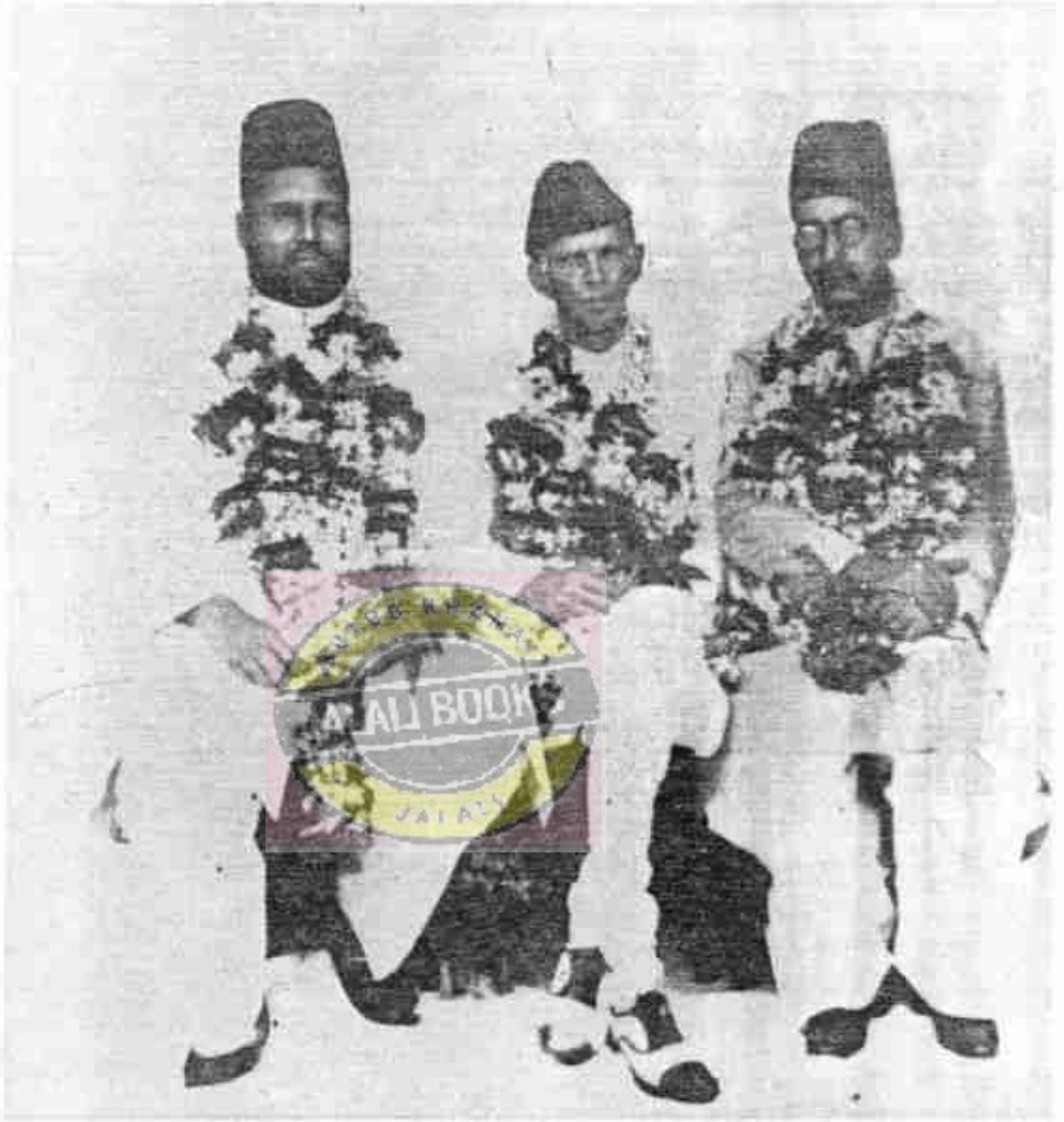
قائداعظم نواب بہادر یار جنگ اور سر سکندر حیات خان
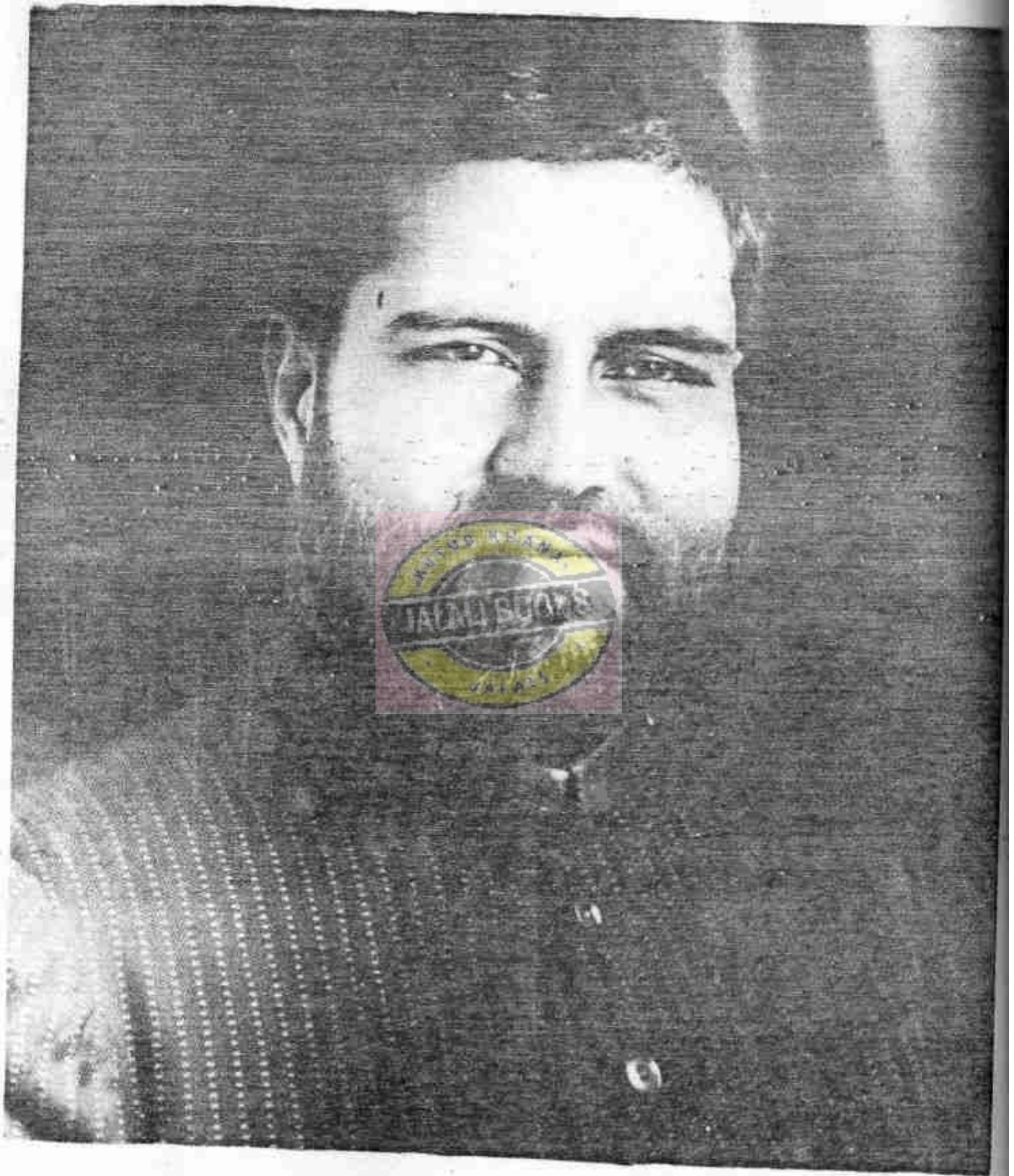
نواب بہادر یار جنگ

قائد اعظم حیدرآباد دکن میں اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ۔

کونسل آف اسٹیٹ و مرکزی اسمبلی مسلم لیگ پارٹی کے اراکین قائداعظم کے ساتھ

قائداعظم امپیریل ہوٹل میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین سے مخاطب ہیں

گورنر جنرل پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح

گورنمنٹ ہاؤس کراچی میں قائد اعظم مسلم نیشنل گارڈ کی سلامی لینے جا رہے تھے۔

قائد اعظم کی سرپرستی میں پاکستان اولمپک کیمپ

راجہ صاحب محمود آباد

قائداعظم پاکستان کی پہلی کابینہ سے حلفِ وفاداری لے رہے ہیں۔

اجمل حسین صاحب کا پاکستان کی پہلی کابینہ سے متعلق کارٹون
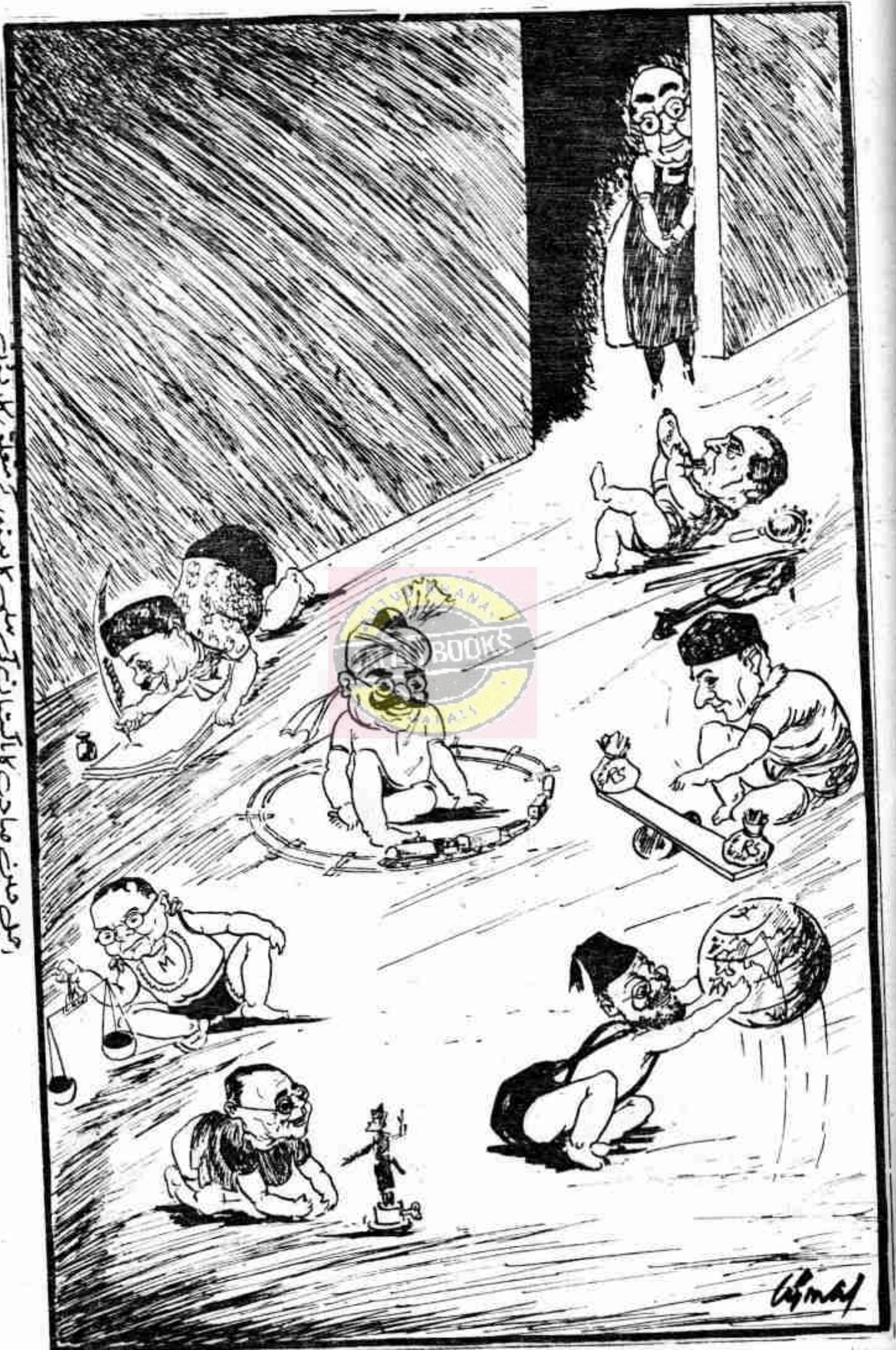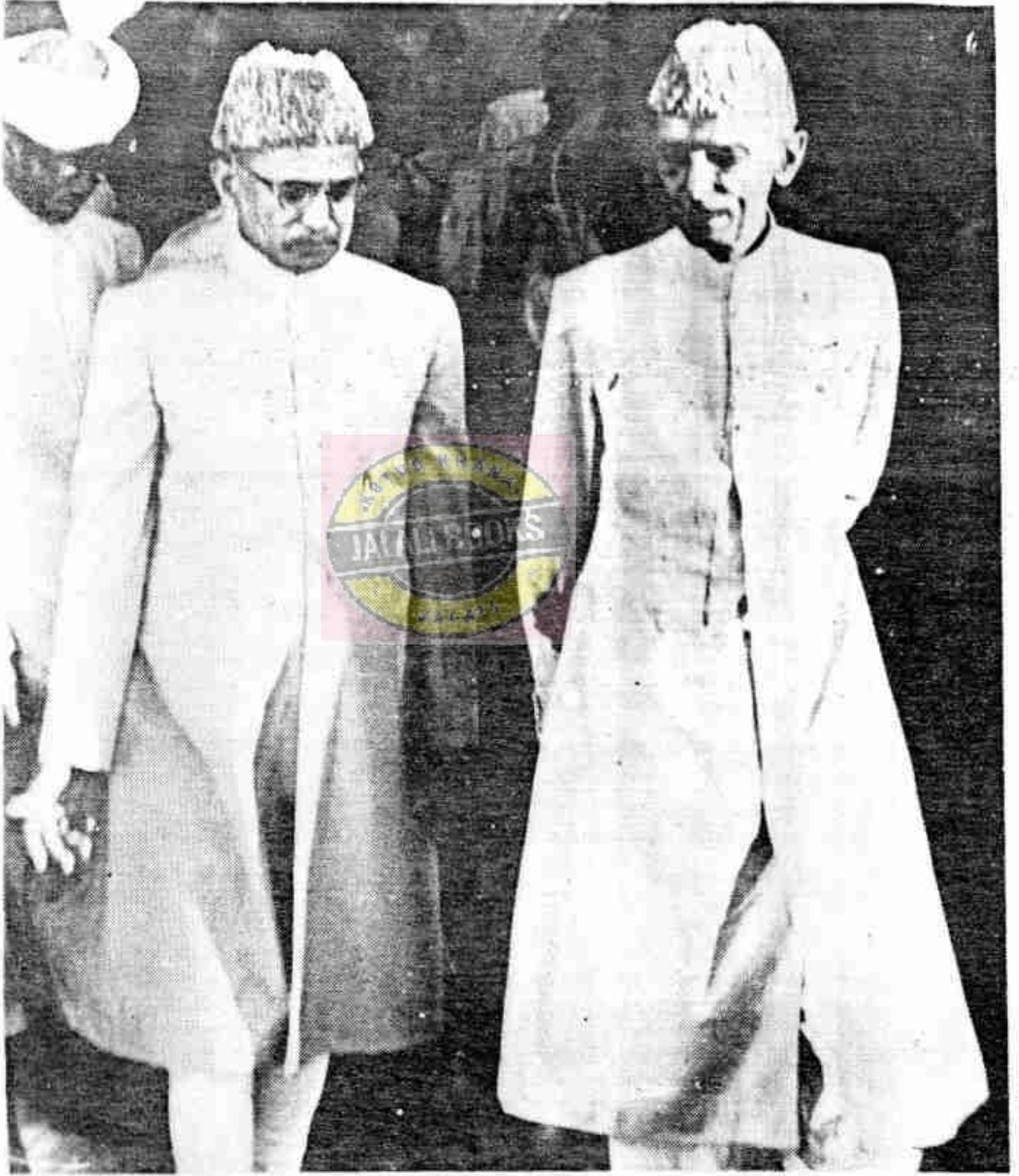
اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر قائداعظم و زاهد حسین

قائد اعظم اور قائد ملت لیاقت علی خان

پاکستان کے نامور پہلوان حمیدہ، بھولو، اسلم اور اکرم
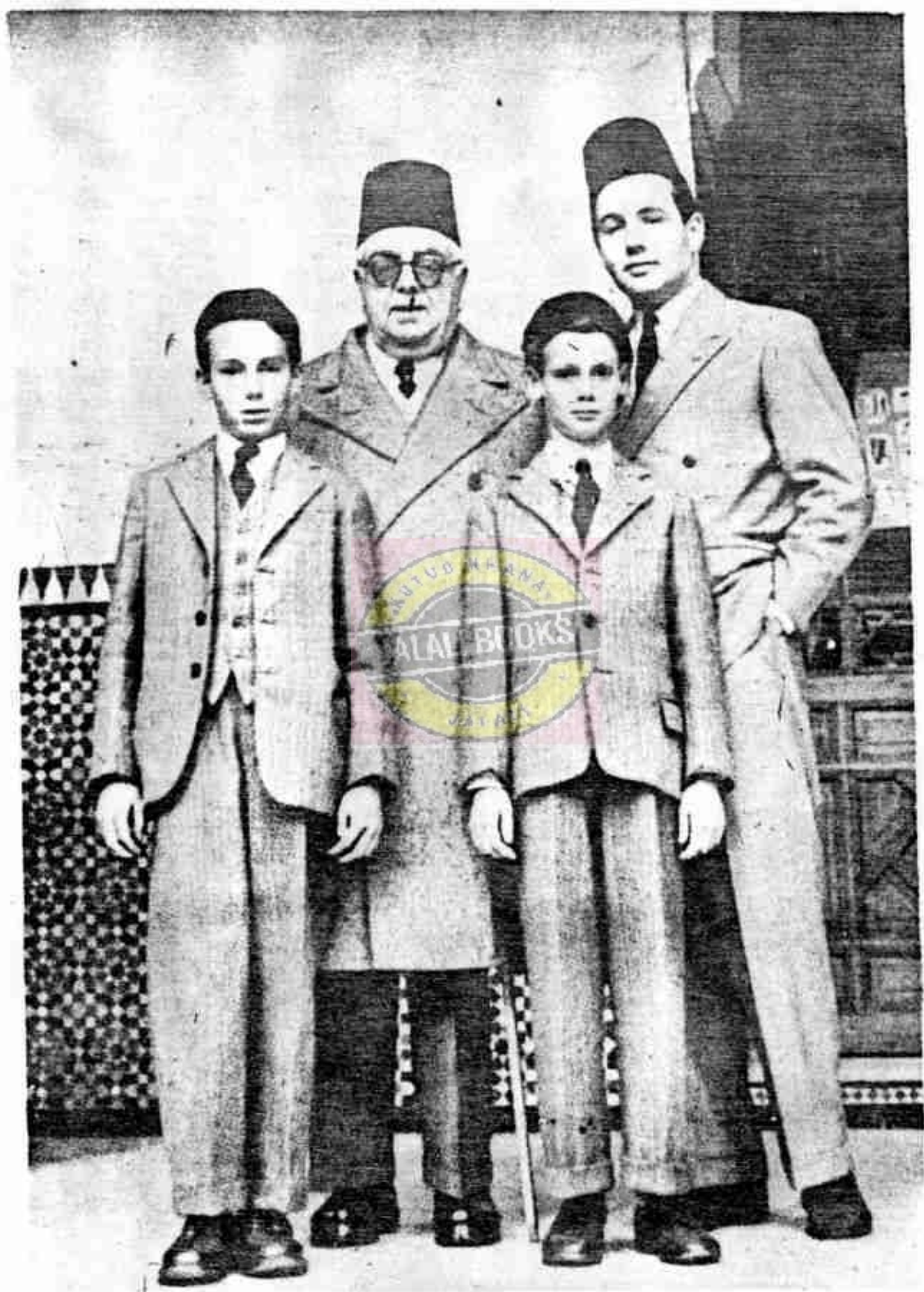
ہز ہائی نس آغا خاں پرنس صدرالدین، پرنس کریم اور پرنس امین
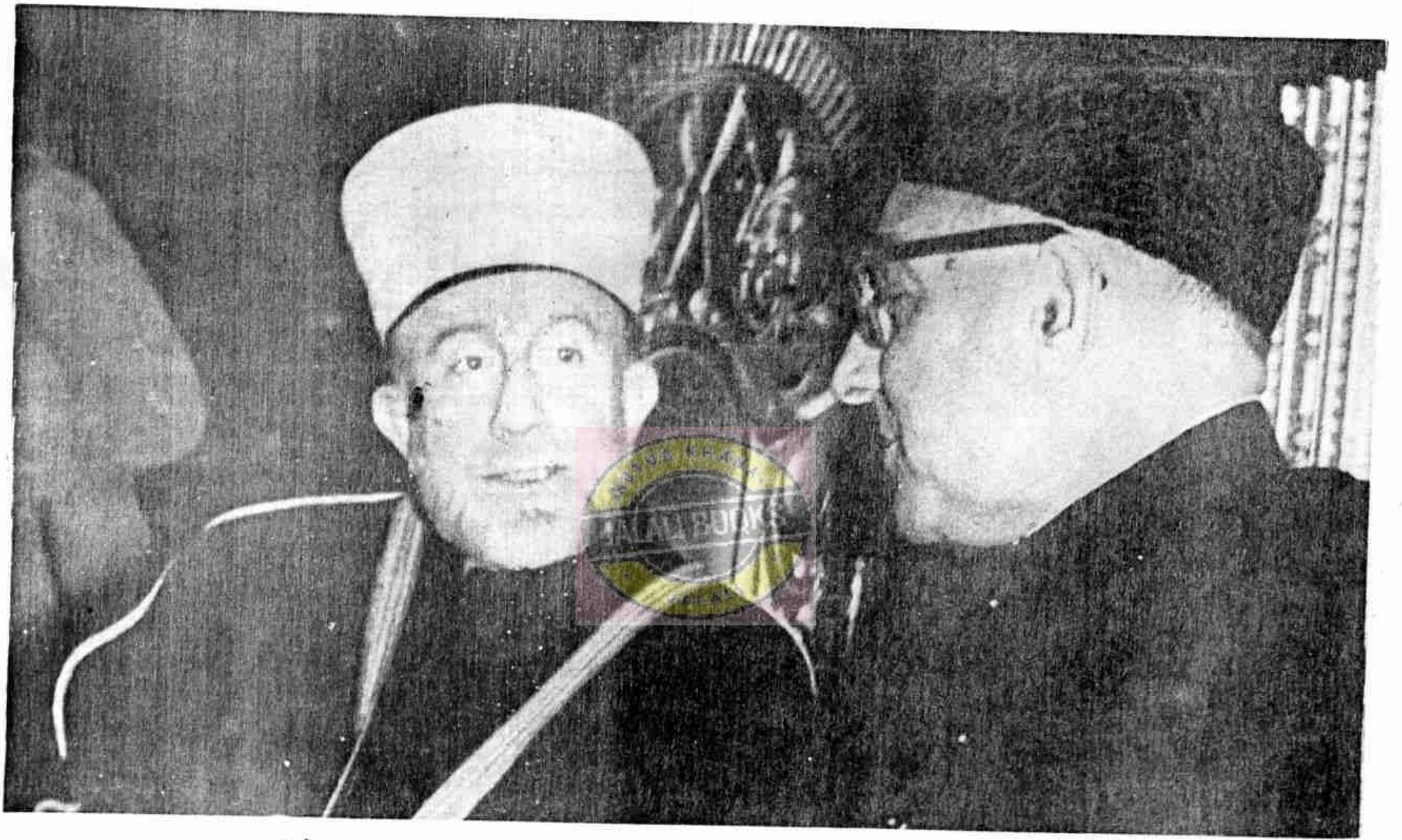
کراچی میں موتمر عالم اسلامی کے پہلے اجلاس کے موقع پر نوابزادہ لیاقت علی خاں اور مفتی اعظم فلسطین

بھارتی افواج کو پاکستانی سرحدوں پر صف آرائی کے موقع پر قائد ملت کا جواب۔
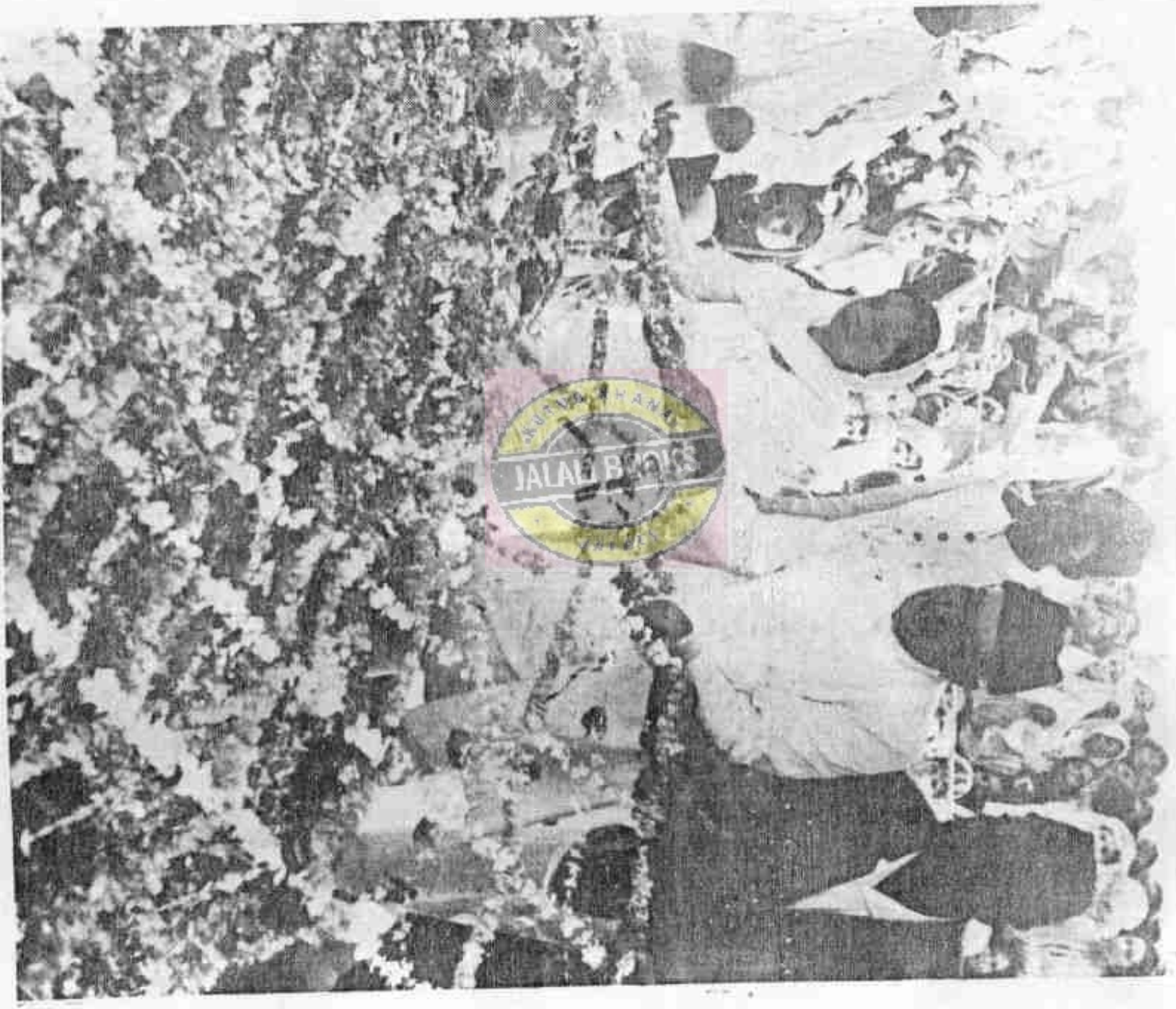
شہیدِ ملت کے مزار پر بیگم رعنا لیاقت علی خان پھولوں کی چادر چڑھا رہی ہیں۔
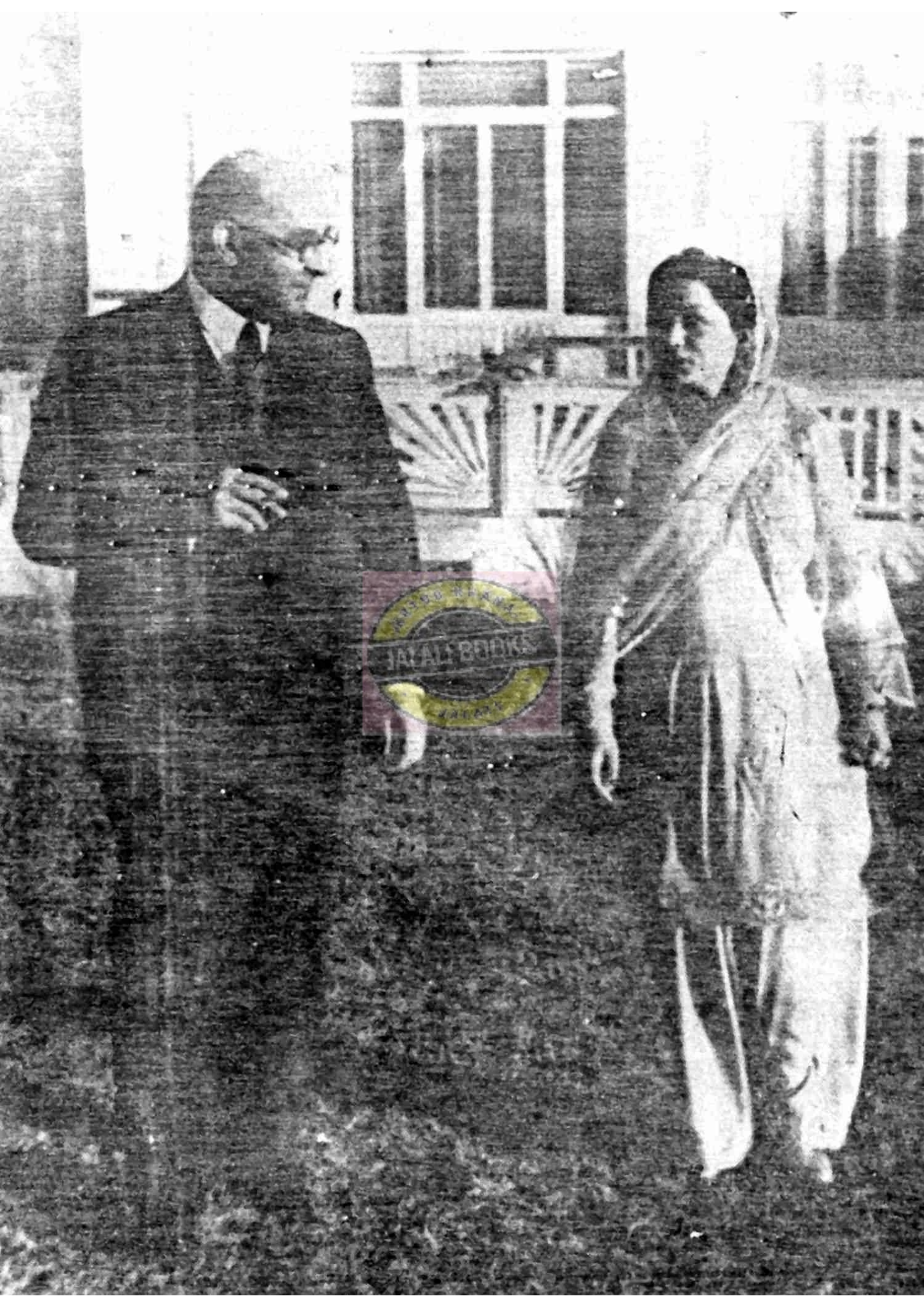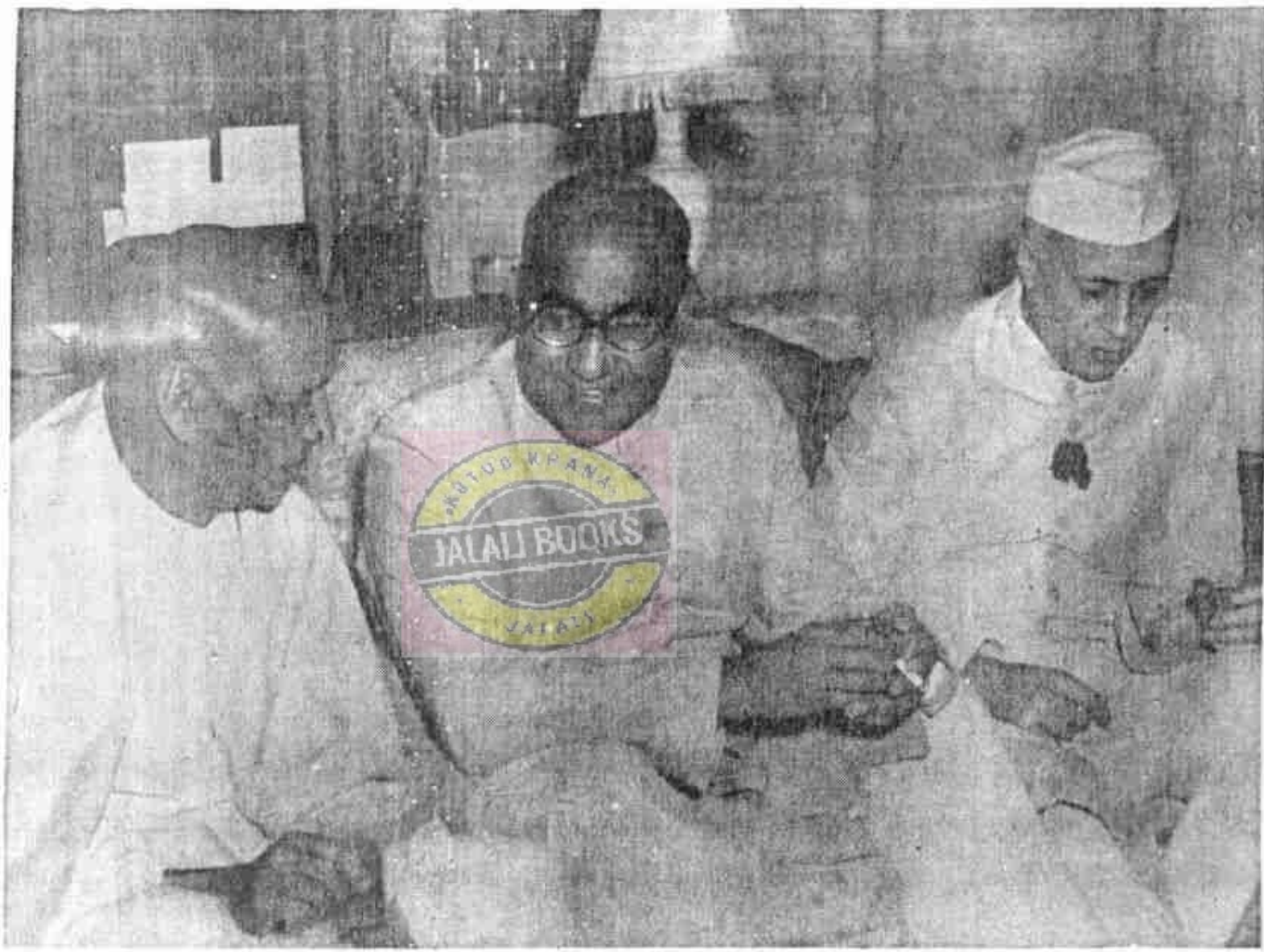
قیام پاکستان کے بعد دھلی میں نوابزادہ پنڈت جواھر لال نہرو اور سردار پٹیل

جنرل آئزن ھاور نوابزادہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کر رھے ھیں۔
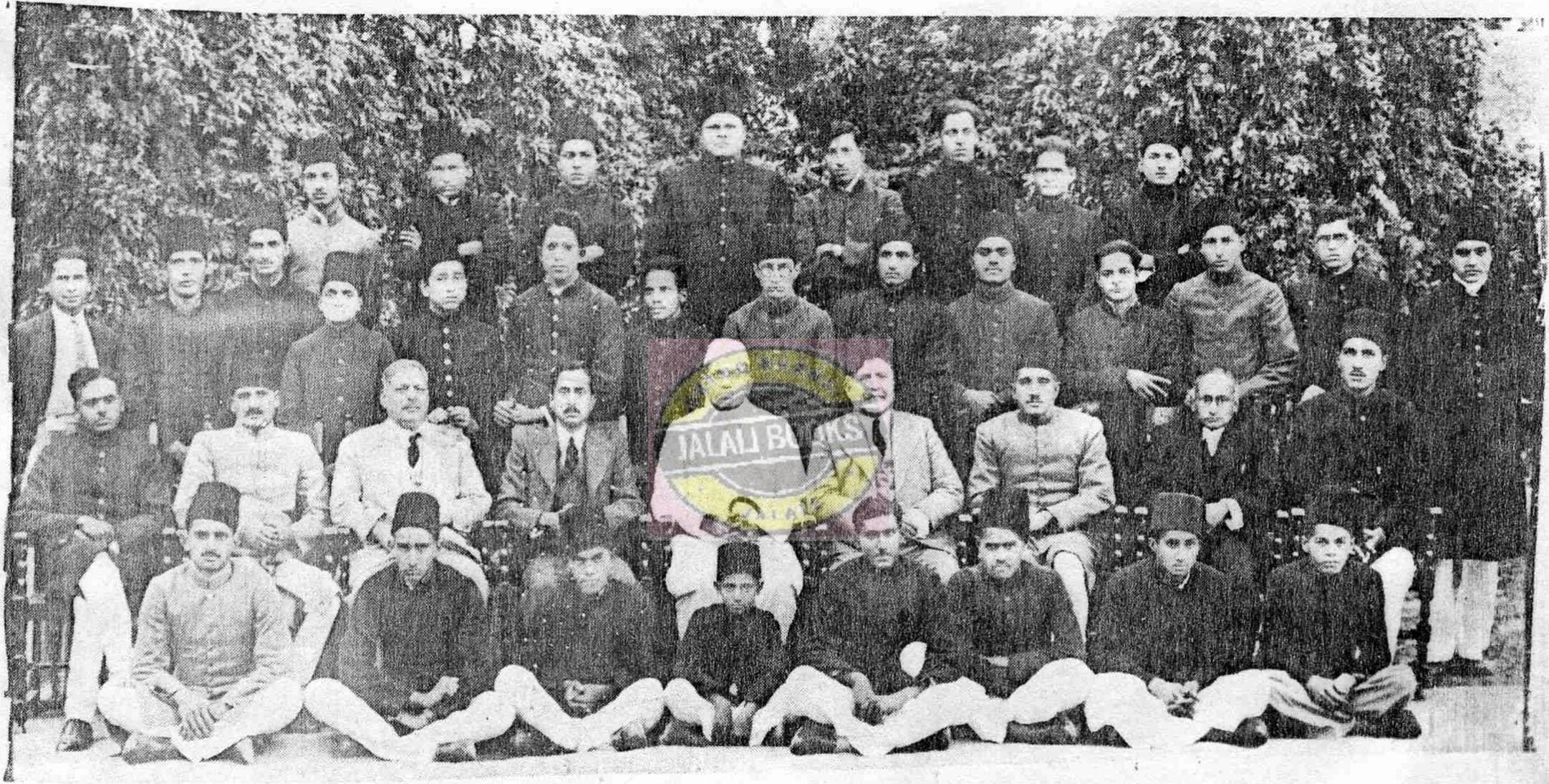
سی پی و برار کے ہوم منسٹر ڈاکٹر دگھو بیٖر راداؤ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور سی پی و برار کے مسلم طلباء کے ساتھ۔
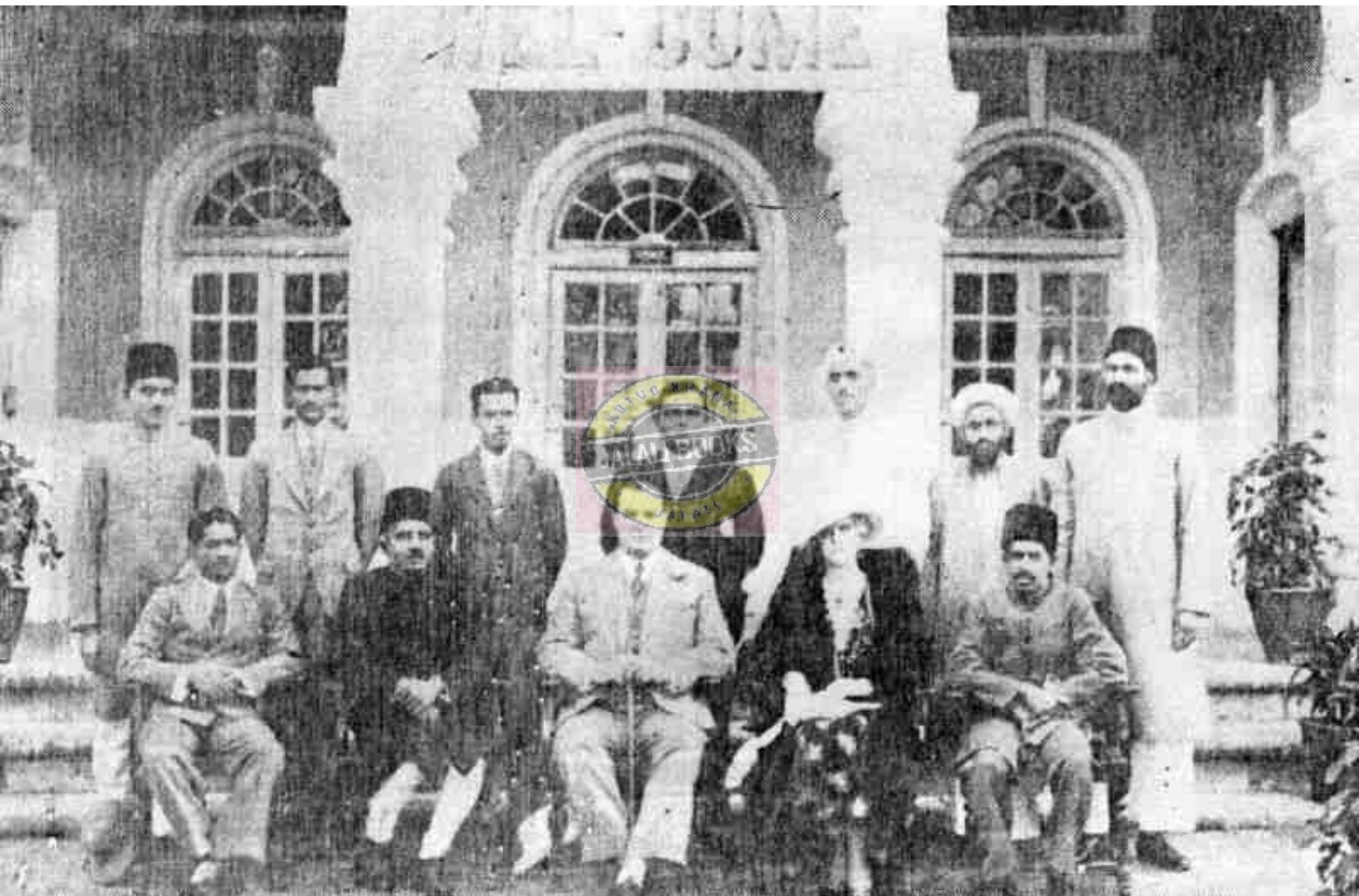
جسٹس فاروقی کے ساتھ سنٹرل پاکستانی جم خانہ کراچی
کی ہاکی ٹیم
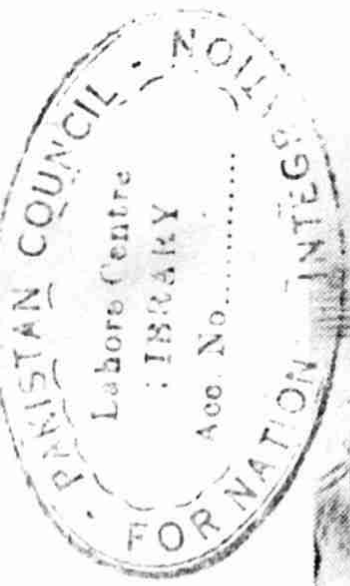
وزیر اعظم آخری عید کے موقعہ پر اپنے اسٹاف اور ملازمین کے ساتھ
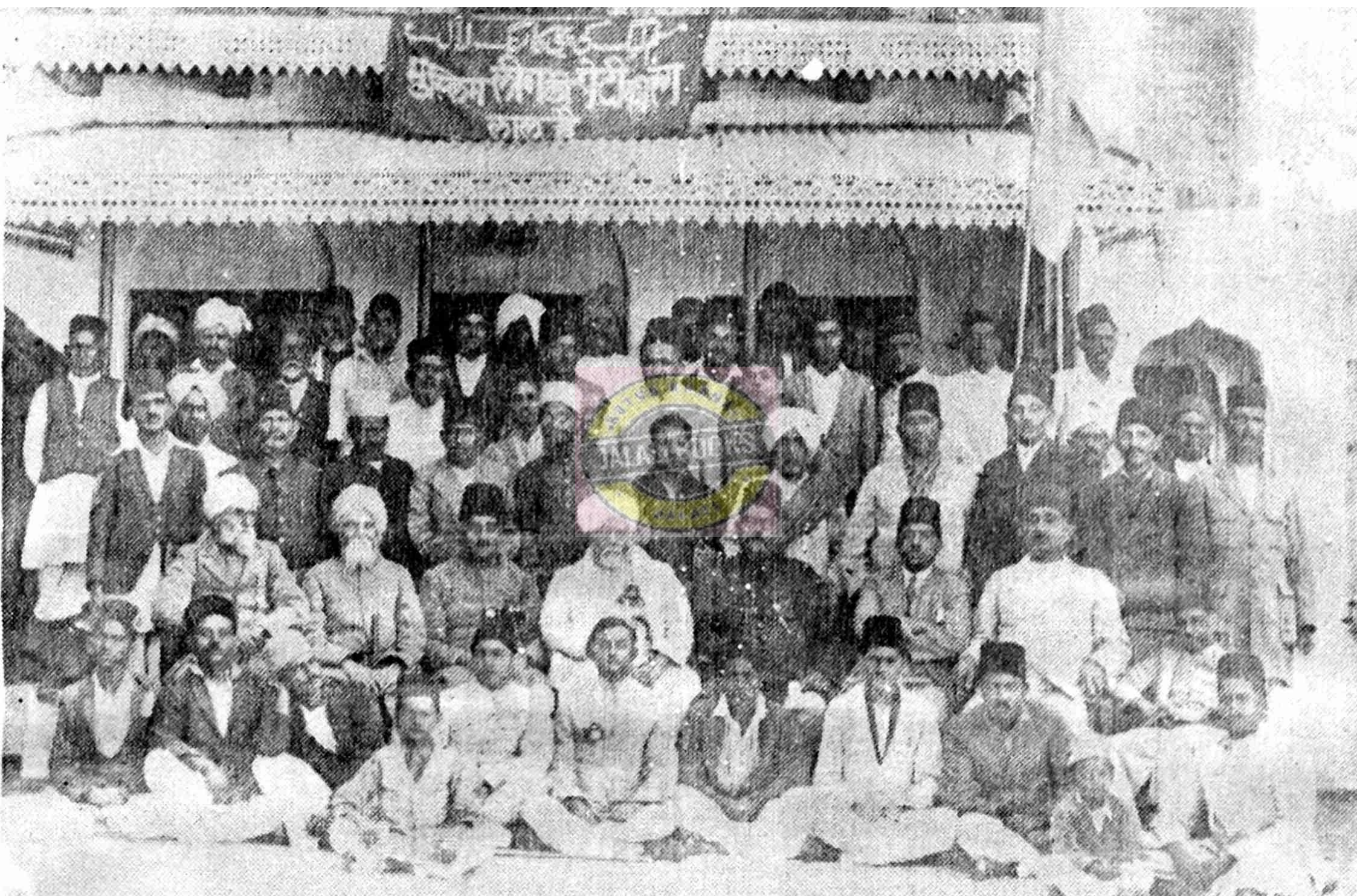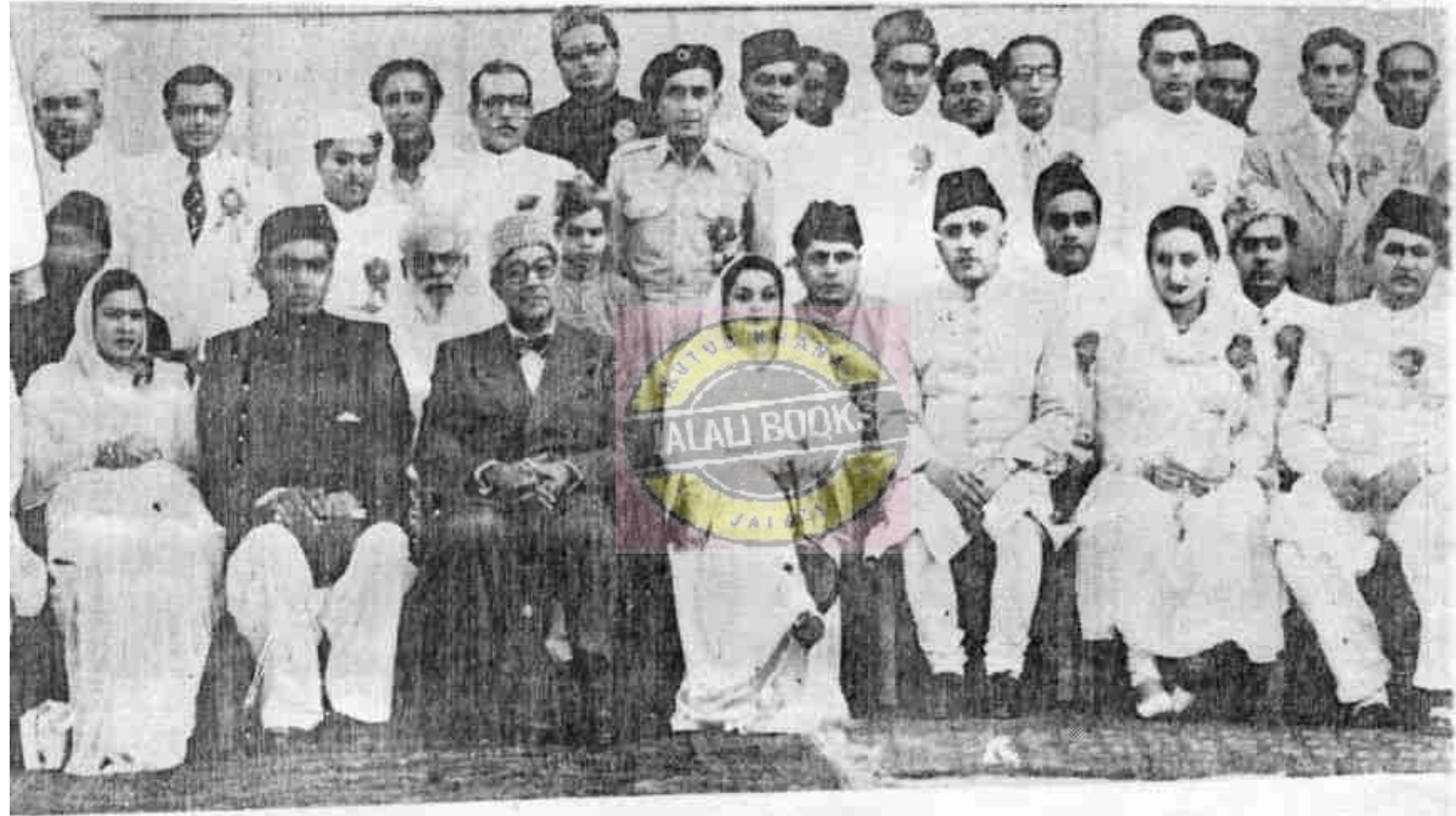
اہالیانِ کراچی کے ساتھ وزیراعظم کی آخری عید ملن پارٹی

نواب صدیق علی خان

تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما نواب صدیق علی خان 1900ء میں ناگپور میں پیدا ہوئے۔